کوثر نیازی

اندازِ بیاں

اندازِ بیاں

کوثر نیازی

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : علمی پرنٹنگ پریس، لاہور

اشاعت اوّل: اگست ۱۹۷۵

تعداد : دو ہزار ایک سو

قیمت : ساٹھ روپے

مقامِ اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

مندرجات

الف ۔ پیش گفتار ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان ۱۱

ب ۔ مقدمہ مصنف ۳۳

ج ۔ فن تقریر کے موضوع پر چند اہم کتابوں کی تلخیص ۱۰۳

د ۔ مذہبی اور دینی تقاریر

۱ ۔ آفتاب ہدایت ۱۱۶

۲ ۔ دور جدید میں اسلام کی خدمت کس طرح ممکن ہے ؟ ۱۳۳

۳ ۔ اسلامی معاشرہ میں مسجد کا مقام ۱۵۷

۴ ۔ حج تمام عبادات کا مجموعہ ہے ۱۶۴

۵ ۔ خلفائے راشدین کے باہمی تعلقات ۱۷۱

۶ ۔ سیدہ رضؓ کی عظمت ۱۸۱

۷ ۔ محبان اہل بیت سے خطاب ۱۸۹

۸ ۔ سفر حجاز کے تاثرات ۱۹۰

۹ ۔ اہل بیت رسولؐ ۲۰۵

۱۰ ۔ محرم کا پیغام ۲۱۲

۱۱ ۔ تہران یونیورسٹی میں خطاب	۲۱۹
۱۲ ۔ اسلامی ریسرچ اور اس کے تقاضے	۲۲۹
۱۳ ۔ اسلامی نظریاتی کونسل سے خطاب	۲۳۷

ر۔ علمی و ادبی تقاریر

۱۴ ۔ برصغیر کی اسلامی ثقافت میں اردو زبان کی اہمیت	۲۴۶
۱۵ ۔ اربابِ علم و دانش کے لیے لمحۂ فکریہ	۲۷۳
۱۶ ۔ اقبال کا عالمگیر پیغام	۲۸۵
۱۷ ۔ آزادئ صحافت	۳۰۵
۱۸ ۔ صحافیوں کی ذمہ داریاں	۳۱۵
۱۹ ۔ قومی زندگی میں ادبی رسائل کی اہمیت	۳۲۱
۲۰ ۔ عربی زبان کی اہمیت	۳۳۷
۲۱ ۔ حالی اور اقبال	۳۵۵
۲۲ ۔ عنایت اللہ مرحوم کی یاد میں	۳۶۷
۲۳ ۔ مقامِ انیسؔ	۳۷۵
۲۴ ۔ خواجہ فریدؒ کا پیغام	۳۹۱

س۔ سیاسی اور عوامی تقاریر

۲۵ ۔ دنیا کا سب سے بڑا انقلابی	۴۱۷
۲۶ ۔ اقوام متحدہ کے فرائض	۴۲۹
۲۷ ۔ مارشل لا کورٹ میں	۴۳۹

۲۸ - قومی تقاضے اور ٹیلیویژن ۴۵۱
۲۹ - نئی نسل سے قومی توقعات ۴۵۹
۳۰ - محنت کشوں کی انجمن میں ۴۷۷
۳۱ - نئی ذمہ داریاں اور نئے تقاضے ۴۹۱
۳۲ - خواتین کے حقوق ۴۹۹

ص۔ خطباتِ جمعہ

۳۳ - بادشاہی مسجد لاہور میں عید کا خطبہ (عید اور ہم) ۵۱۱
۳۴ - خطبہ جمعۃ الوداع (قرآن حکیم کا چیلنج) ۵۲۱
۳۵ - حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ۵۳۱
۳۶ - ووٹ کی شرعی حیثیت ۵۳۹

ط - پارلیمانی تقاریر

۳۷ - عوامی حکومت کے آئینی تصورات ۵۵۵
۳۸ - امن کی راہ ۵۸۵
۳۹ - مسلم بنگال اور پاکستان ۶۱۱
۴۰ - ریڈیو کی اہمیت ۶۲۳
۴۱ - پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس سے خطاب ۶۳۷
۴۲ - بجٹ پر تقریر ۶۴۷
۴۳ - کچھ ذرائع ابلاغ کے بارے میں ۶۶۳
۴۴ - نیشنل پریس ٹرسٹ ۶۸۷
۴۵ - جن پہ تکیہ تھا۔! ۷۰۹

FOREWORD

Pakistan is a nation of individualists and not everyone may agree with everything that Maulana Kausar Niazi has to say on the large variety of subjects he speaks on or writes about. But there will be very few who will dispute the effective and eloquent manner in which he expresses himself. This relationship of style with substance is what *Andaz-i-Bian* is about.

In countries with a low literacy level, the arts and techniques of persuasion play an important part in getting the people to accept new ideas and in motivating them to take the right road to implementing them. In Pakistan, in the traditional open-air public meeting, the audience has varying educational levels, knowledge of contemporary affairs and social backgrounds. In such gatherings a message so articulated as to be understood by the majority is to my mind the most effective test of the style in which the substance of the speech is presented.

Our sub-continent has seen and heard many fine and effective public speakers and the development of oratory as a cultural and political medium. After the unsuccessful war of independence in 1857, public forums and rostrums became the main battlefields and ideas and words became the artillery and ammunition of a new breed of leaders. Their political and religious orientation flavoured the content of their speeches, and the public response to them was a major factor in the success of the mass movements which resulted in the establishment in 1947 of the independent states of Pakistan and India.

A more recent example of the contribution of public oratory to the success of a mass movement was the campaign against the military dictatorships of President Ayub Khan and President Yahya Khan. Many new leaders and speakers were produced by this people's movement. Maulana Kausar Niazi came into the movement with his reputation as a good public speaker already established. The Pakistan People's Party introduced to him a new programme of socio-economic reforms and he in turn explained it to large sections of the people before, during and after the 1970 elections in an idiom they could understand.

His gifts as an orator have served him well. He not only has something important to say but also has a distinctive style in which to say it. This blend is manifest in this collection of the texts of his speeches which, like Maulana Kausar Niazi, speak for themselves.

Zulfikar Ali Bhutto,

I July, 1975

108/072
009208

پیش گفتار

پاکستان انفرادیت پسندوں کی قوم ہے اور ممکن ہے ہر آدمی ہر اُس بات سے متفق نہ ہو جو مختلف النوع معاملات کے بارے میں مولینا کوثر نیازی کی تقریر یا تحریر کا موضوع بنے لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو اُس فصیح و بلیغ اور "مؤثر" انداز کے منکر ہو سکیں جسے وہ اپنے خیالات کا پیرایۂ اظہار بناتے ہیں۔ اسلوب اور نفسِ مضمون کا یہی باہمی رشتہ زیرِ نظر کتاب "اندازِ بیاں" کا موضوع ہے۔

جن ممالک میں خواندگی کی سطح پست ہوتی ہے وہاں عوام کو نئے افکار قبول کروانے اور اُن افکار کو عملی جامہ پہنانے کے لیے درست راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ترغیبِ ذہنی کا فن اور ہُنر بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان کی کُھلی فضاؤں میں ہونے والے روائتی انداز کے عوامی جلسوں میں سامعین ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کے تعلیمی معیار مختلف اور عصری مسائل کے متعلق معلومات اور مجلسی پس منظر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے اجتماعات میں کسی پیغام کا اِس انداز میں بالوضاحت بیان کرنا کہ حاضرین کی اکثریت اُس کا ادراک کر لے اُس اسلوبِ بیان کی مؤثر ترین کسوٹی ہے جس میں تقریر کا نفسِ مضمون پیش کیا جائے۔

ہمارے برِ صغیر نے بہت عمدہ اور مؤثر عوامی مقررین کو سُنا اور ایک ثقافتی اور سیاسی ذریعۂ ابلاغ کی حیثیت سے فنِ خطابت کے ارتقاء کا مشاہدہ کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد عوامی جلسہ گاہیں اور منابرِ خطابت رزم گاہوں کی صورت اختیار

کر گئے اور افکار اور الفاظ رہنماؤں کی نئی نسل کے ہاتھوں میں توپ خانے اور گولہ بارود بن گئے۔ اُن کی سیاسی اور مذہبی طرز و روش اُن کے سُخنانِ خطابت کو خوش ذائقہ بناتی تھی اور عوام کا مثبت ردِ عمل اُن تحریکات کی کامیابی کا غالب عنصر ہُوا کرتا تھا جن کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں پاکستان اور ہندوستان کی خود مختار مملکتوں کا قیام عمل میں آیا۔

کسی عوامی تحریک کی کامیابی میں عوامی خطابت کے دخل کی ایک تازہ ترمثال وہ مہم ہے جو صدر ایوب خان اور صدر یحییٰ خان کی فوجی آمریتوں کے خلاف چلائی گئی۔ اس عوامی تحریک نے کئی نئے رہنماؤں اور مقرّرین کو جنم دیا۔ مولینا کوثر نیازی اس تحریک سے منسلک ہونے سے پیشتر ہی ایک اچھے عوامی مقرّر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے اُنہیں سماجی اور معاشی اصلاح کے ایک نئے پروگرام سے متعارف کرایا اور اُنہوں نے جواباً اس پروگرام کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل، دوران اور بعد عوام کے بڑے طبقوں کے سامنے ایسی زبان میں پیش کیا جو اُن کی فہم کے مطابق ہوتی تھی۔

اُن کی خطیبانہ صلاحیتیں اُن کے بہت کام آتی رہی ہیں۔ اُن کے پاس کہنے کے لیے صرف اہم باتیں ہی نہیں بلکہ بات کرنے کا ایک امتیازی اسلوب بھی ہے۔ گفتار اور اسلوب کا یہ امتزاج اُن کے اس مجموعۂ تقاریر کے متن سے عیاں ہے، اور مولینا کوثر نیازی کی طرح یہ تقاریر بھی اپنی خوبیوں کی خود شاہد ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو
یکم جولائی ۱۹۷۵ء

فہرست مقدمہ

۱ - نطق کی ارتقائی صورتیں	۳۴
۲ - نطق و بیان کے معجزات	۳۵
۳ - آنحضورؐ کی معجز بیانی	۳۶
۴ - بعض دوسرے انبیائے کرام	۳۸
(حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام)	۳۸
۵ - زرتشت، افلاطون - مہاتمہ بدھ - کرشن	۳۹
۶ - کلمات سخن کی اہمیت	۳۹
۷ - قرآن حکیم کی خطیبانہ خصوصیات	۴۰
۸ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان خطابت	۴۴
۹ - خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی کے خطیبانہ کمالات	۴۹
۱۰ - باب مدینۃ العلم	۵۲
۱۱ - جگر گوشۂ رسول	۵۳
۱۲ خطیبۂ اہل بیت	۵۵
۱۳ - ملت اسلامیہ کا عظیم ورثہ	۵۷
۱۴ - حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	
حضرت خواجہ غریب نوازؒ، حضرت نظام الدین اولیا دہلویؒ	
حضرت خواجہ عبداللہ انصاری مہرویؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ	
سید عبدالقادر جیلانیؒ، سید شہاب الدین سہروردیؒ	

امام غزالیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ،
مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ

۱۵ - خطبات جہاد ۵۹
۱۶ - طارق بن زیاد، سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین
محمد غوری، ظہیر الدین بابر، سید احمد بریلوی
شاہ اسمٰعیل شہید، سالار بخت خان
۱۷ - قدیم و جدید دنیا کے بعض عظیم غیر مسلم خطباء: سقراط ۶۲
۱۸ - ڈیما سیتھنز سرو ۶۳
، پیری کلز ۶۴
۱۹ - انگلستان کے نامور مقررین ۶۴
۲۰ - ایڈمنڈ برک، چارلس جیمز فاکس
پامرسٹن، بنجمن ڈسرائیلی
ولیم گلیڈسٹون، جان برائیٹ، ونسٹن چرچل
۲۱ - امریکی مقررین ۶۸
۲۲ - جارج واشنگٹن، ابراہم لنکن، بلی گراہم
۲۳ - عصر حاضر کے بعض دیگر نامور خطیب
۲۴ - ایڈولف ہٹلر، مولینی، جمال عبد الناصر
احمد سوئیکارنو، فائیڈل کاسٹرو، شاہ فیصل،
یاسر عرفات، کرنل قذافی
۲۵ - فنِ تقریر کے اصول و ضوابط ۷۴
۲۶ - تیاری، اندازِ خطاب، معنوی صفات ۷۵

۲۷ برصغیر کے نامور خطباء اور مقررین ۷۷

۲۸ - مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی جوہر
مولانا ظفر علی خاں ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری
شیخ حسام الدین ، ماسٹر تاج الدین انصاری
قاضی احسان احمد شجاع آبادی
مولانا محمد علی جالندھری ، مولانا غلام غوث ہزاروی
مظہر علی اظہر ، شورش کاشمیری
مولانا شبیر احمد عثمانی ، نواب بہادر یار جنگ
علامہ علاؤالدین صدیقی -

۲۹ - شیعہ مکتبۂ فکر ۸۳

۳۰ - مولانا سبط حسن ، حکیم مرتضیٰ حسین
مولانا محمد حسین ، مولانا ناصر حسین
مولانا نجم الحسن ، علامہ باقر علی نجفی
علامہ سید محمد دہلوی ، حافظ کفایت حسین
علامہ رشید ترابی ، علامہ ابن حسن جارچوی
مظفر علی شمسی ، سید اظہر حسین زیدی
علامہ نصیر الاجتہادی ، علامہ عقیل ترابی
علامہ ابن حسن نجفی ،

۳۱ - جماعت اسلامی -

۳۲ - مولانا مودودی ۸۸

۳۳ - واعظین کا سلسلہ ۸۸

۳۴ - مولانا اشرف علی تھانویؒ ، مولانا احمد رضا بریلوی
واعظ میر محمد یوسف ، مولانا احتشام الحق تھانوی
صاحبزادہ فیض الحسن ، مولانا غلام اللہ خان
سید عنایت اللہ شاہ بخاری
مولانا محمد اجمل ، مولانا محمد بخش مسلم
مولانا محمد شفیع اوکاڑوی
مولانا عبد القادر آزاد ، مولانا عبد الشکور دین پوری

۳۵ - قائد اعظم محمد علی جناح ۹۰

۳۶ - ذوالفقار علی بھٹو ۹۲

۳۷ - عبد الحفیظ پیرزادہ ، محمد حنیف رامے
ملک غلام مصطفےٰ کھر ، ممتاز علی بھٹو

۳۸ - اندازِ بیاں ۹۵

۳۹ - کچھ اس کتاب کے بارے میں ۱۰۰

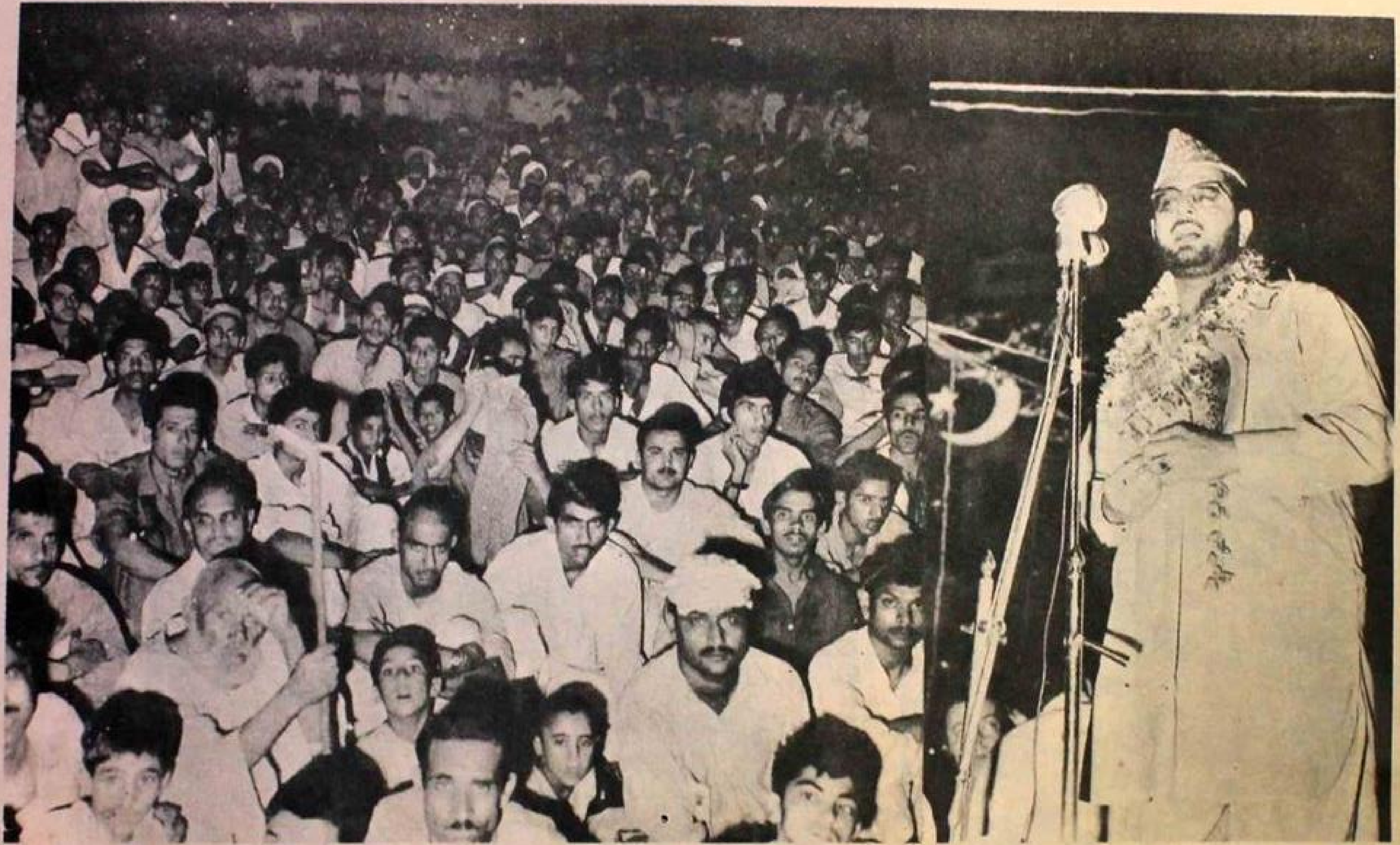

فوارہ چوک پشاور میں ایک جلسہ عام سے خطاب

چکوال میں ایک عوامی جلسہ

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کھاریاں میں

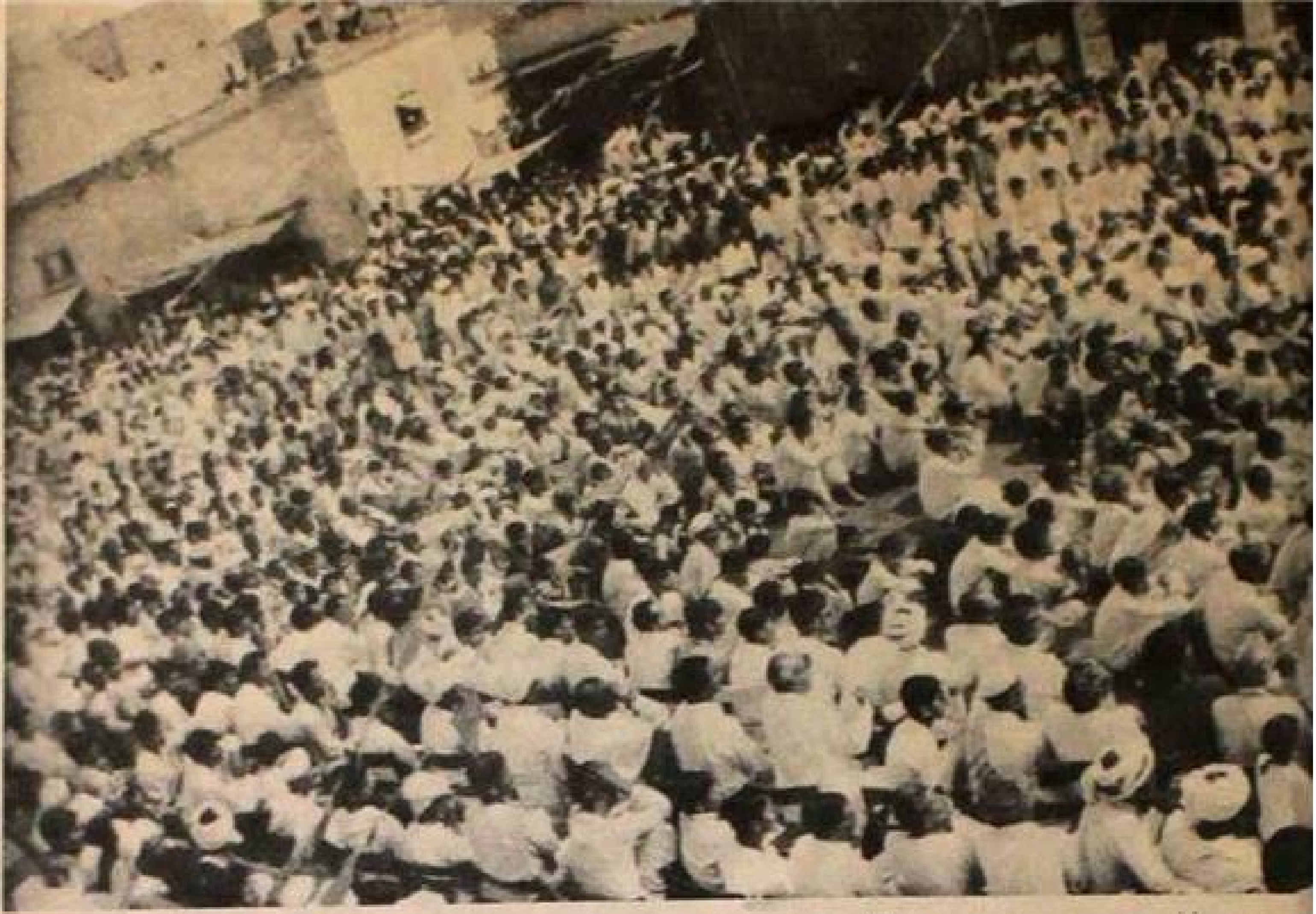

ا منظر ۱۲ر ستمبر ۱۹۷۲ء

ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے ھیں

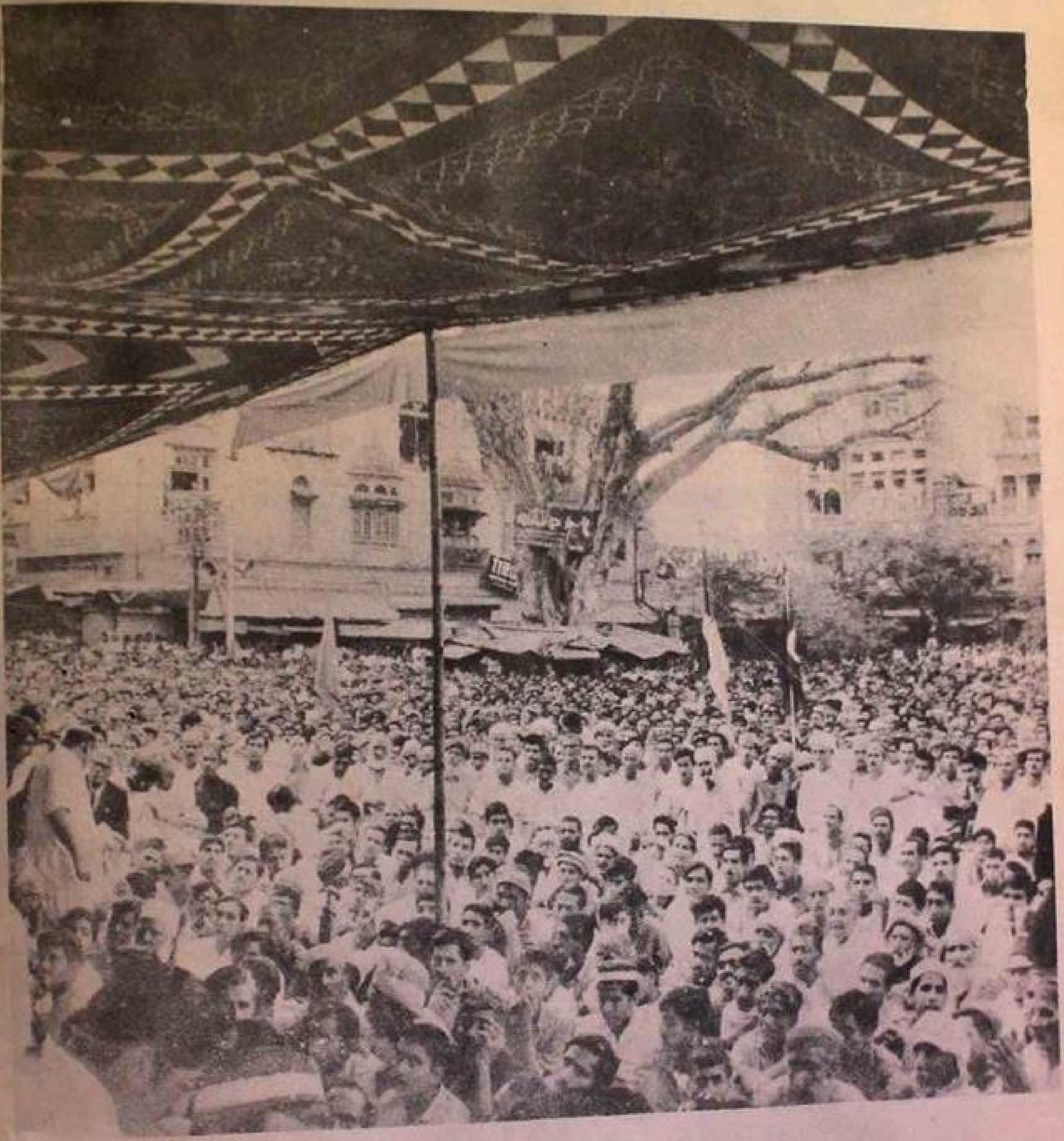

چوک یادگار پشاور کے جلسہ عام

کا منظر ـــــ ۲۵ اپریل ۱۹۷۲ء

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی (مدین) سوات

جلوس کی قیادت کر رہے ہیں ۱۲ مئی ۱۹۷۳ء

راولپنڈی کے ایک نواحی گاؤں ترااڑ م

شرقپور (ضلع شیخوپورہ) میں

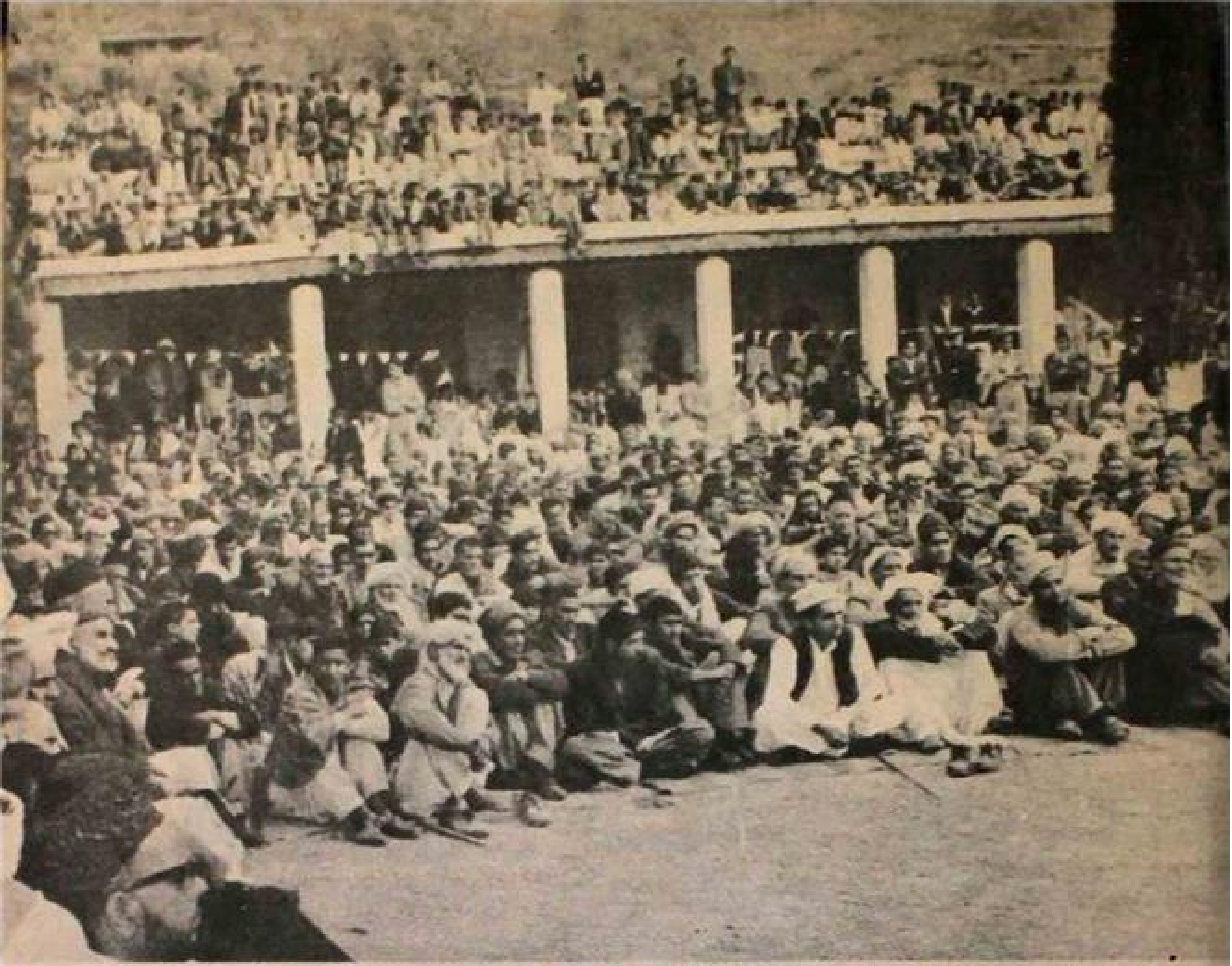

جلسہ عام سے خطاب ۱۱ فروری ۱۹۷۳ء

عام سے خطاب ۱۰، ۸ فروری ۱۹۷۳ء

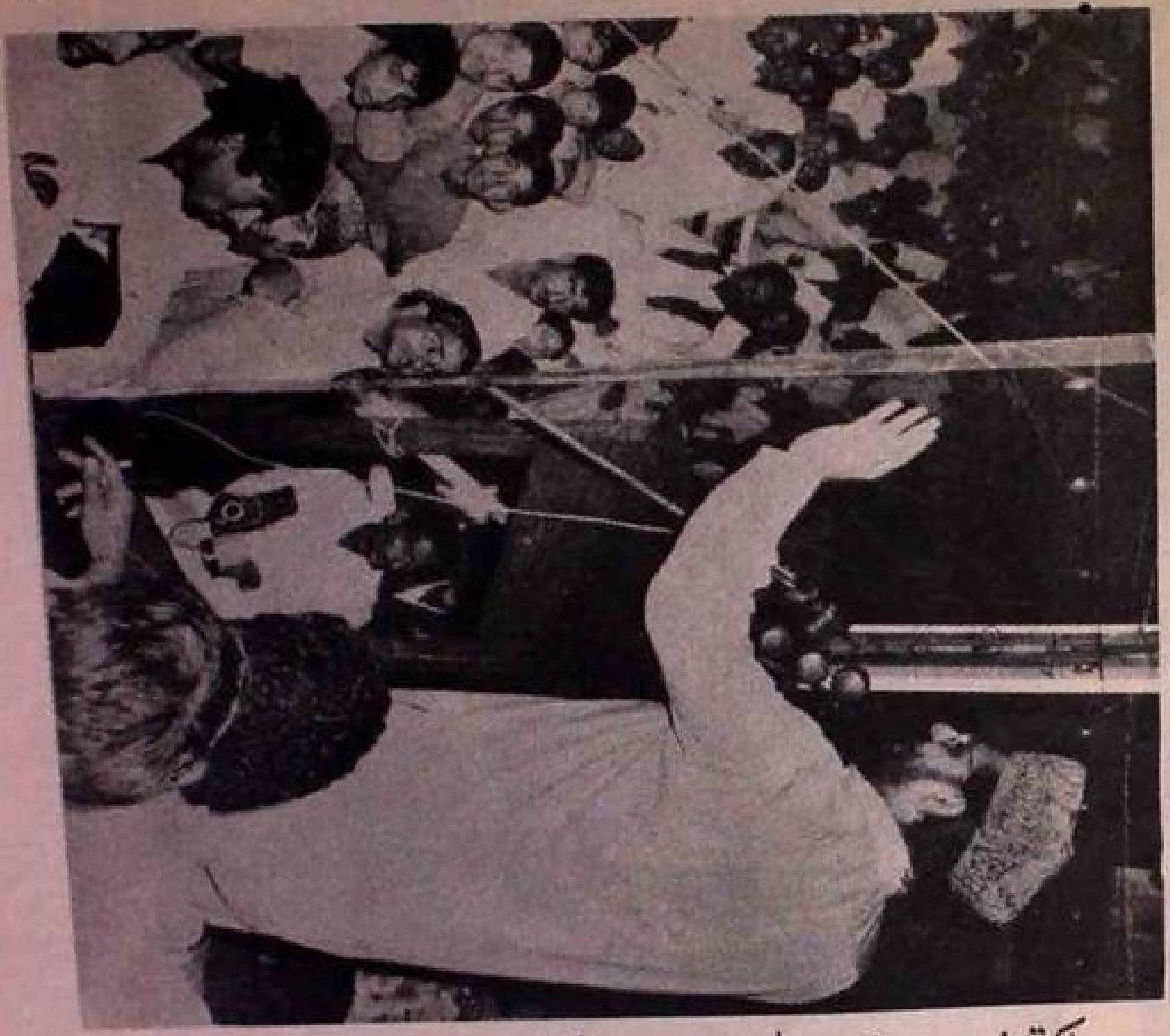

پاکستان پیپلز پارٹی لالہ موسیٰ کے زیر اہتمام
ایک بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب کا منظر۔
۳ ، اکتوبر ۱۹۷۳ء

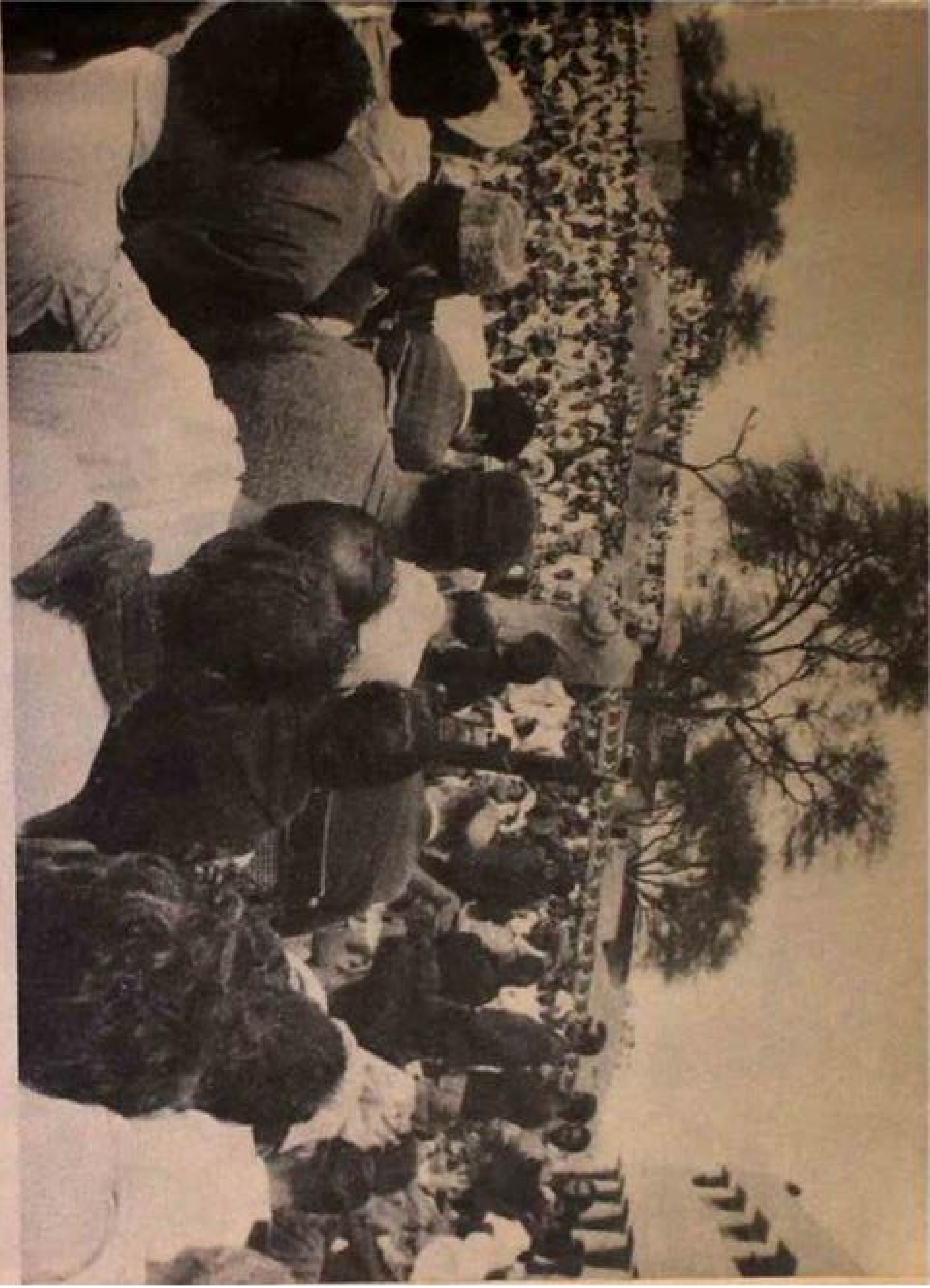

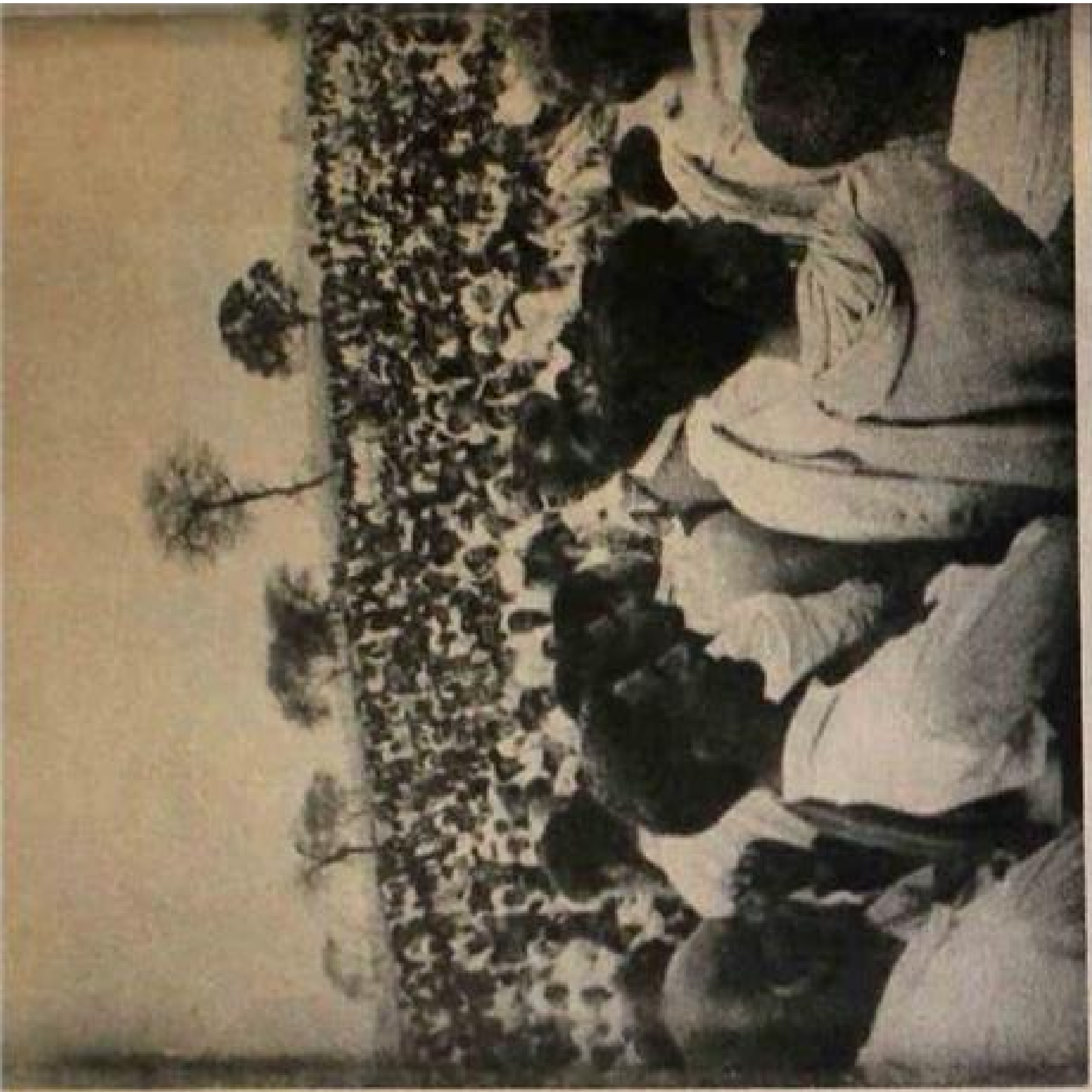

ضلع سیالکوٹ میں ایک عوامی جلسہ کا منظر

وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کراچی میں بوہرہ کمیونٹی کے ساتھ

گوجرانوالہ میں ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت ۱- ۲ر اپریل ۱۹۷۴ء

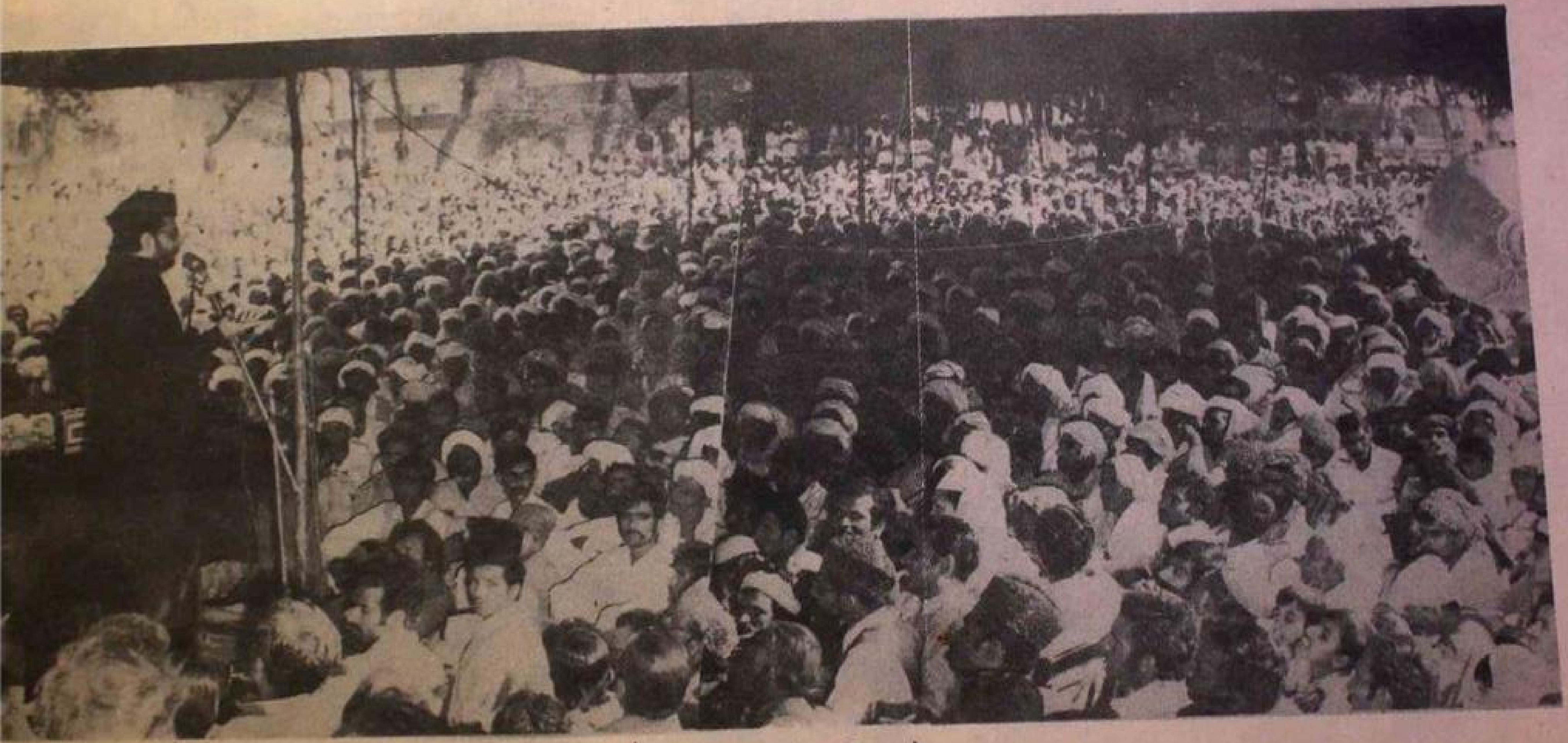

خانپور کے ایک جلسہ عام سے خطاب ۱۰ مارچ ۱۹۷۵ء

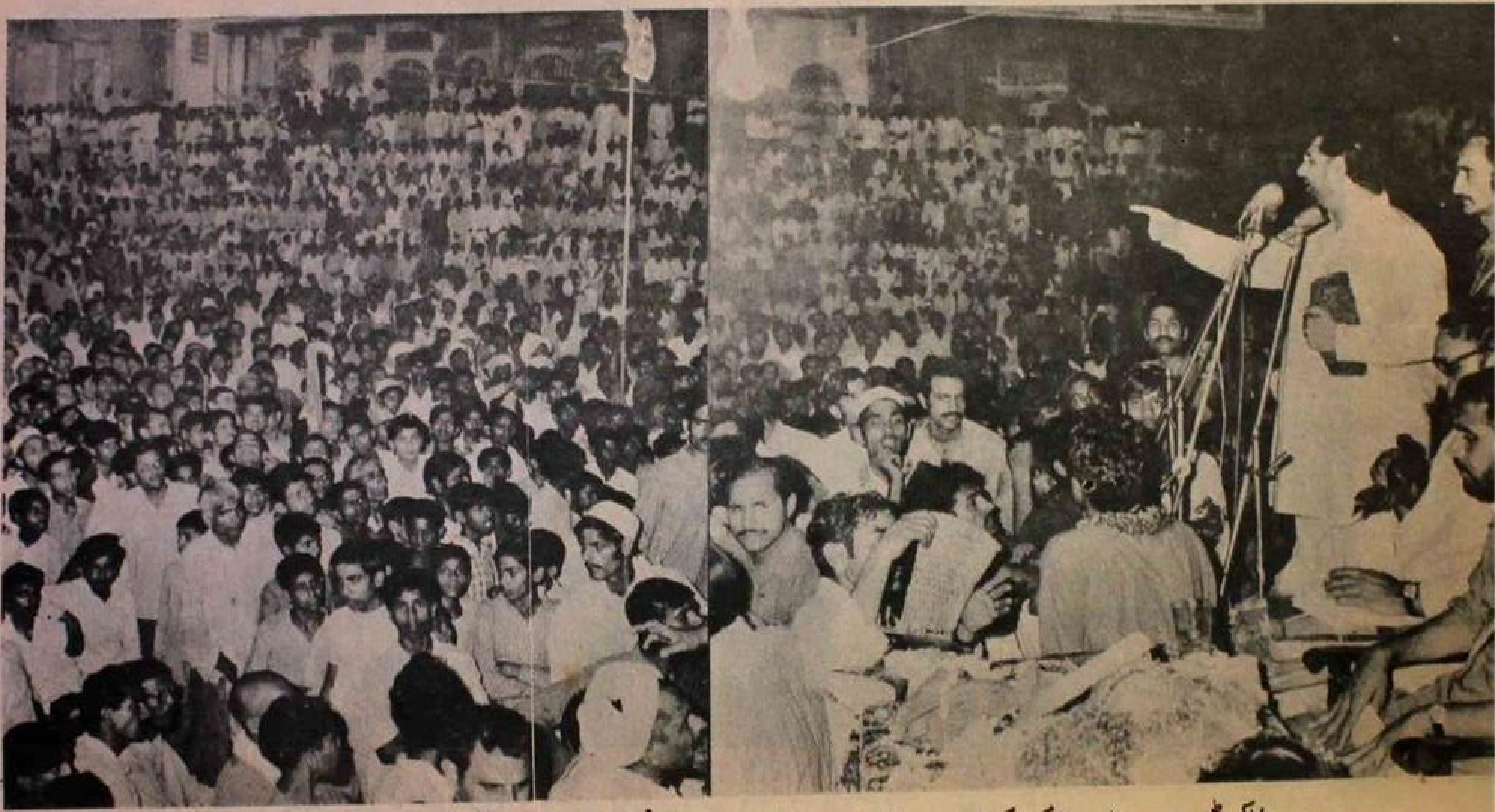

سیالکوٹ میں یوم مئی کے اجتماع پر مزدوروں سے خطاب ۔ یکم مئی ۱۹۷۳ء

حج سے واپسی پر کراچی کے شہری استقبال کر رہے ہیں

مُقدّمہ

اِس عالمِ کون و مکاں میں انسان کو جن دو اہم امتیازی خصوصیتوں کی بنا پر دوسری تمام مخلوقات پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے ان میں سے پہلی خصوصیت نطق ہے اور دوسری شعور۔ یہ دونوں خصوصیتیں دوسرے حیوانات کو حاصل نہیں۔ بعض جانوروں میں کسی حد تک سمجھ اور وقوف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ اور وقوف محض ان کی جبلّی حسیات کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ خود سوچنے اور سوچ کر چیزوں کو سمجھنے کی قوت ان میں نہیں ہوتی۔ ان کے لیے زندگی میں ذاتی تجربات کوئی معنوی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ ان تجربات کو ذہن میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی اور اپنے ہم جنسوں کے تجربات تو ان کے لیے بالکل ہی بے معنی ہوتے ہیں کیونکہ ان تجربات کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کے لیے انھیں زبان کا وسیلہ میسر نہیں۔

اگرچہ نطق اور شعور دو جداگانہ خصوصیات ہیں۔ لیکن ان کا باہمی ربط اتنا قریبی ہے کہ ہم آسانی سے انھیں "منحصر بریک دگر" (Inter-dependent) خصوصیات کہہ سکتے ہیں۔ اگر انسان کو صرف شعور حاصل ہوتا اور وہ نطق کی قوت سے محروم رہتا تو وہ اپنے جسمانی، ذہنی، معاشی، جذباتی اور روحانی تجربات کو دوسروں تک کیونکر پہنچاتا۔ اور اگر ایک انسان کے تجربات دوسرے تک نہ پہنچتے اور ایک گروہ کے تجربات سے دوسرے انسانی گروہ واقف نہ ہو سکتے تو انفرادی تجربات اجتماعی تجربات کی صورت کس طرح اختیار کرتے۔ اور اگر انفرادی تجربات اجتماعی تجربات میں نہ بدلتے تو ارتقائے انسانی کا عمل کیونکر وقوع پذیر ہوتا اور اگر ارتقائے انسانی کا عمل وقوع پذیر نہ ہوتا تو آج ہم زندگی کی کونسی سطح پر ہوتے اور انسانیت حیوانیت پر کس طرح برتری اور شرف حاصل کرتی اور انسان اشرف المخلوقات کے لقب سے کیونکر ملقب ہوتا۔

اسی طرح اگر انسان محض نطق کی صفت سے متصف ہوتا اور شعور کی صفت سے محروم رہتا تو اس کے لیے انفرادی اور اجتماعی ترقی کے کون سے مواقع تھے۔ وہ محض ایک بولنے والی مشین ہوتا۔ اس کا کلام بے ربط بھی ہوتا اور بے معنی بھی۔ کیونکہ کلام میں ربط اور مفہوم پیدا ہی شعور سے ہوتا ہے اور اس ربط اور مفہوم کی سطح لازماً شعور کی سطح کے مطابق اور متناسب ہوتی ہے۔ جو شخص جتنے اعلیٰ اور ارفع شعور کا مالک ہوگا اس کے کلام میں اتنا ہی ربط اور تسلسل ہوگا اور اس کے کلام کے اندر مطالب اور مفاہیم بھی ویسے ہی گہرے ہوں گے۔ افراد کے کلام کا یہی ربط اور تسلسل اور مطالب و مفاہیم کی یہی گہرائی اور عمق اجتماع کے کلام کی زیب و زینت بن کر پورے معاشرے کے اندازِ کلام کو مزیّن اور آراستہ کردیتا ہے اور جب کوئی معاشرہ اجتماعی طور پر اپنے اندر حسنِ گفتار اور خوبیٔ کلام کی خصوصیات پیدا کرلیتا ہے تو اسے دوسرے معاشروں کے مقابلے میں ایک بہتر مقام حاصل ہوجاتا ہے اور پھر اسے یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اس اعزاز پر اظہارِ تفاخر بھی کرے۔

نطق کی ارتقائی صورتیں

حرف، لفظ، کلمہ سب نطق کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ نطق آوازوں کے ربط و تسلسل کی ترتیب و تدوین سے صورت پذیر ہوتا ہے اور سماعت کے واسطے اس کا ابلاغ دوسروں تک ہوتا ہے۔ اس لیے کسی شخص کی ناطقانہ صلاحیتوں سے صرف وہی لوگ استفادہ کرسکتے ہیں، جو حاضر و موجود ہوں۔ اس سے استفادے کا دائرہ بہت محدود، وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس طرح انسانی تجربات کے ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک، ایک مقام سے دوسرے مقام تک اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک منتقل ہونے کے امکانات محدود ہوجاتے ہیں۔ ان امکانات کو وسعت دینے اور انسانی تجربات کو ایک عہد سے دوسرے عہد تک پہنچانے اور فکر و شعور کے تاریخی ارتقا کو تسلسل عطا کرنے کے لیے انسانوں نے اپنے شعور ہی کے بل بوتے پر اپنی آوازوں کو حروف و الفاظ کی صورت میں منضبط کرکے مستقل طور پر محفوظ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس طرح تقریر تحریر میں بدل گئی اور یہ

تحریریں ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے، ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک منتقل ہونے لگیں جو تجربات صرف سماعت کے واسطے سے حاضر و موجود تک پہنچتے تھے اور ان کی نوعیت وقتی اور عارضی ہوتی تھی، وہ بصارت کے واسطے سے غائب اور ناموجود تک پہنچنے لگے اور ان کی نوعیت دائمی اور دیرپا ہو گئی۔

لیکن ابلاغ کی یہ صورت بھی عمومی ہونے کے باوجود عالمگیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جغرافیائی طور پر مختلف ممالک میں منقسم ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت سینکڑوں گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر چند کہ ہر لسانی گروہ میں داخلی طور پر اظہار و ابلاغ کے ممکنات وسیع ہیں، لیکن بین الاقوامی سطح پر اظہار و ابلاغ کے راستے میں لسانی اختلافات ایسی دیواریں بن جاتے ہیں کہ انہیں درمیان سے ہٹانا مشکل بلکہ عامۃ الناس کے لیے محال ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود انسانی ذہن ان دیواروں کو بھی ہٹا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے اور بین اللسانی تراجم کے ذریعے اس نے مختلف لسانی گروہوں کے خیالات کو ایک دوسرے تک پہنچانے (بالخصوص بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں کے خزینوں کو تمام دنیا تک پہنچانے) میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

عصرِ جدید کی سائنسی ایجادوں نے نطق و بیان کے پھیلاؤ کے امکانات میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے اب فانی انسان کی آواز سائنسی آلات کے ذریعے محفوظ ہو کر لافانی بن گئی ہے۔ اب بڑے بڑے جادو بیان خطباء کی خطابت صدیوں تک محفوظ رہ سکتی ہے اور افکار و خیالات کے ساتھ ساتھ بولنے والے کا لب و لہجہ بھی غیر محدود عرصے تک سُنا جا سکتا ہے۔ گویا نطق جو آج سے پہلے وقتی طور پر صرف حاضر و موجود افراد کے لیے قابلِ استفادہ تھا اب صدہا سال تک غائب اور ناموجود کے لیے بھی استفادہ بخش ہو سکتا ہے

نطق و بیان کے معجزات

اجتماعی انسانی روابط میں دوسروں کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا وصف بلکہ عاجز اور مغلوب کر دینے والا سب سے مؤثر ہتھیار نطق و بیاں کا کمال ہے سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے تاریخی واقعات

موجود ہیں جہاں ہتھیار کارگر نہ ہو سکے لیکن زور خطابت اپنا کام کر گیا۔ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین خطیب تھے اور کمالِ خطابت کی بنا پر انھیں افصح العرب کہا جاتا تھا چنانچہ کفارِ مکہ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ حج کے اجتماع پر باہر سے آنے والے لوگ رسولِ کریمؐ سے نہ مل سکیں۔ وہ لوگوں کو یہ کہہ کر رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے روکتے تھے کہ محمدؐ جادوگر ہیں اور ان کی تقریر میں اتنی تاثیر ہے کہ لوگ ان کی باتیں سن کر اپنے آباؤ اجداد کے دین سے پھر جاتے ہیں۔

آنحضورؐ کی معجز بیانی

قریش نے آنحضورؐ کی فصاحت بیان اور تاثیر کلام سے ان لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے بہت جتن کیے جو حج اور عکاظ کے اجتماعات میں باہر سے آتے تھے تاکہ وہ لوگ حضورؐ کی تبلیغ سے متاثر نہ ہو سکیں۔ چنانچہ ایک بار ولید بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے بزرگ تھا حج کے زمانہ کے قریب قریش کا ایک بڑا اجتماع کیا اور اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا "اے گروہ قریش! موسم حج قریب ہے اور اطراف و جوانب سے عربوں کے وفود پہنچنے والے ہیں۔ محمدؐ کی خبر لوگوں تک پہنچ چکی ہے لہذا ان کے متعلق تم سب یک رائے اور یک زبان ہو جاؤ تاکہ کسی ایک کا بیان کسی دوسرے کے بیان کی تکذیب و تردید نہ کرے اور ان کے متعلق باہر سے آنے والے لوگوں کی رائے یکساں ہو۔"

حاضرین نے ولید سے کہا:

"اے عبد شمس تم ہی ہمارے لیے کوئی بہتر راستہ تجویز کر دو۔"

ولید نے کہا:

"تم لوگ بتاؤ کہ ہم اس کا کیا نام رکھیں۔"

قریش نے جواب دیا:

"بہتر ہے کہ ہم ان کو کاہن کہنا شروع کر دیں۔"

ولید بولا: "واللہ وہ کاہن نہیں۔ میں نے بہت سے کاہنوں کو دیکھا ہے مگر ان کے پاس نہ کاہنوں

کی سی زمزمہ آرائی ہے اور نہ ویسی سجع بندی۔"

قریش بولے: "اچھا تو پھر ہم اس کو مجنوں کہیں گے۔"

ولید نے جواباً کہا "وہ مجنوں بھی نہیں۔ میں نے اہلِ جنوں کو دیکھا ہے اور جنون کی کیفیات کو سمجھتا ہوں۔ ان میں نہ ان جیسا اختناق ہے نہ اختلال، نہ شیطانی وسوسے۔"

قریش نے کہا: "اچھا تو پھر ہم ان کو شاعر مشہور کر دیتے ہیں۔"

ولید بولا: "بلاشبہ وہ شاعر نہیں۔ میں شاعری سے اچھی طرح واقف ہوں اور تمام بحور کو جانتا ہوں۔ محمدؐ کے پاس شعر و شاعری قسم کی کوئی چیز نہیں۔"

لوگوں نے کہا: "پھر کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم اسے ساحر مشہور کر دیں۔"

ولید نے کچھ سوچ کر جواب دیا "اگرچہ وہ ساحر بھی نہیں کیونکہ نہ تو اس کے پاس اس طرح کا جنتر منتر ہے نہ جادوگرانہ گرہ بندی، لیکن دوسری چیزوں کے مقابلے میں اسے ساحر مشہور کرنا زیادہ قرینِ عقل ہے۔ تم لوگوں سے کہو کہ یہ ساحر ہے اور ایسا ساحرانہ کلام پیش کرتا ہے جس کے ذریعے بیٹے کو باپ سے، بھائی کو بھائی سے، شوہر کو زوجہ سے اور فرد کو خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔"

لیکن قریش کا ہر پروپیگنڈہ بے کار ثابت ہوا۔ کلام نبوّت نہ شعر تھا نہ سحر بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی لازوال سچائی کی وہ تاثیر تھی جو پتھروں کو پانی کر دیتی تھی۔ اس معجز اثر کلام کے کمالات سے متعلق ایک نہیں بیسیوں واقعات ہیں مثلاً ضماد بن ثعلبۃ الازدی نے جاہلانِ مکہ سے سُنا کہ (نعوذ باللہ) محمدؐ کو جنون ہو گیا ہے تو وہ پرانا دوست ہونے کی وجہ سے حضورؐ کے پاس آیا اور کہا کہ "اگر کچھ جنون کا اثر ہے تو میں جھاڑ پھونک سے اسے دُور کر سکتا ہوں۔" حضورؐ نے جواباً فرمایا "حمد ہے خداوند عالم کی۔ ہم اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسی کی مدد چاہتے ہیں، جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کرے اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔" ضماد پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے درخواست کر کے تین چار بار یہ کلمات سُنے اور اس کے بعد کہا "میں نے کاہنوں کے فقرے، جادوگروں کے الفاظ

اور شاعروں کے اشعار سنے ہیں مگر اس رفعت اور شان کے کلمات نہیں سنے۔" یہ کہہ کر اس نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مسلمان ہو گیا۔

بعض دُوسرے انبیائے کرام

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے بھی جتنے انبیائے کرام انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعُوث ہوتے رہے وہ انتہائی فصیح البیان تھے اور ان کے کمالِ خطابت کے سامنے بڑے بڑے سرکش انسان بھی عاجز اور بے بس ہو جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان خدا کی ہستی کے متعلق جو مکالمہ ہُوا اس کا بیان قرآن حکیم میں موجود ہے۔ جناب خلیل اللہ کے مدلّل اندازِ خطابت سے نمرود ورطۂ حیرت میں پڑ گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان بچپن میں انگارے کی وجہ سے جل گئی تھی جس سے اس میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب آپ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیغمبری کی بشارت ملی اور آپ کو حکم دیا گیا کہ فرعون کی طرف جائیں اور اسے ہدایت کا راستہ دکھائیں تو انھوں نے بارگاہِ خداوندی میں یہی گزارش کی کہ بارِ الٰہا! میری تقریر میں تو رکاوٹ آ جاتی ہے اس لیے فریضۂ تبلیغ کما حقہٗ ادا نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا میرے بھائی ہارونؑ کو میرا نائب بنایا جائے کیونکہ ان کی تقریر رواں ہے۔

اسی طرح جب قبیلے کے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے حضرت عیسےٰؑ کی پیدائش کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ "بچے ہی سے پوچھ لیں"۔ وہ لوگ حیران ہوئے کہ یہ شیر خوار بچہ کیا بتا سکتا ہے۔ لیکن شیر خوار بچے نے امرِ ربی سے اپنے متعلق انھیں بتایا اور ان کے بیان میں حق و صداقت کی ایسی تاثیر تھی کہ اہلِ قبیلہ کو ان کی باتیں تسلیم کیے بغیر نہ بن پڑی۔

تبلیغ و ارشاد کے سلسلے میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا "پہاڑی کا وعظ" مشہورِ خلائق ہے۔ اس وعظ میں ان کے خطیبانہ جوہر پوری طرح کھلے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب قریش کو پہلی بار اسلام کی دعوتِ عام دی تو صفا کی پہاڑی پر اہلِ قبیلہ سے خطاب فرمایا۔ آنحضورؐ کا یہ

پہلا عمومی خطبہ بھی خطابت کا ایک نادر نمونہ ہے۔

ان انبیائے کرام کے علاوہ جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے اور جن کی نبوت پر ہمارا ایمان ہے کئی ایسے عظیم مصلحین مختلف ممالک اور مختلف اقوام میں پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے لوگوں کو نیکی، حُسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کی طرف بلایا ہے۔ یہ سب عظیم مصلحین خطابت کے اوصاف اعلیٰ سے متصف تھے۔ اور انھوں نے اپنے ان خطیبانہ اوصاف سے پوری طرح کام بھی لیا ہے۔ ایران کے عظیم رُوحانی پیشوا زرتشت کے کمالات و مخاطبات کتابی صورت میں موجود ہیں۔ یونان قدیم کے بڑے بڑے مفکر مکالماتی رنگ میں اپنے افکار و خیالات کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں سقراط اور افلاطون کے مکالمات آفاقی شہرت کے حامل ہیں۔ ہندوستان میں مہاتما بُدھ نے بھی تقریر اور خطابت کے ذریعے ہی اپنی تعلیمات کو عام کیا اور ان تعلیمات کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے اس دور کی مذہبی اور علمی زبان سنسکرت کو ترک کر کے مقامی زبان یا پراکرت کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس طرح کی تعلیمات میں کرشن کا وہ اُپدیش عالمی ادب میں ایک بہت بلند مقام کا حامل ہے جو انھوں نے کورو کھشیتر کے میدان میں ارجن کو دیا تھا اور جو بھگوت گیتا کی صورت میں عظیم رزمیہ داستان مہابھارت کا ایک گراں قدر باب ہے۔

کلماتِ سخن (SPOKEN WORD) کی اہمیّت

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم صفی اللہ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم تک اس دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی مبعوث ہوئے ہیں جنھیں مختلف زمانوں میں مختلف ممالک اور مختلف اقوام کو راہِ ہدایت دکھانے کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن صحائفِ آسمانی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیائے کرام کے ذریعے بھیجے گئے صرف چند ہیں بلکہ جن صحائف کے متعلق ہم حتمی طور پر جانتے ہیں وہ صرف چار ہیں۔ ان چار صحائف کا انداز بھی خطیبانہ ہے۔ اس سے کلمات سخن کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے اخلاقی، روحانی اور دینی انقلاب آئے ہیں وہ سب کے سب کلماتِ سخن کی بدولت آئے ہیں۔ انشاء اور تحریری مقالات کے ذریعے ایک نہایت محدود طبقے کو

متاثر کیا جا سکتا ہے جبکہ تقریر اور خطابت کے ذریعے لاتعداد انسانوں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم کی خطیبانہ خصوصیات

تمام دانائیوں اور حکمتوں کا سرچشمہ ہونے کے علاوہ قرآن حکیم فصاحت و بلاغت حکیمانہ اندازِ بیان اور خطیبانہ شوکت و شان کا عدیم المثال مرقع بھی ہے۔ چونکہ قرآن احسن الخالقین کا کلام ہے اس لیے عالم ممکنات میں احسن ترین کلام ہے تشبیہہ و استعارہ، رمز و کنایہ، حُسنِ صوت، شوکت الفاظ، ایجاز بیان، وسعت معانی اور سلاست و روانی کے اعتبار سے یہ کلام بے مثال اور لازوال ہے۔

انبیاء علیہم السلام جس زمانے اور قوم میں مبعوث ہوتے رہے اس زمانے اور قوم میں پائے جانے والے اوصاف سے وہ بدرجہ اتم متصف ہوتے تھے۔ ان کے انہی مثالی اوصاف کے سامنے اس قوم کے افراد اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کے باوجود عاجز ہو جاتے اور ان کی پیغمبرانہ عظمتوں کے سامنے بالآخر سر جھکا دیتے۔ پیغمبروں کی یہ برتری جو خداوند کریم کا خصوصی عطیہ ہوتی اور تائید ایزدی سے ظہور میں آتی تھی پیغمبرانہ معجزہ کہلاتی تھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم تمام قوموں اور تمام زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے لیکن جیسا کہ حضورؐ نے خود فرمایا ہے کہ:

اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً

چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کی بعثت عرب میں ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے اولین مخاطب خصوصیت سے اہلِ عرب تھے۔ لہٰذا حضورؐ کو ان اوصاف میں کامل و اکمل بنایا گیا جو اس زمانے میں عربوں میں پائی جاتی تھیں۔ ان اوصاف میں سب سے بڑا وصف جس پر عرب ناز کیا کرتے تھے ان کی فصاحت اور بلاغت تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی افصح العرب تھے اور وحی کے ذریعہ انھیں جو کلام عطا کیا گیا تھا وہ بھی سرتاسر اعجاز نطق و بیاں تھا اور نطق و بیاں کا یہی اعجاز آنحضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔

اپنے اس اعجاز کے متعلق خود قرآن حکیم میں کئی مقامات پر آیات موجود ہیں۔ فرمایا گیا ہے :

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (۱۷ : ۸۸)

یہاں تو ارشاد ہے کہ تمام انسان اور جن مل کر بھی اس طرح کی کتاب نہیں بنا سکتے لیکن ایک اور مقام پر پوری کتاب کی بجائے صرف دس سورتیں مقابلے میں لانے کے لیے کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۱۱ : ۱۳)

یہاں صرف دس سورتیں مقابلے میں لانے کے لیے کہا گیا تھا لیکن دس سورتیں تو کجا انسانی ذہن سے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ قرآن حکیم کے مقابلے میں ایک سورت بھی پیش کرے۔ لہذا فرمان باری ہوا کہ :

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

(۲ : ۲۳)

اور اس اعلان کے ساتھ ہی قطعی طور پر یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے کہ :

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا

قرآن حکیم کے اس دعویٰ کی صداقت پر شہادت بھی منکرین ہی کی طرف سے مہیا ہوتی ہے جب وہ قرآن حکیم کی سورۃ الکوثر کو جو اس کتاب عظیم کی مختصر ترین سورۃ ہے در کعبہ پر آویزاں دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ :

ما هذا كلام البشر

یہ تو کسی انسان کا کلام ہے ہی نہیں۔

قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر مختلف گروہوں اور مختلف افراد کو مخاطب کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مخاطب اہلِ ایمان ہیں لیکن کفار سے بھی جابجا خطاب ہے۔ بنی اسرائیل بھی کو اہلِ کتاب ہونے کے باوجود گمراہ ہو چکے تھے کئی مقامات پر مخاطب ہیں۔ کچھ آیات میں جملہ بنی نوع انسان سے خطاب ہے۔ افراد میں سے عام طور پر مخاطب انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے جس طرح ان کی حیاتِ ارضی کے دوران خطاب کیا تھا وہی انداز قرآن حکیم میں موجود ہے۔ ضمنی طور پر اندازِ خطاب میں تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ بہت سے مقامات پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور بیشتر مقامات پر آنحضورؐ کی رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ آپ کافروں سے یہ کہیں، مومنوں سے اس طرح گفتگو فرمائیں، اہلِ کتاب سے اس طرح بات کریں، سوال کرنے والوں کو اس طرح جواب دیں اور اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات اس طرح رد کریں۔

اس کتابِ لایزال میں ہر گروہ اور ہر فرد کے ساتھ اندازِ مخاطبت جداگانہ اور مخاطب کی ذہنی سطح، روحانی بلندی، خیالات کی رفعت، جذبات کی گہرائی اور شخصیت کی نشوونما کے مطابق ہے۔ رسول کریمؐ کی ذات پاک چونکہ محبوب ترین ہے لہذا آنحضورؐ سے خطاب کرتے وقت انتہائی محبت اور ملاطفت کا انداز اختیار کیا جاتا ہے اور آپ کو بڑے پیارے انداز میں پکارا جاتا ہے جیسے یاایھا المزمل، یاایھا المدثر، یاایھا النبی، یٰسین، طٰہٰ، بشیر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج منیر اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ کے ذریعے۔ جہاں تمام انسانوں کو مخاطب کیا جاتا ہے وہاں ایسے رموز و نکات بیان کیے جاتے ہیں جو تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھتے ہیں جیسے آیہ کریمہ ہے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَ
قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ط
(۴۹ : ۱۳)

جہاں عام مسلمانوں سے خطاب ہے وہاں ایسے نواہی اور اوامر ہیں جن کی بجاآوری ان کے

لیے لازمی ہے جیسے

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ یا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ

یا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ

یا اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ یا حُرِّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ

وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ

یا ایسے معاشرتی اور معاشی اصولوں کا بیان ہے جو اسلامی معاشرے کی فلاح و بہبود کے ضامن ہیں مثلاً

اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو یا یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا

اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ یا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً

مِّنْ دُوْنِکُمْ ۔

قرآن حکیم میں خطابت ان مقامات پر اوجِ کمال پر نظر آتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ خود اپنی

شان بیان فرماتا ہے یا فرشتوں کی زبان سے اس کی عظمت اور کبریائی کا ذکر ہوتا ہے جیسے

اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ

یا ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ

الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ہ

یا سورہ اخلاص ہے کہ :

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہ وَلَمْ

یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ہ

یا سورہ رحمٰن میں آتا ہے :

اَلرَّحْمٰنُ ہ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ہ اَلشَّمْسُ وَ

الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّ النَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ ہ

بہت سے مقامات پر اندازِ خطابت استفہامیہ ہے لیکن ایسا استفہامیہ جس کا جواب بجز اثبات

ممکن نہیں۔ جیسے نبی کریمؐ سے ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ اصحاب فیل کا واقعہ چونکہ ایسا تھا کہ اس کے بہت سے عینی شاہد موجود تھے۔ لہٰذا استفہام میں اَلَمْ تَرَ آیا ہے۔ بعض مقامات پر اَلَمْ تَعْلَمْ آتا ہے اور جہاں ایسی چیز کے متعلق استفہام ہے جو بذریعہ روایت آنحضورؐ تک پہنچی ہو وہاں استفہام کا انداز دوسرا ہے جیسے هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى

قرآن حکیم چونکہ مالکِ حقیقی کی طرف سے نبی صادق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کیا گیا ہے' لہذا خدائے تعالیٰ کی صفات کا انعکاس اس کے کلمات میں موجود ہے یعنی یہ کلام جلیل بھی ہے اور جمیل بھی۔ بے مثال بھی ہے اور لازوال بھی۔ علم و حکمت کا خزینہ بھی ہے اور اعلیٰ اقدارِ زندگی کا گنجینہ بھی۔ اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ چونکہ یہ خدائے لایزال کا کلام ہے اس لیے ابد تک زندہ اور پائندہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ خطابت

فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے کلامِ خداوندی کے بعد رسولِ پاکؐ کا کلام ہے جس کا مثیل انسانوں میں کہیں نظر نہیں آتا اور انسانوں میں آنحضورؐ جیسا فصیح و بلیغ کوئی اور شخص ہو ہی کیونکر سکتا ہے' جب کہ خود آپؐ کے متعلق قرآن حکیم گواہی دیتا ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۞ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۞ (۵۳ : ۳)

پس وہ صاحبِ کونین جو بات کرتے ہیں اللہ کی وحی کے مطابق کرتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق کوئی بات نہیں کرتے۔ اور ان کو سکھانے والا خود قادرِ مطلق ہے ان کی ہر بات لازماً کمال فصاحت و بلاغت کی حامل ہونی چاہیے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے خود آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ۔ عربوں میں

فصیح ترین ہونا تمام دنیا کے لوگوں میں فصیح ترین ہونے کے مترادف ہے کیونکہ عرب طاقتِ لسانی اور زورِ خطابت میں تمام اقوامِ عالم سے کہیں زیادہ تھے اور باقی دنیا کو عجم یعنی گنگ کہتے تھے پھر عربوں میں فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے قریش اور قریش میں سب سے برگزیدہ اور جامع کمالات حضورؐ رسالت مآب کی ذات والا صفات تھی۔ اس لیے فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے حضورؐ تمام دنیا میں یکتا و بے مثال ہیں۔

ایک بار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضورؐ سے کہا مَا رَأَیْتُ اَفْصَحَ مِنْکَ یعنی میں نے آپ سے زیادہ فصیح کوئی شخص نہیں دیکھا تو آنحضورؐ نے جواب میں فرمایا

مایمنعنی دانا من قریش دارضعت فی بنی سعد

یعنی میرے فصیح ترین ہونے میں کیا چیز رکاوٹ ہوسکتی ہے جب کہ میں قریش میں سے ہوں اور میں نے اپنا بچپن بنی سعد کی آغوش میں گزارا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کہ فصاحت وبلاغت میں خود بھی نادرۂ روزگار تھے، فرماتے ہیں کہ ما سمعت کلمۃ عربیۃ من العرب الا وقد سمعتہا من النبی. یعنی عربی زبان کا کوئی کلمہ ایسا نہ تھا کہ میں نے کسی عرب سے سُنا ہو اور اس سے پہلے نبی کریمؐ سے نہ سنا ہو۔

آنحضرتؐ چونکہ متنوع حیثیات کے مالک اور متعدد مناصب کے حامل تھے یعنی داعیٔ اسلام بھی تھے، مبلغ بھی تھے، بشیر بھی تھے اور نذیر بھی، قافلہ سالار بھی تھے اور میرِ لشکر بھی، ناسخِ دینِ کہن تھے اور واضعِ قوانینِ جدید بھی۔ لہٰذا آپ کے خطبات کے موضوعات بھی متنوع ہیں اور آپ کے مخاطبین میں بھی ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

کان یخطب فی کل وقتٍ بما تقضیہ حاجۃ المخاطبین ومصلحتہم

یعنی آنحضرتؐ جب بھی خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو وہ وقت کے تقاضوں اور مخاطبین کی مصلحتوں کے مطابق ہوا کرتا تھا۔

آنحضرتؐ کے خطبات کی اکملیت اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ آج چودہ سو برس کا زمانہ گزر جانے

کے بعد بھی ان میں وہی تازگی، وہی نکھار، وہی عظمت اور وہی تاثیر ہے جو اس زمانے میں تھی جب حضورؐ بہ نفسِ نفیس اس مادّی دنیا میں موجود تھے۔ حضورؐ نہایت سادہ اور آسان لیکن فصیح زبان استعمال کرتے تھے۔ کلام واضح اور دل میں اُتر جانے والا ہوتا تھا۔ اس میں کسی طرح کا ابہام یا ایہام نہ ہوتا تھا اور نہ ہی مغلق الفاظ اور بھاری بھرکم تراکیب ہوتی تھیں۔ آپؐ چونکہ دنیا میں تشریف لانے والے آخری نبی تھے، لہذا ضروری تھا کہ آپؐ کے اندازِ خطاب میں انتہائی سادگی ہو جس سے آپؐ کا مفہوم نہ صرف اپنے زمانے کے لوگوں پر واضح ہو بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں بھی اس سے پوری طرح مستفیض ہو سکیں۔ آپؐ کی تعلیمات اس ارشادِ خداوندی کے عین مطابق تھیں کہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔

تاریخِ عالم میں بڑے بڑے مقرر اور خطیب گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کا ہر فقرہ اپنے اندر ایک مستقل دُنیائے معانی رکھتا ہو جس کے مسلسل خطبات بھی مربوط اور تسلسل معانی کے اعتبار سے موتیوں کی لڑیاں ہوں اور ان کا ہر جملہ بھی ایسا گوہرِ یکدانہ ہو کہ اپنی چمک دمک میں بے مثال اور قدر و قیمت میں یکتا ہو۔ یہ تمام خصوصیات صرف حضور نبی کریمؐ کے خطباتِ عالیہ کو حاصل ہیں۔

اندازِ بیان کے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنے ہم قبیلہ افراد کے سامنے جو سب سے پہلا خطبہ دیا وہ بھی فصاحت و بلاغت اور دلائل کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ آنحضورؐ فرماتے ہیں:

یابنی عبد المطلب یا بنی عبد مناف ارایتکم لو اخبرتکم
ان خیلا تخرج بسفح ھذا الجبل الکنتم مصدّقی

جب انھوں نے کہا کہ بے شک ہم مان لیں گے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تو آپ نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے فرمایا:

فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید

تو میں ڈرانا چاہتا ہوں اس عذاب سے جو بالکل تمھارے سامنے آچکا ہے۔ لیکن ڈرانے کے ساتھ ہی آنحضورؐ نے اس عذاب سے بچنے کی بشارت بھی ان الفاظ میں دی:

یا بنی عبد المطلب انی واللہ ما اعلم شاباً فی العرب جاء قومہ با فضل بما قد جئتکم بہ انی قد جئتکم بخیر الدنیا والاخرۃ وقد امرنی اللہ ان ادعوکم الیہ

یعنی اے بنی عبد المطلب خدا کی قسم تمھارے پاس کوئی جوان ایسی اچھی چیز نہیں لے کر آیا ہوگا جیسی میں لے کر آیا ہوں۔ میں تو تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔

آنحضورؐ کے ارشاداتِ گرامی واضح، غیر مبہم اور براہِ راست ہوتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا لفظی ایچ پیچ یا معنوی الجھاؤ نہ ہوتا تھا۔ چونکہ آپ کی جوبات تھی وہ دل سے نکلتی تھی اس لیے سیدھی مخاطب کے دل پر اثر کرتی تھی۔ چونکہ آپ نیکی اور بھلائی کی تعلیم پر مامور تھے اس لیے نیکی اور بھلائی کے اُخروی فوائد کے علاوہ ان کے فوری طور پر اسی زندگی میں حاصل ہونے والے فوائد کا بیان ایسے دل نشیں انداز میں فرماتے تھے کہ سننے والوں کے ذہن انھیں محسوس کرنے لگتے تھے۔ آپ نہایت مختصر الفاظ میں نہایت وسیع مفاہیم بیان کرنے پر بے مثال قدرت رکھتے تھے۔ ابلاغ کے اسی کمال نے آنحضورؐ کے ارشادات کو بے حد موثر بنا دیا تھا۔ چنانچہ حضورؐ جب کسی کام کا حکم دیتے تھے تو سب مسلمان اس کی بجا آوری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور جب کسی چیز سے منع فرماتے تو سب لوگ فوراً اس سے ہاتھ کھینچ لیتے۔ متابعت کا وہ بے مثال جذبہ جس سے صحابہ کرامؓ سرشار تھے بڑی حد تک آنحضورؐ کے انتہائی موثر خطبات کا مرہونِ منت تھا۔

خطابت کا ایک رُخ مکتوب نگاری بھی ہے۔ مکتوب میں صاحبِ مکتوب مکتوب الیہ سے غائبانہ طور پر مخاطب ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد کئی بادشاہوں اور سربراہانِ حکومت کو مکتوب بھیجے۔ یہ مکتوبات بھی آنحضورؐ کی فصاحت و بلاغت کے نادر نمونے ہیں۔ ان مکتوبات میں آنحضورؐ جو کچھ فرمانا چاہتے ہیں نہایت وضاحت سے فرماتے ہیں اور شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان ایسا ہے کہ مکتوب الیہ مرعوب ہو جاتا ہے۔ لیکن بیان میں لطافت ایسی ہے کہ اس سے دُنیوی اور اُخروی

فلاح و بہبود کی بشارتیں قلب و نظر کو سکینت اور اطمینان بھی عطا کرتی ہیں۔ مثلاً ہرقل قیصرِ روم کے نام مکتوب مبارک میں تحریر فرماتے ہیں:

سلام علی من اتبع الھدیٰ
امّا بعد۔ فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام
اسلم تسلم
اسلم یؤتک اللہ اجرک مرّتین فان تولیت
فانّ علیک اثم الاریسئین

اسی طرح خسرو پرویز کے نام مکتوب مبارک میں تحریر فرمایا ہے:

ادعوک بدعایۃ اللہ فانّی انا رسول اللہ
الی الناس کافۃً لانذر من کان حیاً و یحق
القول علی الکافرین۔

آنحضورؐ کی زندگی ہی میں مُسیلمہ نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور قرآن حکیم کے مقابلے میں ایک کتاب اور حضورؐ کے معجزوں کے جواب میں کچھ شعبدے دُنیا کے سامنے پیش کرنے لگا۔ اس مردُود نے آنحضورؐ کے نام ایک خط بھیجا اور بکمال عیّاری سرعنوان لکھا "من مُسیلمہ رسول اللہ / الی محمد رسول اللہ۔ آنحضورؐ نے بہ حالت جلال اس خط کے جواب میں جو مختصر سا جواب ارسال فرمایا اس کے اندر ایک جہان معنی پوشیدہ ہے۔ یہ مکتوب اس طرح ہے:

من محمدٍ رسول اللہ الی مسیلمہ کذّاب
سلام علی من اتبع الھدیٰ
امّا بعد
فانّ الارض یورثھا من یشآء من عبادہٖ
والعاقبۃ للمتّقین۔

آنحضورؐ نے مسیلمہ کو کذّاب کے خطاب سے ایسا مخاطب فرمایا کہ جب تک دنیا قائم ہے اس کو اسی صفاتی نام سے یاد کیا جایا کرے گا۔

حضورؐ کا آخری خطبہ جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا خطابت کی تاریخ میں ایک بے مثال خزینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ موتیوں میں تولنے کے قابل اور اس کا ایک ایک جملہ فصاحت و بلاغت میں لاثانی ہے اس کا ایک ایک حصہ ان مسائل کو پوری طرح حل کرتا ہے جو قیامت تک امت کو پیش آنے والے ہیں۔ اس میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تمام اقتصادی، معاشرتی، معاشی اور مجلسی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے جن سے معاشرے میں فساد پیدا ہوتا ہے اور فساد کی پیش بندی کے لیے تمام احکامات نہایت وضاحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ ابلاغ کا کمال یہ ہے کہ آنحضورؐ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد حاضرین سے استفسار فرماتے ہیں کہ

اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا ؟

تو حاضرین جواب دیتے ہیں کہ بے شک یا رسول اللہ۔ اور آپ فرماتے ہیں اللّٰھم اشھد اے ہمارے اللہ تو گواہ رہنا۔

کمال فصاحت، انتہائے بلاغت اور زور بیاں کے اعتبار سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے خطبات تمام زمانوں اور زبانوں کے علمائے امت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ امتِ مسلمہ کے بڑے بڑے علماء، اور خطباء نے خطباتِ نبوی سے اپنے دلوں کو منور کیا اور اپنے اندازِ بیاں کو سحر آفریں بنایا ہے۔ اور جب تک اس عظیم ملت میں علماء، فضلاء، اور خطباء پیدا ہوتے رہیں گے وہ اس مشعل سے انوار حاصل کرتے رہیں گے۔

خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی کے خطیبانہ کمالات

رسولِ اکرمؐ کے خلفاء صرف سیاسی حیثیت سے ہی آنحضورؐ کے جانشین نہ تھے بلکہ علمی، اخلاقی اور روحانی طور پر بھی وہ آنحضرتؐ کے صحیح وارث تھے۔ ان بزرگانِ ملت کی دینی بصیرت،

اسلام سے والہانہ محبت، اسلام کے لیے بے پناہ قربانیاں اور اسلام کی خدمت گزاری محتاجِ تشریح نہیں۔ انھوں نے اپنی بہترین ذہنی، علمی، روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر گلشنِ اسلام کی آبیاری کی۔ ملّتِ اسلامیہ کے ان عظیم رہنماؤں نے خدمتِ دین و ملّت کے لیے جہاں دوسرے ذرائع سے کام لیا وہاں فنِ تقریر و خطابت سے بھی کہ مسائلِ زندگی کے حل و فصل اور امّت کے اندر اتّحاد و اتّفاق پیدا کرنے کے لیے بہترین ذریعہ ہے بہت کام لیا۔ ان کے خطبات آج بھی فنِ خطابت کے نہایت اعلیٰ نمونے ہیں اور ہمارے لیے بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید۔

حضرت ابوبکر صدیق کا وہ خطبہ جو انھوں نے رسولِ اکرمؐ کی وفات پر مضطرب اور بے قرار ہجوم کے سامنے دیا آپ کی حکیمانہ خطابت کی بہترین مثال ہے۔ اس وقت جبکہ یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ جیسا حق پرست اور موحد انسان جذبات کی شدّت سے مغلوب ہو کر ننگی تلوار ہاتھ میں لیے پھر رہا ہے اور اعلان کر رہا ہے کہ جس شخص نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم وفات پا گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا ثانیٔ اثنین نے ایسا مدبّرانہ خطبہ دیا کہ عوام کا اضطراب سکونِ طبیعت میں بدل گیا حضرت عمرؓ کی تلوار نیام میں چلی گئی اور لوگوں نے شرحِ صدر سے آپؐ کے وصال کو تسلیم کر لیا۔

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جناب صدیقؓ نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا وہ فصاحت و بلاغت اور اثر آفرینی کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اس کی اثر آفرینی کا بڑا سبب تو یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ آپ کے قلب کی آواز ہے۔ اور آپ کے الفاظ میں کسی طرح کی ریاکاری اور نمود و نمائش کا دخل نہ تھا۔ نہ ہی آپ نے جو کچھ کہا اس میں اور آپ کے دلی مقصد میں ذرہ برابر فرق تھا۔ چنانچہ جب آپ نے فرمایا کہ:

لوگو! میں تمھارا حاکم بنا دیا گیا ہوں اگرچہ تم سے بہتر نہیں ہوں۔

تو آپ فی الواقعہ اپنے آپ کو کسی اعتبار سے باقی مسلمانوں سے افضل و برتر نہ سمجھتے تھے۔ اور جب آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

جب تک میں اللہ اور رسول کا فرماں بردار رہوں تم پر میری اطاعت لازم ہے

لیکن جب میں اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ہو جاؤں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں۔

تو وہ واقعتاً اس چیز پر ایمان رکھتے تھے کہ خلیفہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرانے کا حق رکھتا ہے۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے ذاتی احکام کی تعمیل پر اصرار کرے۔

اپنی خلافت کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مختلف مواقع پر جو مختلف خطبات دیے وہ ان کی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ خصوصاً وہ مختصر خطبات جو آپ نے جنگ پر جانے والے سالاروں کو وقتاً فوقتاً دیے، بہت اہم ہیں۔ ان خطبات میں گویا صدیقِ اکبرؓ نے جنگ کے ایسے اصول متعین کیے جن سے بہتر اصول دنیا کے کسی اور امیر نے متعین نہیں کیے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ مسندِ خلافت پر تشریف فرما ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں جو خطبات مختلف اوقات پر دیے وہ ان کی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا پہلا خطبہ بھی ویسا ہی اثر آفریں ہے جیسا اثر آفریں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا پہلا خطبہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے انتخاب سے کچھ لوگ اس لیے خائف تھے کہ وہ بہت سخت گیر اور سخت مزاج تھے۔ انھوں نے اپنے متعلق سختی کا اعتراف کیا لیکن کیسے خوبصورت انداز میں۔ فرماتے ہیں:

"تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری ان سختیوں میں جو تم دیکھا کرتے تھے ظلم اور تعدّی روا رکھنے والوں کے لیے کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے اور کمزور مسلمانوں سے ان کے قوی سے حق لینے پر بھی (میری شدّت میں اضافہ ہو گیا ہے) اور میں اپنی اس شدت کے بعد اپنا رخسارہ زمین پر رکھ دینے والا ہوں پاک دامن لوگوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے معصیت سے رک جائیں اور اللہ کے فرمان کو تسلیم کریں۔

پس اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور اپنے نفسوں کے خلاف میری اعانت کرو کہ ان نفوس کو میری سزا سے روکو اور میرے اپنے نفس کے خلاف بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے میری اعانت کرو۔"

خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہے اس پر اس کا اپنا یقین پختہ ہو۔ اس چیز کو آج کل کی اصطلاح میں "Force of Conviction" یعنی عقیدے کی قوت کہتے ہیں۔ حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کے خطبات میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ عقیدے کی یہی قوت تھی جس کی وجہ سے بڑے سے بڑا جابر بادشاہ یا امیر بھی ان مردانِ حق کے ارشاداتِ عالیہ سن کر حیرت اور استعجاب میں پڑ جاتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے فرائض خلافت اور فتوحات کی وسعت کی وجہ سے سیاسی موضوعات پر جو تقاریر کیں ان میں ایک طرف تو اس قدر جامعیت، روانی اور سادگی پائی جاتی تھی کہ ایک بچہ بھی ان کے مفہوم کو سمجھ سکتا تھا، دوسری طرف اس قدر زورِ قوت اور جوش و اثر پایا جاتا تھا کہ سننے والوں کے دل لرز اٹھتے تھے۔

بابِ مدینۃ العلم

جس طرح میدانِ شجاعت میں فاتحِ خیبر حضرت علی کرم اللہ وجہہ، بے نظیر و بے عدیل ہیں اسی طرح میدانِ خطابت میں بھی وہ ایک فردِ فرید ہیں۔ ان کی علمی شان کے متعلق خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت موجود ہے کہ انا مدینۃ العلم وعلی بابھا۔ علمائے عرب و عجم اس بات پر متفق ہیں کہ کلام اللہ اور کلامِ نبوت کے بعد حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرح کا اور کوئی افصح الکلام نہیں۔ وہ آغوشِ رسالت میں پروان چڑھے تھے۔ تلاوتِ وحی کو رسول اللہ کی زبان سے سنا تھا۔ کاتبِ وحی تھے۔ کاتبِ فرامینِ رسول تھے۔ کتاب اللہ کے مفسر تھے۔ اس لیے نطقِ مصطفوی کی تمام خوبیاں نطقِ مرتضوی میں جمع ہو گئی تھیں۔ نہج البلاغہ کے متعلق جو آپ کے خطبات اور مضامینِ حکمت و موعظت کا مجموعہ ہے۔ ابن ابی الحدید سے لے کر دورِ حاضر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین تک بے شمار ناقدینِ علم و ادب نے نہایت وقیع آراء کا اظہار کیا ہے اور انہی میں سے ایک بہت بڑے ناقد نے حضرت علیؓ کی دانش و بینش کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"اگر کتاب نہج البلاغہ نہ ہوتی تو ہم اعجاز قرآن کا معیار نہ سمجھ سکتے۔"

جناب امیرؑ کے اندازِ سخن کا یہ اعجاز ہے کہ اسے سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقدس نورانی ہستی ملاءِ اعلیٰ سے سخن سرا ہے۔ اپنے اندازِ مخاطبت کی قوت اور توانائی سے خود جناب امیرؑ پوری طرح آگاہ ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

"خبردار! زبان انسان کے اعضاء کا ایک حصہ ہے مگر گویائی اس وقت اس کا ساتھ نہیں دیتی جب بولنے والا کمزور ہو۔ اور گفتار زبان مہلت نہیں دیتی جب بولنے والا توانا ہو۔ اور ہم (افرادِ خاندانِ رسالت) امیرِ سخن ہیں اس (سخن) کے ریشے ہماری رگ رگ میں بھرے ہیں اور اس کی شاخیں ہم پر سایہ فگن ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ گرامی جس طرح اخلاقِ حسنہ کا مظہرِ اتم تھی اسی طرح فنِ خطابت میں بھی اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ آپ نے اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر خطبات ارشاد فرمائے ہیں جو بلحاظ خطابت معیاری اور عربی ادب کی روحِ رواں خیال کیے جاتے ہیں۔

جگر گوشۂ رسول

خطابت کی وہ شان جو دودمانِ ہاشمی کا طرۂ امتیاز ہے ہمیں "امام عاشقاں" پور بتول" سیدنا حضرت امام حسینؑ کی ذات والا صفات میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

دوسرے خطبات کے علاوہ امام عالی مقام نے کربلا کے میدان میں جو خطبات بالخصوص یوم عاشورہ کو شہادت سے پہلے بطورِ اتمامِ حجت لشکرِ اعداء کے سامنے دیے وہ ایوانِ خطابت کے روشن ترین چراغوں میں شمار ہوتے ہیں۔ امام عالی مقام نے فوجِ اعداء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو اور غور کرو کہ کیا تمھارے لیے میرا خون بہانا اور میرے احترام کو پامال

کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمھارے نبیؐ کا نواسا نہیں ہوں اور کیا میں ان کے چچازاد بھائی، ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا سیدالشہدا حضرت امیر حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہیں تھے؟ اور کیا جعفر طیار میرے چچا نہیں تھے؟ کیا یہ حدیث جو زبان زدِ خلائق ہے تمھارے کانوں تک نہیں پہنچی کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی حسنؓ کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتاً وہ سچ ہی ہے کیونکہ میں نے آج تک کبھی کوئی غلط بات نہیں کی تو پھر کسی اور بات کی ضرورت نہیں لیکن تم اگر میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ایسے شخص موجود ہیں جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتا دیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ انصاری سے، ابوسعید خدری سے، سہیل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے، وہ تمھیں بتائیں گے کہ انھوں نے رسالتمآبؐ سے اس حدیث کو اپنے کانوں سے سنا ہے۔ پھر کیا یہ چیز تمھیں میرا خون بہانے سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے؟"

سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے امام عالی مقام نے فرمایا:

"اگر اس حدیث کی صحت میں پھر بھی تمھیں شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسول کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم آج دنیا میں مشرق سے مغرب تک میرے سوا کوئی بھی نبیؐ کا نواسا موجود نہیں۔ نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا اقوامِ عالم میں۔ اور میں تو تمھارے ہی نبیؐ کا نواسا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لیے آمادہ ہوئے ہو؟ کیا اپنے کسی مقتول کا قصاص لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کیا ہو؟ یا اپنے کسی مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کر دیا ہو؟ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو جو کسی کو میرے ہاتھوں سے لگا ہو؟"

یہ عظیم خطبہ جو دشمن کی مسلح افواج کو اس وقت دیا گیا جب وہ تلواریں سونتے ہوئے آلِ رسولؐ کا خونِ معصوم بہانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اپنے خطیب کی طرح زندہ جاوید ہو گیا ہے عام طور پر ایسے مواقع پر جب مسلح دشمن ایک بہت بڑی فوج کی صورت میں سامنے کھڑے اور خون بہانے کے لیے بے دریغ آمادہ ہو، انسان کی ہمت اور زبان دونوں لڑکھڑا جاتی ہیں۔ لیکن نواسہ رسول کی اولوالعزمی اور پامردی کی طرح ان کی قوتِ بیان میں کسی طرح کی لڑکھڑاہٹ اس لیے پیدا نہ ہوئی کہ ان کی قوتِ عقیدہ بڑی مضبوط اور مستحکم تھی اور انھیں یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

خطبۂ اہلِ بیت

سیدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اپنے نانا، باپ اور بھائی کی طرح طاقت لسانی اور فصاحت بیانی میں کم نظیر تھیں۔ جب اسیرانِ کربلا کا قافلہ کوفہ کے بازاروں سے گزر رہا تھا تو کوفہ کے مرد، عورتیں اور بچے اپنے گھروں کی چھتوں اور بازاروں میں کھڑے انھیں دیکھ رہے تھے اور بہت سے لوگ خصوصاً عورتیں ان مظلوموں کا حال دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ ایسے عالم میں سیدہ زینبؓ نے ایک مجمع سے خطاب فرماتے ہوئے نہایت موثر انداز میں لوگوں کو صورتحال سے آگاہ کیا، چنانچہ آپ فرماتی ہیں:

"حمد کا سزاوار اللہ ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمدؐ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی عزت کے لیے مخصوص ہے۔ اے اہلِ کوفہ! اے اہلِ مکر و دغا! تم روتے ہو؟ خدا کرے تمھارے آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو۔ اور تمھارے نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون پیدا نہ ہونے پائے۔

کیا تم لوگ سچ مچ آنسو بہا رہے ہو اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ حقیقتاً تمھارے لیے ہے بھی یہی کہ زیادہ رو‌ؤ اور کم ہنسو۔ تم نے سمجھنے کی کوشش بھی کی

کہ کس طرح تم نے رسولِ خدا کے جگر کو چاک کیا؟ ان کے محترم اہلِ حرم کو بے پردہ کیا اور ان کی ہتک حرمت کی؟ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان نے خون برسایا؟ یہ تو کچھ نہیں۔ آخرت کا عذاب بڑا سخت ہوگا اور اس وقت تمھارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اس چند روزہ مہلت پر خوش نہ ہونا۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اس کو موقع کے ہاتھ سے جانے کا اندیشہ نہیں۔ وہ تمھیں ایک وقت تک تمھارے حال پر چھوڑے رکھے گا۔"

بشیر بن خزیم اسدی سے روایت ہے کہ:

"میں نے کبھی ایک پردہ نشین خاتون کو اس طرح پُرزور تقریر کرتے ہوئے نہیں سنا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؑ کی زبان سے آپ کے والد بزرگوار علیؑ ابن ابی طالب بول رہے ہیں۔ آپ کی اس دل ہلا دینے والی تقریر کے دوران میرے گرد و پیش تمام سامعین دانتوں میں انگلیاں دبائے رو رہے تھے۔"

جناب سیدہ زینبؑ جب میدانِ کربلا کے قریب سے گزریں اور وہاں انھوں نے اپنے محترم بھائی کا زخموں سے چُور سر بُریدہ جسد خاک و خُون میں پڑا ہُوا دیکھا تو اس وقت بھی شدتِ غم کے عالم میں جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے وہ اثر آفرینی کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ جب وہ ابنِ زیاد کے دربار میں پہنچیں تو وہاں بھی ابن زیاد کے ان الفاظ پر کہ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم لوگوں کو رُسوا کیا اور تمھارا جھوٹ ظاہر کر دیا" آپ نے فرمایا:

"حمد ہے اس خدا کی جس نے ہمیں عزت دی محمدؐ مصطفےٰ کے ساتھ اور طاہر و اطہر قرار دیا اس طرح جس طرح حق ہے طاہر و اطہر قرار دیے جانے کا۔ رُسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق و فاجر ہو اور جھوٹ اس کا کھلتا ہے جس کے مدِنظر ہمیشہ سچائی نہ رہے اور وہ (جھوٹے) ہم نہیں ہمارے دشمن ہیں۔ بے شک تُو نے میرے عزیزوں کو قتل کیا ہے۔ میری شاخوں کو کاٹ ڈالا ہے اور میری جڑ کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔

اگر اس سے تیری مُراد بُرائی ہے تو خوش ہو لے۔"

ابنِ زیاد نے کھسیانہ ہو کر کہا " یہ بڑی زبان دان خاتون ہے اور اس کے باپ بھی تو شاعر اور قافیہ باز تھے۔"

سیدہ زینبؓ نے جواب دیا " نادان! ایک عورت کو قافیہ بندی اور شاعری سے کیا تعلق؟ اور مَیں تو ایسے عالم میں ہوں کہ مجھے قافیہ بندی کی ہوش کہاں"؟

یزید کے دربار میں پہنچ کر بھی جناب سیدہ زینبؓ نے ایک ایسی معرکۃ الآرا تقریر کی کہ یزید اور اس کے اہلِ دربار دنگ رہ گئے۔ ان کی یہ تقریر بھی خطابت کی تاریخ میں ایک یادگار خطبے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تقریر اتنی دلدوز اور تڑپا دینے والی تھی کہ خود یزید بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اسے یہ اندیشہ بھی ہُوا کہ کہیں اس کے اپنے اُمراء کے اندر بغاوت کی چنگاری نہ سُلگ اُٹھے۔

کہتے ہیں کہ جناب زینبؓ دربارِ یزید میں تھیں کہ نوبت بجنے لگی، شادیانوں کی آواز گونجی، یزید نے کہا ـــــ "سنتی ہو یہ میری اور میرے خاندان کی حکومت کا اعلان ہے" ـــــ سیدہ چُپ رہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اذان کی صدا بلند ہُوئی سیدہ نے فرمایا ـــــ "سُنتے ہو یہ میرے بھائی اور میرے خاندان کی حکومت کا اعلان ہے۔ تمھارے شادیانوں کی آواز فنا کے گھاٹ اتر جائے گی مگر یہ اعلان قیامت تک چار دانگ عالم میں گونجتا رہے گا۔" اس ایک فقرے میں خطیبۂ اہلِ بیت کی خطیبانہ عظمت بہ تمام و کمال جھلک رہی ہے۔

ملّتِ اسلامیہ کا عظیم ورثہ

خطابت کا فن وہ عظیم ترین ورثہ ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے دانشوروں تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، آلِ رسول اور صحابۂ رسولِ پاک سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ خطابت کے ذریعے مسلمان علماء اور دانشوروں نے نہ صرف مسلمانوں تک خداوند تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور رسولِ کریم

کی مقدس تعلیمات پہنچائی ہیں بلکہ اسی فن شریف کی مدد سے مسلمان علمار اور مشائخ نے غیر مسلموں کے درمیان زندگیاں بسر کر کے تبلیغ دین کی ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کو ظلمت اور گمراہی سے نکال کر ہدایت کا روشن راستہ دکھایا ہے۔ ان مسلمان مبلغین نے جس ملک میں بھی تبلیغ دین کے فرائض سر انجام دیے اس ملک کی زبان سیکھی اور انہی لوگوں کی زبان میں ان سے خطاب کرتے رہے اور اس طرح تبلیغ دین کا حق ادا کرتے رہے۔ چنانچہ سرزمینِ ہند میں نامور بزرگانِ دین نے جن میں سید علی بن عثمان ہجویریؒ ملقب بہ داتا گنج بخش، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سلطان الہند غریب نواز، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا دہلوی ایسے عظیم اکابر ملت شامل ہیں۔ تبلیغ کے لیے یہی طریقہ کار اختیار کیا اور لاکھوں انسانوں کو جو کفر و ظلمت کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے اندھیروں سے نکال کر روشنی تک پہنچایا اور لاکھوں ایسے دبے اور پسے ہوئے انسانوں کو جو برہمنی سامراجیت کے ہاتھوں صدیوں سے استحصال کا شکار ہو رہے تھے اور نام کی انسانی لیکن عملاً حیوانی زندگی بسر کر رہے تھے جہالت کی پستیوں سے اٹھا کر علم و دانش اور رفعتوں تک پہنچایا اور استحصال اور مظلومیت کی ذلت سے نکال کر اخوت اور مساواتِ اسلامی کی مسند پر لا بٹھایا۔ خود ایران اور وسطِ ایشیا میں جن بزرگانِ دین نے تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیے انھوں نے خواہ وہ ایرانی نژاد تھے یا عرب، فارسی زبان کو ذریعہ تبلیغ بنایا اور مواعظِ حسنہ کے ذریعے اللہ کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچایا۔ چنانچہ عجم کی تاریخ میں جتنے بڑے بڑے مشائخ اور علما گزرے ہیں انھوں نے فنِ خطابت کے ذریعے اور موعظت کے وسیلے ہی سے دعوت و ارشاد کا حق ادا کیا ہے۔ ان میں سے مثال کے طور پر خواجہ عبد اللہ انصاریؒ ہروی، مولانا جلال الدین رومیؒ، پیر دستگیر سید عبد القادر جیلانیؒ، سید شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت امام غزالی، شیخ سعدی شیرازیؒ، عارف جام حضرت مولانا نور الدین عبد الرحمٰن جامیؒ اور دوسرے سینکڑوں رہنمایانِ شریعت اور سالکانِ طریقت تقریر و مخاطبت کے مردِ میدان تھے ان میں سے کئی بزرگوں کے خطبات اب تک مجالس کے نام سے موجود ہیں اور علمی اور مذہبی تقریبات میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔

خطباتِ جہاد

علماء، مشائخ اور مبلغینِ دین تک ہی محدود نہیں، مسلمان مجاہدوں خصوصاً سالارانِ لشکر نے بھی حرب و ضرب کے مواقع پر خطابت سے بے پناہ کام لیا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایک عمدہ تقریر کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں جس طرح جہاد کے لیے جوش اور جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے کسی اور ذریعے سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک جب بھی مسلمانوں کو جہاد کا معرکہ پیش آیا تو امیرِ مملکت نے عامۃ المسلمین کو اس میں شرکت پر آمادہ کرنے کے لیے خطبہ عام دیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں تو یہ اصول تھا کہ ایسے مواقع پر لوگوں کو اجتماع کے لیے مسجد میں بلایا جاتا تھا اور وہاں انھیں اس معرکے کی تفاصیل بتائی جاتی تھیں جو درپیش ہوتا تھا اور لوگوں کو جہاد کی طرف بلایا جاتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جانشینوں نے اس طریقہ کار کو محض کسی جنگی حیلے یا تدبیر کے طور پر اختیار نہ کیا تھا بلکہ اس میں ارشادِ خداوندی کی تعمیل کا پہلو بھی بڑا نمایاں تھا اور یہ ارشادِ حق تعالیٰ نبی ؐ کے نام ان الفاظ میں ہے کہ یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ۔ قتال کی طرف رغبت دلانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خطابت ہی تو ہے۔ چنانچہ آج تک مسلمان سربراہانِ مملکت اس مؤثر ذریعے سے نہایت اچھی طرح کام لے رہے ہیں۔

تاریخ میں بعض مسلمان جرنیلوں کے ایسے خطبات محفوظ ہیں جو انھوں نے ایسے مواقع پر دیے جب دشمن بہت زیادہ تعداد میں اور بہت زیادہ اسلحہ اور ساز و سامان سے لیس ہوتا تھا اور مسلمانوں کی فوج میں کچھ گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ ان خطبات نے مجاہدین کے گرتے ہوئے حوصلوں کو تھام کر ان میں عزمِ ایمانی کی ایسی قوت پیدا کردی کہ وہ سر بکف اور کفن بردوش اپنے سے کئی گنا زیادہ دشمن افواج کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ ٹکرا گئے اور تعداد اور سامان کی بے انتہا کمی کے باوجود کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ طارق بن زیاد کا وہ مختصر سا خطبہ

جو اس نے ہسپانیہ کے ساحل پر اترنے کے بعد کشتیاں جلا دینے کے بظاہر غیر دانشمندانہ فعل پر اعتراض کے جواب میں دیا تھا تاریخ حریت کا روشن باب بن گیا ہے۔ اور اس خطبے کے ملخص کو اقبال نے ایک شعر میں ڈھال کر مسلمان مجاہدین کے لیے طغرائے عزم و توکل بنا دیا ہے۔ معترضین کے اعتراض پر طارق بن زیاد کے ردِ عمل اور جواب کو علامہ نے اس طرح لکھا ہے کہ

خندید و دست خویش بہ شمشیر بُرد و گفت،

ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

برِصغیر کی تاریخ میں مسلمان فاتحین کو بسا اوقات ایسے مشکل مراحل پیش آئے کہ انھیں اپنے لشکروں سے کئی کئی گُنا بڑے لشکروں کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا۔ ایسے مواقع پر جہاں مجاہدوں کی شجاعت و بسالت کام آتی تھی وہاں امیرانِ لشکر کی پرجوش خطابت بھی بڑا کام کرتی تھی۔ سلطان محمود غزنوی علیہ الرحمۃ نے جب سومنات پر حملہ کیا تو وہاں اس دور کے معرکوں میں سب سے بڑا معرکہ برپا ہُوا۔ ہندوستان بھر کے راجپوت راجے اپنے عظیم بُت کے عظیم مندر کی محافظت کے لیے اپنے اپنے لشکر لے کر وہاں پہنچے تھے۔ ہندو سورماؤں کی تعداد کئی لاکھ تک جا پہنچی تھی جس کے مقابلے میں سلطان کا لشکر بہت ہی کم تھا۔ پھر ہندوؤں کے لشکر کو تو برابر کمک پہنچ رہی تھی لیکن سلطان کے لشکر کو کمک کہاں سے پہنچتی۔ ایسے عالم میں سپاہیوں کا ہراساں ہونا ایک فطری امر تھا لیکن ایسے ہی نازک موقع پر سلطان کا جوشِ خطابت کارگر ہُوا۔ سلطان نے کہا:

"دشمن سامنے ہے اور لق و دق صحرا پیچھے۔ اگر ہم عزم، حوصلے اور اللہ پر توکل رکھتے ہوئے لڑے تو سومنات میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گے اور پھر غازیانہ شان و شوکت کے ساتھ غزنی کی طرف لوٹیں گے لیکن اگر خدانخواستہ ہم نے حوصلہ ہار دیا تو ہم میں سے کوئی بھی غزنی واپس نہ پہنچ سکے گا بلکہ راجپوتانہ کے صحرا میں ہمارے بے گور و کفن لاشے بکھرے پڑے ہوں گے اور گدھ انھیں نوچ رہے ہوں گے اس لیے پیچھے ہٹنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ بلکہ آگے ہی بڑھتے چلو یہاں تک کہ

غازی یا شہید ہو کر دنیا اور عقبےٰ میں سُرخروئی حاصل کرو۔"

کچھ اسی طرح کا خطبہ سلطان محمد غوری نے تراوڑی کی دوسری جنگ میں دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ :

" بھائیو وطن دُور ہے اور شہادت قریب۔ کوشش کرو کہ دشمن کو شکست دے کر غازیانہ شان و شوکت کے ساتھ وطن واپس پہنچو یا شہادت سے ہمکنار ہو کر داخلِ جنّت ہو جاؤ۔"

۱۵۲۶ء میں جب بابر نے پانی پت کی پہلی جنگ میں ابراہیم لودھی کے لشکر کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کیا تو راجپوت راجاؤں کو خیال تھا کہ اپنے پہلے تین حملوں کی طرح وہ اس بار بھی مالِ غنیمت سمیٹ کر کابل واپس چلا جائے گا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بابر نے ہندوستان میں مستقل حکومت کی داغ بیل رکھ دی ہے اور انھیں اپنے ارادے ناکام ہوتے نظر آئے تو انھوں نے چتوڑ کے رانا سنگرام سنگھ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر دہلی سے مسلمانوں کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کیا اور رانا سنگرام سنگھ نے ایک بہت بڑا لشکر لے کر دہلی کی طرف کوچ کیا۔ کنواہہ کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو بابری فوج کے جوان قدرے خوف زدہ ہوئے کیونکہ ان کی تعداد تو وہی تقریباً بارہ ہزار تھی جبکہ راجپوت فوجوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ بابر نے اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے سب سے پہلے تو اپنے نفسِ امّارہ کو شکست دینے کے لیے سرِعام شراب نوشی سے توبہ کی اور شاہی آبداری کے سونے چاندی کے ظروف وہیں منگوا کر ٹکڑے ٹکڑے کرائے اور وہ ٹکڑے اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیے۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسی ولولہ انگیز تقریر کی کہ سپاہیوں کے سینوں کے اندر بجھتے ہوئے دلوں میں از سرِ نو عزم و یقین کی قندیلیں روشن ہو گئیں۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ بہت سے مسلمان فاتحین کے خطیبانہ کمالات سے حاصل ہونے والے نتائج کا جائزہ لیا جائے تاہم اس طرح کے بے شمار واقعات ہماری اپنی یعنی برِصغیر کی تاریخ میں موجود ہیں۔ زوال اور انحطاط کے دور میں بھی ایسے مجاہدین پیدا ہوتے رہے جو جنگجویانہ صفات کے

ساتھ ساتھ خطیبانہ کمال کے حامل بھی تھے چنانچہ اس ضمن میں سید احمد بریلویؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سالار بخت خانؒ کی شخصیتوں کا ذکر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

قدیم و جدید دنیا کے بعض عظیم غیر مسلم خطبار

تقریر کا فن بڑا قدیم ہے اور فن تحریر سے سینکڑوں نہیں ہزاروں سال قدیم تر۔ لیکن اقوام کی معلوم تاریخ صرف تحریر ہی کے ذریعے محفوظ ہوئی ہے۔ لہٰذا ہمیں دنیا کی مختلف اقوام کے صرف ایسے بڑے بڑے مقررین کے حالات معلوم ہو سکے ہیں جن کا زمانۂ حیات وہ ہے جب تحریر کا فن ایجاد ہو چکا تھا۔ ان مقررین میں قدیم یونان کے مقررین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس حقیقت سے تمام اہلِ علم حضرات بخوبی واقف ہیں کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک تہذیب قدیم یونانی تہذیب ہے۔ یونانی تہذیب کے زمانۂ عروج میں بہت سے ایسے علمأ اور حکمأ پیدا ہوئے جن کے علم و حکمت کا شہرہ آج تک ہے اور ابدالآباد تک رہے گا۔ یہ لوگ بڑی خوبیوں اور متنوع صلاحیتوں کے مالک تھے ان میں سے اکثر مفکر بھی تھے اور مقرر بھی، فلسفی بھی تھے اور طبیب بھی، اصولِ شہریت سے بھی آگاہ تھے اور اساسِ جمہوریت سے بھی، ان لوگوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی پیش رفت کے لیے جو خدمات سر انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اس لیے دنیا کے جس خطے کی تہذیب اور ثقافتی تہذیب کے بارے میں کچھ لکھا جائے گا، ان کا ذکر اس میں لامحالہ آئے گا۔

سقراط (SOCRATES)

قدیم یونان کا ایک عظیم مفکر تھا۔ لیکن اس کی بعض تقاریر بھی بہت مشہور ہیں ان میں سب سے مشہور تقریر وہ ہے جو اس نے ۳۹۹ ق م میں اپنے دفاع کے لیے ایتھنز کی عدالت میں کی تھی۔ اس کے نزدیک فصاحت کا سب سے بڑا جوہر اس کی سچائی ہے۔ اس کا یہ فقرہ تو آبِ زر سے

لکھنے کے قابل ہے کہ

("Eloquence consists in speaking the truth")

وہ اپنی تقریروں میں جو کچھ کہتا تھا اس کے درست اور صحیح ہونے میں اسے ذرّہ بھر شک و شبہ نہ ہوتا تھا۔ اسی یقین کی بنا پر اس کی تقریر میں کسی طرح کا ابہام نہ ہوتا تھا۔ بنیادی طور پر چونکہ وہ ایک مفکر تھا لہٰذا اس کی تقریر میں فکر و تدبر کی فراوانی تھی اور وہ اسے زیادہ موثر بنانے کے لیے منطق اور استدلال سے کام لیتا تھا۔

ڈیماستھینز (DEMOSTHENES)

ڈیماستھینز کو تاریخ عالم کا ایک بہت ہی بڑا خطیب سمجھا جاتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو اسے سب سے بڑا خطیب کہتے ہیں۔ اس عظیم یونانی مفکر کی تقریر میں ایک طرف تو مکمل فکری ربط پایا جاتا تھا اور دوسری طرف انتہائی جوش اور جذبہ۔ جوش اور ہوش کے اسی توازن نے اس کی خطابت کو عظمتِ فن کا ایک شاہکار بنا دیا تھا۔

یونانی نقاد ڈایونائی سس Dionysus نے اس کے اندازِ تقریر کو اس زمانے کے تمام مقررین کی خوبیوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ وہ نہایت خوب صورت اور اعلیٰ زبان میں تقریر کرتا تھا۔ لیکن یہ زبان سلاست کا بہترین نمونہ بھی ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے سننے والوں کے دلوں میں آسانی سے اُتر جاتی تھی۔ اس کی تقریر احاطہ تحریر میں آکر ایک اعلیٰ ادب پارہ بن جاتی تھی۔

سسرو (CICERO)

قدیم روما کا سب سے بڑا خطیب اور اپنے دور کا نامور سیاست دان تھا۔ اس کا دل روم کی عظمت کے احساس اور مادرِ وطن کی محبت سے سرشار تھا۔ وہ روم کی سینٹ کا منتخب رکن تھا اور

اس حیثیت میں جو تقاریر اس نے کی ہیں وہ فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ سینٹ کے رکن کی حیثیت سے اس کی بہترین تقریر وہی ہوتی تھی جس میں وہ اپنے کسی مخالف رکن پر تنقید کرتا تھا۔ تقریر میں طنز سے بہت کام لیتا تھا اور حالات و واقعات اور شواہد کے حوالے سے اپنی اس طنز میں تلوار کی کاٹ پیدا کرتا تھا۔ وہ اپنی تقریر میں استفہام انکاری سے بھی خوب کام لیتا تھا اور مسلسل ایسے جملے بولتا جاتا تھا جو سوالیہ انداز میں کسی چیز کی نفی کرتے چلے جاتے۔ اس طرح وہ اپنے حریفوں کو خوب بے نقاب بھی کرتا اور سامعین کے ذہنوں میں اپنی بات بھی اچھی طرح بٹھا دیتا تھا۔

پیریکلز (PERICLES)

قدیم ایتھنز کا ایک نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ سیاست دان تھا۔ ۴۴۳ ق م سے لے کر ۴۲۹ ق م تک وہ ایتھنز کا عوامی امیر رہا۔ وہ ایک انتہائی مقبول مقرر تھا۔ اس کی تقریر سلاست زبان اور سادگی بیان کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہے اس کا قول تھا کہ میں شوکتِ الفاظ سے زیادہ صداقت واقعات سے کلام لیتا ہوں۔ اس کی تقریر کی اثر آفرینی بڑی حد تک یونان کی قدیم عظمت کی ترجمانی کی مرہونِ منت تھی:

انگلستان کے نامور مقررین

ہمارے برصغیر کا انتہائی قریبی رابطہ جس مغربی ملک کے ساتھ رہا وہ انگلستان ہے۔ یہ رابطہ چونکہ حاکم اور محکوم کا تھا اس لیے تقریباً ایک سو سال تک تو یہ عالم رہا کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ انگلستان کے متعلق اس سے کہیں زیادہ جانتے تھے جتنا اپنے ملک کے متعلق۔ ہندوؤں کی تاریخ تو صرف برصغیر تک ہی محدود تھی اس لیے انھیں ہندوستان کی تاریخ سے ہی اپنی قومی تاریخ کا بھی کچھ نہ کچھ پتہ چل جاتا تھا۔ لیکن مسلمان طلبا تاریخ اسلام سے بہت کم واقف تھے البتہ انگلستان کی مجمل سی تاریخ تو ہر وہ نوجوان جانتا تھا جس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہوتی تھی۔

تاہم ذہنی تعصبات سے قطع نظر اس تاریخی حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ انگلستان آزاد منش اور حریت پسند لوگوں کا وطن ہے اور ان کی اس حریت پسندی اور آزاد منشی کی نشو و نما میں ان نڈر، بے باک اور پُرجوش مقررین کا حصہ بہت اہم ہے جنھوں نے اپنی خطیبانہ صلاحیتوں سے کام لے کر حریت اور آزادی پسندی کے جذبہ کو برقرار رکھا ہے۔ انگریز مقررین کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر پارلیمانی اندازِ خطابت کے ماہرین تھے۔ انگلستانی پارلیمان چونکہ پارلیمانوں کی ماں کہلاتی ہے اس لیے بڑے بڑے انگریز مقررین کی تربیت قومی پارلیمنٹ کی وسیع آغوش ہی میں ہوئی چنانچہ چارلس جیمز فاکس، ایڈمنڈ برک، ہنری جان پامرسٹن، بنجمن ڈسرائیلی، جان برائیٹ، ولیم گلیڈسٹون، مورلے، جوزف چیمبرلین، ونسٹن چرچل سب کے سب عظیم پارلیمانی مقررین تھے۔

ان پارلیمانی مقررین میں برک کو ان تقاریر کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی تھی جو اس نے پارلیمنٹ میں وارن ہیسٹنگز پر چلائے جانے والے مقدمے میں ہیسٹنگز کے خلاف کی تھیں۔ جب اس نے بیگمات اودھ کے ساتھ وارن ہیسٹنگز کے متشددانہ سلوک کی تصویر کھینچی تو تماشائیوں کی گیلریوں میں بیٹھی ہوئی معزز انگریز خواتین سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں اور جب اس نے وارن ہیسٹنگز کی دوسری بدعہدیوں کی داستان سنائی تو ہر طرف سے شرم شرم کے آوازے بلند ہوئے۔ اثر آفرینی کی انتہا یہ تھی کہ اپنے خلاف برک کی تقریر سننے کے بعد وارن ہیسٹنگز نے اعتراف کیا کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔

چارلس جیمز فاکس بھی اپنے وقت کا نہایت بلند پایہ مقرر تھا۔ وہ عموماً حزبِ اختلاف میں ہوتا اور اپنے زورِ بیان اور مدلل اندازِ تقریر سے حکومتی بنچوں کی طرف سے کی ہوئی تقریروں کے پرخچے اڑا دیا کرتا تھا۔ اس کا شمار اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کے عظیم ترین خطیبوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تقریر کی بنیادی خوبیاں اس کے کلاسیکی ادب کے وسیع مطالعے پر مبنی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ انقلابِ فرانس کے زبردست حامیوں میں تھا اور مساواتِ انسانی پر پختہ یقین رکھنے کی بنا

پراس کی تقریر میں گہرا اثر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مساوات کے بغیر حقیقی آزادی کا تصور محال ہے۔

پامرسٹن اور ڈسرائیلی بھی جو اپنے اپنے وقت میں انگلستان کے نہایت کامیاب وزیر اعظم رہے تقریر کے مردِ میدان تھے۔ ان دونوں کو ان کی شاندار خدمات کے عوض لارڈ بنایا گیا۔ پامرسٹن کو انیسویں صدی کا کامیاب ترین وزیر خارجہ سمجھا جاتا ہے وہ ۱۶ سال تک وزیر خارجہ اور ۹ سال تک وزیر اعظم رہا۔ اگرچہ وہ اپنی تقریر میں بہت بلند آہنگ نہ تھا اور نہ ہی اس میں فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ خوبیاں تھیں تاہم اس کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایسی زبان استعمال کرتا تھا جو سامعین کی سمجھ اور عقل کے مطابق ہوتی تھی لہذا اس کی تقریر بڑی مؤثر ہوتی تھی۔ اپنی قوتِ تقریر کے بل بوتے پر وہ کئی بار ڈسرائیلی اور گلیڈسٹون ایسے مخالفین کی شعلہ بیانیوں کے باوجود پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

بنجمن ڈسرائیلی نے سیاست اور ادب میں بے شمار شہرت حاصل کی۔ اسے برطانوی کنزرویٹو پارٹی کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔

جب وہ پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو اس پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ وہ چند بے تکی باتوں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا چنانچہ پارلیمنٹ میں قہقہوں اور شور و شغب کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور اُسے مجبور ہو کر بیٹھ جانا پڑا لیکن بیٹھتے ہوئے اس نے اتنا ضرور کہا کہ سرِدست میں بیٹھ جاتا ہوں لیکن وقت آئے گا جب آپ میری تقریر خاموشی سے سُنیں گے۔ وہ نہایت عزم، حوصلے اور فنِ تقریر میں محنت کی وجہ سے وقت آنے پر بڑے پائے کا مُقرر بن گیا اور سیاست اور خطابت دونوں پر قدرت ہونے کے سبب وزارتِ عظمیٰ تک پہنچا۔ اس کی خدمات کی بنا پر اسے لارڈ بیکنسفیلڈ بنا دیا گیا وہ ملکہ وکٹوریہ کا بڑا چہیتا وزیر اعظم تھا۔

برصغیر کے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی غرض تمام چھوٹی بڑی اقوام کے سیاسی رہنما سب سے زیادہ انگلستانی مقررین ہی سے متاثر ہوتے تھے بلکہ فنِ تقریر اور میدانِ سیاست دونوں میں انہی کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس زمانے میں مسٹر محمد علی جناح تعلیم حاصل کرنے کے لیے

انگلستان گئے مسٹر گلیڈ سٹون انگلستان کے وزیر اعظم تھے۔ اس کے علاوہ مسٹر مورلے، مسٹر بالفور، مسٹر ٹی پی اوکانر اور مسٹر جوزف چیمبرلین ایسے نامور پارلیمانی مقررین ایوان کے ارکان میں شامل تھے۔ وہ پارلیمنٹ کے ان ارکان سے جو سب کے سب لبرل تھے بہت متاثر تھے اور ان کی تقریروں کو بڑے غور سے سنا کرتے۔ ولیم گلیڈ سٹون کا شمار انیسویں صدی کے عظیم ترین برطانوی مدبرین میں ہوتا ہے۔ وہ آزاد خیال (Liberal) تھا اور اسی بنا پر برطانوی عوام میں بے حد مقبول تھا۔ اسے یہ عظیم افتخار حاصل ہوا کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ نے اسے چار بار وزیر اعظم منتخب کیا وہ بلا کا ذہین اور نہایت عمدہ مقرر تھا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کا ادیب بھی تھا جس کی وجہ سے اس کی تقریر ادبی خوبیوں سے مرصع ہوتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ تھا کہ وہ تقریر کی تیاری میں بڑی محنت سے کام لیتا تھا۔

جب بیورلے نکلس ہندوستان آئے اور انھوں نے بہت سے ہندوستانی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں تو جس شخصیت سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ قائد اعظم محمد علی جناح کی تھی۔ برطانوی پارلیمانی مقررین سے قائد اعظم کے شغف کا اندازہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ اس موقع پر قائد اعظم جان برائٹ کی تقاریر کا مطالعہ کر رہے تھے۔ چنانچہ برائٹ کی ایک تقریر کا قدرے مفصل حوالہ ان کی گفتگو میں ملتا ہے جان برائٹ انیسویں صدی کا انقلابی سیاست دان تھا وہ عوام اور مزدوروں کا ہمدرد تھا جس کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اس نے انگلستان کے "قوانین غلہ" کے خلاف جو بڑے زمینداروں کے مفادات کی حفاظت کے لیے نافذ کیے گئے تھے زبردست تحریک چلائی جس کی وجہ سے بالآخر رابرٹ پیل کو یہ قوانین منسوخ کرانے پڑے۔ رابرٹ کی خطابت میں قوت، طنطنہ اور وقار پایا جاتا تھا۔

ونسٹن چرچل (SIR WINSTON CHURCHIL)

بیسویں صدی کے عظیم سیاست دان اور انگریز قوم کے بہت بڑے محسن مسٹر ونسٹن چرچل کے نام نامی سے کون شخص ناواقف ہوگا۔ چرچل نے جو سر اور بعد ازاں لارڈ کے خطاب سے متصف ہو کر بھی مسٹر چرچل ہی کہلانا پسند کرتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی وزیر بحریہ کی حیثیت سے قوم کی

بیش بہا خدمات سرانجام دی تھیں۔ لیکن دوسری جنگ میں ہٹلر کی قہرمانی بری اور فضائی قوتوں سے انگریز قوم کو بچانے والے مسٹر چرچل تھے۔ تدبیر سیاست کے علاوہ مسٹر چرچل کو تقریر و خطابت کی صلاحیتیں بھی فراوانی سے عطا ہوئی تھیں۔ ان کی وہ تقریر جو انھوں نے انتہائی نازک حالات میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے موقع پر کی تھی سیاسی تقاریر میں ایک عظیم شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے مبالغہ آمیزی سے کام لینے کی بجائے صاف گوئی کا راستہ اختیار کیا۔ اور قوم کو آنے والی مشکلات سے خبردار کرتے ہوئے سخت محنت کی تلقین کی۔ یہ ان کے حقیقت پسندانہ خطاب کا اثر تھا جس نے انگریز قوم کو ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے پر کمربستہ کر دیا۔ چرچل کا اندازِ بیان بلند آہنگ الفاظ کا مرہونِ منت نہ تھا۔ نہ وہ جذبات سے اپیل کرتے مگر مقصد پر یقین ان کی تقریروں میں جان ڈال دیتا اور وہ اپنے سامعین کو حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نبرد آزما ہونے کی جرأت عطا کر دیتے۔ جنگ کے پانچ سال کے دوران انھوں نے اپنے زورِ خطابت سے جس طرح انگریز قوم کا حوصلہ بلند رکھا وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس دوران انھوں نے امریکی کانگرس اور سینٹ کے اجلاس میں جو تقریر کی وہ بھی بڑی معرکۃ الآرا تھی۔

ان تمام انگریز مقررین کی خطیبانہ صلاحیتوں کے پیشِ منظر میں ان کے پس منظر پر بھی گہری نظر رکھنی چاہیے۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ یہ تمام تقریروں کی تیاری میں بڑی محنت سے کام لیتے تھے۔ بلکہ ان میں سے بعض مقررین تو تقریر سے پہلے خوب مشق بھی کیا کرتے تھے۔ ان کی کامیابی کا دارومدار ان کی فطری صلاحیتوں پر کم اور ان کی کوششوں اور کاوشوں پر زیادہ تھا۔

امریکی مُقرّرین

(BILLY GRAHAM).

انگلستان کی طرح امریکہ کے بعض سرکردہ سیاست دان اور اربابِ اقتدار بھی نہایت عمدہ مقرر تھے۔ امریکی قوم کے محسنِ اوّل جارج واشنگٹن ایک اعلیٰ مدبر اور فوجی کمانڈر ہونے کے ساتھ ساتھ

ایک بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ امریکی اتحاد کو قائم رکھنے والے اور موجودہ ریاست ہائے متحدہ کے حقیقی بانی ابراہام لنکن بھی بڑے اور اعلیٰ پائے کے پارلیمنٹیرین تھے۔

لنکن کی تقریر مختصر لیکن جامع ہوتی تھی وہ مختصر الفاظ کے اندرونی معانی اور مفاہیم کی لامحدود وسعتوں کو سمیٹ لینے پر قادر تھے۔ ان کی تقاریر انقلاب اور آزادی کی مقصدیت کی حامل تھیں اور وہ ان دونوں خصوصیات کے زبردست ترجمان تھے۔ ان کے بعض جملے تو ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ "من گفتم و محاورہ شد" کی مثال صحیح معنوں میں لنکن پر صادق آتی ہے۔

عصرِ جدید کے خطیبوں میں مؤثر خطابت کے لیے ولیم فرینکلن گراہم عرف بلی گراہم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک عیسائی مبلغ ہے اور اپنے فن کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ ایک مقناطیسی اثر رکھنے والا جادو بیاں مقرر ہے اور اسے سننے کے لیے بہت زیادہ لوگ جمع ہوتے ہیں ۱۹۴۹ء میں اس نے لاس اینجلز میں آٹھ ہفتوں کا اجتماع کیا جس میں اس نے ساڑھے تین لاکھ انسانوں کو مذہب پر کاربند رہنے کے لیے نئے سرے سے پابندِ عہد کیا۔ ایک بار گلاسگو میں اس کی تقریر دس لاکھ آدمیوں نے سنی۔ ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے اس نے ہزاروں آدمیوں کو عیسائی بنایا اس کے اندازِ خطابت کے مؤثر ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ لوگ اسے سن کر تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بلی گراہم کی تقریروں کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں سامعین کی ضیافتِ طبع (Entertainment) کا مکمل سامان ہوتا ہے اس کی تقریر طویل تو ہوتی ہے مگر ساتھ ہی جذباتی بھی ہوتی ہے وہ جوشِ بیان میں اسٹیج پر پنجرے میں بند شیر کی طرح اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض تقاریر میں وہ اس طرح اسٹیج پر ہی میل میل بھر کا سفر طے کر لیتا ہے۔

عصرِ حاضر کے بعض دیگر نامور خطیب

عصرِ حاضر کے بعض دوسرے نامور خطیبوں میں ہٹلر، سائنور مسولینی، جمال عبدالناصر، احمد سوئیکارنو

ذوالفقار علی بھٹو اور فائیڈل کاسترو خطیبانہ شہرت کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ ہٹلر جو ایڈولف ہٹلر کے نام سے ایک گمنام اور معمولی انسان تھا اپنی خطیبانہ صلاحیتوں جن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اسے تنظیمی صلاحیتیں بھی فراوانی سے عطا کی تھیں، کی بدولت جرمنی کا مُطلق العنان حاکم بن گیا اور اپنی قوم کی طرف سے ہر ہٹلر اور فیورہر کے پیار بھرے خطابات سے مخاطب ہُوا۔ اس کی گھمبیر آواز، جذباتی وارفتگی اور جنوں آمیز اندازِ تقریر نے اسے قوم کا محبوب رہنما بنا دیا۔ وہ جرمنی کی عظمتِ رفتہ کو موضوعِ سخن بنا کر اس کی بازیافت کا نعرہ لگاتا تھا اور اسی نعرے نے اسے کامیاب کیا۔ وہ استدلالی منطق سے کام لیتا تھا۔ اس کی تقریر سے سامعین کے جذبات و احساسات میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ اپنے وطن اور اپنے فیورہر کے لیے جان و مال کی ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔

ادبی لحاظ سے ہٹلر کی تقریر کا معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا وہ اکثر فحش الفاظ اور عامیانہ تراکیب بھی استعمال کرتا اور گرامر اور الفاظ کو اپنے جذبات کے ماتحت سمجھتا تھا۔ تقریر کے دوران اس کی حرکات و سکنات، سامعین کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہوتی تھیں۔ جلسوں میں تقریر کرنے سے پہلے ان اداؤں کی باقاعدہ ریہرسل کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو اپنے سامعین کے جذبات کو مشتعل کرنے کے بعد وہ خود بھی جلسے کے جذباتی ماحول سے متاثر ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

مسولینی فسطائی نظام کا بانی اور اس لحاظ سے ہٹلر کا پیش رو تھا لیکن ہٹلر دیکھتے ہی دیکھتے اس سے آگے نکل گیا۔ مسولینی بھی بہت بڑا مقرر تھا اور وہ اہلِ اطالیہ کو ان کی قدیم عظمت اور سربلندی یاد دِلا دلا کر ان کے جذبات کو برانگیختہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی تقریر میں اطالویوں کو "اے آلِ سیزر" کے نام سے مخاطب کر کے ان کی انا کو اُبھارنے کی کوشش کرتا تھا۔

لیکن وہ صرف ماضی کی یاد کے ذریعے ہی قوم کو خوش رکھنے پر اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ انھیں ایک روشن مستقبل کی اُمیدیں بھی دلاتا رہا۔ وہ بحیرۂ روم کو "ہمارا سمندر" اور یورپ کے علم و ادب کو "رومیوں کا عطا کردہ علم و ادب" کہا کرتا تھا۔ فنِ خطابت کے زور پر وہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۴ء تک اٹلی کے سیاہ و سفید

کا مالک بنا رہا۔

مصر کے جمال عبدالناصر دنیائے عرب کے بالعموم اور اہلِ مصر کے بالخصوص نہایت اعلیٰ پائے کے رہنما تھے۔ انھوں نے عربوں اور خصوصاً اہلِ مصر کی قومی انا کو جو ایک عرصہ دراز سے عالمِ خوابیدگی میں تھی بیدار کرنے کے لیے فنِ خطابت کو نہایت طریقے اور سلیقے سے استعمال کیا اور عربوں میں خود اعتمادی کی لہر دوڑا دی۔ وہ عصرِ حاضر کے بعض دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح اپنی قوم میں بے حد مقبول تھے۔ ایک انقلابی اور فوجی لیڈر ہونے کے باوجود ان کے مزاج میں بڑی لطافت تھی وہ تقریریں ہمیشہ عقلی دلائل اور منطقی استدلال سے کام لیتے تھے لیکن اس میں جذبے کے خلوص اور شدت کا وہ عالم ہوتا تھا کہ عقلی اور استدلالی پہلو کی حیثیت ثانوی ہو جاتی تھی۔ ان کی آواز میں جادو کا اثر تھا چنانچہ جب وہ تقریر کرتے تھے تو تمام دنیائے عرب اسے مسحور ہو کر سنتی تھی۔

اس جادو بیانی کی مثال ان کی وہ تقریر ہے جو عرب اسرائیل جنگ میں شکست کھانے کے بعد انھوں نے مشتعل اور مایوس مصری عوام کے ایک عظیم اجتماع کے سامنے کی تھی۔ خطیب کے لیے دیانت ایک بنیادی وصف ہے اور اس گھڑی جمال عبدالناصر اس صفت کا عملی مظاہرہ کر چکے تھے۔ انھوں نے جنگ میں ناکامی کی تمام تر ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں وہ مستعفی ہو چکے تھے، مگر جب انھوں نے مصری عوام کے سامنے اپنے استعفے کا اعلان کیا تو ان کی خطابت یہ اثر دکھا چکی تھی کہ مجمع نے بیک آواز "نہیں نہیں" کی صدائیں بلند کیں اور اس طرح پھر سے انھیں صدارت کا عہدہ سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔

انڈونیشیا کے احمد سوئیکارنو بھی ایک ماہر خطیب تھے۔ اپنے عوام کی اُمیدوں، خواہشوں اور امنگوں کی ترجمانی میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ انڈونیشیا کے ماضی کی عظیم روایات اور مستقبل کے روشن امکانات کا بیان ایسے پُراثر انداز میں کرتے تھے کہ سامعین کے دلوں میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی پُراثر خطابت کے زور سے لاکھوں کے مجمع کو مسحور کر دیتے تھے اور اس عالمِ مسحوریت میں سوئیکارنو انھیں جو بھی حکم دیتے تھے لوگ اپنی جان پر کھیل کر اس کی تعمیل پر

کمربستہ ہو جاتے تھے۔

سوئیکارنو کی تقریروں میں وہ منظر خاص طور پر قابلِ دید ہوتا تھا جب وہ اپنی خطابت سے سورِ عظیم اجتماع کو پوری طرح گرفت میں لے لیتے اور اپنی عوامی مقبولیت کے اظہار کے لیے مجمع کو ہدایت کرتے کہ جب میں ہاتھ بلند کر کے گراؤں تو سب لوگ "آزادی زندہ باد" کا نعرہ لگائیں۔

ایک لمحے کے لیے تمام مجمع ساکت ہو جاتا۔ پھر جب سوئیکارنو اپنا ہاتھ بلند کر کے گراتے تو اجتماع سے بیک آواز آزادی کا نعرہ بلند ہوتا اور تمام فضا گونج اٹھتی۔ وہ اس عمل کو بار بار دہرا کر اپنے مخالفین پر ثابت کر دیتے تھے کہ عوام ان کے ساتھ ہیں۔

سوئیکارنو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنے اندازِ خطابت کا ایک دل چسپ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تقریر کرتے وقت سامعین کی نفسیات پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور اسلامی روایات وعقائد کو مضمون کی وضاحت کے لیے کس طرح برمحل استعمال کیا کرتے تھے۔ صدر سوئیکارنو لکھتے ہیں:

"میرا کوئی ذاتی مکان نہیں۔ میرے پاس نہ زمین ہے نہ کوئی رقم، کتنی ہی بار میرے پاس گھر کا خرچ چلانے کے لیے ایک روپیہ بھی نہیں ہوتا۔ ایک بیرونی ملک میں ایک بار ہمارے ایک سفیر نے میرے لیے پاجامہ خرید کر دیا۔ دنیا میں میں ہی واحد صدر ہوں جس کے پاس رہنے کے لیے ذاتی جگہ تک نہیں ہے۔ ایک بار کچھ لوگوں نے میرے لیے مکان بنانا چاہا مگر میں نے انھیں منع کر دیا۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے کہ اپنے عوام سے کچھ مانگوں میں تو انھیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔

میری تقریروں میں اکثر جدائی کے لمحات کا تذکرہ ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ موت ہر انسان کے لیے مقرر ہو چکی ہے میں اس کے لیے اپنے عوام کو آمادہ رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت پر بھی یقین ہے اور زندگی بعد از موت پر بھی۔ میرا عقیدہ ہے

کہ میرے دونوں بازوؤں پر دو فرشتے ہر وقت موجود ہیں۔ میرے دائیں جانب کا فرشتہ اچھے اعمال کو لکھتا رہتا ہے۔ قیامت کے دن وہ کہے گا کہ سو بیکارنو! لو یہ تمھارے اچھے اعمال ہیں، انھیں دیکھو۔ اس کے بعد بائیں جانب کا فرشتہ پکارے گا کہ نہیں... تمھارے گناہ اور تمھاری خطائیں بڑی طویل ہیں اور اس کے بعد ہم مجبور ہیں کہ تمھیں دوزخ میں ڈال دیں۔ اور واقعی میرے اعمال اس لائق ہیں۔ لیکن میں یہ سوچنے کی کیوں ہمت کروں کہ اللہ مجھے کہاں بھیجے گا۔ میں تو اس وقت صرف یہی سوچتا ہوں کہ جب میری آخری گھڑی آئے تو اس میں زیادہ دیر نہ لگے۔ اور ہاں جب میں مروں تو میری قبر پر القابات و خطابات نہ لکھنا۔ مجھے مذہب اسلام کے مطابق دفنا دینا اور ایک سادہ کتبہ لگا دینا کہ یہ بابائے قوم کی قبر ہے جو انڈونیشیا کے عوام کا ترجمان تھا۔"

موجودہ دور میں امریکہ جیسی عظیم ترین طاقت کے پہلو میں کیوبا کا چھوٹا سا جزیرہ خار بن کر کھٹک رہا ہے اور یہ ساری کھٹک فائیڈل کاسترو کی بدولت ہے جو کیوبا کا فرمانروائے مطلق ہے۔ کاسترو ظاہراً تو جنگی لباس میں ملبوس ایک ہمہ وقتی سپاہی نظر آتا ہے لیکن اس کی سیاسی طاقت اس کی سپاہیانہ تراش خراش کی مرہونِ منت نہیں بلکہ اس مسلسل، بے تکان اور استدلالی انداز میں بولنے کی بے پناہ قوت کی وجہ سے ہے جو قدرت نے اسے نہایت فراوانی سے عطا کی ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے تقریر کر سکتا ہے اور چونکہ دورانِ تقریر وہ جذبات کے ہر رُخ کو کامیابی کے ساتھ نطق و بیان کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور ایک ہی وقت میں اور ایک ہی تقریر کے دوران خوشی، غم، جرأت و مردانگی، غصے اور مزاح کے مختلف النوع جذبات کی بخوبی عکاسی کر لیتا ہے، اس لیے لوگ گھنٹوں محویت کے انداز میں اس کی تقریر سنتے رہتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں اور نہ اُکتاتے ہیں۔

یوں تو ہر عرب پیدائشی خطیب ہوتا ہے اور موجودہ دور کے کم و بیش تمام عرب راہنماؤں

میں یہ صفت کسی نہ کسی حد تک ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن ان میں شاہ فیصل ، یاسر عرفات اور کرنل قذافی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میں نے شاہ فیصل کی کم و بیش بارہ تقریریں سُنی ہیں۔ وہ ایک داعی اور مُبلّغ کے انداز میں کلام کرتے ہیں۔ ان کی عربی اتنی سہل اور سادہ ہوتی ہے کہ عربی نہ جاننے والے بھی اُسے آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ بڑی متانت سے بولتے ہیں۔ جذبات سے زیادہ دماغ کو اپیل کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں کسی نقطہ پر زور دینے کا موقع آتا ہے وہاں جوش سے بھی کام لیتے ہیں۔

یاسر عرفات اور قذافی دونوں بنیادی طور پر سپاہی ہیں اور اس لحاظ سے ان کی تقریروں میں اسکالر کا سا لب و لہجہ متوقع نہیں ہو سکتا مگر جن لوگوں نے قذافی اسٹیڈیم میں کرنل قذافی کی تقریر سُنی ہے انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ وہ گھن گرج سے زیادہ نسبتاً دھیمے اندازِ استدلال پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی تقریر میں دریا کی روانی کی بجائے ایک سُبک خرام ندی کا بہاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عرفات آتش بیانی سے آگ لگا دیتے ہیں، اُن کے مُنہ سے پھُول نہیں انگارے برستے ہیں۔ گویا قذافی اور فیصل اگر جمال کا مظہر ہیں تو عرفات جلال کا پیکر ہیں۔

پاکستان کے موجودہ وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو بھی دورِ حاضر کے ایک بے مثال خطیب ہیں۔ ان کے فنِ خطابت کا مختصر سا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا۔

فنِ تقریر کے اصُول وضوابط

عصرِ حاضر میں جہاں دوسرے علوم و فنون کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے وہاں فنِ تقریر کے سائنسی تجزیہ اور مطالعہ کی طرف بھی پوری توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ گفتگو اور تقریر کے فن پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں ڈیل کارنیگی، ایلن منرو، ایڈورن ہملن کار اور ولیم این برگنس اور ریے کیسلر ایمل کی تصنیفات بڑی مُفید معلومات کی حامل ہیں۔ ان سب مصنفین میں ڈیل کارنیگی کو

اولیت کا شرف حاصل ہے کیونکہ اس نے نفسیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ اور مختلف افراد، گروہوں اور قوموں کے ذہنی اور فکری عمل اور ردِ عمل کا تفصیلی مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے مطالعات اور مشاہدات کا ملخص اپنی تصنیفات میں کیا ہے۔ دوسرے مصنفین کی بھی اپنی اپنی اہمیت ہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی مخصوص سوچ کے مطابق موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم جہاں تک نتائج اخذ کرنے کا تعلق ہے تقریباً تمام مصنفین نے کم و بیش یکساں قسم کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ چنانچہ اچھی تقریر کے متعلق ذیل کی باتوں پر تقریباً سبھی مصنفین متفق نظر آتے ہیں۔

ا۔ تیاری

(۱) تقریر کرنے سے پہلے اس کی تیاری پر خوب محنت کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں پہلا مرحلہ غور و خوض کا ہے۔ جتنا اہم موضوع ہوگا اتنا ہی زیادہ اس پر غور و خوض ہونا چاہیے جس طرح کہ "پہاڑی کے وعظ" سے پہلے حضرت عیسٰے علیہ السلام چالیس روز تک جنگل میں سوچ بچار کرتے رہے۔

(۲) متعلقہ مواد کا تفصیلی مطالعہ نہایت ضروری ہے اور اس تفصیلی مطالعہ میں ابتدائی کتابوں سے لے کر انسائیکلو پیڈیا تک سے کام لینا چاہیے۔

(۳) اس کے بعد بہترین خیالات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کیونکہ جتنا کچھ پڑھا گیا وہ سب تو ایک تقریر کے اندر سما نہیں سکتا۔ خیالات کا عمدہ انتخاب تقریر کی عمدگی کا ضامن ہے۔

(۴) اچھی تقریر کے لیے تقریر کا خاکہ تیار کرنا ضروری ہے۔ جس طرح کوئی عقلمند معمار نقشے کے بغیر مکان تعمیر کرنے کا ارادہ نہیں کرتا اسی طرح کوئی اچھا مقرر تقریر کا خاکہ تیار کیے بغیر تقریر کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔

ب۔ اندازِ خطاب

(۱) تقریر کے انداز میں تصنع نہ ہو۔ قدرتی اور بے تکلفانہ انداز اختیار کیا جائے۔ تقریر میں گفتگو کا انداز سامعین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور مقرر اور سامعین کے درمیان خوشگوار رابطے کا کام دیتا ہے۔

(۲) تقریر کے لیے موزوں تیاری ضروری ہے لیکن تحریری نوٹ لے کر ان کی مدد سے تقریر کو آگے چلانے کی کوشش عام طور پر خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرتی۔ تحریری نوٹ مقرر اور سامعین کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور ان کا ذہنی رابطہ قائم نہیں رہتا۔

(۳) ہاتھ کے اشاروں اور سر اور آنکھوں کی حرکات سے تقریر میں اثر بڑھتا ہے لیکن حرکات و سکنات قدرتی ہونی چاہئیں۔ اگر ان میں اداکاری کا رنگ آجائے تو سامعین مقرر کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴) آواز نہ اتنی بلند ہو کہ مقرر چیختا چلاتا سنائی دے اور نہ اتنی دھیمی کہ تمام سامعین تک بخوبی پہنچ ہی نہ سکے۔

ج۔ معنوی صفات

ظاہری صفات کے علاوہ عمدہ تقریر کے لیے بعض اہم معنوی صفات بھی ضروری ہوتی ہیں۔ جو اچھے مقرر کی تقریر میں شعوری کوشش کے بغیر ہی ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان صفات کو اپنے لاشعور میں جذب کرنے کے لیے ابتدائی زمانے میں بڑی ٹھوس اور مثبت کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چند صفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) موضوع تقریر کا واضح تصوّر اور اس کی اہمیت کا ادراک

(۲) موضوع کے متعلق تفصیلی معلومات

(۳) مکمل خود مختاری

ان تین باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ تینوں آپس میں اس طرح مربُوط اور منسلک ہیں کہ ایک کے بغیر دوسری کا وجود ممکن نہیں۔

جب تک اس موضوع تقریر کا واضح تصوّر ذہن میں نہ ہو گا اور جب تک اس کی اہمیت کا ادراک پوری طرح نہ ہو گا اس وقت تک تقریر کی کوشش ایک سعیٔ لاحاصل سے زیادہ کچھ نہ ہو گی۔ اگر مقرر خود ہی موضوع کی اہمیت سے آگاہ نہ ہو گا تو سامعین کو اس کے متعلق کیا بتا سکے گا اور خود

اس کے اندازِ تقریر میں خلوص اور جوش و جذبہ کہاں سے آئے گا۔

یہ امر بھی بدیہی ہے کہ جب مقرر کو اپنے موضوع کے متعلق تفصیلی معلومات نہ حاصل ہوں گی تو اس کے ذہن میں موضوع کا واضح تصور کیونکر پیدا ہوگا اور وہ یہ کیسے دعویٰ کر سکے گا کہ اس نے سامعین کے علم میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

پھر اس چیز سے تو کسی کو انکار کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی کہ مقرر کے اندر خود اعتمادی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب وہ اپنے موضوع پر پُوری طرح حاوی ہو۔ اور موضوع پر پوری طرح حاوی ہونے کے لیے تفصیلی مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

لیکن جس طرح پیراکی کے اصول و ضوابط پر عبور حاصل کرنے سے انسان تیراک نہیں بن سکتا اسی طرح فنِ تقریر کے اسرار و رموز پڑھ لینے سے انسان مقرر نہیں ہو جاتا۔ تیرنے کے لیے عملی طور پر پانی میں چھلانگ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تقریر کا فن سیکھنے کے لیے تقریر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان زمانوں میں بھی جب فنِ تقریر پر سائنسی انداز سے بحث نہ ہوتی تھی اور لوگ اس فن پر تکنیکی طور سے حاوی نہ ہوتے تھے، دنیا بھر کے تمام ممالک میں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوتے رہے۔ خود ہمارے برِصغیر میں جہاں جمہوری نظام ــــ جو فی الواقع فنِ تقریر کی پرورش گاہ ہوتا ہے ـــ کسی رنگ میں کبھی نہ آیا تھا اور سو ڈیڑھ سو سال تک تو ہر قسم کا سیاسی عمل رُکا سا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے دوران ایسا ایسا مقرر پیدا ہُوا کہ ان میں سے بیشتر لوگوں کے فرمودات آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

ہم نے قارئین کی سہولت کے لیے اس موضوع پر چند مشہور کتابوں کی تلخیص ایک الگ باب میں پیش کر دی ہے جس سے فنِ تقریر کے سلسلے میں ضروری باتیں بیک نظر سامنے آجاتی ہیں۔

برِصغیر کے نامور خُطبا اور مقررین

جب ہم برِصغیر کے خطیبوں کا جائزہ لیتے ہیں تو جو چیز نہایت واضح طور پر ہمارے سامنے

آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان نامور خطبا اور مقررین میں زیادہ تر مسلمان ہیں۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا شبیر احمد عثمانی اور نواب بہادر یار جنگ۔ ان عوامی مقررین کے علاوہ بعض ایسے وکلا بھی گزرے ہیں جو قانونی امور پر بحث و تقریر میں یکتائے روزگار تھے۔ جیسے سر فیروز شاہ مہتہ، جناب بدرالدین طیب اور قائد اعظم محمد علی جناح۔ بہت تھوڑے ہندو مقررین ایسے ہیں جو عوامی مقررین کی حیثیت سے نام پیدا کر سکے ہیں جیسے مسز سروجنی نائیڈو اور مسٹر سبھاش چندر بوس۔ پارلیمانی مقررین میں البتہ دیوان چمن لال اور پنڈت موتی لال نہرو منجھے ہوئے مقرر تھے۔

بیسویں صدی میں برصغیر میں جو چند نابغۂ روزگار شخصیتیں ابھری ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مقام بہت بلند ہے۔ مولانا بنیادی طور پر ایک اعلیٰ پائے کے انشا پرداز تھے۔ انھوں نے انشا پردازی کے ذریعے صحافت میں نام پیدا کیا اور صحافت کے رستے سیاست میں داخل ہوئے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تحریر و تقریر دونوں میں یکتا ہوں۔ مولانا کی نثر کے متعلق حسرت موہانی نے اعتراف کیا ہے۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

سیاست، صحافت، تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کا یہ شہسوار فن خطابت میں بھی بے مثال اور نادرۂ روزگار تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں "لوگوں کی نگاہیں میرے ہونٹوں کی جنبش کا انتظار کرتی ہیں۔" مولانا امین احسن اصلاحی نے کہا تھا "ان لوگوں کا دماغ کئی ہزار دماغوں کا نچوڑ ہے۔" مشہور صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیز کے قول کے مطابق "جب مولانا تقریر کرتے تھے تو سامعین پر نور کی ایک چادر تن جاتی تھی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان تمام تر کمال کے باوجود عوام کے لیے ادق ہوتی تھی۔ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کی وجہ سے ان کی اردو "معرب" اور "مفرس" تھی۔ ان کی تشبیہات، استعارول اور فارسی زبان کے اشعار کو سمجھنے کے لیے علمی پس منظر کی ضرورت تھی اور یہ خواص

میں تو تھا مگر عوام میں نہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ بہت بڑے خطیب ہونے کے باوجود اہلِ علم کے طبقے سے نکل کر عوام میں مقبول نہیں ہوسکے۔

عوام اگر ان کی تقریروں پر سر دھنتے تھے تو محض حسنِ عقیدت اور اس جذبہ و تاثیر کے ماتحت کہ وہ امام الہند کی تقریر سُن رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح مولانا محمد علی جوہر بھی ایک بہت بڑے صحافی، سیاست دان، انشاپرداز اور مُقرر تھے۔ مولانا آزاد عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے لیکن مولانا محمد علی جوہر آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ انہوں نے دو اخبار کامریڈ (انگریزی) اور ہمدرد (اردو) میں جاری کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی دھوم مچ گئی۔ وہ جتنے اعلیٰ پایہ کے انشاپرداز تھے اس سے کہیں بڑھ کر مقرر تھے۔ ان کے اندازِ خطابت کا اعتراف اپنے بیگانوں نے کیا ہے۔ انگریزی زبان کے شہرہ آفاق مصنف ایچ جی ویلز نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ "محمد علی کا دل نپولین کا، قلم میکالے کا، اور زبان برک کی تھی"۔

مولانا محمد علی کی لذتِ تقریر کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اپنے زیورات تک اتار کر تحریکِ خلافت کے فنڈ میں دے دیا کرتی تھیں اور جب انہوں نے ہندوستان کو دارالکفر قرار دیتے ہوئے ہجرت کی تحریک شروع کی تو ہزاروں لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر کابل جا بسے۔ زورِ بیان اور روانی کے علاوہ ان کی برجستہ گوئی اور حاضر جوابی اپنی مثال آپ تھی۔ طنز و ظرافت کی چاشنی سے بھی کام لیتے تھے۔ آواز ایسی پاٹ دار تھی کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں، بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا "کہ کارخانے میں توپیں ڈھالی جا رہی ہیں"۔

مولانا محمد علی جوہر کی طرح مولانا ظفر علی خاں بھی بیک وقت سیاست دان، صحافی، انشاپرداز اور شاعر تھے۔ اپنی متنوع صلاحیتوں میں سے ہر ایک صلاحیت میں وہ درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ تاہم ان کی اعلیٰ درجے کی شاعری زندگی میں بھی ان کے لیے باعثِ عز و افتخار رہی اور مرنے کے بعد بھی اس صنف نے انھیں جاودانی زندگی عطا کی ہے۔ خطیب وہ اس پائے کے تھے کہ لاکھوں کے اجتماع ان

کی تقریر کے دوران ساکت و صامت ہو جاتے تھے۔

جلیانوالہ باغ کے بدنام زمانہ جلاد صفت جنرل ڈائر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ظفر علی خاں تقریر نہیں کرتے انگارے برساتے ہیں۔ پنجاب میں جن لوگوں نے احرار کی شعلہ بیانی کا مقابلہ کیا تھا اُن میں مولانا ظفر علی خاں کا نام سرِ فہرست ہے۔

اگرچہ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے دوران اسلامیانِ ہند کے درمیان ایک سے ایک بڑا خطیب اور مقرر پیدا ہوا لیکن جس شخص نے پشاور سے کلکتے اور کشمیر سے راس کماری تک، تمام ہندوستان میں اپنی خطابت کا لوہا منوایا وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ وہ مختلف قومی تحریکوں سے وابستہ رہے اور اپنی شعلہ بیانی اور آتش نوائی کی وجہ سے انھوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں بسر کیا لیکن تحریکِ احرار کے ساتھ ان کی وابستگی گوشت اور ناخن جیسی تھی۔ بڑے بڑے جلسوں کو اپنی تقریر کے جادُو سے مسحور کر دینے کے فن میں کوئی شخص شاہ صاحب کا ہم پلہ نہ تھا۔ وہ رات کے نو دس بجے تقریر شروع کرتے تو صبح تک کیے جاتے اور سُننے والے اس طرح جم کر بیٹھتے گویا تمام عمر تقریر ہوتی رہے تو وہ تمام عمر یوں ہی بیٹھے رہیں گے۔ تقریر میں جذبات کی شدّت پیدا کر کے لوگوں کو بے اختیار رُلا دینا، ایثار اور قربانی کے بیان سے انھیں اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار کر دینا اور چٹکلوں اور لطیفوں سے روتی ہوئی محفل کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

شاہ صاحب قبلہ نہایت مجلسی اور خوش مذاق انسان تھے۔ اور ان کے لطیفوں اور چٹکلوں سے ہمیشہ محفل میں رونق پیدا ہوتی تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور میں نظر بند تھے۔ جیل میں دو احاطے سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص تھے۔ ایک کا نام دیوانی گھر تھا اور دوسرے کا بم کیس۔ دیوانی گھر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا محمد علی جالندھری اور دوسرے احرار رہنما تھے اور بم کیس میں مولانا امین احسن اصلاحی، میاں طفیل محمد اور ہم لوگ تھے۔ ہر جمعے کے دن دونوں احاطوں کی والی بال ٹیموں کا میچ ہُوا کرتا تھا۔ دیوانی گھر ٹیم کے کپتان صاحبزادہ فیض الحسن تھے اور بم کیس ٹیم کا کپتان مَیں تھا۔ شاہ صاحب کھیل دیکھنے آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی خود

بھی شامل ہو کر سروس کیا کرتے تھے۔ ایک بار مولانا اصلاحی نے کہا:

"مولانا آپ سروس کرتے ہیں؟"

انہوں نے کہا "ہاں، بلکہ زندگی اسی میں گزر گئی ہے۔"

مولانا اصلاحی نے کہا "لیکن یہ سروس اکثر فاؤل ہوتی ہے۔"

یہ تو خیر ایک جملۂ معترضہ تھا۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ شاہ جی کے فنِ خطابت کے بارے میں میرا علم سماعی نہیں۔ میں نے اُن کی تقریریں بھی سُنی ہیں اور اُن کا فیضِ صحبت بھی پایا ہے۔ وہ ازراہِ کرم جیل میں جب بھی ہمارے احاطے میں تشریف لاتے میرے کمرے میں ضرور آتے۔ شعر سنانے کی فرمائش کرتے۔ پھر سراپا داد بن کر حوصلہ افزائی بھی فرماتے۔

شاہ جی کو اگر زمانۂ قدیم کے خطیبوں میں سے کسی کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے وہ تو یونان کا "ڈیماستھینز" ہے۔ جسے اس دور کے ناقدین نے سب سے پہلے بڑا خطیب قرار دیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ڈیماستھینز نے شجاعت کے موضوع پر فقط دادِ خطابت دی ہے۔ ولولہ انگیز تقریریں کی ہیں اور وقت آنے پر میدانِ کارزار سے راہِ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھی ہے۔ مگر شاہ جی نہ صرف کاروانِ شجاعت کے حدی خواں تھے بلکہ اس مقصد کے لیے انھوں نے ساری عمر مصائب اور آزمائشوں کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ خود فرماتے تھے "میری آدھی عمر ریل میں اور آدھی جیل میں کٹ گئی۔ خطابت کا جادو جگانے کے لیے خطیب کو سحر آفرین شخصیت کا بھی حامل ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے بھی شاہ جی کا جواب نہ تھا۔ خوب صورت سرو قد نقش ونگار، لمبے لمبے گیسو، بھرے بھرے پُر رعب چہرے پر گھنی گھنی داڑھی، ہاتھوں میں عصا یا کلہاڑی، عوامی لباس۔ اس پیکر میں جب وہ اسٹیج پر آتے تو لوگ دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتے۔ کہتے ہیں ایک مشہور انگریز فلم ساز نے ان کی تقریر سُن کر کہا تھا کہ اگر مجھے اپنی فلم میں حضرت مسیح کا کردار ادا کرنے کے لیے کسی شخص کو لینا ہو تو اس مقصد کے لیے شاہ جی سے زیادہ موزوں کوئی نہ ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تلاوتِ قرآن میں بھی وہ ایک اچھوتا انداز رکھتے

تھے۔ جب کبھی حجازی لے میں قرآن حکیم پڑھتے تو یوں لگتا جیسے شجر و حجر جھوم اٹھے ہوں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی تاثر کے نتیجے میں کہا تھا۔

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

احراری مکتبۂ فکر نے مسلمانانِ ہند کی کوئی ٹھوس سیاسی خدمت کرنے میں تو کامیابی حاصل نہیں کی لیکن اس جماعت میں بعض بڑے پائے کے عوامی مقررین پیدا ہوئے جن میں شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا غلام غوث ہزاروی، مظہر علی اظہر اور شورش کاشمیری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام مقررین کی نمایاں خصوصیات ان کا جذباتی اندازِ بیان، شعر و ادب کی چاشنی اور مذہب سے حد درجہ شیفتگی تھیں۔ ان کے مداحوں سے قطع نظر ان کے مخالفین بھی ان کے جلسوں میں ان کی تقریروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے شوق سے جاتے تھے اور ان کے لطیفوں، چٹکلوں اور دلچسپ اندازِ بیان کا دل سے اعتراف کرتے تھے۔

جن احراری مقررین کے نام اُوپر لیے گئے ہیں ان سب کے ساتھ وقتاً فوقتاً مجھے قومی جلسوں کو خطاب کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کے سب پائے کے مقرر ہیں۔ لیکن ان میں شورش کاشمیری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ قدیم اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں بیک وقت مقبول ہیں۔ اور عمر رسیدہ اور نوجوان دونوں طبقے کے لوگوں کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ صرف مقرر ہی نہیں بلکہ شعر و ادب اور صحافت میں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ تحریر، تقریر، صحافت اور سیاست کے شعبوں میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے تربیت یافتہ ہیں اس لیے ان کی خطابت میں ایک منفرد بانکپن پایا جاتا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقاریر بھی ثقاہت، نفاست اور لطفِ بیان کے محاسن سے آراستہ ہوتی تھیں مولانا عثمانی سیاست میں سرگرم حصہ لینے کی بجائے علمی محاذ پر مسلمانوں کی خدمات انجام دیتے رہے لیکن جب حصولِ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے اپنی خدمات مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیں۔

مولانا کے علم و فضل کا شہرہ تو بہت ہے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ قرآن کا یہ مفسر اور حدیث کا یہ شارح ایک بلند پایہ خطیب بھی تھا۔ مولانا نے یوپی کے الیکشن میں جمعیت العلمائے ہند کے مقابلے میں مسلم لیگی اُمیدواروں کی حمایت میں جو تقریریں کیں ان سے الیکشن کی فضا ہی بدل گئی اور مسلمانوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے یہ علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہو نگے پاکستان کے حامیوں کی دل کھول کر مدد کی۔ مولانا کے اندازِ خطابت میں عالمانہ رنگ پایا جاتا تھا اور وہ قرآن و حدیث کے حوالوں سے اپنی تقریر کو مزیّن کرتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ بھی تحریکِ پاکستان کے بڑے سرگرم کارکن اور قائدِ اعظم کے انتہائی مخلص اور جاں نثار ساتھیوں میں سے تھے۔ دکن کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں ان کا بڑا حصّہ تھا۔ اپنی خطابت کے زور پر وہ جلد ہی ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور اور مقبول ہو گئے۔ ان کا اندازِ خطابت دوسرے تمام رہنماؤں میں نمایاں اور انفرادیت کا حامل تھا۔ چونکہ وہ سراپا خلوص اور ایثار تھے۔ اس لیے ان کا ایک ایک لفظ پُر تاثیر اور سامعین کے دل میں گھر کرنے والا ہوتا تھا۔ میری عمر تو اتنی نہیں کہ میں ان کے سُننے والوں میں ہوتا مگر جن لوگوں نے ان کی تقریر سُنی ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کی تقریر میں روانی بھی بہت تھی اور موضوع کی مناسبت سے کبھی یہ روانی آتش فشاں لاوے کی طرح ہوتی تھی اور کبھی نرم روجوئے بار کی طرح، اُن کے لہجہ میں تلوار کی کاٹ تھی اور بیان میں جوشِ ایمانی کی فراوانی۔

تحریکِ پاکستان کے مقررین میں علامہ علاؤ الدین صدیقی کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قائدِ اعظم کے پیغام کو عام کرنے کے لیے انھوں نے ملک کے طول و عرض میں تقریریں کی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ ہمیشہ اتحادِ اسلامی کے لیے کوشاں رہے اور شیعہ سُنّی اجتماعات میں ان کے خطبے ہمیشہ اشتیاق سے سُنے گئے۔ الفاظ کی ادائیگی اور لہجے کے اُتار چڑھاؤ سے تقریر میں وہ بھی ایک خاص رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔

شیعہ مکتبِ فکر

فنِ خطابت میں شیعہ مکتبِ فکر کو خصوصی اہمیّت حاصل ہے کیونکہ یہ اسکول بنیادی طور پر خطابت

ہی کی مدد سے آگے بڑھا ہے اور خطابت کی جتنی مانگ، جتنی پہچان اور جتنی قدر یہاں ہے دوسری کسی جماعت میں نہیں۔ وہ لوگ جو سُنّی اور شیعہ دونوں نقطہ ہائے نظر کے اجتماعات میں شامل ہوتے رہے ہوں۔ وہ ان دونوں کے باہمی فرق سے بخوبی واقف ہیں۔ سُنّیوں کا اجتماع عام طور پر ایسا ہوتا ہے جیسے قبرستان میں اذان دی جا رہی ہو اور جواب میں "صدائے بر نخاست" کی کیفیت ہو۔ کبھی کبھی سنّیوں کے چُپ چاپ اور جذباتی طور پر سرد مہری کے اجتماعات کے متعلق میں کہا کرتا ہوں کہ لفظ سنّی شاید بنا ہی اس چیز سے ہے کہ یہ لوگ سُن سُن کر سُنّ ہو گئے ہیں اس لیے واعظ اور خطیب کے زورِ بیان اور جوشِ خطابت کی مناسب اور گرم جوشانہ انداز میں داد بھی نہیں دے سکتے اور جب واعظ خطیب یا شاعر کو اپنی گرمیٔ گفتار کی مناسب داد ہی نہ مل سکے تو اس پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جسے عرفی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

عرفی دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

سُنّیوں کے اجتماعات کے برعکس شیعہ اجتماع ایک زندہ اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں نہ صرف خطیب کے ہر خوب صورت فقرے کی داد دی جائے گی بلکہ عمدہ اور حسین قسم کے الفاظ و تراکیب پر بھی جزاک اللہ اور سبحان اللہ کے ڈونگرے برسائے جائیں گے۔ سامعین پوری طرح دادِ سخن دینے والے (Responsive) ہوں تو خطیب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور خطیب اور سامع کے درمیان ایک رشتۂ موانست قائم ہو جاتا ہے جو فنِ خطابت کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

شیعہ اجتماعات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہاں خطیبوں کی قدر افزائی صرف زبانی طور پر نہیں کی جاتی بلکہ مالی طور پر بھی ان کی بہت خدمت کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیعہ خطیب اور واعظ حضرات فکرِ معاش سے آزاد ہو جاتے ہیں اور خطابت، وعظ اور مجلس خوانی ان کا ہمہ وقتی پیشہ بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز پر پورا پورا وقت دیا جائے وہ اس سے یقیناً بہتر ہوگی جس پر ادھورا وقت اور ادھوری توجہ دی جائے۔

ہمارے برصغیر میں مرثیہ گوئی کی طرح شیعہ طرزِ وعظ و خطابت کا سب سے بڑا مرکز بھی لکھنؤ ہی رہا ہے۔ چنانچہ اس مکتبۂ فکر کے بہت سے خطیبوں اور واعظوں نے اس شہر میں نشو و نما پائی ہے۔ ان میں مولانا سبط حسن اور حکیم مرتضیٰ حسین بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں خطیبانہ عظمت اور شہرت میں بلند مقام پر فائز تھے۔ حکیم مرتضیٰ حسین خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھے۔ ان کے خاص موضوعات توحید اور معراج تھے جن پر وہ مجلس پڑھتے تھے اور لمبا اوقات چھ چھ گھنٹے بے تکان بولتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی وفات کو تقریباً بتیس برس ہو چکے ہیں۔

ان کے ہم عصر مولانا محمد حسین محققِ ہند لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے ان کے گھر کو مجتہد ہاؤس کہا جاتا تھا۔ مولانا لکھنؤ کے علاوہ اطرافِ ہند میں دُور دور جا کر مجلس پڑھتے تھے۔ بڑے پائے کے بزرگ اور خطیب تھے۔

اسی دور کے ایک اور مشہور واعظ شمس العلماء مولانا ناصر حسین تھے۔ واعظ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک منجھے ہوئے اہلِ قلم بھی تھے۔ ان کے والد گرامی جناب حامد حسین موسوی نے ایک کتاب بنام "کتاب الانوار" شروع کی تھی۔ انھوں نے تصنیف کے اس کام کو جاری رکھا اور اپنے والد بزرگوار کے کیے ہوئے کام پر بہت سی جلدوں میں اضافہ کیا ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سعید الملت سید محمد سعید نے بھی اسے آگے بڑھایا۔ اس وقت اس کتاب کی بتیس جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ سعید الملت کا انتقال آج سے کوئی دس برس پہلے ہُوا۔

شمس العلماء مولانا نجم الحسن بھی عالم مجتہد، پیش نماز اور واعظ تھے۔ وہ بھی لکھنؤ سے ابھرنے والے خطیبوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے ایک نواسے سید محمد رضی آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی پر ان کی تقاریر نشر ہوتی رہتی ہیں۔

علامہ باقر علی نجفی بھی لکھنؤ کے مشہور شیعہ عالمِ دین اور خطیب تھے۔ لیکن وہ تقسیم ہند سے پہلے پاکستان میں آباد ہو گئے تھے۔ میں جب میانوالی گورنمنٹ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا تو وہ وہاں اُردو اور فارسی کے مدرس تھے۔ اکثر اسکول کے بعد بھی ان کی مجالس میں مجھے بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان کی تقریر میں تفہیم اور

تعلیم کا رنگ نمایاں تھا اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے حضرت علامہ سے کافی فیض حاصل کیا ہے۔

علامہ سید محمد دہلوی بھی شیعہ علماء میں ایک قد آور خطیب تھے۔ انھوں نے بمبئی کی طرف خطابت اور مجالس خوانی میں زندگی کا ایک بڑا حصّہ گزارا۔ پھر پاکستان چلے آئے۔ پاکستان میں وہ شیعہ حضرات کے قائد تسلیم کیے جاتے تھے۔ تقریباً تین سال پہلے کراچی میں ان کا انتقال ہُوا۔

یو پی سے لاہور میں آنے والے علامہ حافظ کفایت حسین ایک نامور شیعہ عالم دین تھے وہ فلسفی خطیب اور واعظ تھے اور اپنے فن میں بڑے کامل۔ زندگی بھر انھیں وعظ و خطابت سے کام رہا۔

علامہ رشید ترابی اصلاً حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ کراچی میں سکونت پذیر ہُوئے۔ آج سے تھوڑا عرصہ پہلے تک سریر آرائے منبر تھے مجلس خوانی میں بڑے باکمال تھے۔ اندازِ بیان اتنا دلکش اور دل نشین تھا کہ لوگ گھنٹوں بیٹھے سنتے رہتے اور پھر بھی سیر نہ ہوتے تھے۔

حضرت علامہ جدید علوم سے بھی بہرہ ور تھے اس لیے ان کی تقریریں بڑی خیال انگیز ہوتی تھیں۔ وہ مذہب اور سائنس کے تقابل میں نہیں بلکہ باہمی تعاون اور تفاہم میں یقین رکھتے تھے۔ فقروں کی ادائیگی کا انداز اُن کا مخصوص تھا۔ اُس میں ہاتھوں کے اشاروں کی آمیزش اک عجب ماحول پیدا کر دیتی تھی۔ آج کئی شیعہ نوجوان ان کی آواز اور ان کے انداز کی نقالی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نقل نقل ہے اور اصل اصل۔

علامہ ابن حسن جارچوی مرحوم بھی پائے کے خطیب تھے اور دلِ درد مند کے مالک، قومی سیاست میں حصّہ لینے کی وجہ سے وہ بھی شیعہ اور سُنّی عوام میں یکساں مقبول تھے اپنی فقرہ بازی سے لوگوں کو ہنساتے بھی اور مصائب اہلِ بیت بیان کرنے پر آتے تو دل کھول کر رُلاتے بھی۔

مجھے ان تینوں بزرگوں کے ہمراہ مجالس کو خطاب کرنے اور ان کے خطبات حلاوت آمیز سننے اور ان سے محظوظ ہونے کے مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں۔

اس وقت شیعہ خطیبوں میں مظفّر علی شمسی اور سید اظہر حسین زیدی، علامہ نصیر الاجتہادی، علامہ ابن حسن نجفی اور علامہ عقیل ترابی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ مظفّر علی شمسی ایک سیاسی

لیڈر بھی ہیں اور بنیادی طور پر مجلس احرار کے مدرسہ خطابت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ خالص شیعی اجتماعات کے علاوہ عمومی اجتماعات میں بھی تقاریر کرتے اور داد و تحسین پاتے ہیں۔ سید اظہر حسین زیدی زبان کے خطیب ہیں اور وسیع مطالعہ کے ساتھ اپنے خطاب میں الفاظ کے ساتھ بڑی عمدگی سے کھیلتے ہیں اور سامعین ان کے اس انداز سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔

علامہ نصیر الاجتہادی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ تقسیم کے بعد سے پاکستان میں مقیم ہیں۔ واعظ بھی ہیں اور خطیب بھی، مقفیٰ اور مسجع الفاظ خوب استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی ایک تصنیف نہج الفصاحت قابلِ مطالعہ ہے۔

علامہ عقیل ترابی ۔ صحیح معنوں میں خلفِ رشید ہیں، اپنے لائق باپ علامہ رشید ترابی کے انداز میں بولتے ہیں۔

علامہ ابنِ حسن نجفی ایک صاحبِ علم مقرر ہیں اور علم اور جذبات کی آمیزش سے اپنے خطبے تیار کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی

بنیادی طور پر جماعت اسلامی کا مکتبۂ فکر خطیبانہ جوہر نہیں رکھتا جس طرح جماعت احرار خطابت کی وجہ سے مشہور ہوئی ہے اسی طرح جماعت اسلامی اپنے لٹریچر کی وجہ سے آگے بڑھی ہے۔ اس جماعت کے اکابر کی تقریریں خشک تحریروں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور ان تقریروں میں وہ اکثر اوقات ایسی ادق اور نامانوس اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جن سے سامعین بوریت محسوس کرتے ہیں۔

اس مکتبۂ فکر کے ایک معروف ادیب اور جماعت کی حد تک مشہور مقرر جناب نعیم صدیقی ہیں ایک بار موصوف کے فنِ تقریر پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے نہایت عمدہ اور موزوں تبصرہ کیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ۵۳ء میں ہم لوگ تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں لاہور سنٹرل جیل میں

نظربند تھے۔ ان ایام اسیری کے دوران کبھی کبھی مجلس شعر بھی آراستہ ہوتی تھی۔ شاہ جی اور اکابرین احرار دیوانی گھر میں تھے اور ہم لوگ ایک دوسرے احاطہ "بم کیس" میں۔ جمعہ کے جمعہ شاہ صاحب ہمارے ہاں تشریف لاتے تو مجھے شعر سنانے کے لیے کہا کرتے اور دل کھول کر داد بھی دیتے۔ ایک ایسی ہی محفل میں نعیم صدیقی کا تعارف ان سے کرایا گیا تو فرمانے لگے۔ "اچھا آپ ہیں نعیم صدیقی! خوب! کچھ تعارف تو آپ سے پہلے بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک بار میں قاسم باغ کے قریب سے گزر رہا تھا، وہاں کوئی جلسہ ہو رہا تھا جس میں ایک تقریر جاری تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ مشین نہ تھی آپ تھے۔"

مولانا مودودی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا مودودی کی تقاریر سکون سے سنی جاتی ہیں لیکن اس چیز میں ان کے کسی کمالِ خطابت کو دخل نہیں۔ ان کی تقریر بھی ایک مقالہ ہوتی ہے جس میں وہ نہایت خشک اور جذبات سے عاری انداز اختیار کر کے تقریر کو اچھا خاصا بوجھل بنا لیتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اوسط درجے کے سامع کے لیے آسانی سے قابلِ فہم نہیں ہوتا۔ کوئی اور شخص اس قسم کی تقریر کرے تو شاید مجمع تھوڑی دیر کے بعد بھاگ نکلے۔ مولانا کی علمی شہرت اور اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ان کا احترام دو ایسے اہم عوامل ہیں جن کے بل پر وہ جلسوں میں سُنے جاتے ہیں۔

جماعت اسلامی والے عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے خطابت میں ایک نیا انداز اور نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خطابت کے مسلّمہ قواعد اور اصولوں کے معیار تک اپنے نطق و بیان کو پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے خطابت کو ایک نیا رنگ اور اسلوب دیا ہے "محض انگور کھٹے ہیں" کے مترادف ہے۔

واعظین کا سلسلہ

خطیبوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں علما کا ایک ایسا سلسلہ بھی چلتا ہے جسے ہم واعظین کا سلسلہ

کہتے ہیں۔ وعظ خطابت ہی کی ایک شاخ ہے اور ہر واعظ خطیب ہوتا ہے مگر ہر خطیب کو واعظ نہیں کہہ سکتے۔ وعظ میں عام طور پر دینی مسائل کا بیان ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سامعین کو نہایت سادہ الفاظ اور عام فہم انداز میں اوامر و نواہی سے آگاہ کیا جاتا ہے اور انھیں نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

واعظوں کے لیے خوش الحان ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ وہ دورانِ وعظ جو آیات قرآنی تلاوت کرتے ہیں یا احادیث رسول سناتے ہیں ان کی قرأت نہایت خوش الحانی سے کرتے ہیں۔ مثنوی مولینا روم میں سے چیدہ چیدہ اشعار بھی پڑھتے ہیں جس کی ایک مخصوص لے ہوتی ہے۔ نعتیہ اشعار بھی بکثرت سناتے ہیں۔ اور علاقائی زبانوں کے عشق و معرفت کے اشعار بھی پڑھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ پند و نصائح کے لیے نہایت دل کش پیرایہ اختیار کرتے ہیں جس سے لوگ یقیناً متاثر ہوتے ہیں۔

پرانے زمانے میں جس طرح مفتی اور صدر الصدور کے عہدے ہوا کرتے تھے اسی طرح بعض مسلم ممالک میں سرکاری واعظ بھی ہوتے تھے۔ پرانے وقتوں میں ایک صاحب علی بن حسین الواعظ الکاشفی بڑے مشہور واعظ گزرے ہیں۔ مولینا نورالدین عبدالرحمٰن جامی بھی اونچے درجے کے واعظ تھے۔ اور حضرت امام غزالی کے وعظوں کا ایک مجموعہ ترمجالس غزالی کے نام سے آج بھی دستیاب ہے۔ مولینا جلال الدین رومی بھی جب تک شمس تبریزؒ کی محبت میں گرفتار نہ ہوئے تھے وعظ ہی کہا کرتے تھے۔

ہمارے معاشرے میں بھی اچھے واعظ ہمیشہ موجود رہے اور اب بھی موجود ہیں۔ ان میں مولینا اشرف علی تھانویؒ بڑے بلند پایہ واعظ ہوئے ہیں۔ علمی اعتبار سے مولانا کو بہت اونچا مقام حاصل تھا اور ان کے مواعظ حسنہ میں ان کا یہ علمی مقام خوب خوب منعکس ہوتا تھا۔ ان کے کئی کئی گھنٹوں کے ایک ایک وعظ میں سینکڑوں ہزاروں کتابوں کا عطر سمٹ آتا ہے اور اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کے ایک ایک وعظ سے دورِ جدید کے مصنفین کئی کئی کتابیں لکھ سکتے ہیں۔

بریلوی مکتبِ فکر کے امام مولینا احمد رضا خاں بریلوی بھی بڑے اچھے واعظ تھے۔ ان کی امتیازی خصوصیت ان کا عشقِ رسول ہے جس میں سرتاپا ڈوبے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کا نعتیہ کلام بھی

سوز و گداز کی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اور مذہبی تقریبات میں بڑے ذوق و شوق اور احترام سے پڑھا جاتا ہے۔

کشمیر کے میر محمد یوسف جو واعظ کشمیر کہلاتے تھے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے کشمیری مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے مسندِ وعظ سے پوری طرح کام لیا تھا۔ میرِ واعظ کا خطاب ان کا خاندانی اعزاز ہے۔

موجودہ دور میں مولانا احتشام الحق تھانوی صفِ اول کے واعظ ہیں۔ ان کا قرآن خوانی کا انداز بہت دل کش اور منفرد ہے۔ قرآن حکیم کے مطالب و معانی اور اسرار و رموز کے بیان میں وہ اپنے سامعین کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر بات کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے ان کا درسِ قرآن باقاعدگی سے براڈکاسٹ کیا جاتا ہے اور ملک بھر میں بڑے ذوق و شوق سے سُنا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ اس وقت صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا غلام اللہ خاں، سید عنایت اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد اجمل، مولینا محمد بخش مسلم، مولینا محمد شفیع اوکاڑوی، مولینا ضیاء القاسمی، مولانا عبدالقادر آزاد، مولینا عبدالشکور دین پوری مانے ہوئے واعظ ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ بھی ملک میں بہت سے دوسرے واعظانِ کرام شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں لیکن یہاں ان کے تذکرے کی گنجائش نہیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح

جس طرح برصغیر کی سیاسی تاریخ قائدِ اعظم کے تفصیلی تذکرے کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس ملک کے تذکرہ خطابت میں بھی ان کا ذکر انتہائی اہم ہے۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ وہ برِصغیر میں مسلمان قوم کے عظیم اور انتہائی سربرآوردہ رہنما دس کروڑ مسلمانوں کے نجات دہندہ اور پاکستانی قوم کے باعظمت باپ ہیں۔ لیکن اس کا احساس شاید کم لوگوں کو ہے کہ ایک انتہائی بلند کردار، راست گفتار اور عظیم سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے پارلیمانی مقرر بھی تھے۔ کوئی شک نہیں کہ

انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن بنوا کر ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس نے انھیں بقائے دوام کی سند عطا کی ہے۔ لیکن یہ کارنامہ جہاں بڑی حد تک ان کی ایمانی قوت اور حسنِ تدبر کا نتیجہ ہے وہاں اس کے لیے ان کی مہارتِ تقریر کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا پڑے گا۔ تعلیم کے دوران وہ برطانوی پارلیمنٹ میں مسٹر گلیڈ سٹون، مسٹر مورلے، مسٹر چیمبرلین اور دوسرے برطانوی مدبرین کی تقاریر بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتے تھے اور ان کا ذہن اندر ہی اندر آئینی مباحثوں اور سیاسی تقریروں کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں وہ ہندوستان کی مرکزی کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۴۷ء تک متواتر منتخب ہوتے رہے۔ پارلیمانی بحث مباحثوں میں کوئی شخص ان کے مقابل کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اسمبلی میں ان کی تقریریں جوش اور ہوش مندی کا حسین امتزاج ہوا کرتی تھیں۔ وہ جس موضوع پر بولنے کا ارادہ کرتے اس کے متعلق پوری تیاری کر کے اسمبلی میں جایا کرتے تھے۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ان کا اندازِ تقریر نہایت واضح اور غیر مبہم تھا۔ وہ نہ بہت تیز بولتے تھے اور نہ بہت آہستہ۔ اور نہ بہت اونچی اور نہ بہت دھیمی آواز میں۔ ان کی تقریر ولولہ انگیز ہوتی تھی لیکن اس کے اندر ٹھوس منطقی استدلال ہوتا تھا۔ اور ہر چند کہ ان کی ہر تقریر میں جوش اور جذبہ پایا جاتا تھا لیکن جذبات کو مشتعل کرنے والی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔

وہ الفاظ کے استعمال پر پوری طرح قادر تھے اور اپنی تقریر میں ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی صرف نہ کرتے تھے۔ اسمبلی کے طویل زمانۂ رکنیت میں انھوں نے جو تقریریں کی ہیں وہ ان کی غیر معمولی قانونی قابلیت اور آئینی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

پارلیمانی خطابت سے گزر کر جب ہم عوامی جلسوں میں ان کی تقریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں بھی ان کی عظمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں وہ عام طور پر پہلے سے تیار کیے ہوئے خطبات سے کام لیتے تھے، لیکن بسا اوقات انھیں فی البدیہہ تقریریں بھی کرنا پڑتی تھیں اور یہ فی البدیہہ تقریریں کبھی کبھی بہت طویل بھی ہوتی تھیں لیکن کیا مجال جو کہیں ربط ٹوٹے یا ذرہ بھر جھول آئے۔ لوگ ان کی تقریروں سے مسحور ہو جایا کرتے تھے اور وہ لوگ بھی جو ان کی

تقریر سمجھ نہ سکتے تھے ان کے لب ولہجہ اور اندازِ مخاطبت سے ایسے متاثر ہوتے کہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھے نہایت عقیدت اور احترام سے ان کی تقریر سنتے رہتے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو

جناب ذوالفقار علی بھٹو کی خطابت کے بارے میں کچھ لکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خوشامد اور تملق پر محمول کیا جائے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جس طرح وہ دنیائے سیاست میں اپنا ایک جداگانہ اسلوب رکھتے ہیں اسی طرح خطابت میں بھی ان کا مخصوص اور منفرد انداز ہے۔ مجھے ان کے ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی کی جدّوجہد کے زمانے میں کئی جلسوں سے خطاب کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی ہر تقریر کے بعد میں نے ان کے اندازِ خطابت اور مواد سے بہت کچھ حاصل کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ میں یہ استکبارِ نفس کبھی پیدا نہیں ہوا کہ ـــــــ "مجھ سا ہو تو سامنے آئے"۔ لیکن یہ حزن ہے کہ بہت کم خطیبوں کی تقریر سننے کی آرزو میرے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بطور سامع میں انہی جلسوں میں عام طور پر شریک رہا ہوں۔ جن میں دوسرے مقررین کے ساتھ مجھے بھی بولنا تھا۔ جو تقریریں فنی اور علمی لحاظ سے دقیع نہ ہوں ان کا سننا میرے لیے بڑا صبر طلب ہے۔ بھٹو صاحب ان خطیبوں میں سرِفہرست ہیں جن کے سامعین میں شامل ہو کر مجھے ہمیشہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔

انگریزی ان کا اصل میدان ہے اور اس میں انہوں نے بڑے بڑوں سے لوہا منوایا ہے وہ جب انگریزی بولتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ مزاد خان کا ایک دریا موجزن ہے۔ وہ ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی۔ چٹکی لیتے ہیں۔ نشتر بھی لگاتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں جب امریکی وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کسنجر پاکستان آئے تو بھٹو صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک ضیافت دی۔ تقریر حسبِ معمول لکھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایسے مواقع پر ایک ایک لفظ تول کر بولا جاتا ہے مگر انھوں نے لکھی ہوئی تقریر جیب میں ہی رہنے دی اور اپنے

مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں فی البدیہہ تقریر کی۔ اس تقریر کی برجستگی ادبیت، طنز وظرافت اور فصاحت وبلاغت کا اثر یہ تھا کہ کیسنجر جیسے عالمی مدبّر کو بھی برسرِ محفل یہ اعتراف کرنا پڑا کہ بھٹو صاحب کی تقریر میں جو روانی اور جولانی ہے میں اس کا جواب لانے سے قاصر ہوں۔ اُس دن سبھی حاضرین نے محسوس کیا کہ بھٹو اور کیسنجر کی خطابت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بھٹو صاحب کی انگریزی تقریروں کا مجموعہ "Politics of the People" تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور اس میں ان کے زمانۂ طالب علمی سے لے کر صدارت کے زمانے تک کی تمام تقاریر شامل ہیں۔ جو لوگ خطابت میں گہرائی اور گیرائی کی حقیقی شان دیکھنا چاہتے ہوں اُن کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

انگریزی کے بعد روانی کے لحاظ سے ان کی تقریروں میں دوسرا نمبر سندھی کا ہے۔ سندھی اُن کی مادری زبان ہے۔ مگر انگریزی پڑھے لکھے لوگ اور خاص طور پر یورپ میں تعلیم پانے والے لوگ اپنی مادری زبان بھول جاتے ہیں۔ کچھ اسے بولنا بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں اور کچھ کا حافظہ ہی انگریزی زبان سے اتنا مرعوب ہو جاتا ہے کہ وہ کسی دیسی زبان کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں پاتے، مگر بھٹو صاحب کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اپنی مادری زبان سے محبت رکھتے ہیں۔ اس پر فخر کرتے ہیں اور جن اصحاب نے سندھی زبان کے ذخیرۂ علم وادب اور ارتقا کا کوئی سرسری بھی جائزہ لیا ہے وہ جانتے ہیں کہ سندھی ہے بھی ایک قابلِ فخر زبان۔ سندھ کے اکثر علاقوں میں بھٹو صاحب اُردو کے علاوہ سندھی میں خطاب کرتے ہیں۔ میں نے ابھی حال ہی لاڑکانہ میں ان کی ایک سندھی تقریر سنی۔ لاڑکانہ کے شہریوں نے ان کے اعزاز میں ایک عظیم استقبالیہ کا انتظام کیا تھا اور یہ تقریر سپاس نامے کے جواب میں کی گئی تھی۔ اس تقریر میں بھی انگریزی سے کم روانی نہ تھی۔ مزید براں یہ اتنی سادہ اور عام فہم تھی کہ کوئی بھی اُردو بولنے والا اسے بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے کسی یورپ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ وزیرِاعظم کی بجائے سندھی کا ایک عوامی خطیب لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہو۔ جب بھٹو صاحب سندھی زبان میں تقریر کرتے ہیں تو اس وقت کوئی اندازہ نہیں

کر سکتا کہ انگریزی زبان کا یہ وہ بلند پایہ مقرر ہے جس نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں سلامتی کونسل کے اجلاس میں ایسی تقریریں کی ہیں جو عالمی اور بین الاقوامی خطابت کی تاریخ میں ہمیشہ شاندار لفظوں میں جگہ پائیں گی۔

بھٹو صاحب صدر ایوب کی حکومت سے علیحدہ ہوئے اور انھوں نے سیاسی میدان میں نئی جدّ وجہد شروع کی تو بڑا نے سیاست دانوں کا خیال یہ تھا کہ وہ پاکستانی عوام کے قائد نہیں بن سکیں گے اُن کے نزدیک اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ وہ زیادہ اچھی اُردو نہیں جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ موچی دروازہ، چوک یادگار، نشتر پارک اور لیاقت باغ میں انگریزی کو ذریعۂ اظہار نہیں بنایا جا سکتا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے میں ان کی یہ خوش فہمی دُور ہو گئی۔ بھٹو صاحب اُردو میں تقریریں کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دلوں کی دنیا پر چھا گئے۔ آہستہ آہستہ انھیں اُردو زبان پر بھی عبور حاصل ہوتا چلا گیا۔ انھوں نے اِس سلسلے میں بڑی محنت سے کام لیا۔ مصروفیات کے اژدہام کے باوجود اُردو سیکھنے کے لیے وقت نکالا۔ بول چال کی مشق کی۔ اپنے قریبی ساتھیوں سے الفاظ اور اصطلاحوں کے صحیح تلفظ پر بحث و تمحیص کی اور اتنا ذخیرۂ الفاظ جمع کر لیا کہ اب وہ دو دو، ڈھائی ڈھائی گھنٹے بے تکان اردو زبان میں خطاب کرتے ہیں اور انھیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اردو زبان میں کبھی کبھی اُن سے تذکیر و تانیث یا تلفظ یا محلِ استعمال کی کوئی نہ کوئی فروگزاشت اب بھی ہو جاتی ہے مگر وہ ایسی معصومانہ ہوتی ہے کہ بھونڈی لگنے کی بجائے بھلی لگتی ہے اور عوام اس سے اُلٹا محظوظ ہوتے ہیں۔

دنیا کے اکثر عظیم خطیبوں میں ایک چیز مشترک ہے وہ دل کش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان کا اسٹائل جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ بھٹو صاحب کی جواں سالی، خوش لباسی اور خوب صورتی سامعین کو پہلی نظر ہی میں متاثر کر لیتی ہے۔ پھر جب وہ اسٹیج پر آ کر اپنے مخصوص انداز میں عوام کی طرف اپنا ہاتھ لہراتے ہیں اور تالی بجاتے ہیں تو پورا مجمع ان کی طرف ایک اکائی بن کر متوجہ ہو جاتا ہے۔ دورانِ تقریر میں کبھی کبھی وہ جوش میں آ کر کوٹ اُتار دیتے ہیں

یا ایک پورے دائرے کا چکر لگاتے ہیں۔ مخالفین کا مذاق اُڑاتے ہوئے دل چسپ انداز میں اُن کی نقل اُتارتے ہیں تو سامعین بے اختیار داد دیتے اور مقرر کے جذبات سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس دور میں ان سے بڑا کوئی دوسرا عوامی مقرر نہیں مگر وہ صرف عوامی مقرر ہی نہیں ہیں۔ وہ بیک وقت دانشوروں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا دل بھی مٹھی میں لے سکتے ہیں اور اَن پڑھ دیہاتی مجمع کو مسحّر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

بھٹو صاحب جس طرح خود نوجوان ہیں اسی طرح اُن کی پارٹی بھی نوخیز اور نو عمر ہے۔ قدرتاً چند سالوں میں اس کے اندر نامور خطیبوں کا پیدا ہونا ایک امر محال ہے مگر اُن بیسیوں نوجوان کارکنوں سے قطع نظر جو اپنے مقصد سے سرشار ہو کر اپنے لیے خطابت کی نئی راہیں تراش رہے ہیں، چند نام ایسے ہیں جن سے مستقبل کی خطابت کی اہم توقعات وابستہ ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک جناب حفیظ پیرزادہ ہیں جو تھوڑے ہی عرصے میں ایک اچھے پارلیمانی مقرر کی حیثیت سے اُبھرے ہیں اور دوسرے جناب حنیف رامے ہیں جن کی تقریریں ادب و دانش کا عمدہ امتزاج پیش کرتی ہیں۔ ملک غلام مصطفےٰ کھر اور جناب ممتاز بھٹو بھی اُبھرتے ہوئے عوامی خطیب ہیں۔ کھر جناب بھٹو کے انداز میں بولتے ہیں اور ممتاز صاحب انگریزی اور سندھی میں تقریر کرتے ہیں۔

اندازِ بیاں

اب ٹھیک طرح سے یاد نہیں مَیں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا یا پانچویں میں کہ ایک مرتبہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز جن کا نام غالباً قاضی عبدالرحمٰن تھا، ہمارے اسکول میں تشریف لائے۔ صبح اسمبلی میں انھوں نے یک لخت بغیر کسی پیشگی نوٹس کے یہ خواہش ظاہر کی کہ طلبا میں سے کوئی لڑکا آکر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پر تقریر کرے۔ چند لمحوں کے لیے ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ بھی پریشان ہو گئے۔ اس موضوع پر

کسی طالب علم سے انھوں نے تقریر تیار نہ کرائی تھی اور مجھ سمیت بچے اگر کبھی کبھی اسمبلی میں بولتے بھی تھے تو رٹی رٹائی تقریروں کے علاوہ ان کے پاس سرمایۂ گفتار نہ تھا۔ ایک دو منٹ کی خاموشی کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے آواز دی اور کہا کہ تقریر کرو۔ یہ میری زندگی میں تیاری کے بغیر فی البدیہہ تقریر کرنے کا پہلا موقع تھا۔ اس دن تقریباً آدھ گھنٹہ بولا ہوں گا۔ "جنگِ بدر" تک پہنچا تو ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے ایک غلطی کی اصلاح کی اور شاباش دے کر تقریر ختم کرنے کا حکم دیا۔ یاد پڑتا ہے کہ کچھ نقد انعام بھی دیا تھا۔

اُس زمانے میں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ ہم چند طالب علم دوستوں نے مل کر "بچہ مسلم لیگ" قائم کی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ "مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن" بن گئی۔ اس کے جلسے ہونے لگے۔ کبھی اسکول میں تو کبھی کسی مسجد میں۔ میں لاہور آگیا تو "سہ روزہ کوثر" اور بعد میں روزنامہ "تسنیم" کے ادارے میں شامل ہوگیا۔ یہاں لوہاری دروازے کے اندر "مسجد پٹولیاں" کے نام سے ایک مشہور مسجد ہے یہاں کبھی کبھی جُمعہ کا خطبہ دینے لگا۔ آہستہ آہستہ شہر کی سیاسی اور علمی اور ادبی تقریبات میں شرکت کا موقع ملتا چلا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران میں مارشل لا میں گرفتار ہوگیا۔ رہا ہُوا تو چند دنوں کے بعد "سیفٹی ایکٹ" میں پکڑ لیا گیا۔ اس زمانۂ اسارت میں مجھے دل جمعی سے مُطالعہ کا موقع ملا۔ مشہور عالمِ دین مولٰینا امین احسن اصلاحی قرآن حکیم اور حجۃ اللہ البالغہ" پڑھانے لگے۔ مشہور اہلِ حدیث عالم محمد اسمٰعیل آف گوجرانوالہ حدیث کا درس دیتے۔ پھر یہیں پہلی مرتبہ سیّد عطاء اللہ شاہ بُخاری اور بعض دوسرے بلند پایہ خطیبوں سے ملاقاتیں رہیں اور اس طرح قید کے اِن دس مہینوں نے پختگی کے اعتبار سے مجھے دس سال آگے بڑھا دیا۔ رہائی کے بعد میں نے جامع مسجد شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں جمعہ کا خطاب شروع کیا جو کم و بیش بارہ سال جاری رہا۔ میری کوشش یہ تھی کہ میں ہر جُمعہ کسی نئے موضوع پر اظہارِ خیال کروں۔ اِس مقصد کے لیے میں تین دِن پہلے سے تیاری شروع کرتا۔ پیشِ نظر موضوع پر مخالف اور موافق ہر کتاب دیکھتا۔ باقاعدہ نوٹس لیتا اور اس طرح اپنے

ذخیرۂ علمی کو بڑھانے کی کوشش کرتا۔ اسی زمانے میں مخلوط انتخاب کے خلاف اور جداگانہ قومیت کے تصورات کو اجاگر کرنے کے لیے ملک کی گیارہ سیاسی اور دینی جماعتوں نے "اسلامی محاذ" کے نام سے ایک مشترکہ جماعت قائم کی تو میں اس کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ اس محاذ کے زیرِ اہتمام موچی دروازہ میں تو اکثر عظیم الشان جلسے ہوتے ہی تھے آہستہ آہستہ ملک بھر میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوتی چلی گئیں اور اس طرح میں پشاور سے لے کر کراچی تک جگہ جگہ عام جلسوں سے خطاب کرتا رہا۔

جو لوگ مجھ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دینی مزاج کے اعتبار سے عشقِ رسول میرا مذہب ہے اور اتحادِ اسلامی میرا مسلک ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں اس زمانہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے باوجود سینکڑوں مرتبہ ملک کے طول و عرض میں ہونے والی سیرت کانفرنسوں اور شیعہ سُنّی مشترک اجتماعات میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ اس دور کا شاید ہی کوئی نامور سیاسی لیڈر، عالمِ دین یا واعظ ہو جس کے ساتھ میں نے کسی نہ کسی جلسے سے خطاب نہ کیا ہو۔ اور اس طرح مجھے اس کے اندازِ تقریر کا مطالعہ کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ جماعت اسلامی کے بعد کئی سال میں سیاست سے الگ تھلگ رہا۔ ۱۹۶۹ء سے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوامی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا اور اس زمانے میں بھی بیسیوں تقریریں کیں۔ اب پلٹ کر ماضی کے سلسلے کو دیکھتا ہوں تو اب تک جتنی تقریریں کر چکا ہوں۔ ان کا شمار مشکل نظر آتا ہے۔ تاہم یہ عدد ہزاروں میں تو ضرور ہو گا۔

میں نے اپنے تجربے کی رُو سے خطابت کے سلسلے میں جو چند اہم باتیں نوٹ کی ہیں وہ میں ذیل میں قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کرتا ہوں۔

میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ جب میں نے لاہور میں خطبۂ جمعہ دینا شروع کیا تو میں موضوع کے انتخاب کے بعد تین دن اس کے لیے مطالعہ کرتا۔ مخالف اور موافق کتابیں دیکھتا۔ ان سے ضروری یادداشتیں مرتب کرتا پھر تقریر کا خاکہ بناتا، کہاں سے ابتدا کرنی ہے کہاں پر

انتہا۔ شروع کے ایام میں تو اکثر تقریریں لفظ بہ لفظ ہی لکھ لیتا اور چند ابتدائی جلسوں میں تو مجھے یاد ہے کہ میں نے آدھ آدھ پون پون گھنٹے کی تقریر پہلے لکھی ہے اور پھر ریہرسل کے بعد اسے لفظ بہ لفظ یاد کیا ہے ایسے کہ تقریر کرتے وقت ایک لفظ بھی مسودے کا چھوٹنے نہیں پایا۔ گو ابتدائی مشق کے لیے یہ ضروری ہے مگر ایسا انداز مصنوعی ہوتا ہے اس میں اثر پیدا نہیں ہو سکتا آہستہ آہستہ میں اسے ترک کرتا چلا گیا۔

اکثر مقررین تقریر کرتے وقت اپنے سامنے نوٹس رکھتے ہیں اور وقفے وقفے کے بعد اس کی ورق گردانی کر کے سلسلۂ تقریر جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں میرے نزدیک یہ طریقِ کار بھی سامعین کو متاثر نہیں کرتا۔ ایک اچھے مقرر کے لیے حافظ کو جلا دینا ایک بنیادی ضرورت ہے۔

جہاں مطالعہ کی وسعت تقریر کے لیے ضروری شرط ہے۔ وہاں تقریر کی تاثر آفرینی کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ خود خطیب جس بات کو پیش کر رہا ہے اس پر وہ کامل یقین بھی رکھتا ہو۔ جس قدر اس کا عقیدہ (Conviction) مضبوط ہوگا اسی قدر وہ سننے والوں کو بھی متاثر کر سکے گا۔ اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو بات وہ دلوں میں اتارنا چاہتا ہے اس پر کیا کیا اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ اس کی مخالفت کے امکانی دلائل کیا ہیں۔ تاکہ وہ تقریر میں ان سب کا توڑ بھی پیش کر سکے۔

مطالعہ کی وسعت کی ابھی اوپر میں نے بات کی ہے۔ یہ مطالعہ صرف تقریر کی تیاری کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ ایک خطیب کا ذوقِ مطالعہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ مطالعہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی میں شمار کرنے لگے اور اس کا ایک ایک فارغ لمحہ کتابوں کی صحبت میں بسر ہو۔

خطابت کے لیے چونکہ زبان کی صحت شرطِ اول ہے اس لیے خطیب جس زبان میں کلام کرنا چاہتا ہے اسے اس زبان پر بھی کامل عبور ہونا چاہیے۔ اس کا تمام جدید و قدیم ذخیرۂ ادب اس کی نگاہ میں ہو۔ میں نے بہت سے مشہور مقررین کو دیکھا ہے کہ وہ اشعار تک

غلط پڑھتے ہیں اور اِس طرح اُن کی تمام علمیت اور فضیلت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور سخن شناس لوگ اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ شخص جو ادبی ذوق کی لطافت سے مالا مال نہیں اچھا خطیب نہیں ہو سکتا۔ جتنے بھی بڑے خطیب گزرے ہیں اُن سب میں یہ ذوق بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر بعض دوسری خوبیوں کے باعث اس کمی کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی مُقرّر دادِ خطابت دینا چاہتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ دورانِ تقریر اشعار بھی استعمال کرے۔

ایک اچھے مقرر کے لیے مضحکہ خیز لباس، تکیہ کلام، غیر ضروری تکرار اور سوقیانہ اندازِ بیان سے اجتناب بہت ضروری ہے۔

ایک اچھا مقرر اپنے معیارِ خطابت کے سلسلے میں کبھی قناعت پسند نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ ہر تقریر کے بعد اپنا ناقدانہ جائزہ بھی لیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بڑے بڑے خطیب عمر کے آخری مرحلے میں بھی اسٹیج کے خوف (Stage fear) میں مبتلا رہے۔ یہ خوف انھیں تیاری پر ابھارتا اور تقریر کو بہتر بنانے میں مدد دیتا۔

ایک اچھے خطیب کی قوتِ مشاہدہ بھی بہت تیز ہوتی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش ہونے والے واقعات کو گہری نظر سے دیکھتا، ان کا تجزیہ کرتا اور مناسب وقت پر انھیں استعمال کرنے کے لیے ذخیرہ کرتا چلا جاتا ہے۔ روزمرہ کے معاملات کو بے حسی سے دیکھنے والا کبھی بڑا خطیب نہیں ہو سکتا۔

اچھی تقریر کے لیے صحتِ تلفظ ایک اہم تقاضا ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں نے سیرت کے موضوعات پر ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے تقریر کی ہے اور اس اثنا میں کبھی کوئی لفظ پر تول کر میرے سامنے آگیا ہے کہ اسے استعمال کروں مگر مجھے یہ تسلی نہیں ہوئی کہ اس کا حقیقی تلفظ کیا ہے۔ یہ زیر کے ساتھ ہے یا زبر اور پیش کے ساتھ ہے تو میں نے اس شک کی بنا پر اسے استعمال نہیں کیا اور اس کی جگہ اُسی سے ملتا جلتا کوئی دوسرا لفظ استعمال کر لیا ہے۔ بعد میں

ہمیشہ ایسے لفظوں کے لیے میں نے لغت کی ورق گردانی کی۔ اہلِ زبان سے پوچھا اور جب مکمل اطمینان ہوگیا پھر کہیں جاکر اسے اپنے ذخیرۂ لفظی میں جمع کیا۔

ایک اچھا مقرر ہمیشہ تقریر سے پہلے خیالات کے ہجوم کو ترتیب کے ایک خاص نظم میں منضبط کردیتا ہے۔ میں نے ہمیشہ طویل سے طویل تقریر کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کی ہے۔ آغاز اور اختتام کے علاوہ درمیان کی تمام کڑیاں بھی پہلے سے میرے ذہن میں ہوتی ہیں۔ مجھے کہاں سے ہوکر کدھر جانا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات مجمع کے تیور دیکھ کر سامعین کی پیشانیوں سے بھی موضوع چُننے پڑتے ہیں، یا اچانک پیدا ہو جانے والی صُورتِ حال کو بھی خطابت کا نقطہ بنانا پڑتا ہے۔ مگر عام طور پر پیشگی ترتیب مُفید اور موثر ثابت ہوتی ہے۔

کچھ لوگ مشہور مقررین کا رنگ اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسی طرح کا لباس، وہی وضع قطع، ویسے ہی حرکات وسکنات، اسی طرح کا آواز میں اُتار چڑھاؤ اور ویسی ہی شعر خوانی ___ مگر نقالی سے کبھی کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اقبال کی یہ نصیحت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

اکثر مقررین تقریر کے دوران بار بار پانی پیتے ہیں۔ اس سے سامعین کے ساتھ ان کا ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ بظاہر کتنی چھوٹی بات کیوں نہ ہو مگر میں نے اسے ہمیشہ مُضر پایا ہے۔ اسی طرح اسٹیج کو زیادہ بلند نہیں ہونا چاہیے۔ نہ اسٹیج اور حاضرین کے درمیان فاصلہ مناسب ہوتا ہے۔ جس قدر سامعین مقرر کو اپنے میں سے سمجھیں گے اور اس کے اور اپنے درمیان انھیں قرب کا احساس ہوگا اسی قدر زیادہ مقرر کو ابلاغ میں آسانی ہوگی۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اپنی تمام تر خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود میں نے دو باتوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے نہ تو میں کبھی احساسِ برتری میں مُبتلا ہُوا ہوں اور نہ میں نے کبھی غیر ضروری عجز سے کام لیا

ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے نہ بے جا تعریف سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور نہ بغض اور حسد پر مبنی تنقیص نے مجھے احساس کمتری کا شکار کیا ہے۔ میں جو کچھ ہوں بحمد اللہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ اپنی خامیوں سے بھی آگاہ ہوں اور اپنی خوبیوں کا بھی مجھے احساس ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خامیاں میری اپنی پیدا کردہ ہیں اور خوبیاں میرے رب کی دین ہیں۔ خطابت میں بھی مجھے کسی مقام کا دعوےٰ نہیں۔ مگر چونکہ سالہا سال سے اس میدان میں ہوں۔ دوستوں کا اصرار تھا کہ اپنی تقریروں کا ایک مجموعہ بھی شائع کروں اور اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھوں، جس سے خطابت کی اہمیت، مشہور خطیبوں اور خطابت کے اصول و قواعد بیک نگاہ سامنے آجائیں۔ اپنی تقریروں کی تلاش کی تو صرف قریب کے زمانے کی کچھ تقریریں ہی دستیاب ہوسکیں۔ جنہیں ٹیپ سے اُتار کر لفظ بہ لفظ پیش کردیا گیا ہے۔ یوں تو میری بیسیوں تقریریں کم و بیش تمام بڑے شہروں میں مختلف لوگوں کے پاس محفوظ ہیں مگر ان کی تلاش اور ترتیب و تدوین میں بڑا وقت درکار تھا۔ ناچار آسانی سے ہاتھ آنے والی تقریروں پر اکتفا کرنا پڑا۔ مگر تقریریں کسی نہ کسی حد تک یہ بھی نمائندہ ہیں۔ ان میں ادبی، سیاسی، دینی، علمی اور پارلیمانی ہر انداز کی تقریر موجود ہے دو تین خطبات جمعہ بھی ہیں۔ ہر تقریر کے شروع میں قارئین کی سہولت کے لیے مختصر لفظوں میں وہ فضا بھی محفوظ کردی گئی ہے جس میں وہ تقریر ہوئی تھی۔

مجھے امید ہے کہ اہلِ نظر اس حقیر کاوش کو بہ نظر استحسان دیکھیں گے۔

کوثر نیازی

اسلام آباد۔ ۱۵ جولائی ۱۹۷۵ء

فنِ تقریر کے موضوع پر
چند اہم کتابوں کی تلخیص

(۱) گفتگو اور تقریر کا فن

ڈیل کارنیگی

(۲) پرنسپلز اینڈ ٹائپس آف سپیچ

ایلن - ایچ - منرو

(۳) سپیچ میکنگ پرنسپلز اینڈ پریکٹسز

ولیم - این - برگنس
رے - کیسز - ایل

(۴) پٹ مینس ریڈی سپیچ میکر

ایڈون ہملن کار

(۱) کامیاب تقریر کے چار لوازم

۱: مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے آغاز

۲: موضوع کے متعلق مکمل علم

۳: مکمل خود اعتمادی سے کام لینا

۴: مشق۔ مشق۔ مشق

تقریر کی صحیح تیاری کا طریقہ

۱:۔ گہرا غور و خوض (حضرت مسیحؑ پہاڑی کے وعظ سے پہلے چالیس روز تک جنگل میں سوچ بچار کرتے رہے۔)

۲: متعلقہ مواد کا گہرا مطالعہ (ریڈرز گائیڈ ٹو پیریوڈیکل لٹریچر سے مدد لے کر کتب کا انتخاب۔ انسائیکلوپیڈیا)

۳: بہترین خیالات کا انتخاب (ایک سو خیالات جمع کریں ان میں سے نوّے خیالات ضائع کر دیں۔ مواد اور مقررہ وقت کا خیال رکھیں)

۴: تقریر کا خاکہ تیار کرنا (کوئی عقل مند شخص نقشہ کے بغیر مکان تعمیر نہیں کرتا)

۵: تقریر آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق ہونی چاہیے۔ مختلف قسم کا مواد دماغ میں موجود ہو لیکن تقریر خود پھلے پھولے اور لاشعوری طور پر پروان چڑھے۔

۶: "الفاظ کے پیچھے مت بھاگو بلکہ خیالات کی تلاش کرو۔ جب خیالات کا ہجوم ہو گا تو الفاظ خود بخود چلے آئیں گے۔" ہوریس

اندازِ خطاب کی خوبیاں

۱:۔ تحریری نوٹس مقرر اور سامعین کے تعلق کو مصنوعی اور پُر تکلف بنا دیتے ہیں۔ اور

ان کی باہمی رفاقت میں حائل ہوتے ہیں۔

۲: اپنے بیان میں اپنی شخصیت سمو دیں۔ ایک عام بات اور ایک عظیم بات میں یہی فرق ہے۔

۳: اندازِ بیاں دلنشیں اور دلچسپ ہونا چاہیے۔

"ایک تقریر میں تین اہم باتیں ہوتی ہیں۔ مقرر کون ہے؟ اس کا اسلوب بیان کس قسم کا ہے؟ اس کا مواد کس قسم کا ہے؟ ان تینوں میں مواد سب سے کم اہمیت رکھتا ہے"۔ لارڈ مارلے۔

۴: اندازِ تقریر اور لہجہ فطری ہونا چاہیے۔ یہ محسوس نہ ہو کہ آپ نے تیاری کی ہے۔

۵: تقریر کے وقت آپ کو تازہ دم، خوش لباس اور باوقار ہونا چاہیے۔ اگر تقریر سے پہلے سامعین کے سامنے بیٹھنا ہو تو کرسی پر باوقار انداز میں تن کر بیٹھیں۔

۶: سٹیج پر اداکاری نہیں دکھانا چاہیے۔ حرکات وسکنات بالکل بے ساختہ ہونی چاہئیں، جیسے سانس لینے کا عمل۔

۷: تقریر میں مزاح کا عنصر صرف موزوں حد تک ہونا چاہیے۔ مکمل مسخرا پن اس کی افادیت کھو دیتا ہے۔

۸: استفہامی انداز میں تجسس پیدا کریں۔ مثلاً:

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی سترہ قومیں آج بھی غلام ہیں؟"

۹: تقریر کا اختتام اچانک اور غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے۔ اشعار پر تقریر ختم کرنا بہت بہتر ہوتا ہے۔ آخر میں کہی ہوئی بات زیادہ دیر یاد رہتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ نقطۂ عروج پر تقریر ختم کریں۔

(۲) ا۔ مؤثر تقریر کی صفات

(الف) تقریر کے انداز میں تصنع نہ ہو۔ زیادہ اثر آفرینی کے لیے گفتگو کا انداز اختیار

کیا جائے۔

(ب) تقریر کے لیے موزوں تیاری کی جائے۔ موضوع کے متعلق پورا علم حاصل کیا جائے۔

(ج) تقریر کے دوران ذہن کو بیدار رکھا جائے۔

(د) آواز نہ اتنی بلند ہو کہ ناگوار محسوس ہو اور نہ دھیمی کہ سنی نہ جا سکے۔

(ح) تقریر کو موضوع کے متعلق رکھا جائے۔ غیر متعلق اور مبہم باتیں نہ کی جائیں۔

(س) تقریر میں بلند بانگ دعوے نہ کیے جائیں۔ خود اعتمادی ایک اچھی چیز ہے لیکن غرور اور تکبر کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ غور و فکر اور جذبات (کامیاب تقریر کے عوامل)

غور و فکر کے مراحل

۱: مسئلہ کا واضح تصور

۲: اس کی صحیح نوعیت اور اہمیت کا ادراک

۳: ماحول اور معاشرہ سے اس کے تعلق کا تعین

۴: مسئلہ کا صحیح حل

جذبات کا دخل

انسان صرف عقل اور فکر سے کام نہیں لیتا۔ زیادہ تر جذباتی عمل اور ردِعمل انسانی کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مقرر کو جذبات سے مناسب انداز میں اپیل کرنا چاہیے۔ لازمی ہے کہ مقرر خود اپنے موضوع کے بارے میں صادقانہ جذبات رکھتا ہو ورنہ وہ سامعین کے جذبات میں تلاطم پیدا نہ کر سکے گا۔

۳۔ موضوع کے بارے میں معلومات حاصل کرنا

(الف) تقریر میں طے شدہ اصولوں اور معاملات سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ بنیادی صداقتوں کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ مثلاً "جھوٹ بولنا گناہ ہے"۔

(ب) موضوع کے متعلق ماہرین کی رائے ضرور معلوم کرنا چاہیے اور غیر متعلقہ مواد کے مطالعہ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

(ج) بہت سی باتیں براہِ راست مشاہدہ سے معلوم ہوتی۔ مقرر کی قوتِ مشاہدہ اعلیٰ ہونا چاہیے۔

(د) تاریخ کا گہرا مطالعہ ہمیشہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مقرر کو تاریخ سے ضرور دلچسپی ہونا چاہیے۔

(ر) کلاسیکل مقرروں کی تقریروں کا مطالعہ بڑی حد تک مددگار ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ سٹیج پر جسمانی حرکات وسکنات

(الف) سامعین سے فوری رابطہ قائم کر لینا چاہیے۔ یوں محسوس ہو کہ آپ ان سے ذاتی طور پر مخاطب ہیں۔

(ب) اسٹیج پر سیدھے، باوقار لیکن بآرام طریقے سے پوری طرح چاق وچوبند کھڑے ہوں۔

(ج) ہاتھوں کو جیبوں میں نہ ڈالیں اور نہ ہی کولہوں پر رکھیں۔

(د) اسٹیج کے علاوہ بھی اچھے انداز میں نشست وبرخاست اپنی عادتِ ثانیہ بنالیں۔

(Stand Tall : Sit Tall : Walk Tall)

(ر) اسٹیج پر اپنی جگہ بدلنے سے سامعین کی توجہ بیدار کی جاسکتی ہے لیکن حرکت بالکل فطری انداز میں ہونی چاہیے۔

(س) مسلسل چلنے پھرنے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اس صورت میں سامعین کی توجہ

جو کچھ مقرر کہہ رہا ہو اس سے ہٹ کر اس کی حرکات پر مرکوز ہو جائے گی۔

(س) اسٹیج پر آنا بھی باوقار طریقہ سے چاہیے اور جانا بھی اسی طریقہ سے چاہیے تاکہ پہلا اور آخری تاثر اچھا ہو۔

۵۔ ہاتھوں کی حرکات

الف: انگشتِ شہادت سے اشارہ۔ مثلاً جب آپ یہ کہہ رہے ہوں کہ "یہ اصول غلط ثابت ہو چکا ہے" اس وقت یوں اشارہ کریں جیسے یہ اصول مجسم آپ کے سامنے کھڑا ہو۔ اسی طرح الزام لگاتے وقت یا چیلنج دیتے وقت اس انگلی کا اشارہ بہت موزوں ہے۔

ب: جب آپ تعاون کی اپیل کر رہے ہوں تو اپنا ہاتھ اس انداز میں آگے بڑھائیں جیسے آپ کوئی کاغذ وصول کر رہے ہوں۔ ہتھیلی اس صورت میں اُوپر کی طرف ہونی چاہیے۔

ج: جب آپ کسی خیال کی مذمت کر رہے ہوں تو ہاتھوں کو اس انداز میں حرکت دیں جیسے کسی گندی چیز کو آپ دھکیل کر الگ کر رہے ہوں۔

د: جذبات اور عزم کے اظہار کا ایک اہم طریقہ بند مٹھی یا مکہ ہوا میں لہرانا ہے۔

ر: جب آپ دو قسم کے خیالات اور نظریات کو الگ کر رہے ہوں تو ہاتھوں کی مدد سے بھی انھیں الگ الگ کرنے کا اظہار کریں مثلاً "ہمیں یا تو پکا انقلابی ہونا چاہیے یا پورا رجعت پسند" لفظ انقلابی پر آپ ایک ہاتھ کو ایک طرف لے جائیں اور رجعت پسند پر دوسرے ہاتھ کو دوسری طرف۔

۳

۱۔ ابلاغ کا حقیقی مفہوم

خیالات کا ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچانا، دیگر اشیا کی منتقلی سے بالکل مختلف ہے۔ مادی اشیاء ایک فرد سے دوسرے فرد تک اپنی ایک ہی صورت میں پہنچتی ہیں۔ اس کے برعکس خیالات ایک ذہن میں جنم لیتے ہیں اور تحریر اور تقریر کے ذریعے جب دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں تو ان کی شکل لازماً وہی نہیں رہتی جو پہلے ذہن میں تھی۔ کامیاب ترین ابلاغ یہ ہے کہ مقرر ایسے انداز میں اپنے خیالات دوسرے افراد تک پہنچا دے کہ ان کی نوعیت اور اہمیت جو اس کے ذہن میں تھی سامعین کے ذہن میں پہنچ کر بہت کم بدلنے پائے۔

۲۔ ابلاغ کے لیے مقرر کی صحیح کوشش

زیادہ درست بات یہ ہو گی کہ ہم اپنے خیالات دوسروں کے ذہن میں منتقل نہ کریں بلکہ ان کے ذہن کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ہمارے انداز میں سوچیں۔ اس سے خود بخود خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہو گی۔

۳۔ ابلاغ میں سامع کی اہمیّت

اگر مقرر سامعین کو کسی موضوع کے بارے میں اپنا متفق بنانا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس بات کو پوری اہمیت دے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کی بنا پر سامعین کس انداز میں سوچ رہے ہیں۔ اپنے موضوع سے متعلق مواد کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ سامعین کے ذہن کو ایک مخصوص لائن پر ڈال سکے۔ تقریر کی کامیابی اس پر منحصر نہیں کہ مقرر نے کیا کہا

بلکہ اس بات پر ہے کہ سامعین اسے سن کر کیا سوچتے ہیں۔

۴۔ ابلاغ میں مواد کی اہمیّت

ابلاغ کی کامیابی میں مواد بھی بہت اہم ہے۔ مقرر کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے اور اس کا مواد سامعین کی دلچسپی کا باعث ہے تو مقرر کی کامیابی بہت آسان ہے۔ یہ بات مقرر کے اندازِ بیان پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اس بات کا شعور کہ سامعین تقریر کے موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں خود بخود اچھا اندازِ خطاب اُبھار دیتا ہے۔

۵۔ سامعین کی توجّہ

انسان کسی کام کی طرف تین وجوہات کی بنا پر توجہ کرتا ہے۔

الف: کسی کام کو فرض سمجھ کر ارادتاً۔ مثلاً ناول پڑھتے ہوئے کسی ضروری خط کے لکھنے کا خیال آجاتا ہے اس وقت کوشش کرکے یہ کام کرنا پڑے گا۔

ب: کسی بیرونی وجہ سے غیر ارادتاً۔ مثلاً گلی میں آگ بجھانے والے انجن کی آمد پر غیر ارادتاً توجہ اُدھر مبذول ہو جاتی ہے۔

ج: کسی معاشرتی دباؤ کے تحت یا تعلیم و تربیت یا کسی مقصد کے تحت۔ اس صورت میں انسان نہ ارادتاً نہ غیر ارادتاً بلکہ غیر رضاکارانہ طور پر شعوری توجہ دیتا ہے۔

سامعین کی توجّہ کیسے حاصل کی جائے

کوئی مقرر بھی اسٹیج پر فائر انجن نہیں لا سکتا لیکن بعض اوقات کوئی معمولی سی بات سامعین کو پوری طرح متوجہ کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر مقرر چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو جائے تو سامعین ہمہ تن گوش ہو کر متوجہ ہو جائیں گے۔ اس طرح ان کی توجہ غیر ارادی طور پر حاصل ہو سکے گی

مقرر کو سب سے زیادہ توجہ دُور بیٹھے ہوئے سامعین پر دینی چاہیے۔ اگر وہ اُن کو اپنی طرف پُوری طرح متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی تقریر کامیاب رہے گی۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی مقرر بھی مستقل طور پر ایک نکتہ پر متوجہ نہیں رہ سکتا۔ انسانی ذہن اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے۔ مُقرر کو یہ کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے بلکہ مزاح کی مدد سے یا مثالیں اور حوالے دے کر سامعین کے ذہن کو تھوڑا آرام بھی پہنچانا چاہیے۔ اس کے بعد ان کے ذہن کو مرکزی نکتہ کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔

مُقرر کی ذہنی کیفیت

مُقرر کم از کم اپنی تقریر کے دوران ایک قائد اور رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اس بات کا پُورا شعور ہونا چاہیے اور اس کا طرزِ عمل اس حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ:

الف: مقرر میں عزتِ نفس کا گہرا احساس ہو۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح ایک ندی کبھی اپنے منبع سے بلند نہیں ہوسکتی۔ تقریر بھی اپنے منبع یعنی مقرر کی شخصیت سے اونچی نہیں ہوسکتی۔

ب: مقرر اپنے موضوع کے بارے میں اپنے سامعین سے زیادہ جانتا ہے اس لیے اسے اپنے بارے میں شعوری طور پر یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ موضوع کے بارے میں صاحب علم ہے۔

ج: مُقرر کو موضوع کے بارے میں حقیقی طور پر پُرجوش ہوجانا چاہیے۔ اس میں ایک مبلغانہ جذبہ ضروری ہے۔

د: موضوع کی تیاری کے نتیجہ میں مقرر میں ایک خود اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے اسے پوری طرح کام میں لانا چاہیے۔

س: اس بات کی احتیاط رکھنا چاہیے کہ خود اعتمادی اور عزتِ نفس تکبّر کی حدوں کو نہ چھُونے لگے، نہ ہی کسی بات سے "بڑھانکنے" کا تاثر ملے۔

(۴) مقرر کے لیے آداب

۱۔ صدر کے لیے مناسب القاب استعمال کرنا نہ بھولیں۔

۲۔ اپنے پیشرو مقرروں کے بارے میں چند تعریفی کلمات ضرور کہیں۔

۳۔ تقریر کے دوران غیر ضروری حرکات سے اجتناب کریں مثال کے طور پر:

الف: سامنے پڑی ہوئی کسی چیز مثلاً گلاس وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ

ب: اپنے لباس، نکٹائی وغیرہ کو درست کرنا یا بٹن سے کھیلنا

ج: سر کھجانا یا ناک یا چہرے پر ہاتھ پھیرنا

د: کوٹ کے کالر کو ہاتھوں میں پکڑنا

ہ: ہاتھ جیبوں میں ڈالنا یا کولہے پر دھرنا

س: ڈیسک کا سہارا لے کر اس پر جھک جانا

۴۔ اگر موضوع بہت سنجیدہ یا خشک ہو تو اس میں مناسب مزاح کی چاشنی ملائیں۔

۵۔ اگر تقریر کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہو اس کا احترام کریں۔ یوں بھی طول بیان سے احتراز کریں۔

۶۔ اگر آپ تقریر کے لیے تیار نہ ہوں اور فی البدیہہ بولنا پڑے تو اس کے لیے کوئی معذرت وغیرہ نہ کریں۔

آواز کے بارے میں ہدایات

۱۔ ایک خوب صورت بلند آہنگ آواز قابلِ رشک چیز ہے۔

۲۔ کوشش کر کے اور مسلسل مشق سے آواز کی درشتی دور کی جا سکتی ہے۔

۳۔ بولتے وقت ایسے تمام اعضا کو پوری طرح استعمال کریں جن سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں

مثلاً دانت، منہ، ہونٹ، گلا، پھیپھڑے وغیرہ

۲۔ کسی بھی موقع پر "دھاڑنے" کی ضرورت نہیں۔

جسم کی حرکات وسکنات

۱۔ ہر قسم کی حرکات وسکنات بالکل فطری انداز میں ہونا چاہئیں۔

۲۔ زیادہ تر ہاتھوں کو استعمال کریں، لیکن سر اور چہرے کی حرکات سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

۳۔ کسی بات سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے ہاتھوں کو سامنے لائیں اس انداز میں کہ ہتھیلیاں باہر کی جانب ہوں۔

۴۔ کسی دعوے کے لیے ہتھیلیاں کھول کر بازو لہرائیں۔

۵۔ رنج یا غصہ کے اظہار کے لیے ہاتھوں کو مصافحہ کے انداز میں سامنے باندھ لیں۔

۶۔ دلیل دیتے ہوئے انگشت شہادت سے سامنے کی طرف اشارہ کریں۔

۷۔ متنبہ کرتے ہوئے دونوں ہاتھ سامنے بلندی کی طرف اٹھائیں اس طرح کہ ہتھیلیاں سامعین کی طرف ہوں۔

۸۔ اپیل کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلائیں کہ ہتھیلیاں اُوپر کی طرف ہوں

مذہبی اور دینی تقاریر

۱. آفتابِ ہدایت
۲. دورِ جدید میں اسلام کی خدمت کس طرح ممکن ہے
۳. اسلامی معاشرہ میں مسجد کا مقام
۴. حج تمام عبادات کا مجموعہ ہے
۵. خلفائے راشدینؓ کے باہمی تعلقات
۶. سیدہؓ کی عظمت
۷. محبانِ اہلِ بیت سے خطاب
۸. سفرِ حجاز کے تاثرات
۹. اہلِ بیت رسولؐ
۱۰. محرم کا پیغام
۱۱. تہران یونیورسٹی میں خطاب
۱۲. اسلامی ریسرچ اور اس کے تقاضے
۱۳. اسلامی نظریاتی کونسل سے خطاب

آفتابِ ہدایت

"سیرت پاک میرا موضوع خاص ہے۔ اس کے ایک ادنیٰ طالبِ علم کی حیثیت سے میں نے سیرت کے موضوع پر بلا مبالغہ بیسیوں محفلوں اور جلسوں سے خطاب کیا ہے۔ اگر یہ ساری تقریریں محفوظ ہوتیں تو کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو سکتی تھیں۔

اب ماضی کی اس کوتاہی کو دیکھتا ہوں تو کفِ افسوس مل کر رہ جاتا ہوں خدا کا شکر ہے کہ کم سے کم عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ۱۹۷۳ء میں مَیں نے آرام باغ کراچی کے ایک عظیم الشان اجتماع میں جو تقریر کی تھی۔ اہلِ صحافت نے اسے ضائع نہیں ہونے دیا۔

اس تقریر میں بعض علما کی اس کج فکری پر بھی تنقید کی گئی ہے جس کا مظاہرہ قومی اسمبلی کے بعض اجلاسوں میں ہوا۔ لیکن کوشش برابر یہی رہی ہے کہ موضوع کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔"

○

یہ سیرتِ پاک کی محفل ہے اور ہر شخص جو سیرتِ پاک کی مجلس میں شامل ہوتا ہے۔ اُس کو یوں محسوس کرنا چاہیے کہ جیسے وہ دربارِ نبوت میں حاضر ہے۔ جیسے وہ آنحضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ پاک سُن رہا ہے۔ ایک ایک لمحہ جو آپ کا یہاں بسر ہوگا۔ وہ عبادت میں شامل ہوگا۔ وہ جانِ عبادت ہوگا۔ وہ روحِ عبادت ہوگا۔ بلکہ اس حد تک عبادت ہوگا کہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ یہ ساری عبادتیں وہ ہیں کہ انسان ان میں شریک ہیں۔ لیکن ایک عمل آپ کا ایسا ہے کہ جس کے اندر خود خالق بھی شریک ہے، اس کے فرشتے بھی شریک ہیں اور اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ عمل کتنا مقدّس ہوگا۔ وہ عمل کتنا عظیم ہوگا۔ وہ عمل کتنا محبوب ہوگا کہ جس میں مخلوق کے ساتھ ساتھ خود خالق بھی شریک ہو، اور وہ عمل کون سا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ یا ایّھا الّذین اٰمنو اے ایمان والو! تم سرکارِ دوعالم پر اور ہمارے نبی پر صلوٰۃ بھیجا کرو اس لیے کہ ان اللہ و ملٰئکتہٗ یصلّون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنو صلّوا علیہ وسلّمو اتسلیما اے ایمان والو! اللہ تبارک تعالیٰ اور اس کے فرشتے حبیب پاک پر

درُود بھیجتے ہیں۔ تو اے ایمان والو! تم بھی ہمارے حبیب پر درُود بھیجا کرو۔ گویا آپؐ کا ذکر آپؐ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا وہ عمل ہے کہ جس کے اندر فرشتے بھی شامل ہیں۔ جس کے اندر خود خُدائے پاک بھی شامل ہے۔

میں اس بات پر مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ اہالیانِ کراچی نے انتہائی گرمجوشی کے ساتھ انتہائی ایمان افروز مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آقا و مولا کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور تنہا کراچی پر ہی موقوف نہیں ہے آج پاکستان کے چپے چپے میں آپؐ کی یاد منائی جا رہی ہے۔ آپؐ کی یاد میں آپؐ کی سیرت کی محفلیں سجائی جا رہی ہیں۔ صلوٰۃ و سلام آپ پر بھیجا جا رہا ہے۔ آج صبح پنڈی میں کم و بیش کوئی چار پانچ لاکھ آدمیوں کا جلوس تھا۔ جب ہم تین چار میل پیدل گزر کر ایک مقام پر پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ابھی جس مقام سے جلوس روانہ ہوا تھا وہاں بے شمار دنیا باقی ہے جو جلوس میں شریک ہوگی۔ ایک سرا ابھی تک اس مقام پر باقی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمان اپنے آقا و مولیٰ سے کتنی محبت رکھتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو مسلمانوں کو مایوس کریں، جو مسلمانوں پر فتوے لگائیں، جو گنہگاروں کے درمیان اور ان کے شفیع اور ان کے آقا و مولیٰ کے درمیان دیوار بن کے حائل ہونے کی کوشش کریں۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ خدا نہ کرے کہ میں ان لوگوں میں شامل ہوں۔ میں یہ ایمان رکھتا ہوں کہ آج بھی ہر چند کہ ہم گنہگار ہیں۔ ہر چند کہ ہم سیہ کار ہیں لیکن ہم میں گئے سے گیا مسلمان، گنہگار سے گنہگار مسلمان، خاطی سے خاطی مسلمان، عاصی سے عاصی مسلمان بھی ایسا ہے کہ جو اپنی ماں سے زیادہ، اپنے باپ سے زیادہ اپنی جان سے زیادہ آقا و مولیٰ سے محبت رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس میں شبہ ہو۔ کوئی دلیل چاہیے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کوئی بھی آزمانے کی کوشش نہ کرے۔ کوئی کسی گنہگار مسلمان کو یہ چیلنج نہ دے۔ ورنہ اس کو یہ چیلنج بہت مہنگا پڑے گا۔ اس کی جرأت نہ کرے کہ کسی مسلمان کو یہ چیلنج دے۔ اگر کوئی آزمانا چاہتا ہے تو دیکھ لے۔ ہو سکتا ہے اس سارے

اجتماعِ عظیم میں کوئی شخص اپنی ماں کے بارے میں گستاخی برداشت کرلے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے باپ کے بارے میں کوئی شخص گستاخانہ کلمات کہے اور وہ برداشت کرجائے۔ لیکن اگر کسی شخص نے یہ جرأت کی، یہ جسارت کی کہ اس کے آقا و مولیٰ سرورِ کائنات امام المرسلین، خاتم النبیین دانائے سبل ختم رسل مولائے کل محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور میں کوئی توہین کا جملہ کہنے کی کوشش کرے تو خدا کی قسم آج بھی لاکھوں کروڑوں انسان اس کی زبان کو گدی سے کھینچ لیں گے۔ کیا یہ بات اس کا ثبوت نہیں ہے کہ ماں باپ سے زیادہ محبت ایک گنہگار سے گنہگار مسلمان کو آپؐ کی ذات بابرکات سے ہے۔ ٹھیک ہے ہم گنہگار ہیں لیکن مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ سرکار دوعالم کی عدالت میں ایک شخص پکڑا ہوا آیا۔ ایک مسلمان پکڑا ہوا آیا جس پر شراب پینے کا الزام تھا۔ اس نے مانا کہ اس نے شراب پی ہے۔ اس کو سزا دی گئی۔ دوسری مرتبہ پھر وہی شخص اس الزام میں پکڑا ہوا آیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ اے دشمنِ خدا و رسول تجھے شرم نہیں آتی؛ پھر وہی گناہ کرکے آگیا ہے۔ تو سرکار رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (یہ صحیح بخاری میں ہے) کہ اے عمرؓ! خبردار اس شخص کو دشمنِ خدا و رسول نہ کہو۔ خدا کی قسم میں شہادت دیتا ہوں کہ اس شخص کے دل میں خدا و رسول کی محبت موجزن ہے۔ ٹھیک ہے کہ عملی طور پر کوتاہیاں ہوسکتی ہیں لیکن ایک مسلمان اپنے آقا و مولا کی محبت کے سلسلہ میں پیچھے نہیں ہوسکتا اور یہی وہ چیز ہے جس نے آج تک شاہراہِ تاریخ پر ہم کو زندہ و پائندہ قوم کی حیثیت سے گامزن رکھا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہمیں مٹنے نہیں دیا، فنا نہیں ہونے دیا۔ ہمارے اوپر ہزاروں سیلاب آئے اور گزر گئے ہزاروں مشکلیں پڑیں اور آسان ہوگئیں۔ ہزاروں طوفان آئے اور نرم و نازک موجوں کی صورت میں تبدیل ہوگئے، لیکن یہ محبت ہمارے سینوں سے نہیں نکل سکی۔ تاریخ میں اس محبت کی وجہ سے ہم زندہ ہیں۔ ہمارا نبی بھی زندہ ہے اور اس کی امت بھی زندہ ہے۔ اس کی قوم بھی زندہ ہے اور جب تک یہ قوم اپنے اس زندہ نبی، زندہ رسُول پر ایمان لاتی رہے

گی اور محبّت کا یہ تعلق قائم رکھے گی۔ اس قوم کو زندگی کی نعمت سے کوئی طاقت محروم نہیں رکھ سکتی۔ لیکن دوستو ٹھیک ہے کہ ہم احترام کرتے ہیں، ہم محبت رکھتے ہیں۔ ہم عقیدت کے جذبات رکھتے ہیں۔ ہم آپ کا نام نامی لیتے ہیں۔ اسمِ گرامی لیتے ہیں۔ ادب سے لیتے ہیں۔ احترام سے لیتے ہیں کیونکہ ہم ان نام نہاد مفکّروں کی طرح نہیں ہیں۔ ہم ان نام نہاد مصنّفوں کی طرح نہیں ہیں کہ جو نام لیتے ہیں بس زیادہ سے زیادہ "حضرت محمدؐ" صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ان کی زبان سے نہیں نکلتا، نکلتا ہے تو بس یہ نکلتا ہے ان کی تحریریں میں اگر پڑھو تو یہی الفاظ نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ عشق کی نعمت ضروری نہیں کہ علم کے ساتھ مل جائے۔ یہ چیزیں وہ ہیں کہ بعض اوقات آپ ان لوگوں میں دیکھیں گے جنھیں لوگ بے علم کہتے ہیں، جنھیں لوگ جاہل کہتے ہیں۔ لیکن کون جانتا ہے کہ عشق کے اعتبار سے، معرفت کے اعتبار سے، محبت کے اعتبار سے، ان ہزاروں عالموں اور مفکّروں کی لکھی ہوئی کتابیں ان کے ایک کلمۂ محبت کے مقابلے میں ہیچ ہوں، کوئی حیثیت نہ رکھتی ہوں۔ لیکن ہم مسلمان آپ کا نام عزت سے کیوں لیتے ہیں۔ آپ کا نام محبت سے کیوں لیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ ہمارے خالق نے ہمیں سکھایا ہے۔ یہ تو ربّ العالمین نے سکھایا ہے۔ یہ اس کا طریقہ ہے، خدا کا طریقہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا طریقہ ہے۔ قرآن حکیم کو آپ دیکھیں۔ پورا قرآن آپ کی زندگی ہے۔ آپ کی سیرت ہے، آپ کا حسن ہے، آپ کا جمال ہے۔ قرآن بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھیجا ہے اور رسولِ دوعالم بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھیجے ہیں۔ وہ قرآن مصحف میں ہے۔ کتاب میں ہے۔ یہ قرآن، قرآن ناطق ہے، قرآن مجسّم ہے۔ انسانی شکل میں ہے۔ یہ قرآن مکّہ مکرّمہ کی گلیوں میں پتھر کھاتا تھا۔ اس پر پتھروں کی بارش ہوتی تھی۔ البتّہ مدینہ منورہ میں اس کے جاں نثار تھے لیکن یہ قرآن تھا کہ جس کا سونا، اٹھنا، بیٹھنا، جاگنا، چلنا پھرنا، جنگ کرنا، صلح کرنا اور جس کا خاموش رہنا اور بولنا جس کی ہر ادا اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے مطابق تھی۔ اس قرآن میں جو قرآن مصحف کی صورت میں تھا۔ کتاب کی صورت میں تھا۔ اس قرآن میں آپ دیکھیں

گے اللہ تبارک تعالیٰ نے (یوں تو سارا قرآن آپ کے بارے میں ہے) جہاں آپؐ کا نام لیا ہے بڑے احترام سے لیا ہے۔ پورے قرآن میں وہ چار مقامات ہیں جہاں آپ کا نام لیا گیا ہے مگر جہاں آپؐ کا ذکر آیا ہے، کہیں یٰسین کی صورت میں ہے، کہیں طٰہٰ کی صورت میں ہے کہیں نبی کی صورت میں ہے، کہیں رسُول کی صورت میں ہے، کہیں مدثر کی صورت میں ہے، کہیں نصیر کی صورت میں ہے، کہیں داعی کی صوُرت میں ہے۔ سارا قرآن حکیم آپ دیکھیں۔ جگہ جگہ آپ کو کسی نہ کسی لقب سے، کسی نہ کسی خطاب سے محبت بھرے انداز سے اللہ تبارک تعالیٰ نے یاد کیا ہے اور بعض آیات تو ایسی ہیں کہ جن میں کئی کئی نام آپ کو عطا ہوئے ہیں۔ کئی کئی ناموں سے حق تعالیٰ نے آپ کو یاد کیا ہے۔ فرمایا ایھا النبی انا ارسلناك شاهداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باسمه وسراجاً منیرا۔ اس میں سات ناموں سے اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے محبوب کو یاد کیا۔ کہا اے نبی، کہا اے رسُول اے شاہد، اے مبشّر، اے نذیر، اے داعی، اے سراج منیر سات ناموں سے اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ کو یاد کیا۔ اس لیے یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا بنایا ہوا طریقہ ہے کہ ہم بھی جب آپ کا نام لیتے ہیں، محبت سے لیتے ہیں، عقیدت سے لیتے ہیں۔ احترام سے لیتے ہیں اور آپؐ کا نامِ نامی اور اسم گرامی جب آتا ہے تو ہماری گردنیں فرطِ عقیدت سے جھک جاتی ہیں۔ کس کس اسلوب سے، کس کس انداز سے آپ کا تذکرہ فرمایا۔ آپ کو سراج منیر بنا کے بھیجا۔ سراج منیر کے لفظی معنی ہیں روشن چراغ۔ لیکن سراج ہی کو اللہ تبارک نے سورج کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ فرمایا سراجاً وھاجاً وہاں سورج کے معنی میں اِستعمال کیا تو یہاں جہاں روشن چراغ معنی ہے وہاں روشن آفتاب کیوں مفہوم نہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاف طریقے سے روشن آفتاب بھی اس کا مفہوم ہے لیکن روشن چراغ کہہ کر روشن آفتاب کیوں مراد لیا ہے؟

چراغِ ہدایت: بات یہ ہے کہ اس طرح اللہ تبارک تعالیٰ آپ کی خصوصیتیں بیان

فرمانا چاہتا ہے وہ جو سُورج میں ہیں اور وہ جو چراغ میں ہیں، روشنی دونوں میں ہے سُورج میں بھی چراغ میں بھی۔ لیکن ایک خصوصیت ایسی ہے جو سورج میں نہیں ہے جو صرف چراغ میں ہے، سورج میں یہ طاقت نہیں کہ وہ مزید بہت سے سُورج اپنی روشنی سے پیدا کر دے۔ لیکن چراغ میں یہ خصوصیت ہے کہ ایک چراغ سے ہزاروں، لاکھوں چراغ روشن ہوتے ہیں مگر اس چراغ کی روشنی میں کمی نہیں آتی تو آپ کو سراج منیر بنا کر بھیجا، روشن چراغ بنا کر بھیجا کہ اس ایک چراغ سے بزمِ کائنات میں لاکھوں چراغ صحابہ کرام، ائمہ اہلِ بیت، صوفیائے کرام اور اولیائے کرام کی صورت میں، مجاہدوں کی صورت میں پیدا ہوئے۔ لاکھوں چراغ روشن ہوئے اس ایک چراغ سے۔ جنھوں نے کائنات کو بقعۂ نور بنا دیا، جنھوں نے اندھیروں کو دور کر دیا، جنھوں نے تاریکیوں کے خلاف جہاد کیا مگر یہ مراد لینے کے بعد روشن آفتاب جو کہا اس میں بھی دوستو اور بزرگو! آج جبکہ ہم آپؐ کی یاد منا رہے ہیں۔ آج جبکہ ہم عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کر رہے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ آفتاب آپ کو کہا تو اس میں اور کیا قرینے ہیں یوں تو اتنے قرینے ہیں کہ ختم ہونے میں نہ آئیں اگر انھیں بیان کیا جائے لیکن چند موٹی موٹی باتیں ہیں جن پر ہر مسلمان کو غور کرنا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ سورج کی اس کائنات میں کیا حیثیت ہے؟ یہ سورج اگر اس کائنات میں نہ ہوتا تو سمندروں سے بھاپ نہ اٹھتی بھاپ نہ اٹھتی تو بادل نہ بنتے، بادل نہ بنتے تو بارش نہ برستی، بارش نہ برستی تو پھر غنچے نہ چٹکتے پھول نہ مہکتے اور بلبل نہ چہکتے۔ پھر تاریکی ہی تاریکی ہوتی، پھر ویرانیاں ہی ویرانیاں ہوتیں، پھر اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا۔ پھر اس کائنات میں دھواں اڑتا ہر چہار طرف گرد اڑتی۔ پھر یہ کرہ منجمد ہوتا، کرہ تاریک ہوتا کہ اس میں زندگی کا نام و نشان نہ ہوتا۔ یہی سورج کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح دوستو روحانیت کی دنیا میں اگر وہ آفتابِ نبوت طلوع نہ ہوتا اگر وہ آفتابِ رسالت طلوع نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا۔ یہ کائنات، یہ دلوں کی دنیا اُجڑ جاتی، یہ روحوں کی دنیا اجڑ جاتی۔ اس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا۔ اس میں وہموں کے ڈیرے ہوتے۔ اس میں شرک

کے بسیرے ہوتے ۔ اس کے اندر کوئی مہک نہ ہوتی، کوئی چمک نہ ہوتی۔ اس کے اندر روشنی کی کوئی کرن نہ ہوتی، کوئی جگنو نہ چمکتا اس کے اندر ویرانی ہی ویرانی ہوتی اور دل کی دنیا اُجڑ جاتی اگر وہ آفتاب طلوع نہ ہوتا کہ جسے حق تعالیٰ نے سراج منیر کہہ کر یاد کیا ہے۔ دوستو یہ بھی دیکھو کہ آپ کو کہا آفتابِ رسالت، آفتابِ نبوت ۔ سورج جبکہ طلوع ہوتا ہے تو تارے ہوتے ہیں اور وجود ان کا مٹ نہیں جاتا وہ ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے ۔ نظر بھی آتے ہیں تو روشنی نہیں دیتے اس لیے کہ جب سورج نکل آیا تو پھر چراغوں کی ضرورت نہیں رہتی پھر چاند کی ضرورت نہیں رہتی۔ چاند ہوتا ہے ہم مانتے ہیں کہ یہ چاند ہے لیکن روشنی ہم سورج سے حاصل کرتے ہیں۔ مانتے ہیں کہ ستارے ہیں لیکن روشنی ہم سورج سے حاصل کرتے ہیں۔ چراغ ہوتا ہے ہم کہتے ہیں کہ یہ چراغ ہے لیکن روشنی کے معاملے میں ہم سورج ہی سے تعلق قائم رکھتے ہیں۔ تو اس دنیا میں، اس کائنات میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے، ستاروں کی مانند ان میں کوئی ستارہ تھا کوئی چاند تھا، کوئی چراغ تھا۔ سب آئے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے لیے اپنی اپنی ملتوں کے لیے اپنے اپنے قبیلوں کے لیے حضرت مسیحؑ نے کہا آج بھی انجیل میں، کتاب مقدس میں موجود ہے کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کا چرواہا بن کر آیا ہوں وہ بھی ساری دنیا کے لیے نہ آئے تھے وہ بھی اپنے قبیلے کے لیے تھے، وہ بھی بنی اسرائیل کے لیے تھے ۔ موسیٰؑ آئے وہ بھی بنی اسرائیل کے لیے آئے اور ہر ہر قوم کے پاس ایک نبی آیا۔ قرآن حکیم کہتا ہے ولکل قوم ھاد ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے ہر قوم کے لیے ہم نے ایک ہادی بھیجا ہے ہو سکتا ہے، آج دنیا نے جن کی تعلیمات کو بگاڑ دیا ہے دنیا نے جن کی تعلیمات کو مسخ کر دیا ہے۔ آج جن کے بارے میں انسانوں نے شخصیتیں تراش لیں ہو سکتا ہے وہ بھی خدا کے بھیجے ہوئے ہادی ہوں مگر قوموں نے ان کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ ان کی تعلیمات کو مسخ کر دیا ہے۔ اور ان کی لائی ہوئی روشنی کو بجھا دیا ہے لیکن ایسا ہونا تھا اس لیے کہ جب سورج طلوع ہو گیا جب آفتابِ نبوت جگمگا اٹھا۔ جب

فاران کی چوٹیوں سے سراج منیر طلوع ہوگیا تو اس کے بعد پھر زمانے کو کسی ستارے کی ضرورت نہیں۔ پھر کسی چراغ کی حاجت نہیں، کسی دیے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہیں ہم مانیں گے، ہم ان پر ایمان لائیں گے ان پر ایمان نہ لائیں تو ہمارا ایمان خراب ہو جائے۔ ہمارے ایمان میں نقص واقع ہو جائے، ہمارا ایمان ضائع ہو جائے لیکن روشنی آج اس دور میں کوئی کسی ستارے سے نہ لے گا اس لیے کہ سورج سامنے ہے۔ جب سورج کے سامنے کوئی چراغ جلائے تو لوگ کہیں گے اس کی عقل ماری گئی ہے، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ سورج کی روشنی میں یہ چراغ کی روشنی کا محتاج ہے۔ اس لیے دوستو وہ سورج طلوع ہوا، ستاروں کو مانیں گے، انبیاء کو مانیں گے لیکن فیض آپؐ سے ہو گا، ہدایت آپ سے ملے گی، نجات اسی دروازے سے ملے گی، سعادت یہیں سے ملے گی، تعلیم یہیں سے ملے گی، اصول یہیں سے ملیں گے آئین یہیں سے ملے گا، نظام یہیں سے ملے گا، تمدن یہیں سے ملے گا، تہذیب یہیں سے ملے گی اس لیے کہ نبوت ختم ہو گئی، اس لیے کہ رسالت آپؐ پر ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ سورج کے بعد کسی روشنی کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے کہ سورج کے ہوتے ہوئے جو قیامت تک کے لیے سورج ہے اس کے ہوتے ہوئے پھر کسی اور کی ضرورت نہیں ہے ؎

بصد یقین و بصد اعتبار دیدہ وری\
تجھی پہ ختم ہے رُوح الامیں کی نامہ بری

اب روح الامین کی نامہ بری، جبرئیل کی نامہ بری ختم ہو چکی ہے۔ جس ذات پر ختم ہوئی تھی اب اس کے بعد کسی کی ضرورت نہیں جو پہلے آئے تھے ان کو مانیں گے لیکن روشنی آپؐ سے لیں گے، تعلیم آپ سے لیں گے، ہدایت آپ سے لیں گے۔ دوستو! روشن آفتاب کہاں۔ آج کچھ لوگ اس روشن آفتاب کو اپنی قباؤں میں چھپانا چاہیں تو نہیں چھپا سکتے اپنی عباؤں میں چھپانا چاہیں تو نہیں چھپا سکتے اگر وہ اس آفتاب کو اپنی ملکیت بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہ آفتاب کسی کی ملکیت نہیں، روشنی کسی کی ملکیت نہیں، صداقتیں کسی کی ملکیت نہیں، ہوا

کسی کی ملکیت نہیں، سچائیاں کسی کی ملکیت نہیں، علم کسی کی ملکیت نہیں۔ آج کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اس کو اپنی ملکیت بنالیں۔ گنہگاروں کو اس سورج کی روشنی سے محروم کر دیں لیکن یہ سورج تو قباؤں کے اندر سے اپنی روشنی بکھیرے گا تم اپنی قباؤں کو جورات سے زیادہ تاریک ہیں ڈال دو اس سورج پر لیکن سورج کے بارے میں تو تم جانتے ہی ہو کہ یہ عبائیں اور قبائیں کہاں اس کو ڈھانپ سکیں گی۔ وہ تو سارے جہان کے لیے ہے، وہ تو عالم کے لیے ہے، وہ تو عالمین کے لیے ہے اس کو جس نے بھیجا وہ رب العالمین ہے وہ جہانوں کا پروردگار ہے جو کتاب اس پر بھیجی وہ ذکریٰ للعالمین ہے وہ سب کے لیے رحمت ہے۔ تم مسلمانوں میں حصے بخرے کر کے کچھ کے لیے اس کو ریزرو کر کے رکھنا چاہتے ہو؟ کچھ کو اس سے محروم کرنا چاہتے ہو؟ لیکن وہ تو رحمت ہیں ان کے لیے بھی جو نہیں مانتے ہیں کہ یہ سورج ہے، روشنی دیتا ہے اور ان کے لیے بھی جو نہیں مانتے، گالیاں دیتے ہیں سورج تو سب کے لیے ہے تم کیسے اجارہ دار بن سکتے ہو؟ تم کیسے جملہ حقوق محفوظ کر سکتے ہو۔ تم کیسے اس کو ذاتی ملکیت بنا سکتے ہو؟ وہ تو سب پر چمکے گا سورج سب کے لیے ہے۔ سورج کی خصوصیت مساوات ہے وہ چمکتا ہے سوسائٹی کی کوٹھیوں پر بھی، وہ چمکتا ہے لیاری کی جھگیوں پر بھی، وہ چمکتا ہے سوئٹزرلینڈ اور کشمیر کے مرغزاروں پر بھی، وہ چمکتا ہے افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں پر بھی، وہ چمکتا ہے آزاد منش انسانوں پر بھی اور اس کی روشنی سے کوئی دشمن طاقت محروم نہیں کر سکتی ان کو بھی جو ترانوے ہزار قیدی آج کیمپوں میں ہیں وہ سورج ان کو روشنی دیتا ہے وہ ہر جگہ ان کو بھی روشنی دیتا ہے وہ ہر جگہ کے لیے ہے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سورج صرف عالموں کو روشنی دے گا، جاہلوں کو روشنی نہیں دے گا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سورج صرف امیروں کو روشنی دے گا، غریبوں کو روشنی نہیں دے گا۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ صرف ماننے والوں کو روشنی دے گا نہ ماننے والوں کو روشنی نہیں دے گا۔ نہیں یہ سب کے لیے ہے یہ سب کو اپنی کرنوں سے منور کرتا ہے یہ غریب کی کٹیا بھی روشن کرتا ہے، یہ امیر کا گھر بھی بقعۂ نور

بناتا ہے اس میں بخیلی نہیں ہے، اس کی شان سخاوت ہے اور یہ شان کے ساتھ اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے، اپنی روشنی لٹا رہا ہے تو آپ آئے سراج منیر بن کر، غلاموں کے لیے بھی آئے وہ جو بکتے تھے۔ منڈیوں کے اندر جن کی بولی دی جاتی تھی جن کی نیلامی کی جاتی تھی اور جن کے لیے زیادہ سے زیادہ بولی دی جاتی تھی، روپے بڑھا چڑھا کر دیے جاتے تھے، خریدا جاتا تھا جیسے مویشیوں کو خریدا جاتا ہے اور عورتوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی منڈیاں بنا کر انھیں بیچا جاتا تھا انھیں خریدا جاتا تھا۔ آپؐ آئے آپؐ نے فرمایا سنو' نظام مصطفےٰ کا یوم منانے والو! یہ یوم مصطفےٰ ہے اس میں نظام بھی ہے اس میں اصول بھی ہے اس میں عمل بھی ہے اس میں سنت بھی ہے اس میں قرآن بھی ہے اس میں سب کچھ ہے جب یوم مصطفےٰ ہے تو پھر الگ سے کوئی یوم آج کے دن منانا بدعت نہیں ہے؟ زیادتی نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟ آج یوم مصطفےٰ ہے اور پھر آپ کی شخصیت میں نظام بھی ہے آپ کی حیثیت و شخصیت میں عمل بھی ہے، آئین بھی اور آئین کے سلسلے میں آپ کا بتایا ہوا طریق بھی ہے آپ کی دکھائی ہوئی سنت بھی ہے آج آؤ دیکھو وہ لوگ جو مناتے ہیں آج کے دن کو سیاست کے انداز میں ان سے کہو نظام مصطفےٰ کو اپنے ذوق کے تابع نہ بناؤ۔ تم لوگوں نے آئین ساز اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی تھی جب ہم نے یہ شق رکھی کہ غلامی پاکستان میں نہیں ہوگی۔ غلامی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے تو اے عباؤں قباؤں کے مالکو! تم لوگوں نے کہا تھا قومی اسمبلی میں، قومی اسمبلی کا ریکارڈ شاہد ہے تم لوگوں نے کہا تھا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے اس لیے کہ غلاموں کی اجازت تو قرآن میں اسلام میں موجود ہے تم لوگوں نے نظام مصطفےٰ کے بارے میں یہ کہہ کر تہمت لگائی۔ آؤ صحیح بخاری کی حدیث سناتا ہوں اگر ہمت ہے تو تردید کر دو آج بیس سال کی مدت دیتا ہوں جو جگہ جو مقام منتخب کر لو وہاں بھی تمھارے ساتھ اس حدیث پر گفتگو کرنے کو تیار ہوں۔ صحیح بخاری میں ارشاد ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اس شخص کے خلاف جو غلام بیچتا ہے، غلام کی خرید و فروخت کرتا ہے۔ انسانوں کو غلام بنا کے منڈیوں میں بیچتا ہے۔ میں مدعی بنوں گا، میں اس پہ دعویٰ کروں گا، میں استغاثہ دائر کروں گا

وہ جنھوں نے غلامی کو ختم کیا۔ جنھوں نے زنجیریں کاٹیں، جنھوں نے بیڑیاں کاٹیں، جنھوں نے انسان کو آزاد کیا اور جن کے ایک غلام حضرت عمر فاروقؓ نے عمر ابن العاصؓ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اے گورنر! انسانوں کو ماؤں نے اپنے پیٹوں سے آزاد جنا ہے۔ تم نے ان کو کب سے غلام بنا لیا؟ جس کے غلاموں کو یہ توفیق ملی کہ انھوں نے غلامی کا قلع قمع کیا۔ جنھوں نے اس طرح غلامی کو لعنت بنا دیا کہ آج پوری دنیا میں غلامی سے نفرت کی جاتی ہے، آزادی کی خواہش کی جاتی ہے۔ آج جہاں جہاں آزادی کی طلب ہے، تڑپ ہے، خواہش ہے، خواہ وہ کشمیر ہو، خواہ وہ ویٹ نام ہو، خواہ وہ فلسطین ہو جہاں جہاں یہ شمع روشن ہے اس میں اگر خون جل رہا ہے تو شہدائے اسلام کا جل رہا ہے، شہدائے کربلا کا جل رہا ہے، حضورؐ کے ساتھیوں کا جل رہا ہے جنھوں نے زمانے کو حریت اور آزادی کا سبق دیا۔ آپؐ نے غلاموں کو اٹھایا، سینے سے لگایا۔ آپؐ نے ان کو آزادی عطا کی۔ آپؐ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی کو مٹایا، سدِ باب کر دیا، آپؐ غلاموں کے لیے بھی آئے، آزاد لوگوں کے لیے بھی آئے۔ آپؐ ان کے لیے بھی آئے جو امیر تھے اور ان سے لے کر غریبوں کو دیا اور جو غریب تھے آپؐ انھیں میں رہے، انھیں میں پیدا ہوئے یتیم بن کر آپؐ نے دنیا میں قدم رکھا تاکہ آپؐ کی امت میں غریب لوگ یہ دیکھ کر مایوس نہ ہو جائیں کہ آپؐ بھی امیر ہیں۔ دوستو! آج نظامِ مصطفٰے کی بات کی جاتی ہے لیکن جب قومی اسمبلی میں یہ شق آئی آئین میں کہ اسلام سرکاری مذہب ہوگا پاکستان کا اس لیے کہ جس طرح ایک فرد کلمہ پڑھتا ہے اس طرح قوم کو بھی کلمہ پڑھنا چاہیے اور یہ شق صدر ناصر کے آئین میں بھی موجود ہے جن پر کفر کے فتوے لگے ہیں۔ ہم نے پچیس سال میں پہلی مرتبہ یہ شق رکھی ہے آئین کے اندر کہ اسلام مملکت کا سرکاری دین ہوگا۔ مملکت مسلمان ہو گی، مملکت بھی کلمہ پڑھے گی۔ آج جو لوگ سیاسی مقاصد کے لیے ایکسپلائٹ کرتے ہیں مذہب کو ان سب لوگوں نے اس شق کے حق میں ووٹ نہیں دیا قومی اسمبلی کے اندر نظامِ مصطفٰے کا یوم منانا آسان ہے عمل کچھ اور ہے اس لیے کہ ہم گنہگاروں کی طرف سے یہ بات پیش ہو رہی تھی اس لیے کہ ان لوگوں کی طرف

لیکن آپ کی پاؤں سے یہ بات پیش ہو رہی تھی کہ جن پر یہ کفر کے فتوے لگے مگر جو گنہگار ہیں۔ لیکن آپ کی پاؤں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ سمجھتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی طرف سے شق پیش کی جا رہی تھی۔ یوم منانا آسان ہے لیکن پچیس سال میں تم میں سے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی تھی کہ قرار داد مقاصد میں وہ اس غلطی کی اصلاح کرتا، وہ اس عبارت کی اصلاح کرتا جو تمہاری طرف سے اس کے اندر موجود تھی اور وہ یہ تھی کہ اس میں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات مملکت کو دے دیے اور مملکت جو ہے وہ عوام کے نمائندوں کے ذریعے سے وہ اختیارات استعمال کرتی ہے۔ جب کوئی اپنے اختیارات کسی کو دے دیتا ہے تو خود تو پھر وہ عضوِ معطل ہے تو پھر تو اس کائنات کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر تو وہ رام کی لیلا والا تصور صحیح ہے کہ رام بیٹھا ہے لیلا سو رہی ہے، رام دیکھ رہا ہے۔ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ اسلام کا عقیدہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی حاکمیت کسی کو عطا نہیں کرتا کسی کو نہیں دیتا، کسی کو تفویض نہیں کرتا کسی میں منتقل نہیں کرتا اس لیے ریاست کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت دیے جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہم نے اس کی ترمیم پیش کی ہم نے اس کو مؤدب کیا تم یوم مناتے رہو، آج بھی یوم مناتے رہو، لیکن یہ شرف پاکستان کے ان نمائندوں کو حاصل ہوا ہے جو آج بھی اپنے آپ کو غلامِ مصطفےٰ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور تمہیں تھے وہ جنھوں نے پھر یہ کیا کہ جب ووٹ کا معاملہ آیا تو ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔ ووٹ نہیں دیا۔ جب دستخط کرنے کا مرحلہ آیا تو دستخط کر دیے۔ دوستو! مجھے بتاؤ کوئی منطق کوئی لاجک، کوئی اصول کہ ووٹ نہ دو لیکن دستخط کر دو۔ اب دستخط کرنے میں ایک بات تھی۔ آئین میں شق تھی کہ جو آدمی آئین کو نہ مانے گا اس کی سیٹ اس کے قبضے سے چلی جائے گی تو میں اس لیے کہتا ہوں کہ دوستو! وہ سراج منیر آیا اور روشن آفتاب آیا تو سب کے لیے آیا، جاہلوں کے لیے بھی، عالموں کے لیے بھی، غریبوں کے لیے بھی، امیروں کے لیے بھی اور کٹیا والوں کے لیے بھی اور ان محلوں کے لیے بھی اس نے روشن کر دیا بلند کو بھی پست کو بھی اور اس کی روشنی قیامت تک رہے گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سورج کی

روشنی پرانی ہوگئی۔ آج کچھ لال بجھکڑ نام نہاد دانشور پیدا ہو گئے وہ کہتے ہیں کہ اسلام پرانا ہوگیا۔ پرانا تو سورج بھی ہے کہہ دو کہ ہمیں سورج نہیں چاہیے۔ کہہ دو اس کی روشنی نہیں چاہیے۔ دیکھتا ہوں کتنے دن جیتے ہو۔ اس کائنات کے اندر کہہ دو ہوا پرانی ہے ہم اسے نہیں مانتے ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ کہہ دو ہمیں روشنی کی حاجت نہیں ہے تو کوئی چیز پرانی ہو تو ضروری نہیں کہ آج کے دور میں اس کی ضرورت ہی نہ ہو۔ سورج پرانا ہے مگر نیا بھی ہے وہ آفتاب عالم تاب پرانا بھی تھا۔ کیونکہ اس وقت طلوع ہوا جب آدمؑ ابھی بین ماء و الطین تھا؟ اس وقت وہ سورج طلوع ہوا لیکن وہ جتنا پرانا ہے اتنا نیا بھی، وہ کل کے لوگوں کے لیے بھی تھا آج کے لوگوں کے لیے بھی ہے۔ قیامت تک کے لوگوں کے لیے بھی ہے۔ اس کی روشنی جس طرح کل کے لیے تھی اسی طرح آج کے لیے بھی ہے۔ اسی طرح آئندہ کے لیے بھی رہے گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ پرانی ہے۔ اس لیے ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کا نظام، آپ کے اصول وہ ہیں جو قیامت تک کے لیے ہیں۔ ان اصولوں کے اندر ہم اپنی تفصیلات ملت کے مشورہ سے طے کریں گے اور جن کے اندر ہمیں اجازت دی گئی ہے۔ قوم کے نمائندے مل بیٹھ کر ان اصولوں کے اندر نظام کی تفصیلات طے کریں وہ تفصیلات ہم طے کریں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ ایک فرد کو دیکھ کر ہم اپنا دین بدلنا شروع کر دیں کہ جب وہ شخص جو صدر ہو تو ہم کہیں کہ صدارتی نظام اسلام کے خلاف ہے اور جب وہ وزیرِ اعظم بننے لگے تو کہیں کہ نہیں پارلیمانی نظام ٹھیک ہے لیکن اختیارات صدر کو ہونے چاہییں۔ ہم یہ تماشا نہیں کریں گے اس لیے کہ پارلیمانی نظام ہو، صدارتی نظام ہو، کوئی نظام ہو جس میں ملک کا بھلا ہے، جس میں ملت کا بھلا ہے۔ اسے ہم آپؐ کے دیے ہوئے اصولوں کے حدود میں رہتے ہوئے اختیار کرنے کے مجاز ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس نظام میں نظامِ مصطفےٰ کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

دوستو اور بزرگو! آج کے دن جو عید میلاد کا مقدس دن ہے۔ آج کے دن ہمیں یہ

طے کرنا ہے۔ آج کے دن ہمیں یہ سوچنا ہے۔ آج کے دن ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس آفتاب عالم تاب سے ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ اس کی روشنی سے اپنے سینوں کو منور کرتے رہیں گے۔ اپنے ذہنوں کو جلا دیتے رہیں گے۔ اس کی روشنی کو عام کریں گے۔ اس کے آگے فصیلیں نہیں باندھیں گے۔ فصیلیں باندھیں بھی تو روشنی پہنچے گی۔ آج ہم اپنے اندر آنتیں بنائے ہوئے ہیں، جماعتیں بنائے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں گروہ کے سوا کوئی آدمی نظامِ مصطفےٰ کی کملی کے اندر آنے کے قابل نہیں ہے۔ دوستو دیکھو وہ کالی کملی والا اتنا سخی تھا کہ جب حاتم طائی کی بیٹی آئی جو کافرہ تھی اور آپؐ کو معلوم ہوا کہ یہ اس کی بیٹی ہے آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی کہ اس پر وہ بیٹھے اس کے لیے آپؐ نے یہ احترام کیا کہ جو تمہارے نزدیک ایک کافر کی بیٹی تھی، جو پکڑی ہوئی دشمن کے کیمپ میں تھی۔ اس کے لیے بھی احترام کیا اور آپؐ نے تو نجران سے آئے ہوئے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں اپنے طریقوں سے عبادت کرنے کی اجازت عطا کی ابن قیم کی زاد المعاد دیکھ لو۔ اپنے پاس سے حوالہ نہیں دے رہا ہوں اور جب طائف سے بنو ثقیف کا وفد آیا تو مسجد نبوی میں ان کے خیمے لگائے گئے۔ اس مسجد نبوی میں ایک نماز کے عوض پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ اس میں خیمے لگے۔ وہ مہمان خانہ بنی اور جب بعض لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو ناپاک ہیں، یہ تو نجس ہیں، مشرک ہیں، بت پرست ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، لیس علی الارض من نجاستھم شئے۔ ان لوگوں کی نجاست کا عقیدہ کی نجاست کا زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ نے تو یہ رواداری ان کے لیے دکھائی۔ یہ فراخ دلی ان کے لیے دکھائی۔ اور تم کیا ہو مسجدوں پر بورڈ لگے ہوئے ہیں کہ یہاں اس عقیدے کا آدمی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ روشنی صرف ان لوگوں کے لیے ہے اور ان لوگوں کے لیے نہیں ہے اور غلطی سے کوئی آجائے غریب تو کہتے ہیں اسے نکال دو۔ دھوؤ کیونکہ مسجد ناپاک ہو گئی ہے۔ تم نے اس روشنی کو کب سے اپنی جاگیر بنا لیا۔ تم نے کب سے اس کو ملکیت بنا لیا؟ تم نے کب سے یہ حق لے لیا؟ یہ لمبے لمبے دم چھلّے اپنے نام کے

ساتھ لگانے کے بعد یہ حق لے لو کہ مسلمانوں کو اس روشنی سے بھی محروم کرنے کے ٹھیکیدار بن گئے ہو جس کو سرٹیفکیٹ دو وہ اس روشنی کو لے سکتا ہے اور جس کو نہ دو، وہ نہیں لے سکتا ٹھیک ہے میں تو اندھیروں کا مارا ہوا انسان ہوں۔ اندھیروں میں بھٹکا ہوا انسان ہوں۔ گناہوں کی ظلمتوں کا مارا ہوں۔ بھٹکا ہوا انسان ہوں۔ میں کوئی نورانی نہیں ہوں۔ مجھ میں نور نہیں ہے اور نہ میں نورانی ہوں نہ صدیقی ہوں نہ قادری ہوں نہ چشتی ہوں نہ بدایونی ہوں اور میں کچھ نہیں ہوں۔ لیکن میرے دوستو! یہ ساری قوم ان سارے دم چھلوں کے نہ ہونے کے باوجود آپ کی اپنی ہے۔ کالی کملی والے کی غلام ہے۔ آپ کی محبت میں جان دینے والی ہے۔ آپ کے نام نامی پر کٹ مرنے والی ہے اور یہی ایک تعلق اس ذات پاک سے کافی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ ایک تعلق اس قوم کو دنیا میں زندہ رکھے گا اور آخرت میں آپ کی شفاعت کا اس کو شرف حاصل ہو گا۔ میرے دوستو! یہ محبت خوب ہے۔ یہ روشنیاں خوب ہیں۔ یہ ظاہر میں ہیں کاش ان روشنیوں کو ہم اپنے سینوں میں بھی جگہ دے سکیں۔ یہ زیبائش و آرائش خوب ہے۔ کاش! ہم دل کے اُجڑے ہوئے ویرانوں میں بھی اس زیبائش و آرائش کو جگہ دے سکیں۔ یہ دروازے خوب ہیں۔ یہ گیٹ خوب ہیں۔ یہ محرابیں خوب ہیں۔ کاش! روح کے اندر بھی ہم کوئی دروازہ لگا سکیں۔ اس کے اندر بھی کھڑکی ہو۔ اس کو تو ہم نے بند کر دیا ہے۔ مقفل کر دیا ہے۔ تازہ ہوا اس کو لگنے نہیں دیتے۔ آؤ عہد کریں کہ ہم بھی اپنے آقا و مولا کی سنت پر چلتے ہوئے معراج حاصل کریں گے۔ کیسے معراج حاصل کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ الصلوٰۃ معراج المؤمن نماز مومن کی معراج ہے کیونکہ اس کے اندر عاجزی ہے۔ اس میں آدمی جھکتا ہے۔ اپنے رب کے سامنے اپنے آپ کو خاک پر ڈال دیتا ہے۔ اپنا اکڑا ہوا سر زمین پہ رکھ دیتا ہے۔ عاجزی جو کرتا ہے اس کو بلندی ملتی ہے۔ محمد مصطفےٰ اتنے جھکے کہ اس کے بعد جھکنے کا کوئی مقام باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے اتنا بلند ہوئے کہ بلندیوں کا اس کے بعد کوئی مقام نہ رہا تو اس لیے آؤ آج کے دن ہم طے

کریں کہ معراج حاصل کریں گے۔ ہماری معراج کیا ہے۔ ہم عرش تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم تو لوح و قلم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم تو چاند پر پہنچ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا تیر مار لیا۔ حالانکہ ابھی ایسے ستارے اس خلا کے اندر ہیں کہ ان کی روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے اور جب سے کائنات بنی ہے ان ستاروں کی روشنی زمین تک پہنچ نہیں سکی اور ابھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے معراج حاصل کر لی۔ ہماری معراج یہ نہیں ہے کہ ہم یہ مقام حاصل کر سکیں۔ وہ ایک ہی ہستی تھی جو لوح و قلم تک پہنچی جو قاب و قوسین او ادنیٰ کی صفت سے موصوف ہوتی اس مقام پر پہنچی کہ جہاں کوئی مقام نہ تھا۔ اس کیفیت پر پہنچی کہ جہاں کوئی کیفیت نہ تھی۔ یہ اس کی ذات کے لیے خاص ہے۔ ہماری معراج کیا ہے۔ ہماری معراج یہ ہے کہ ہم آپؐ کے گرد پا کو، آپ کے نقشِ قدم کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنا لیں۔ آپؐ تک پہنچ جائیں۔ یہ ہماری معراج ہے۔ اس لیے میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ آپ سے خطاب کرتے ہوئے، آپ سے عرض کرتے ہوئے اپنے آقا و مولا سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے حضور آپ کی طرف سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ عہد کرتے ہوئے اس پوری قوم کی طرف سے اس موقع پر جب کہ آئین بنایا ہے۔ ہم نے ربیع الاول کے مبارک دنوں میں جس آئین پر اس مبارک مہینہ کی برکتیں پرتوفگن ہیں اور سعادتیں پرتوفگن ہیں اور اس مبارک مہینہ کی عظمتیں پرتوفگن ہیں۔ اس مبارک مہینہ میں جس میں ہفتہ آئین کا تکملہ آج کے مبارک دن ہو رہا ہے اور جس میں مساواتِ محمدیؐ کی جھلک ہے۔ ہم نے وہ آئین بنایا ہے۔ آج یہ عہد کرتے ہوئے کہ اس آئین کی حفاظت کریں گے۔ کسی کو اس آئین کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دیں گے۔ یہ عہد کرتے ہوئے کہ ہر سازش کو ناکام بنا دیں گے۔ یہ عہد کرتے ہوئے اپنے آقا و مولا سے عرض کرتے ہیں۔ یہ وعدہ دُہراتے ہوئے آپ سے عرض کرتے ہیں کہ ؂

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا
میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

دورِ جدید میں اسلام کی خدمت کس طرح ممکن ہے؟

"۱۹۶۵ء میں جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد مجھے لائل پور کی جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ نے اپنے سالانہ اجلاس میں تقریر کرنے کی دعوت دی ــــــ استاد محترم حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صدرِ جلسہ تھے۔ اس تقریر میں ہر چند کہ جماعتِ اسلامی کا نام نہیں لیا گیا مگر بین السطور میں اس اختلاف کی واضح جھلک موجود ہے جو جماعت سے میرے استعفے کا باعث بنا تھا۔ اس لحاظ سے یہ تقریر بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ مودودی صاحب سے خط و کتابت کے بعد میں نے پہلی مرتبہ ایک جلسۂ عام میں خدمتِ اسلام کے غلط تصورات پر تنقید کرتے ہوئے اس کا صحیح تصور اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تقریر بھی ہفت روزہ "شہاب" سے ماخوذ ہے اور اس پر "ادارہ شہاب" نے جو نوٹ

دیا ہے وہ بھی قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو گا۔"

نوٹ کے الفاظ یہ ہیں :

"حضرت مولانا عبدالرحیم اشرف کے جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ لائل پور کے سالانہ اجلاس کا تذکرہ ان صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اس میں مدیر "شہاب" نے جو تقریر کی تھی وہ معاصر "المنبر" کے شکریے کے ساتھ "شہاب" میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ سے نقل کی گئی ہے اور تقریر بلفظ ہے۔ مدیر شہاب کا خطبۂ جمعہ ان کے تبلیغی دوروں کی وجہ سے دو تین شماروں سے شائع نہیں ہو رہا ہے امید ہے قارئین اس تقریر کو خطبۂ جمعہ کا بدل پائیں گے۔"

صدرِ گرامی قدر! بزرگانِ محترم اور دوستانِ عزیز!

لائل پور میں اس سے قبل ایک تقریر کی تھی مگر اس وقت ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ لیکن آج تقریر کرتے ہوئے بہت سی دقّتیں محسوس کر رہا ہوں۔ سب سے بڑی ذہنی رکاوٹ یہ ہے کہ مجھے اپنے استادِ مکرّم حضرت مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے سامنے لب کشائی کرنا پڑ رہی ہے میں اسے بڑی جسارت سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ بزرگوں کے سامنے مجھ ایسے آدمی کی مثال وہ ہے کہ ایک چوہے کو ہلدی کی ایک گانٹھ مل گئی اور اس نے جا کر پنساری کی دُکان کھول دی۔

دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ موضوع جو مجھے دیا گیا ہے اس پر صبح کی نشست میں مولانا سید ابوبکر غزنوی صاحب اور آج خود مولانا اشرف صاحب نے اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ اب میری گفتگو اصل موضوع پر حاشیہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

تو اب میں کیا کہوں اور کیسے کہوں؟ یہ میرے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔

تیسری رکاوٹ خود موضوع کا انتخاب ہے۔ صبح بھی حکیم صاحب محترم کے بارے میں ایک فاضل مقرر نے شکایت کی تھی کہ موضوع انھوں نے بڑا سخت ان کے ذمہ لگایا اور مجھے بھی اب یہی کہنا پڑ رہا ہے کہ ؂

شوخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مجھے بھی ان سے یہی شکایت کرنا پڑ رہی ہے کہ انھوں نے جو موضوع میرے ذمہ لگایا ہے وہ واقعی بڑا کٹھن، بڑا سنگلاخ، بڑا جاں گداز اور بڑا صبر آزما ہے۔

اس دَور میں اِسلام کی خدمت کس طرح ممکن ہے؟

یہ موضوع ـــــ اوّل تو اتنا تفصیلی اور اتنا پہلو دار ہے، اور اس کے اتنے گوشے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا یوں ہے جیسے کوئی اڑتی ہوئی چڑیا کے پر گننے کی کوشش کرے یا پانی پر گرہ لگائے یا بہتے ہوئے دریا کی موجوں کو گننے کی کوشش کرے ـــــ "خدمتِ اِسلام کس طرح ممکن ہے؟" ـــــ کس کے لیے ـــــ؟ عوام کے لیے؟ ـــــ علماء کے لیے؟ ـــــ پروفیسروں کے لیے؟ ـــــ دانشوروں کے لیے؟ ـــــ اساتذہ کے لیے؟ ـــــ ڈاکٹروں کے لیے؟ ـــــ اطبار کے لیے؟ ـــــ والدین کے لیے؟ ـــــ حکمرانوں کے لیے؟ ـــــ کس کس کے لیے؟ ـــــ خود میرے لیے!

اب یہ ساری باتیں اتنی تفصیلی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی لیا جائے تو رات ختم ہو جائے مگر مضمون ختم نہیں ہوگا اور یوں بھی اس کی مشکل اس موضوع کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ اس "دورِ جدید میں اسلام کی خدمت کس طرح ممکن ہے؟" میں یہ "ممکن ہے"

کا لفظ بڑا قابلِ غور ہے' یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ بات کچھ ایسی مشکل ہے کہ کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ کس طرح ممکن ہے ؟ گویا وہ اس منزل پر پہنچنے والا ہے یا پہنچ رہا ہے کہ یہ تو ناممکن بنا دی گئی ہے۔ بہت مشکل کر دی گئی ہے۔ بہت دشوار کر دی گئی ہے تو اب اس دشوار کو سہل بنانا اور اس ناممکن کو ممکن بنانا ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

پھر ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ اس موضوع کے اندر کچھ بحثیں ایسی بھی آجاتی ہیں جن سے دوستوں کو شکایت پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

راہ رو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

اور وہ حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ :

"بہترین جہاد سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے"۔

تو یہ حقیقت ہے کہ "سلطان جائر" سے مراد صرف حکمران ہی نہیں ہیں۔ "سلطان" کے معنی طاقت، اتھارٹی، جائر، جور کرنے والی ظالم طاقت، استبدادی قوت۔ کل صرف حکمران اس کے مصداق ضرور تھے کیونکہ قوت و اقتدار کے ذرائع اور وسائل فقط انھیں کے ہاتھ میں تھے' اور عوام کو کوئی دخل حاصل نہ تھا۔ سلطنت کے مسائل میں ، اقتدار کے معاملات میں، اختیارات کے معاملات میں ——— مگر یہ دور عوامی اور جمہوری دور ہے اور اس میں جہاں اختیار حکمرانوں کے پاس ہے وہاں خود عوام کے پاس بھی ہے۔ وہ برا بھلا سہی ، وہ خلاصوں کے ذریعے نچڑ نچڑ کر ہی ان کے پاس آیا ہو، کہ پہلے عوام کا خلاصہ نکلا بنیادی جمہوریتوں کے ذریعہ اور پھر ان خلاصوں کی مدد سے اقتدار حاصل کیا گیا یہ الگ بات ہے' مگر پھر بھی ہماری جمہوریت یہی کہتی ہے اور اب تو خود علمائے کرام کہنے لگے ہیں کہ طاقت اور اختیار کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔ تو گویا اقتدار عوام کے پاس بھی ہے ، اختیار عوام کے پاس بھی ہے۔ ذرائع و وسائل عوام کے پاس بھی ہیں۔ اور آج یہ عوامی طاقت بھی اتنی استبدادی بن چکی ہے کہ اگر یہ غلط راہوں

پر جارہی ہو اور اگر اس کے سامنے غلط نقطہ ہائے نظر ہوں تو یہ اتنی خطرناک استبدادی طاقت بن جاتی ہے کہ حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنا تو آسان ہوتا ہے مگر عوام کے سامنے کلمۂ حق کہنا بے حد مشکل بن جاتا ہے۔ حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے پر "واہ واہ" ہوتی ہے، داد ملتی ہے۔ "زندہ باد" کے نعرے لگتے ہیں۔ پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں اور جرأت اور دلیری کے گیت گائے جاتے ہیں اور اس کی بہادری کے چرچے ہوتے ہیں لیکن عوامی رجحانات کے خلاف بات کرنا اپنی مقبولیت اور اپنے ہر دلعزیزی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے اور وہ لوگ جو حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا جانتے ہیں جو جیلوں سے نہیں ڈرتے، جو جیل کی آہنی سلاخوں سے نہیں ڈرتے۔ تختۂ دار پر جھول سکتے ہیں جن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینا کچھ مشکل نہیں۔ بہت کم ان میں سے ایسے ہوئے ہیں اور ہر دور میں یہی رہا ہے کہ وہ عوام کے سامنے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر سکیں۔ تو وقت یہ بھی ہے ڈرتا اس سے بھی ہوں کہ دوست ناراض نہ ہوں۔ قوم ناراض نہ ہو جو بات کہوں گا تلخ بھی ہے اور ع

"نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی"

کی بات مشہور ہے ہی تو اس تلخی کو آپ کے سامنے رکھتے ہوئے کچھ ڈر محسوس ہوتا ہے اگرچہ یہ عرض ضرور کروں گا کہ ؎

"چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی"

تو حضراتِ محترم! مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ میں یہ عرض کروں کہ —— "اس دور میں اسلام کی خدمت کس طرح ممکن ہے"؟

مسلمانوں کی "اِسلام پسندی": یہ "خدمتِ اسلام" کا لفظ بہت غلط فہمی

پیدا کرتا ہے۔ اپنے ذوق کی بات عرض کرتا ہوں ایک لفظ ہے "اسلام پسند" وہ میں بھی لکھتا بولتا ہوں اور سب حضرات لکھتے بولتے ہیں۔ وہ چلا ایسا ہے، رائج ایسا ہوا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ہے مگر ذوق نے ایسا کیا ہے کہ آخر یہ "اسلام پسند" لفظ ہے کیا؟ اسلام کو پسند کرنے والے، تو مسلمان کی تعریف اب صرف یہ رہ گئی ہے کہ وہ اسلام کو پسند فرماتا ہے۔ جیسے مجھے یہ اچکن پسند ہے، مجھے یہ ٹوپی پسند۔ مجھے یہ چشمہ پسند ہے۔ اس طرح مسلمان اسلام کو پسند فرماتے ہیں یہ اس پر احسانِ عظیم ہے کہ یہ اسے پسند کرتے ہیں اور یہ بھی غنیمت ہے کہ پسند کرتے ہیں۔ ایک دَور وہ تھا کہ جان و مال رکھ دیے جاتے تھے، اسلام کے حضور میں، اسلام کے آگے بیچ دیا جاتا تھا جان کو، مال کو اور اولاد کو، اسلام ـــــ پسند اور ناپسند کا مسئلہ نہ تھا۔ خواہش یہ ہوتی تھی کہ خدا کرے کہ اسلام ہمیں پسند کر لے۔ اب یہ دَور آ گیا ہے کہ ہم اسلام کو پسند فرمانے لگے ہیں۔ تو اس لفظ سے بھی کچھ تکلیف ہوتی ہے ایسے بولتے ہوئے، لکھتے ہوتے کئی دفعہ کوشش کی کہ نہ لکھیں، نہ بولیں، مگر رائج ایسا ہوا ہے اس دورِ جدید کی اسلامی لغت میں کہ بڑی مشکل ہوتی ہے کہ یہ لفظ استعمال نہ ہو۔

خدمتِ اسلام اصل میں اپنی ہی خدمت ہے

اور دوسرا لفظ "خدمتِ اسلام" کا ہے جو اس دور کا نہیں مگر عام طور پر جب اسے استعمال کیا جاتا ہے تو غلط فہمی اس سے بھی پیدا ہوتی ہے، اسلام کی خدمت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسلام آپ کی خدمت کا محتاج اور حاجت مند ہے یا اگر اسلام کو آپ کی خدمات مہیا نہ ہوں تو اس کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خدمتِ اسلام کا ہرگز یہ مفہوم نہیں جو ظاہراً سامنے آتا ہے۔ بلکہ خدمتِ اسلام اصل میں خود اپنی خدمت ہے۔ اسلام کی خدمت نہیں، جیسے اللہ کا حق۔ اللہ کا حق ان معنوں میں نہیں کہ اگر ہم ادا نہ کریں تو اللہ کا کچھ نقصان ہو جائے گا اور اگر ادا کر دیں تو اللہ کی حکومت میں اور اس کے خزانہ

میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔ اللہ کا حق اصل میں حق النفس ہے، اپنا ہی حق ہے۔ جسے ادا کریں تو فائدہ خود اپنے آپ کو پہنچتا ہے اور ادا نہ کریں تو نقصان بھی اپنے آپ کو ہوتا ہے۔ تو خدمت اسلام کا مفہوم بھی یہی کچھ ہے کہ اگر اسلام کی خدمت کرتے ہیں تو خود اپنی ذات پر احسان ہے، خود اپنی خدمت ہے، نجات ہمیں ملے گی، اسلام کو اگر ساری دنیا مل کر چھوڑ دے تو اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا اور اگر اسلام کو ساری دنیا مل کر اختیار کر لے تو اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ تو خدمتِ اسلام ان معنوں میں نہیں ہے کہ آپ کی احتیاج لاحق ہے اسلام کو یا آپ کا حاجت مند ہے اسلام، یا، آپ کی نصرت و تائید چاہتا ہے۔ چاہتا ہے مگر آپ کے لیے چاہتا ہے، آپ کی بھلائی اس کے پیشِ نظر ہے۔ آپ کی دنیا و آخرت اس کے سامنے ہے آپ کو بنانا چاہتا ہے، آپ کو بگاڑ سے بچانا چاہتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی خدمت کرتے ہیں تو اسلام کی خدمت سے آپ اس پر کوئی احسان نہیں کرتے۔

اسلام کی خدمت یا اسلام کی پیروی

اب مشکل یہ ہے کہ اسلام کی خدمت کے لیے شرطِ اول یہ ہے کہ اسلام کی پیروی کی جائے میں کہتا ہوں کہ اسلام کی خدمت یہ ہے کہ اسلام کی پیروی کی جائے اور مجھ سمیت اسلام کے جو جدید خادم ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی ہم خدمت تو کریں لیکن اسلام کی پیروی نہ کریں اپنے ذاتی معاملات میں اسلام کی پیروی نہ کریں۔ اپنی اولاد کی تربیت کے معاملہ میں اسلام کی پیروی نہ کریں۔ اپنے ادارہ کو چلاتے ہوئے اسلام کی پیروی نہ کریں۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جو شخص خدمتِ اسلام کرنا چاہتا ہے اس کو روزِ اول ہی سے اس شرط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ اسلام کی خدمت کر ہی نہیں سکتا جو خود اسلام سے گریزاں ہے تو ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ پوری قوم اسلام کی خدمت کرے اس کے لیے بھی یہی ایک صورت ہے کہ پوری قوم اسلام کی پیروی کرے تب اسلام کی خدمت کر سکتی ہے، پیروی کے بغیر اسلام کی خدمت کا لطف نہیں اور

یہ اس قوم کے لیے تو خاص طور پر بے حد ضروری ہے۔ اسی سے اُس کا تصور ہے، اسی سے اس کا تعین ہے، اسی شعور کی وجہ سے یہ قوم زندہ ہے۔ اسی کی وجہ سے تاریخ میں اس کا نام روشن ہے اسی کی وجہ سے یہ قوم ہزاروں خرابیوں کے باوجود آج بھی شاہراہ حیات پر حرکت واقدام کرنے کے قابل ہے۔ اس کا قومی وجود برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کی پیروی کرے۔ نبوت کا دروازہ بند ہو چکا، اب کوئی نبی نہیں آئے گا، اب کوئی ظلی نبی نہیں آئے گا۔ اب کسی بروزی نبی کی ضرورت نہیں، مُہر لگ چکی ہے اس محضر پر جس میں انبیائے کرام کے اسمائے گرامی لکھے تھے ؎

بصد یقین و بصد اعتبار دیدہ وری
تجھی پہ ختم ہے رُوح الامیںؑ کی نامہ بری

اب روح الامیں کسی کے نام، نامہ و پیام لے کر نہیں آئے گا۔ اب جبرائیل امین کسی کے پاس وحی لے کر نہیں آئے گا۔ اب کسی کو اللہ تعالیٰ عہدِ نبوت سے سرفراز نہیں فرمائے گا۔ اب یہ ذمہ داری امت کی ہے کہ دنیا کو اللہ کا پیغام دے اور دنیا کو آخرت کا خوف دلائے اور دنیا کو اسلام کی حیات بخش تعلیمات کا جامِ حیات پلائے۔ اب یہ ذمہ داری اس ملت کی ہے، اسی امت کی ہے، مسلمان قوم کی ہے، اقبال نے کہا ؎

"پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسُولِ ما رسالت ختم کرد
خدمتِ ساقی گری بر ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت

اب ساقی ہم ہیں، اور یہ جام ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہمیں زمانے کو پلانا ہے، اسی جام سے زندگی مل سکتی ہے۔ اسی جام سے سرودری مل سکتی ہے، اسی جام سے روحانی اور ابدی زندگی کے راز کھل سکتے ہیں، اسی جام سے دنیا کے پیچیدہ مسائل حل ہو سکتے ہیں اسی

جام سے ابدی حیات کے دروازے وا ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ جام ہے جو زمانے کے سارے دکھوں کے لیے نسخۂ شفا ہے مگر جس کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ساقی گری کرے اور دوسروں کو یہ جامِ حیات بخش پلائے، آج وہ دوسروں کے پیالوں سے سیراب ہونے کی کوشش میں ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ کسی دوسرے کا پس خوردہ حاصل کر لے تو اس پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے، جس کا ذمہ یہ تھا کہ وہ قیادت کرے اور امارت کرے، جس کا ذمہ یہ تھا کہ وہ مُقتدا بنے، اب وہ دوسروں کا مقتدی بننے میں مسرت محسوس کرتا ہے جس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسروں کا راہنما بنے وہ اب دوسروں کے نقشِ پا پر چلنے میں فخر محسوس کرتا ہے، جس کا کام یہ تھا کہ دوسروں کی دست گیری کرے، آج وہ خود زندگی کی پگڈنڈیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

خوش فہمی میں نہ رہیں!

سیاسی لیڈروں کی زبانی سنیں گے کہ قوم زندہ ہے، قوم بیدار ہے، قوم اسلام چاہتی ہے قوم کا ۹۹ فیصد طبقہ نظامِ اسلام کا شیدائی ہے، رکاوٹ صرف اربابِ اقتدار ہیں لیکن اگر اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور حقائق کی دنیا میں اتر کر اندازے لگائیں اور خوش فہمیوں میں نہ رہیں، سیاسی ضروریات کے لبادے نہ اوڑھیں تو یقین مانیے یہی نظر آئے گا کہ وہ جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے آج اس کی تعبیر ہمارے سامنے ہے کہ "اعمالکم عمالکم"۔ "تمھارے اعمال تمھارے اعمال ہیں"۔ جیسے تمھارے اعمال ویسے تمھارے حاکم ہوں گے، جیسے تم خود ہو گے ویسے تمھارے حکمران ہوں گے، حکومت تم سے عبارت ہے، اربابِ اقتدار تم میں سے ہیں، وہ تمھارا ہی نچوڑ ہوں گے، تمھارا ہی خلاصہ ہوں گے، تمھاری ہی رُوح ہوں گے، وہ اسی دودھ کے مکھن ہوں گے، اگر یہ دُودھ ہی زہر آلُود ہو گیا، دودھ ہی خراب ہو گیا تو مکھن کے بارے میں کیوں توقع باندھیں

جو آخر اسی دودھ میں سے نکلنا ہے۔ خدمتِ اسلام اگر قوم کو انجام دینی ہے تو ایک ہی راستہ ہے کہ اس کا ہر ایک فرد اسلام کی پیروی کے لیے کمربستہ ہو جائے، یہ نہ دیکھے کہ قوم غلط راستے پر جا رہی ہے، وہ اپنے آپ کو تیار کرے، اپنے آپ سے ابتدا کرے، وہ اسلام کی پیروی کے لیے کمربستہ ہو جائے، ایک ایک فرد اگر تیار ہونے لگے تو وہ وقت آسکتا ہے جبکہ پوری قوم بدل جائے، لیکن مصنوعی تبدیلیوں اور تدبیروں سے اس قوم کی حالت نہیں بدل سکتی۔ مرض بہت گہری جڑیں پکڑ چکا ہے۔ یہ روگ بہت دیرینہ ہو چکا ہے۔ سطحی علاج سے اس کا ازالہ ممکن نہیں۔

امت کا روگ "حبِ مال" ہے

وہ روگ کیا ہے، وہ مرض کیا ہے؟ ایسا نہیں کہ مجھ میں نہیں، مجھ میں بھی ہے، آپ میں بھی ہے، ہم سب میں ہے، اور جب تک یہ مرض ہے، یہ روگ ہے، یہ خدمتِ اسلام نہیں کرا سکتا۔ یہ خدمتِ اسلام کرنے نہیں دے گا۔ خدمتِ اسلام کرنے کے لیے اس کا علاج کرنا ہوگا۔ اور وہ مرض کیا ہے؟ وہ روگ کیا ہے؟ ہمارے آقا و مولیٰ، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حبّ الدّنیا راس کل خطیئۃ"

کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

تمام گناہوں کی جڑ ہے، جتنے مرض تم دیکھ رہے ہو روحانی، جتنی خرابیوں میں تم آج اپنی قوم کو پاتے ہو، ان کی تہ میں اتر کر دیکھو تو حبِ دنیا ہی تمھیں نظر آئے گی۔ اسی لیے تو فرمایا تھا ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

"لکلّ امّۃ فتنۃ وفتنۃ امّتی حال"

ہر اِمّت کے لیے ایک آزمائش ہے اور میری امت

کی آزمائش مال ہے۔

یہ مال پہلی امتوں میں بھی تھا، یہ دنیا پہلی امتوں میں بھی تھی مگر وہ اپنی زیبائش و آرائش کے ساتھ عُریاں نہ تھی، فطرت نے اپنا جمال بے نقاب نہیں کیا تھا۔ یہ عروس ہزار دامادیوں دلہن بن کر نہیں آئی تھی جیسے آج یہ بنی ٹھنی بیٹھی ہے۔ جیسے آج زیبائش و آرائش کے سامان اس میں ہیں۔ یہ کبھی کسی زمانہ میں نہیں تھے۔ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یعنی نبوت آخری کا زمانہ قیامت تک کے لیے ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جس میں انسان تسخیرِ کائنات کے ارادے کر رہا ہے انسان کل خواب دیکھتا تھا کہ وہ اڑن کھٹولے میں سوار ہوا میں جا رہا ہے۔ لیکن آج وہ عملاً اڑن کھٹولوں میں اڑا پھر رہا ہے۔ کل وہ تصور نہیں کرتا تھا کہ اونٹ اور گھوڑے سے بھی بڑھ کر کوئی تیز رفتار سواری ہو سکتی ہے لیکن بھاپ کے دیو کو قابو میں کرنے کے بعد اب وہ مشینوں کے بل پر اڑا پھر رہا ہے اور پرندے کی طرح فضا میں تیر رہا ہے۔ آج انواع و اقسام کے وہ کھانے، وہ لذتیں، وہ سامانِ آرائش، وہ رہن سہن کے طریقے اس کو میسر ہیں، وہ عمدہ فرنیچر اس کو مہیا ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھا۔ یہ مال و دولت، دنیا کے انداز، آج آزمائش کا جو پہلو لیے ہوئے ہیں وہ کل نہ تھے اور جس جس مصلح نے اصلاحِ احوال کی ٹھانی جس جس نے قوم کو خدمتِ اسلام کے قابل بنانا چاہا تو اس نے سب سے پہلے اسی حبِ دنیا کے بت پر ضرب کاری لگانے کی کوشش کی کیونکہ اگر یہ بت موجود ہے تو " ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں" بت پرستی کا وہ زمانہ تو گیا جب مٹی کے بت بنائے جاتے تھے۔ جب انسان پیشاب کرتا تھا تو اس پیشاب کی گیلی مٹی سے بت بنا کر اس کے آگے سربسجود ہو جاتا تھا۔ وہ زمانہ اسلام کے فیوض و برکات کی وجہ سے ختم ہو گیا مگر ؎

"بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات"

اب زمانہ نے نئے نئے بت تراش لیے ہیں۔ ان میں وطن بھی ہے، قوم بھی ہے، بینک بیلنس بھی ہے، موٹر کار بھی ہے، بنگلہ بھی ہے، ممبری بھی ہے، یہ سارے نئے بت ہیں۔ اب ساری دنیا ان ہی کی پرستش کرتی ہے۔ قوم اگر خدمتِ اسلام کرنا چاہتی ہے تو بتدریج اس کو خوفِ آخرت کی طرف آنا ہوگا۔ آخرت کا خوف دِلوں میں بسانا ہوگا۔ آخرت کے خوف کے لیے اپنے آپ کو اللہ کے حضور سجدہ میں گرانا ہوگا اور حُبِّ دُنیا سے جتنا بھی وہ کنارہ کش ہو سکتی ہے اسے کنارہ کش ہونا پڑے گا اگر وہ نہیں ہوتی ہے تو کسی غلط فہمی میں نہ رہیں اور ضروری ہے اور بالخصوص پاکستان میں بسنے والی قوم کے لیے کہ یہ پیرویِ اسلام کرے تاکہ خدمتِ اسلام کر سکے۔ اور یہ اس لیے بھی کہ اس نے پاکستان کو بڑی امنگوں اور آرزوؤں اور بڑی امیدوں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ اور اسے تو زمانہ بھر میں اسلام کی شہادت کا حق ادا کرنا تھا۔ اب کس منہ سے یہ قوم غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گی۔ مولانا رومؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے زمانہ میں ایک غیر مسلم تھا۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے کہا کہ بھائی تو مسلمان کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے کہا۔ حضرت میں آپ جیسا مسلمان ہو نہیں سکتا اور جیسے دوسرے مسلمان ہیں، ویسا مسلمان میں بننا نہیں چاہتا۔ تو غیر مسلم جب دیکھتے ہیں کہ مسلمان قوم کا نقشۂ اخلاق یہ ہے کہ اس کے ہاں بندوں کے حقوق، بھائیوں کے حقوق، اپنے پڑوسیوں کے حقوق، اپنے محلہ والوں کے حقوق، اپنے شہریوں کے حقوق، بڑوں کے حقوق اور بچّوں کے حقوق کو یوں بری طرح کچلا جا رہا ہے، روندا جا رہا ہے، پامال کیا جا رہا ہے کہ جیسے ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ جس سوسائٹی میں پانی تک مہنگا ہے اور انسان کا خون، مسلمانوں کا خون ارزاں ہے، جس سوسائٹی کا یہ حال ہے وہ خوش فہمی میں کیوں رہے اور مجھے معاف کرو اگر میں سخت لفظ کہوں۔ جنت الحمقاء میں کیوں بس رہے ہو جس سوسائٹی کا یہ عالم ہو وہ خدمتِ اسلام کیا کرے گی؟ کیا یہی تدابیر ہیں خدمتِ اسلام کی؟ کل قیامت

کے روز کیا منہ دکھا سکیں گے باری تعالیٰ کو ہم ہ جب یوگ یہ کہیں گے کہ ہم تو اسلام تو قبول کر لیتے مگر خود تیرے ماننے والے ہماری راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ ہم نے جب ان کے اعمال کو دیکھا تو ہم اسلام سے بددل ہو گئے، تو قوم کے افراد اگر اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ خود اسلام کی پیروی کریں۔ ہم میں سے ہر ایک اسلام کی پیروی کرنا شروع کر دے، اس انتظار میں نہ رہے کہ سارا ماحول بدلے گا تو میں بھی بدل جاؤں گا۔ ماحول یوں ہی بدلا کرتا ہے جب ایک ایک فرد بدلنے کے لیے تیار ہو جائے۔

علمائے کرام کا فرض

اور خدمتِ اسلام علما کو بھی کرنا ہے، ان کا تو فریضہ ہے وہ تو علومِ نبوّت کے وارث ہیں وہ تو جانشین ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے، ان کے ذمّہ یہ نازک فریضہ ہے، وہ زمانہ پر اسلام کی حقانیت واضح کریں۔ وہ پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک ہیں، نمک اگر خراب ہو گیا اور چراغ اگر بجھ گیا تو روشنی کی کرن کہاں سے حاصل کی جا سکے گی۔ مگر میں علما کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ میں ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں اور ان کی جوتیوں کو اپنے سر پر اٹھانے کے لیے تیار ہوں اور یہ احساس رکھتا ہوں کہ دین اگر آج بھی زندہ ہے تو انھی بزرگانِ ملت کی وجہ سے زندہ ہے کہ جنھوں نے چٹائیوں پر بیٹھ کر اور بھیک کے ٹکڑے مانگ کر قال اللہ و قال الرسول کی تعلیم دے کر ملت کے اندر دینی اقدار کو زندہ رکھا۔ یہ سب کچھ مانتے ہوئے، اعتراف کرتے ہوئے میں یہ کہتا ہوں اور افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ آج کے علما میں وہ ہمّت نہیں الا ماشاءاللہ وہ اس فرض کو بھلا بیٹھے ہیں جو ان کے ذمّے لگایا گیا تھا۔ آج وہ ان بحثوں میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ جن بحثوں کے بارے میں کل قیامت کے دن بھی ان سے نہیں پوچھا جائے گا۔ حضرت مفتی صاحب نے صبح اپنی مخصوص علمی زبان میں واضح کر دیا کہ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ

رفع یدین کرتے تھے یا نہیں، آمین اونچی کہتے تھے یا نہیں، جو باتیں پوچھی جانے کی ہیں ان کی طرف توجہ کم ہے اور جو باتیں پوچھی نہیں جاتی ہیں ان باتوں پر رزم آرائیاں ہیں اور ان باتوں پر ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈالا جا رہا ہے افسوس کہ وہ چراغ جو علمائے سلف نے اندھیروں میں فروزاں کیے تھے وہ گل ہو رہے ہیں اور وہ پھول جو انھوں نے راہ گزاروں میں کھلائے تھے آج کانٹے بن کر ہمارے دامنوں کو تار تار کر رہے ہیں، اور وہ پرچم جو انھوں نے فضاؤں میں بلند کیے تھے آج ان کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں، زمانہ چیلنج کر رہا ہے اسلام کو وقت چیلنج کر رہا ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ نئے نئے عقدے پیدا ہو رہے ہیں۔ نئی نئی گرہیں پیدا ہو رہی ہیں اور جدید تعلیم یافتہ لوگ، غیر مسلم ہی نہیں مسلمان بھی کہتے ہیں کہ اسلام میں ان کا کیا حل ہے۔ کوئی متفقہ حل ہے، ان باتوں کا آج تک تمھارے علماء سود کے بارے میں، بینک کے سود کے بارے میں متفقہ طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ اس کی حیثیت کیا ہے وہ کہتے ہیں انشورنس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تصویر کے بارے میں ایسی آرا ہیں جو آپس میں متصادم ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہوائی سفر میں اگر آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھا ہے تو سمت قبلہ کے تعین کا مسئلہ، نمازوں کے اوقات کے مسائل اور بہت سے مسائل جو اس ہوائی سفر سے پیدا ہوتے ہیں، یہ خون جو بطور تغذیہ مریض کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے، بطور غذا داخل کیا جاتا ہے، بطور علاج داخل کیا جاتا ہے، یہ جائز ہے یا ناجائز، خون تو حرام ہے، یہ خون کسی دوسرے کے جسم میں جب کہ اضطراری حالت بھی نہ ہو، داخل کیا جانا کیسا ہے۔ جب کہ یہ روش عام ہے کہ ہر ہسپتال میں ایسا کیا جاتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے علماء سے پوچھا ہے۔ جس کسی سے پوچھا اس نے وہ بات کہی جو پہلے نے بالکل غلط بتلائی تھی۔

نئے مسائل کا متفقہ حل تلاش کیا جائے: یہ زمانہ تقاضا کرتا ہے کہ کم سے

کم علماء کی ایک مجلس ایسی ہونی چاہیے جس میں ہر فرقہ کا، ہر مکتبِ خیال کا، ہر گروہ کا نمائندہ ہو، یہ علماء سر جوڑ کر بیٹھتے اور ہر وہ مسئلہ جو نیا پیدا ہوتا ہے اس پر باہم دگر غور و خوض کرتے، غور و فکر کرتے اور متفقہ طور پر ایک رائے ظاہر کرتے اور اس طرح یہ ثابت کرتے کہ اسلام دنیا بھر کے مسائل کا حل ہے اور اسلام کبھی بھی انسانوں کو وقتی مسائل کے حل سے مایوس نہیں کرتا، علماء اگر خدمتِ اسلام کرنا چاہتے ہیں اور یقیناً کرنا چاہتے ہیں، ان کا شب و روز کا مشغلہ ہی یہی ہے تو سب سے پہلی بات اس ضمن میں یہ ضروری ہے کہ تمام فرقوں کے علماء، جید علماء، معتمد علماء پر مشتمل ایک ایسی قومی مجلس، ہو جسے حکومت تشکیل نہ کرے، خود علماء تشکیل کریں جو ماہانہ یا سہ ماہی نشست کرے اور اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں ایک متفقہ فیصلہ ملک اور قوم کے سامنے پیش کرے۔

علماء اور موجودہ ناپاک سیاست

علماء کے لیے اپنا مقام پہچاننے، خدمتِ اسلام کرنے کا یہ طریقہ ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ وہ اس ناپاک سیاست کے اندر فریق بن کر، حریف بن کر میدانِ عمل میں آئیں۔ سیاست اور دین علیحدہ علیحدہ نہیں، ہرگز نہیں، تم کہتے ہو، میں بھی کہتا ہوں۔

"جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

مگر یہ بھی کہتا ہوں اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ موجودہ ناپاک سیاست کا اِسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وہ سیاست ہے جس کے متعلق انھی علامہ اقبال نے یہ بھی کہا تھا

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو

جو سیاست اسلام میں ہے وہ یہ سیاست نہیں۔ جب اسلام کی عملداری ہو گی تو سیاست میں بھی اسلام ہوگا۔ اور سیاست کے شعبہ میں بھی اسلام کی عمل داری کا پرچم لہرائے گا۔ اور اس کو متاثر اور اس کے اصول مرتب و مدون کرے گا، مگر یہ مطلب نہیں، دین اور

سیاست کی ہم آہنگی کا، کہ سیاست کا جو کھیل تمہارے سامنے کھیلا جارہا ہے، تم بھی لنگر لنگوٹ کس کر، ایک فریق کی صورت میں اس میں شامل ہو جاؤ اور یہ کہو کر دین اور سیاست ایک ہے مگر یہ موجودہ سیاست دین میں کہاں سے آئی۔ مولانا تشریف رکھتے ہیں ان سے پوچھ لیجیے کہ کیا علماء کا مقام یہ ہے کہ وہ اپوزیشن بن کر سامنے آئیں، حزبِ مخالف بن کر سامنے آئیں۔ حزبِ مخالف اور حزبِ اقتدار کا تصور اسلام کا تصور نہیں ہے۔ یہ مغرب کی پیداوار، لادینی سیاست کا تصور ہے، یہاں کوئی حزبِ اقتدار نہیں، یہاں کوئی حزبِ اختلاف نہیں ہے۔ اگر اسلام کی آئیڈیل سوسائٹی ہو، اگر اسلام کا مثالی معاشرہ ہو تو یہاں کوئی ایسا گروپ نہیں ہو سکتا جو کرسیوں پر قابض ہو، اور کوئی ایسا گروپ نہیں بننے دیا جائے گا جو میدان میں اس لیے منظم ہو کر آئے کہ ہمیں کرسیوں کی ضرورت ہے۔ کسی اور کو ان کرسیوں پر نہیں بیٹھنے دیں گے، اسلام میں اقتدار کی کھینچا تانی نہیں ہے، یہ رسہ کشی نہیں ہے۔ علما کا مقام داعی کا مقام ہے۔ یہ کسی کے مخالف نہیں ہیں اور کسی کے فریق اور کسی کے حریف نہیں ہیں۔ حق بات جو کہے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ کرسی والا ہو یا کرسی کے بغیر ہو، وہ اس کھیل میں نہیں آتے۔ اس ناپاک سیاست میں یہ جو ناگزیر برائی ہے، اپوزیشن اور پارٹی ان پاور کی جس کو اب ہم مشرف بہ اسلام کرنا چاہتے ہیں، جس کا اسلامی ایڈیشن تیار کرنے لگے ہیں اس کے اندر علماء کا مقام ایک داعی کا مقام ہے۔ وہ اقتدار کے طالب بن کر میدان میں نہیں آتے۔ علمائے حق کبھی نہیں آئے اور جب آئے تو وہ اسلام کے لیے سیاہ ترین دن ہوا اور ملت کو اور قوم کو اس کی سزا بھگتنا پڑی۔

حضرت مجددؒ کی مثال

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کامیاب ہو گئے اور جہانگیر نے شکست کھائی جہانگیر کو جھکنا پڑا۔ گوالیار کے قلعہ میں نظر بند ہونے والے کو آج بھی خراجِ تحسین پیش کیا

جاتا ہے۔ مقبرہ جہانگیر میں عیش کرنے والے جاتے ہیں، تفریح کرنے والے جاتے ہیں، بھولے سے بھی کوئی فاتحہ خوانی نہیں کرتا۔ مگر مزار مجدد علیہ الرحمۃ آج بھی لوگوں کے لیے رجوع کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہ مقام کیسے نصیب ہوا۔ تاریخ سے پوچھو، جہانگیر کا سالارِ اعظم مہابت خان حضرت مجددؒ سے ارادت رکھتا ہے، عقیدت رکھتا ہے، حلقہ بگوش ہے حضرت کا۔ حضرت مجددؒ کو جب گرفتار کیا جاتا ہے تو وہ بغاوت کی تیاریاں کرتا ہے، تو جہانگیر کو بہت افسوس لاحق ہوتا ہے۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ اگر مہابت خان نے بغاوت کر دی تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ مگر مہابت خان میں اچانک تغیر آجاتا ہے اور خود آکر معافی چاہتا ہے، جہانگیر سے کہتا ہے میں نے غلطی کی، میں غلطی کے لیے معافی چاہتا ہوں، جہانگیر حیران ہے کہ یہ تغیر کیسے آیا؟ وہ پوچھتا ہے یہ ارادہ بدلا کیسے؟ کہا کہ میرے مرشد نے قلعہ گوالیار کی حوالات سے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ خبردار بغاوت نہ کرنا۔ ہم جہانگیر سے اس کا تخت نہیں چھیننا چاہتے، اس کا تاج نہیں چاہتے، ہم اس کی اصلاح چاہتے ہیں۔

تم اگر حریف کی صورت میں آؤ گے اور اسٹیج پر سے للکار کر کہو گے کہ تم غلط کام کر رہے ہو اور تمھیں کرسی پر نہیں بیٹھنا چاہیے ہمیں کرسی پر بیٹھنے کا حق ہے تو فطری بات ہے کہ رکاوٹ پیدا ہو گی، تمھاری بات اثر نہیں کر سکتی، اسے سیاست اور طلبِ اقتدار کا رنگ دیا جائے گا۔ کلماتِ نصیحت بھی زہر آلود تیر بن کر دل میں پیوست ہو جائیں گے۔ علما جب کبھی آئے انھوں نے کبھی تخت و تاج نہیں چاہا، انھوں نے یہی کہا کہ ہم کرسیوں کے طالب بن کر نہیں آئے۔ کرسیاں تمھیں مبارک تخت و تاج تمھیں مبارک، ہم تو چاہتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا دامن مضبوطی سے تھام لیں، ہم تمھاری نجات کے طالب ہیں، یہ جذبہ لے کر علمائے دین اٹھے، داعیانہ مقام لے کر اٹھے، نہ اپوزیشن کے حلقہ بگوش بنے، نہ پارٹی ان پاور کے اندر شامل ہوئے، آپ بھی نہ ان کی خوشامدیں کریں، نہ اُن کے منت گزار بنیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ کچھ ہی عرصے بعد آپ دیکھ لیں گے کہ سیاست کے اندر اسلامی خطوط نمایاں ہونے

لگیں گے۔ میں علمائے دین سے عرض کروں گا کہ خدمتِ اسلام کا رستہ یہ نہیں ہے کہ ارباب اقتدار کی خوشامد کی جائے ان کی کاسہ لیسی کی جائے اور ان کے آگے جھکا جائے اور ان کی صفوں میں شامل ہوا جائے اور نہ خدمتِ اسلام کا رستہ یہ ہے کہ ان عناصر کو سینوں سے لگایا جائے جنھوں نے اسلام پر اتنے مہلک وار کیے ہیں کہ آج تک اسلام کے بدن سے خون رس رہا ہے۔ جتنی خرابیاں تم آج پاتے ہو یہ سب انھی سے اسلام کو ورثہ میں ملی ہیں اور آج تم انھی عناصر کو گلے لگا کر اور حریف بن کر، فریق بن کر یوں سمجھتے ہو کہ خدمتِ اسلام کے راستے ہموار ہو جائیں گے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ علمائے کرام کو اس سے نکل جانا چاہیے جتنی جلدی وہ نکل سکیں۔

علمِ دین کے سرچشمے

علماء کے لیے خدمتِ اسلام کی دوسری صورت وہی ہے جو مجھ سے پہلے مولانا نے فرمائی آج اس کی ضرورت ہے کہ ایک ایک بستی کے اندر سرچشمے دینی تعلیمات کے جاری کر دیے جائیں۔ علم ان کالجوں سے بھی حاصل ہوتا ہے، سکولوں سے بھی حاصل ہوتا ہے، ان یونیورسٹیوں سے بھی حاصل ہوتا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ علم کی یہ تعریف نہیں، تعلیم کا یہ مقصود نہیں، یہ ٹیکنیکل تعلیم ضرور ہے لیکن تعلیم سے جو مقصود ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہوتا اور وہ مقصود کیا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پُر انوار کی بارش ہو۔ انھوں نے ایک مصرع میں یہ عقدہ حل کر دیا ہے۔ کہا کہ

"کہ بے علم نتواں خدا را شناخت"

جو بے علم ہے وہ خدا کو نہیں پہچانتا، خواہ اس کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگری ہی کیوں نہ ہو، خواہ وہ ایم اے پاس ہو، خواہ وہ یونیورسٹی کا بہترین سکالر بلکہ چانسلر ہو، لیکن خدا کی معرفت اگر اسے حاصل نہیں وہ بے علم ہے اس لیے کہ وہ خدا کو نہیں پہچانتا۔ علم کی تعریف

میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن جو بات شیخ نے ایک مصرع میں کہہ دی ہے وہ کوئی نہ کہہ سکا۔
آج اس علم کی ضرورت ہے جس سے خدا مل سکتا ہو۔ جو خدا کی پہچان بتا سکے۔ جو بچھڑے ہوئے بندے کو اپنے رب سے ملا سکے۔ جو اس کی چوکھٹ پر جھکنا سکھائے، جو معبوداتِ باطل کے حلقۂ گرفتاری سے نکال کر اس کے دروازے پر پہنچا دے۔ اس علم کی آج ضرورت ہے اور یہ علم جس کی روشنی بھی ٹمٹماتی جا رہی ہے۔ تاریکی کے بادل اُمڈتے چلے آ رہے ہیں۔ ظلمات تہ بہ تہ بڑھتی جا رہی ہیں یہ علم کہ جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سُورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس علم کی ضرورت نہیں کہ جو چاند پر تو کمند ڈالنے کی فکر میں ہو مگر زمین کے معاملات اس نے بگاڑ کر رکھ دیے، جس نے اہلِ زمین کے باسیوں کو وہاں کے رہنے والوں کو سکون کی دولت سے محروم کر دیا۔ جس کے اپنے گھر میں اندھیرا ہے مگر وہ باہر روشنی کی کرنیں بانٹتا پھرتا ہے، اس علم کی کائنات کو ضرورت نہیں۔ وہ علم کہ جس سے وہ نوجوان تیار نہیں ہو رہے جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے کہ ؎

"محبّت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند"

وہ نوجوان جو یہ علم بنا رہا ہے۔ اقبال ہی کے شعر میں کہوں ؎

"محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں پتنگ"

یہ جو ستاروں پہ "پتنگ" ڈال رہے ہیں وہ علم نہیں ہو سکتا۔ اور ستاروں پر اگر کمند ڈالتے

ہیں تو فلمی ستاروں پر کمند ڈالتے ہوں گے ان ستاروں پر کمند نہیں ڈالتے۔ آج اس علم کی ضرورت ہے جو زمانہ کو خدا کی پہچان بتلائے خدا کی شناخت کرائے۔ جو بچھڑے ہوئے بندے کو اپنے آقا سے ملائے اور وہ علم اگر ہے تو وہی ہے جو اسلامی تعلیمات سے حاصل ہوتا ہے شریعت سے حاصل ہوتا ہے، کتاب و سنت سے حاصل ہوتا ہے اور جس کے لیے "جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ" قائم کیا گیا ہے اور جس کے لیے اس طرح کے اور ادارے قائم ہونے چاہییں۔ علماء اگر خدمتِ اسلام کرنا چاہتے ہیں تو اس قسم کے مراکز ناگزیر ہیں جو بھولے ہوئے جہازوں کو راستہ دکھانے کے لیے روشنی کے مینار کا کام دیں۔ وہ سرچشمے ہوں جو آج بھی فضا کے اندر روحانیت کی پیاس بجھاتے ہیں۔

خدمتِ اسلام حکمرانوں کو بھی کرنی چاہیے

اب میری بات ختم ہونے کو ہے لیکن اگر میں ایک طبقے کا ذکر کیے بغیر بات ختم کر دوں تو ٹھیک نہیں۔ خدمتِ اسلام حکمرانوں کو بھی کرنی ہے اور کرنی چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر حق اسلام کا انہی پر ہے کہ وہ اسلام کی خدمت کریں اس لیے کہ انھیں اس ملک میں حکمرانی کے حقوق حاصل ہیں۔ جو اسلام ہی کے لیے بنا۔ جو محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل بنا۔ اگر اس ملک کے اربابِ اقتدار خدمتِ اسلام نہیں کرتے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ حکمرانی کا استحقاق نہیں رکھتے۔ انھیں حکمرانی کا کوئی حق نہیں ہے۔ انھیں کرسیوں پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کی کرسیوں کا استحقاق اسی صورت قائم اور ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کی خدمت کریں۔ مگر اسلام "لپ سروس" نہیں چاہتا۔ زبانی جمع خرچ نہیں چاہتا۔ محض لمبے چوڑے بیانات نہیں چاہتا۔ لچھے دار تقریریں نہیں چاہتا۔ محض پریس کانفرنسوں کا طالب نہیں۔ محض نعروں اور سلوگنوں کا طالب نہیں۔ اسلام عملی کام چاہتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات کہی مولانا عبدالرحیم اشرف نے کہ انھوں نے فرمایا:

"اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کُتّا بھی بھوکا پیاسا
جان دے دے تو کل اس کے بارے میں عمرؓ سے سوال ہوگا"

تو اگر آج اسلام خود سسک رہا ہے۔ اس پر وار کیے جا رہے ہیں اور اسلام حملوں کے ہجوم اور نرغہ میں گھرا ہوا ہے اور اگر آج اسلام پر ہر چہار طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے۔ تو کیا حکام یہ سمجھ رہے ہیں۔ جن سے ایک مُردار کتیا کے بارے میں بھی سوال ہونا ہے۔ ان سے اسلام کے بارے میں سوال نہیں ہوگا ——— ؟ کیا جواب دیں گے وہ کل قیامت کے دن ؟ قوم کے سامنے تو جواب دینے کی نوبت نہیں آئی اور جوان حالات میں شاید نہ آئے مگر وہ ایک عدالت باقی ہے۔ جو ایسی عدالت ہے کہ وہاں نہ تاج و تخت کام آئیں گے نہ دوست کام آئیں گے۔ نہ حشمت کام آئے گی۔ وہاں ساتھی نہیں ہوں گے، زندہ باد کے نعرے نہیں ہوں گے وہاں پھولوں کے ہار نہیں ڈالے جائیں گے وہاں باب ہائے استقبال نہیں بنائے جائیں گے وہاں پتیوں کی بارش نہیں ہوگی وہاں تن تنہا پا بہ مہر بہ لب خدا کے سامنے اپنا نامہ اعمال پیش کرنا ہوگا یہ حکومت جہاں انعام ہے وہاں بہت بڑی ذمّہ داری بھی ہے خوبی تب ہے جب اس ذمّہ داری کو ادا کیا جائے ورنہ یہ اتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ مسلمان جسے یہ خطرہ لاحق ہے کہ میں اس ذمہ داری کو ادا نہ کر سکوں گا۔ وہ ایک مٹھی بھر جو کے عوض حکومت کی کرسی سے سبکدوش ہونے کو تیار ہو جاتا ہے۔ سوچیں حکمران کہ آج یہاں تعزیراتِ ہند کا نسخہ تو رائج کیا جا رہا ہے اور قرآن غلافوں میں لپٹا مسجدوں کے طاق میں بند پڑا ہے۔ اسلامی مشاورت کی کونسل نے کہا کہ تعزیراتِ اسلامی نافذ کرنے کی سفارش کر دی گئی ہے مگر ابھی تک وہ سفارش راہ دیکھ رہی ہے کہ کب اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ اگر وہ اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اسلامی تعزیرات نافذ کرنا ہوں گی۔ انھیں اسلام کا قانون رائج کرنا ہوگا۔ انھیں وہ ثقافت مٹانا ہوگی جو ہم نے باہر سے درآمد کی، جو اسلام کی ثقافت نہیں ہے، جو سنت کی ثقافت نہیں

ہے۔ اس ثقافت کو سینے سے لگا کر اسلام کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔

حضرات محترم! میں زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا، میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی خدمت اسلام کی نہیں خود اپنی خدمت ہے۔ اپنی نجات ہے۔ اس میں ہمارا اپنا فائدہ ہے اور اسلام کی خدمت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اس کی پیروی نہ کی جائے۔ مشکلات راستہ میں آئیں گی۔ رکاوٹیں درپیش ہوں گی۔ برادری ناراض ہو گی۔ دقتیں قدم قدم پر آپ کا دامن تھامیں گی۔ سوسائٹی برہم ہو گی۔ ساری تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تب کچھ خدمت اسلام ہو سکے گی اور جو لوگ خدمتِ اسلام کرنا چاہتے ہیں ان کے نام میرا پیغام یہ ہے وہ میرے لیے بھی دعا کریں اور اپنے لیے بھی دُعا کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں خدمتِ اسلام کے لیے اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی توفیق بخشے اور یہ کہنے کی توفیق بخشے کہ ہزار مشکلات ہوں، ہزار دقتیں ہوں، ہزار رکاوٹیں ہوں مگر ؎

کوثر یہ جہاں بھر کے خداؤں کو سُنا دو
ہم پیروئ مذہبِ اسلام کریں گے

اسلامی معاشرہ میں مسجد کا مقام

"نارتھ ناظم آباد کراچی میں مسجد عثمان غنی کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے
۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو مسجد کے مقام و مرتبہ پر چند کلمات"

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمد للہ رب العلمین والصّلوٰۃ والسّلام علی سیّد المرسلین

وعلیٰ اٰلہ واصحابہٖ اجمعین من یومنا ھذا الیٰ یوم الدین۔

میں انجمن کے کارپردازوں کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس مُبارک تقریب میں مجھے شامل ہونے کا موقع دیا اور ان مُبارک ساعتوں میں جب کہ لیلۃ القدر میں بہت تھوڑا فاصلہ باقی ہے۔ اس نسبت سے انھیں میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حقیقت میں مَیں تہ دل سے ان کا شکر گزار ہُوں۔ اس دُور افتادہ بستی میں مسجد عثمان غنی کے قیام کی خبر سے مجھے بے حد مسرّت ہُوئی اصل میں انجمن نے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو

کو بھی لکھا تھا کہ وہ اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھیں اور بعد میں ازراہِ کرم انھوں نے مجھ سے بھی کہا اور وزیرِ اعظم نے اس خط پر جو انجمن نے ان کو بھیجا تھا۔ مجھے یہ لکھ کر بھیجا کہ جب میں یہاں سنگِ بنیاد رکھنے آؤں تو اس موقع پر میں ان کی بھی نمائندگی کروں تو یہ حقیقت میں میرا ہی آنا نہیں ہے۔ بلکہ میں اس موقع پر سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے ان کی بھی نمائندگی کروں گا۔ انھوں نے کہا ہے کہ ان کی نیک دعائیں اور ان کا تعاون انجمن کے شاملِ حال ہوگا اور اس مسجد کے قیام میں اس کی تعمیر میں انشاءاللہ وہ حصّہ لیں گے۔

یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ مسجد کا ہماری قومی، ملی اور دینی زندگی میں کیا مقام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس دورِ زوال پذیر میں جہاں اور بہت سی چیزوں سے ہم دور ہو گئے ہیں وہاں مسجد کی عظمت اور ہماری اجتماعی زندگی میں مسجد کا جو مقام ہے اس سے بھی ہم غفلت برت رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں کا کوئی شہر تعمیر ہوتا تھا تو اس میں سب سے پہلے مسجد بنائی جاتی تھی۔ اس کے بعد شہر کی دوسری عمارتیں تعمیر ہوتی تھیں۔ بغداد جب قائم ہوا اور بغداد جب آباد ہوا تو سب سے پہلے اس میں مسجد بنائی گئی اور اس کے بعد یہ شہر آباد ہوا۔ دلّی کی آبادی کا جب مرحلہ آیا تو سب سے پہلے اس میں مسجد قوت الاسلام قائم کی گئی اور اس کے بعد دلّی بسی۔ لیکن آہستہ آہستہ مسلمانوں نے اس طریقے کو چھوڑ دیا۔ اب ہمارے نقشوں میں اور ہر چیز کی گنجائش موجود ہوتی ہے لیکن مسجد کو ہم نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہماری اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔

ایک زمانے میں تو مسجد عدالت کا کام بھی دیتی تھی۔ اس میں خلفائے وقت بیٹھ کر فیصلے کیا کرتے تھے۔ عہدِ نبوی میں اس میں باہر سے آئے ہوئے مہمان ٹھہرتے تھے۔ اس کے اندر باہر سے آنے والے وفود کو آپ شرفِ باریابی بخشتے تھے۔ مسجد کے اندر مسلمانوں کے معاملات طے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کی جاتی تھی۔ مسجد ایک کمیونٹی سینٹر تھا۔ ایک آبادی یا ایک شہر کے اندر ایک مرکزِ اعصاب تھا۔ کوئی شخص مسلمان

ہوتے ہوئے اس آبادی کی مسجد میں نہیں پہنچا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یا تو وہ سفر پر ہے یہاں نہیں ہے یا پھر کوئی مشکل پیش آگئی ہوگی وہ کسی تکلیف میں ہے اس لیے نہیں آسکا۔

مسجد ایک نظام مساوات پیش کرتی ہے۔ اس کے اندر غریب امیر ایک صف میں کھڑے ہو کر اللہ رب العزت کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس طرح مسجد یہ بتاتی ہے کہ جو نظام مساوات مسجد کے اندر مسلمانوں نے قائم کیا ہے۔ یہی مساوات کا نظام مسجد سے باہر کی زندگی میں بھی قائم ہونا چاہیے کیونکہ یہی ہمارے لیے مثال مسجد کی ہے اور مثالی اجتماع یہی ہوتا ہے کہ جو مسجد کے اندر ہو۔ لیکن یہ باتیں آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئیں اور امام اور مسجد کا جو تصور ہماری نگاہوں میں تھا وہ اوجھل ہوتا چلا گیا۔

ہماری خواہش ہے کہ مسجدوں کا پرانا نظام جو کہ حقیقی نظام تھا اس کا از سرِ نو اجراء کیا جائے۔ مسجد کو شہروں کے اندر اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اس کا حقیقی مقام دیا جائے۔ اسے از سرِ نو کمیونیٹی سینٹر بنایا جائے اس کے ساتھ ریڈنگ روم اور دار المطالعہ ہو اور اس میں صفائی ہو اور اتنا ماحول اچھا اور صاف ستھرا ہو کہ اس کے اندر آنے والا یہ محسوس کرے کہ میں واقعی اللہ کے گھر میں آیا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرکارِ دو عالم کا ارشاد ہے کہ لہسن کھا کر مسجد میں نہیں آنا چاہیے۔ سبب کیا ہے؟ سبب یہ ہے کہ جو دوسرے نمازی ہیں ان کو بُو محسوس نہ ہو۔ اسی لیے فقہ نے کہا ہے کہ اگر ایسے کپڑے ہوں جن میں پسینے کی بُو آرہی ہو تب بھی مسجد میں نہیں جانا چاہیے کیونکہ جب جماعت میں کھڑے ہوں گے تو ساتھ کھڑے ہونے والے نمازیوں کو بدبُو محسوس ہوگی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ہمارا مذہب یہ چاہتا ہے کہ صفائی ہو، پاکیزگی ہو اور لوگ اپنے ظاہر اور باطن کو پاک کریں جیسے سجدے سے ان کا باطن پاک ہوگا اسی طرح وہ ایسا لباس پہنیں جو قیمتی نہ ہو لیکن صاف ستھرا ہو اور مسلمانوں کے ماحول کی صحیح عکاسی کرتا ہو۔

ہماری خواہش ہے کہ اوقاف کے تحت ہم مسجدوں کا نظام بہتر بنائیں اور مسجدوں

کے جو آئمہ ہیں ان کو سوسائٹی میں اتنی عزت اور رقم ملے کہ وہ اپنی گزر بسر آسانی سے کر سکیں
آپ پادریوں کو دیکھیں ان کے یہاں جو لوگ ہوتے ہیں انھیں " Father " یعنی باپ کہا
جاتا ہے۔ ان کی عزت کی جاتی ہے ان کو معقول معاوضہ ملتا ہے ان کا احترام ہوتا ہے
ہمارے ہاں مسجد میں جو امام ہے وہ ہماری نگاہ میں ایک مُلّا ہے۔ ہم اس کی کوئی وقعت
نہیں سمجھتے اور دل میں کوئی عزت نہیں کرتے۔ چنانچہ جو قومیں اپنے مذہبی رہنماؤں کی عزت
نہیں کرتیں وہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ہماری خواہش ہے کہ
مساجد اور علمائے کرام کا معاشرے میں وقار قائم ہو اور مسجد حقیقی معنوں میں کمیونٹی سینٹر بنے
اور اس کے بعد وہ انقلابی کام جو حضورؐ نے انجام دیا وہ اس کے ذریعے سے انجام پائے۔

"حج تمام عبادات کا مجموعہ ہے"

"۱۲؍ستمبر ۱۹۷۲ء کو سفینۂ عرب سے دیارِ حبیبؐ کے مُسافروں
کا پہلا قافلہ روانہ ہوا تو ان کے الوداع کے لیے یہ چند الفاظ کہے گئے۔"

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیّد المرسلین
وعلیٰ اٰلہ واصحابہ اجمعین من یومنا ھذا الی یوم الدین '

حجاج کرام ! السلام علیکم ! میں آپ سب کو اپنی طرف سے اور صدر ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے مُبارک باد دیتا ہُوں کہ آپ کو اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ موقع نصیب کیا کہ آپ اس کے پاک گھر کی زیارت کر سکیں اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے روضۂ اقدس کی دید سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر سکیں ۔

پچھلے سال اسی جگہ اسی جہاز میں حاجیوں کو الوداع کہتے ہُوئے میں نے حکومتِ پاکستان کی جانب سے اعلان کیا تھا کہ انشاء اللہ آئندہ سال ہم ایسے انتظامات کرینگے جن کے تحت حج پر سے تمام پابندیاں ختم ہو جائیں گی ۔ قرعہ اندازی کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور جتنے حاجی دیارِ حبیب کو جانا چاہیں گے ان کو جانے کی سہولتیں دی جائیں گی ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے صدر ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا وعدہ پُورا کرنے کی توفیق دی اور ہمیں

یہ موقع دیا کہ ہم آپ کی خدمت کا ذریعہ بن سکیں۔ ہر چند کہ ملک بہت مشکلوں میں تھا اور ہمیں زرِ مبادلہ کی بہت سخت ضرورت تھی۔ خزانہ کی حالت بھی اچھی نہ تھی اور پچھلے سالوں میں جو خرچ ہوتا تھا حج کے اُوپر وہ کوئی دو کروڑ روپیہ تھا۔ لیکن اس سال جب کہ ہمارا آدھے سے زیادہ مُلک دشمن کے قبضہ میں چلا گیا اور سارا ملک لُٹ پُٹ گیا تو اس کے باوجود ہم نے اٹھائیس کروڑ روپیہ کا زرِ مبادلہ حاجیوں پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لوگ پُوچھتے ہیں کہ یہ رقم کہاں سے آئے گی۔ ہم انھیں یہ جواب دیتے ہیں کہ جس کی راہ میں عازمینِ حج سفر کر رہے ہیں وہی ان کے لیے روپے پیسے کا بندوبست بھی کر دے گا اور انشاءاللہ اس کی وجہ سے جو کمی ہوئی ہے وہ بہت جلد پوری ہو جائے گی۔

حضرات آپ جس مبارک سفر پر روانہ ہو رہے ہیں میں اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے آپ کو کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ آپ کے علمائے کرام آپ کے اس سفر میں آپ کے ساتھ جا رہے ہیں آپ کو راستے میں احکامِ حج بھی بتائیں گے اور آپ سے حج کے فضائل بھی بیان کریں گے۔ میں تو آپ کو صرف اتنا بتانا چاہتا ہُوں کہ یہ حج کی عبادت وہ عبادت ہے جس کے اندر اسلام کی ساری عبادتیں شامل ہیں۔

پانچ رکن ہیں اسلام کے۔ توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ لیکن حج وہ عبادت ہے جس میں توحید بھی شامل ہے، نماز بھی شامل ہے، روزہ بھی شامل ہے اور زکوٰۃ بھی شامل ہے اس میں آپ جگہ جگہ نمازیں پڑھیں گے۔ ان نمازوں میں بعض نمازیں بھی علیحدہ ہیں۔ جب آپ عرفات میں جائیں گے، مزدلفہ میں جائیں گے، ان مقدس مقامات پر جائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہاں آپ ایسے وقت میں نمازیں پڑھیں گے جیسے وقت میں آپ اپنے علاقوں میں اور اپنے ملک میں نہیں پڑھتے تو یہ نماز بھی اس کے اندر ہے۔ اس میں زکوٰۃ بھی ہے آپ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے جا رہے ہیں اس کے اندر توحید بھی ہے۔ اللہ کا جو پہلا گھر ہے توحید کا مرکز ہے "بیت اللہ شریف" اس کی زیارت آپ کریں گے۔ اس کا

طواف آپ کریں گے اور اس طرح توحید کے اعلان کا آپ اظہار کریں گے اور پھر اس کے اندر روزہ بھی ہے کیونکہ روزے کے اندر جو پابندیاں ہیں وہ حج کے اندر بھی آپ کو ملیں گی یہ چیز آپ کر سکتے ہیں یہ نہیں کر سکتے۔ آگے چل کر ایک جگہ آئے گی جہاں یہ لباس اُتار کے ایک کفن نما لباس آپ پہنیں گے پھر آپ کے اُوپر بہت سی چیزیں ناجائز ہو جائینگی جو چیزیں حلال ہیں وہ بھی حرام ہو جائیں گی۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ بہت سی چیزوں کے پابند ہو جائیں گے۔ اس طرح یہ عبادت ایسی ہے جس میں یہ سارے رکن شامل ہیں۔ نماز بھی ہے روزہ بھی ہے زکوٰۃ بھی ہے توحید بھی ہے۔

آپ بہت خوش نصیب ہیں کیونکہ سرکارِ دو عالمؐ نے فرمایا ہے کہ جو آدمی حج کرتا ہے پُورے شعور کے ساتھ اور احتساب کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اپنا کہ میں غلطیاں نہ کروں تو پھر وہ واپس آتا ہے تو ایسا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہُوا ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگ جب واپس آئیں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ نئی زندگی شروع کریں گے اپنے ملک کی خدمت کے لیے قوم کی خدمت کے لیے نئے ارادے کے ساتھ آپ زندگی کا سفر شروع کریں گے۔

میں آپ کو مبارکباد پیش کرتے ہُوئے یہ بھی عرض کروں گا کہ اس دفعہ آپ خوش نصیب ہیں کہ ساری دنیا سے سب سے زیادہ حاجی آپ کے پاکستان سے جارہے ہیں آپ کے لیے موقع ہے کہ آپ اپنے ملک کا نام روشن کریں۔ اس مُلک کا کہ جو ٹکڑے ہو گیا اس مُلک کا جس کی سرحدوں پر راکھ کے ڈھیر لگے ہُوئے ہیں اس مُلک کا جو لُٹ پُٹ گیا ہے۔ اس مُلک کا جس کو پہلے دُنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کہتے تھے۔ لیکن آج وہ پہلے نمبر سے ہٹ کر کہیں پانچویں چھٹے نمبر پر جا پڑی ہے۔

آپ اس ملک کے نمائندے بن کر جارہے ہیں حج کے لیے۔ اس لیے آپ غور کریں کہ پاکستان کی عزّت پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے آپ کا ملک بدنام ہو۔ آپ کی قوم بدنام ہو۔ لڑائی جھگڑے پر نا بُو رکھیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوں گی سفر میں

جن کو آپ ناپسند کریں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص حج کے دوران اپنے نفس کو کنٹرول نہ کرے اپنی عادتوں کو کنٹرول نہ کرے۔ اپنے آرام کو قربان نہ کرے تو اس کے لیے حج پر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہت سے ساتھیوں سے آپ کو تکلیف بھی پہنچے گی۔ لیکن آپ انھیں معاف کر دیجیے گا اور آپ یہ خیال کیجیے گا کہ ایسے سفر پر آپ جا رہے ہیں جہاں انبیائے کرام کے نقوشِ قدم ہیں۔ ان راہوں پر آپ چلیں گے جہاں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چلے ہیں۔ ان راہوں پر آپ جائیں گے جہاں اہلِ بیت کے نقوشِ قدم ہیں۔ جہاں صحابہ کرام کے نقوشِ قدم ہیں تو آپ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ نیک دلی فراخ دلی اور رواداری کا مظاہرہ کریں اور جہاں مسلمان بھائیوں سے بات کرنے کا موقع ہو پاکستان کے لیے ان سے دُعائیں کرائیں۔ خود بھی آپ دُعائیں کیجیے پاکستان کے لیے۔ جب آپ جائیں اس مُبارک سرزمین پر پہنچیں تو جہاں آپ اپنے لیے دُعا کریں اس ملک کو بھی فراموش نہ کریں وہ ملک جو ایسے سانحہ سے دوچار ہو چکا ہے کہ تاریخِ اسلام میں اس سانحہ کی مثال نہیں ملتی۔ آپ اپنے ان قیدی بھائیوں کے لیے بھی دعا کریں جو ایک لاکھ کی تعداد میں آج بھی دشمن کی قید میں ہیں۔ آپ اپنے صدر ذوالفقار علی بھٹو کے لیے بھی دُعا کریں جو رات دن ایک کر کے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ مجھ گنہگار کو بھی اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں جس نے آپ کی خدمت کے لیے اپنی طرف سے کوئی کمی روا نہیں رکھی ہے۔ آپ ان تمام کارکنوں کو بھی نہ بھولیں جنھوں نے اس حج کے سفر کے سلسلے میں آپ سے تعاون کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ملک کو عالمِ اسلام کو پاکستان کو اس سفر میں نہیں بھولیں گے اور دُعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو مضبوط بنا دے۔ اللہ تعالیٰ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو پھر سے یہ ہدایت دے یہ توفیق دے کہ وہ جو بھولے ہوئے ہیں بھٹکے ہوئے ہیں جنھیں دشمن نے گمراہ کیا ہے وقت آئے گا کہ آگے چل کر وہ پھر ہمارے ساتھ ہو جائیں یہ ساری دُعائیں آپ کو وہاں کرنی ہیں۔

پاکستان کے آپ سفیر ہیں۔ آپ لوگ پاکستان کے سفیر ہیں۔ حاجی ہونے کی صورت میں آپ کا فرض ہے کہ پاکستان کا نام روشن کریں۔ پاکستان کی سفارت کریں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے پاکستان کی بدنامی ہو۔ یہ گزارشات مجھے آپ سے کرنی تھیں۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ آپ رمضان سے پہلے حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں اور رمضان میں جو عمرہ ادا کیا جاتا ہے وہ حج کے برابر ہوتا ہے اس لیے کہ رمضان میں جو نفل آدمی ادا کرتا ہے وہ فرض کے برابر ہوتا ہے۔ جب آپ وہاں عمرہ کریں گے تو یہ بھی آپ کو حج کا ثواب ملے گا اور جتنے عمرے آپ رمضان کے دوران کریں گے اتنے حج آپ کو ملیں گے اگر آپ جمعہ کے دن وہاں عمرہ کریں گے تو آپ کو حجِ اکبر کا ثواب ملے گا تو اس لیے آپ لوگ بہت خوش نصیب ہیں۔ یہ سہرا آپ کی حکومت کے سر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق دی ہے کہ ہم رمضان سے پہلے آپ کو بھیجیں۔ پھر ہم رمضان کے دوران بھی حاجیوں کو بھیجیں گے باوجودیکہ ہمیں مشکلات درپیش ہیں تو میں آپ لوگوں سے پھر بھی استدعا کروں گا اور اب بھی استدعا کروں گا کہ آپ لوگ سب مل کر پاکستان کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالےٰ اس کو مضبوط بنائے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو مستحکم بنا دے۔ اس کی تمام مشکلوں کو دُور کر دے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالےٰ ہمیں اپنے جھگڑے ختم کرنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالےٰ جن لوگوں کو حج کرنے کا موقع مل رہا ہے ان کا حج قبول فرمائے۔ ان کی واپسی خیریت سے اپنے وطن میں ہو اور جو لوگ حج کے لیے باقی ہیں اللہ تعالےٰ ان کو بھی یہ توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالےٰ ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی دراز کرے انہیں موقع دے کہ وہ پاکستان کی صحیح معنوں میں خدمت کر سکیں اور اس مُلک میں اسلامی مساوات کا نظام رائج کر سکیں آپ لوگ دعا کریں جو قیدی ہمارے دشمن کی قید میں ہیں اللہ تعالےٰ ان کو رہائی

عطا فرمائے اور ہمارے جو بھائی مشکلوں میں ہیں اللہ تعالیٰ ان تمام کی مشکلیں حل کردے۔ اللہ تعالیٰ عالمِ اسلام کو اتحاد عطا فرمائے اور جتنے مسئلے عالمِ اسلام کے ہیں وہ سب حل فرمادے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ ونور عرشہٖ محمدٍ وّ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ؂

خلفائے راشدینؓ کے باہمی تعلّقات

"یہ ایک خطبۂ جمعہ ہے، جو میں نے ۱۹۶۳ء میں جامع مسجد شاہ عالم مارکیٹ لاہور میں دیا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکائی جارہی تھی۔ ان دنوں میرے خطبوں کا موضوع عام طور پر اتحادِ اسلامی ہوتا تھا۔ اس خطبے میں خلفائے راشدینؓ کے باہمی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے میں نے ان انتہاپسندانہ رجحانات پر تنقید کی ہے، جن میں صحابہ کرام کی تنقیص پائی جاتی ہے۔"

○

حضرت علیؑ کی محبت جزوِ ایمان ہی نہیں بلکہ عین ایمان ہے۔ جس کی پیدائش خانہ کعبہ[1] میں ہوئی ہو۔ جس کی تربیت آغوشِ رسالت میں کی گئی ہو۔ پھر جس نے سنِ بلوغ سے پہلے ہی رسول اللہؐ کی دعوت پر لبیک کہی ہو۔ جس نے ہجرت کی یادگار رات میں بسترِ نبوی پر نیند کے مزے لوٹے ہوں۔ جس نے دامادِ رسول اور زوجِ بتول بننے کا شرف حاصل کیا ہو جس نے ایک کے سوا سارے جہادوں میں رسول اللہ کی ہمرکابی میں کفار سے جنگ کی ہو۔ جس کی تلوار ذوالفقار ہو۔ جس کی حیثیت رسول اللہؐ کے نزدیک وہی ہو جو حضرت موسیٰؑ کے نزدیک ہارون کی ہو۔ اور پھر جس اُولوالعزم ہستی کی ساری زندگی اس شان میں گذری ہو کہ آنکھ کھلی بھی اللہ کے گھر میں ہو اور شہادت کا رُتبہ بھی اللہ کے گھر میں حاصل کیا ہو۔ کون مسلمان ایسا ہے جو اُن کی محبت اور عظمت سے اپنا دل معمور نہ رکھتا ہوگا۔ جو اُن کی محبت کے باب میں بخیل ہے وہ رسول اللہؐ کو صدمہ پہنچاتا ہے اور جس سے رسول اللہؐ کو صدمہ پہنچ جائے اس سے خدا

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۴۰۸ باب مآثر امیر المومنین علی ابن ابی طالب (از شاہ ولی اللہ دہلوی)

بھی خوش نہیں ہو سکتا۔ کل پرسوں اسی بزرگ ہستی کا یوم منایا جا رہا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کچھ باتیں آپ ہی کے متعلق گوش گزار کروں۔ ان کی شجاعت، ولایت فصاحت و بلاغت اور علم و فضل کے بارے میں تو سب جانتے ہیں۔ میں آج ایک ایسے موضوع کے متعلق کچھ عرض کروں گا جسے بدقسمتی سے ہمارے ہاں خاص طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ان خلفائے عظام سے حضرت علیؓ کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؛ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت علیؓ نے کیا خدمات سرانجام دیں۔ افسوس کہ ہمارے ہاں اس پہلو کو بہت کم منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اگر یہ گوشہ پوری طرح سامنے آجائے تو وہ غلط فہمیاں بآسانی رفع کی جا سکتی ہیں جن کی وجہ سے تاریخ بہت سی پیچیدگیوں کا شکار ہو چکی ہے۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس کے بارے میں دو روایات ملتی ہیں۔ لوگوں کو چونکہ اختلافات میں زیادہ مزا آتا ہے اور عام معمول کی باتوں میں انھیں کوئی لطف نہیں آتا اس لیے اُن روایتوں کو پھیلایا گیا ہے جن میں اختلافات کی باتیں نمایاں ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ کے بعد بیعت کی۔ حالانکہ انہی روایات کے ساتھ اور روایات بھی ہیں جن میں اس کے بالکل برعکس واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اگر ان دوسری روایات کو تسلیم کر لیا جائے جو ان برگزیدہ ہستیوں کے کردار سے مطابقت بھی رکھتی ہیں تو صورتِ حال کا یہ اختلافی نقشہ ہی باقی نہیں رہتا۔

تاریخ طبری اور الاستیعاب میں جو روایتیں موجود ہیں اور یہ سب روایتیں مستند ہیں ان میں سے کسی کو بھی پایۂ اعتبار سے ساقط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان روایات کے مطابق جب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیعت لینی شروع کی تو حضرت علیؓ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے انھیں وہیں اس کی اطلاع ملی تو وہ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی حال میں مسجد نبوی کی طرف چل پڑے کہ انھوں نے صرف ایک لمبا کرتا پہنا ہوا تھا۔ انھوں نے

جاتے ہی قدرے تاخیر سے آنے کی معذرت کی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ افسوس کہ ہمارے ہاں یہ اور اس طرح کی دوسری روایات دانستہ یا نادانستہ پسِ پشت ڈال دی گئی ہیں حالانکہ یہ ان اکابر صحابہ کے شایانِ شان بھی ہیں اور حضرت علیؓ مرتضٰے کے ان نظریات سے بھی ہم آہنگ ہیں جو ان کے مختلف خطبات میں بڑی اہمیت کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ نہج البلاغہ جلد دوم میں جناب علیؓ کا جو ۱۴۴ واں خطبہ موجود ہے اس میں آپ حضرت عمرؓ فاروق کو مشورہ دیتے ہوئے نظامِ حکومت پر کیا بلیغ تبصرہ فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ومکان القیم بالامر مکان النظام من الخرز یجمعہ ویضمہ فان انقطع النظام تفرق وذھب ثم لم یجتمع بحذافیرہ ابدا"

"کسی حکومت میں امر کو قائم کرنے والے حاکم کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو دانوں میں ڈورے کی۔ یہ ڈورا ان دانوں کو جمع رکھتا ہے اور یہ ڈورا ٹوٹ جائے تو دانے بکھر جائیں گے اور پھر کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔"

جب حالت یہ ہو کہ ایک طرف ارتداد کا فتنہ اپنے عروج پر ہو مانعین زکوٰۃ کی سرکوبی کے لیے مسلمانوں کا لشکر جہاد کرنے کے لیے باہر جا رہا ہو اور وصالِ رسالت مآبؐ سے مسلمانوں کے دل مغموم ہوں تو اس حال میں یہ بات کیسے قرینِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے کہ یہ نظریہ رکھنے والے علیؓ مرتضٰے نظامِ حکومت کے ڈورے میں نہ پروئے گئے ہوں گے اور انھوں نے کامل چھ ماہ تک "القیم بالامر" کی حیثیت قبول نہیں کی ہوگی۔ میں تو یہ تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت علیؓ نے رسولِ خداؐ کے بعد اس نظامِ حکومت کو مضبوط کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ یہ بات ان کے کردار کے شایانِ شان ہی نہیں کہ جس بات کو وہ خود بطور نظریہ پیش کر رہے ہیں وقت آنے پر اس کے مطابق عمل نہ کریں۔

خلیفہ اول کے دور میں حضرت علیؓ کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھیں اہم محکمے سپرد کیے گئے تھے وہ خارجہ اور داخلی امور میں تمام سرکاری خط و کتابت کے

نگران تھے۔ اسیرانِ جنگ کے ساتھ معاملات اور زرِ فدیہ کا حساب کتاب بھی ان کی ذمہ داری تھی۔ جب خلافت کے اولین ایام میں یہ خطرہ درپیش ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مُرتدین مدینہ پر حملہ کر دیں تو اس وقت خلیفہ اول نے مدینہ کی حفاظت کے لیے صحابہ کرام کے تین حصے بنائے ان میں سے ایک حصے کی قیادت حضرت علیؓ کے سپرد کی گئی اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

خلافتِ فاروقی میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد خلافتِ فاروقی کا زمانہ آتا ہے۔ خلیفہ ثانی کے دور میں حضرت علیؓ کو یہ حیثیت حاصل تھی کہ جب فاروق اعظمؓ دربارِ مدینہ سے باہر گئے تو انھوں نے حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام بنایا اس تین سے ایک بار تو وہ لشکر کی کمان بنفسِ نفیس سنبھالنے کی نیت سے باہر گئے اور دوسری بار انھوں نے بیت المقدس کا سفر اختیار کیا۔ مجلسِ مشاورت میں بھی ان کو اہم حیثیت حاصل تھی اور عمر فاروقؓ ان کے مشوروں پر ہمیشہ عمل کرتے تھے۔ چنانچہ جب بیت المقدس کے محاصرہ میں کفار کا قافیہ تنگ ہو گیا تو انھوں نے ہتھیار ڈالنے کے لیے یہ شرط عائد کی کہ امیر المومنین عمر فاروقؓ خود یہاں تشریف لا کر ہمارے لیے امان نامہ لکھیں۔ جب یہ بات بارگاہِ خلافت میں پہنچی تو انھوں نے اس مسئلہ پر مجلسِ مشاورت طلب کی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے مشورہ دیا کہ آپ کو بیت المقدس نہیں جانا چاہیے کیونکہ دشمن تنگ آ چکے ہیں آپ جائیں یا نہ جائیں وہ ہر حال میں ہتھیار ڈال دیں گے اور آپ کے نہ جانے سے اسلام کا رُعب قائم رہے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ آپ ضرور تشریف لے جائیں۔ اس سے کفار پر مسلمانوں کے اخلاقِ عالیہ کا اثر پڑے گا اور ان پر تبلیغ اسلام کے دروازے کھل جائیں گے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس مشورہ کو قبول کیا اور آپ بنفسِ نفیس بیت المقدس تشریف لے گئے۔

ایک اور موقع پر جب حضرت عمرؓ کا ارادہ ہوا کہ وہ روم پر لشکر کشی کرنے والوں کی

قیادت خود کریں تو انھوں نے مجلسِ مشاورت بلائی اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ حضرت علی رضؓ نے جو رائے دی وہ آپ کے خطبہ ۱۳۲ میں موجود ہے۔ فرمایا آپ کو خود نہیں جانا چاہیے بلکہ اپنی جگہ کسی اور تجربہ کار آدمی کو بھیجنا چاہیے کیونکہ

"فان اظهر الله فذاک ما تحب وان تکن الاخری کنت ردءا للناس

ومثابۃ للمسلمین"

"یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظفر مند کیا تو یہ عین مطلوب ہے اور اگر دوسری صورت ہو گئی تو آپ مسلمانوں کے لیے مددگار اور جائے رجوع ثابت ہوں گے"

اس رائے سے جہاں جناب علی مرتضیٰ کا حضرت عمر فاروق رضؓ کی شخصیت کے متعلق یہ خوش آئند تبصرہ سامنے آتا ہے کہ بحیثیت خلیفہ انھیں تمام "مسلمانوں کے لیے جائے رجوع" سمجھتے تھے وہاں اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ امیر المومنین عمر فاروق آپ کے مشوروں کو کتنے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کی اسی رائے پر عمل کیا۔

مختلف مہمات پر خود خلفائے راشدین نے آپ کو مدینہ سے باہر اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ آپ کے مشوروں سے مستفید ہونا چاہتے تھے جس نے دامانِ رسول میں تربیت حاصل کی ہو خلفائے کرام اس کے مشوروں سے محروم ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر نازک مرحلہ میں حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ رکھا اور وہ ملکی اور دینی معاملات میں ان کے مشوروں پر عمل کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں

اب حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے کا ذکر سن لیجیے۔ اس سلسلے میں اختلافی روایات بھی موجود ہیں مگر میں قرآن کو مانتا ہوں اور جو تاریخی روایات قرآن کے خلاف ہوں انھیں آگ میں جھونک دینے کا قائل ہوں اور قرآن نے ان صحابہ کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ "اشداء علی الکفار" اور "رحماء بینھم" ہیں۔

گویا وہ اقبال کے اس شعر کی زندہ تفسیر تھے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اختلافات تو تقاضائے بشریت ہیں ان سے مفر نہیں۔ اختلاف رائے صحابہ کرام میں بھی تھا۔ ابوبکرؓ و عمرؓ میں بھی ہوا اور عثمانؓ و علیؓ میں بھی تھا لیکن میں یہ جاننے کے لیے تیار نہیں کہ ان کے دل ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے، پھٹے ہوئے تھے یا وہ باہم دگر مخالف تھے۔ آپ اس سلسلے میں بڑے سے بڑے مورخ کو بطورِ شہادت پیش کر دیں مگر میں قرآن کی اس تصریح کے بعد کسی مُورّخ سے مرعوب ہونے کے لیے تیار نہیں۔ میرے نزدیک تاریخ کا وہ سارے کا سارا دفتر بے معنی اور جلا دینے کے قابل ہے جس میں اس طرح کی مخالفت کے من گھڑت قصے موجود ہیں۔

عثمانؓ و علیؓ کے تعلقات کا اندازہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھیے:

حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں طبرستان کی جنگ ۳۰ ہجری میں ہوئی اس کے لیے جو لشکر بھیجا گیا اس میں حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسینؓ بھی شامل تھے اور انھوں نے کفار سے لڑائی کی۔ اگر ان کے درمیان اختلافات ہوتے تو ان کے صاحبزادے کس طرح ایک مجاہد کی حیثیت سے لشکر میں شامل ہوتے۔

جب حضرت عثمان غنیؓ پر باغی ہجوم کر کے آئے تو حضرت علیؓ ہی نے انھیں دو بار مدینے سے دُور کیا۔ جب وہ تیسری بار آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا اور شتر سوار ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے خط پیش کیا اس پر مہرِ خلافت ثبت تھی اور اس میں حاکمِ مصر کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ انھیں پہنچتے ہی گرفتار

کر دیا جائے اور سنگین سزائیں دی جائیں۔ باغیوں نے کہا کہ یہ سخت بے انصافی ہے کہ یہاں تو انھیں امان دی جائے اور وہاں یہ ہدایت دی جائے کہ ان سب کو سنگین سزائیں دی جائیں۔ حضرت علی رضؓ نے ان باغیوں پر جرح کی کہ تم تین گروہ تھے اور مدینہ سے جاتے وقت تم میں سے ایک مصر کی طرف روانہ ہو گیا تو دوسرے دو گروہ کوفہ و شام اور بصرہ کی طرف علیحدہ علیحدہ روانہ ہو گئے۔ اب جیسا کہ تمھارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شتر سوار اور خط مصر والے گروہ کو ملے ہیں تو اس گروہ کے افراد کا یہاں آنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن شام اور بصرہ کے گروہ کس طرح یہاں آگئے اور انھیں کس طرح خبر ملی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمھاری نیت میں فتور ہے۔

اس زوردار جرح اور فراست مرتضوی کے اس شاندار مظاہرہ کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ باغیوں کے استدلال کا تار پود بکھر کر رہ گیا اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

حضرت علی رضؓ نے امیر المومنین سے باغیوں کے خلاف جنگ کی اجازت چاہی تو آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ مسلمان میری وجہ سے فتنہ و فساد میں مبتلا ہوں۔

سبب یہ تھا کہ وہ مسلمانوں (بلکہ کلمہ گوؤں پر) بے حد شفیق تھے ان کا خون بہانا انھیں پسند نہ تھا۔ وسیع الظرفی کا یہ عالم تھا کہ جب مسلمانوں نے ان سے دریافت کیا کہ مسجد نبوی میں باغی امامت کراتے ہیں کیا ہم ان کے پیچھے نماز پڑھ لیں تو آپ نے فرمایا:

"اذا هم احسنوا فاحسن معهم وان اساؤ فاجتنب اسائهم"

"یعنی جب وہ اچھا کام کریں تو ساتھ دو اور جب برائی کریں تو ان کے برے کام سے بچو۔"

جب حضرت علی رضؓ اور دوسرے صحابہ کو لڑنے سے منع کر دیا گیا تو حضرت علی رضؓ نے حضرت

عثمان غنیؓ کی حفاظت کے لیے اپنے دونوں لختِ جگر حسنؓ و حسینؓ کو بھیج دیا اور وہ آخر وقت تک ان کے مکان کے گرد پہرہ دیتے رہے۔ خود اندازہ فرمالیجیے جس کے مکان کی حفاظت اور پہرہ کے لیے حسنؓ و حسینؓ تیار ہو جائیں اس مکان کے مکینوں کی عظمت و رفعت کا کیا ٹھکانا۔

یہ تھی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کے تعلقات کی نوعیت۔ آپ نے خود بھی اس پر بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی۔ جب حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں کسی نے اُن سے سوال کیا کہ پہلے خلفا کا زمانہ تو امن و امان میں کٹ گیا، آپ کے دَور میں یہ فتنہ و فساد کیوں ہے تو حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ "ان کے مُشیر ہم تھے اور میرے مشیر تم۔"

دوستانِ عزیز! حضرت علی مرتضےٰؓ اور حضرات خلفائے ثلاثہ کے تعلقات کی یہ ایک ہلکی سی تصویر آپ کے سامنے رکھ دی گئی ہے جہاں تک علیؓ کی عظمت اور محبت کا تعلق ہے ہمارا ایمان ہے کہ بغض حسد، دشمنی اور کینہ کی وجہ سے جو شخص ان کے مرتبہ و مقام میں کمی لاتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے کبھی سُرخ رُو نہیں ہو سکتا لیکن ان کی محبت کا منطقی نتیجہ اور تقاضا یہ بھی ہے کہ جن عظیم ہستیوں سے ان کے تعلقات کا یہ انداز رہا۔ جن کو انھوں نے "الیقیم بالامر" تسلیم کیا جن کے وہ مُشیرِ اعلیٰ رہے۔ جن کی غیر حاضری میں وہ امورِ سلطنت میں ان کی نیابت کے فرائض انجام دیتے رہے ان سے بھی حُسنِ ظن اور محبت کے جذبات میں کوئی ذرہ برابر کمی نہ آنے پائے۔ خلفائے راشدین چاروں کے چاروں انسانیت کی رُوح اور اس کا عطر تھے۔ وہ آپس میں محب بھی تھے اور محبوب بھی، طالب بھی تھے اور مطلوب بھی۔ مقصد بھی تھے اور مقصود بھی۔ جو ان کے اس تعلق کو نہیں مانتا اُلٹا ان کی مخالفتوں اور عداوتوں کے قصّوں پر کان دھرتا ہے وہ خلافت ہی پر نہیں بلکہ معاذ اللہ رسالت پر حملہ کرتا ہے کیونکہ قرآن حضور کے مقاصدِ بعثت بیان کرتے ہوئے

یہ بھی بتاتا ہے کہ آنے والا ان کے تزکیہ نفوس کے لیے آیا ہے: "وَیُزَکِّیْھِمْ"۔ اور اس کے بعد اس نے اعلان کیا کہ "الیوم اکملت لکم دینکم۔ آج کے دن میں نے تم پر دین کا اتمام کر دیا"۔ اور ظاہر ہے کہ دین کا اتمام اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ رسول اللہ کے مقاصدِ بعثت کی تکمیل ہو جائے۔ اب اگر معاذ اللہ خلفائے راشدین بھی نفسانی خواہشات کا شکار رہے تو دوسرے لفظوں میں رسول اللہ کا مشن ہی پورا نہ ہوا۔ اگر انجن کے ساتھ چار ڈبے ہی صحیح معنوں میں انجن سے پیوست نہ تھے تو کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ گاڑی آگے چل سکے گی۔ اگر خاکم بدہن حضورِ رسالت مآب اپنے قریبی شاگردوں کی بھی تربیت نہ کر سکے تو پھر آج سینکڑوں سال کے بعد ان کی تعلیم کس طرح لوگوں کو سیرت و کردار کے سانچے میں ڈھال سکتی ہے؟

سیّدہؓ کی عظمت

"جناب سیدۃ النساء سے مجھے ایک عجب عقیدت ہے۔ اسی عقیدت کے رشتے سے میں جنت البقیع کراچی میں یوم فاطمۃ الزہرا کی صدارت کرنے کے لیے مدعو تھا۔ دفورِ عقیدت سے زبان گنگ تھی جلسے میں جاتے ہوئے آخر وقت تک کچھ سوچ نہیں سکا تھا کہ اس موقع پر کیا کہوں گا۔ حسنِ اتفاق کہ ایک شیعہ عالم نے مجھ سے پہلے ایک جملہ کہا جس نے سازِ عقیدت کے تار چھیڑ دیے۔ یہ تقریر اسی فوری تاثر کی آئینہ دار ہے۔ شیعہ دوستوں نے اسے ازراہِ محبت ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع کیا ہے۔ اس کیفیت کو محفوظ رکھنے کے لیے ٹیپ سے اتارتے ہوئے اس کے فقروں میں کہیں کوئی لفظی ترمیم نہیں کی گئی۔"

حضرات علمائے کرام، شعرائے عظام، خواتین و حضرات !!

ابھی میرے ایک دوست کہہ رہے تھے کہ اسلام میں ایک ہی خاتون ایسی ہے جس کو شعراء نے اور فضلاء نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ توحید میں تثلیث ہے اور تثلیث میں توحید ہے۔ اور جس کے خلاف جس کے ابطال میں میں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے کیا کسی پہلو سے یہ درست تو نہیں؟ کسی جگہ اس کا کوئی مفہوم نکلتا ہے کہ نہیں نکلتا۔ میں اپنے دوست کی یہ بات سن کر، توحید میں تثلیث اور تثلیث میں توحید پر ایک اندازِ خاص میں ایک مفہومِ معین میں ایمان لے آیا۔ مجھے یوں لگا کہ جب میرے دوست یہ بات کہہ رہے تھے کہ جناب زہراؓ ہی کو اسلام میں وہ عورت مانا گیا ہے تو میں نے دیکھا کہ جناب فاطمہؓ کے روپ میں مجھے جناب خدیجہؓ نظر آئیں اور پھر میں نے دیکھا کہ جو تعریفیں جناب خدیجہؓ الکبریٰ کی ہو رہی ہیں وہ سب جناب زہراؓ کو پہنچ رہی ہیں۔ اور جو جناب زہراؓ کی ہو رہی ہیں وہ سب ان کو پہنچ رہی ہیں۔ پھر میں یہیں بیٹھے بیٹھے غور کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ جناب زینبؓ بھی جناب زہراؓ کے روپ

میں ہیں۔ جو تعریفیں جناب زہراؑ کی ہیں وہ جناب زینبؑ کو پہنچتی ہیں اور جو جناب زینبؑ کی ہیں وہ جناب زہراؑ کو پہنچتی ہیں تو جناب زہراؑ کی توحید میں یہ تین شخصیتوں کی تثلیث مجھے نظر آئی اور اس تثلیث میں مجھے جناب زہراؑ کی توحید نظر آئی اور میں کیسے اس کی یہ توجیہہ نہ کرتا۔ کیونکہ میرے دوست نے تو یہ بات کرتے ہوئے اس پہلو کی تشریح نہ کی تھی اور اگر وہ یہ تشریح نہ کرتے یا مجھ تک نہ چھوڑتے کہ میں یہ تشریح کروں تو پھر ان عظمتوں کو کہاں لے جاتا۔ میں ان احسانات کو کہاں دفن کرتا۔ میں ان شفقتوں کو کیسے بھلاتا۔ میں اس دولت کو کیسے بھولتا جس نے اسلام کو خرید لیا اور میدانِ کربلا میں جناب زینبؑ کے کردار کو آخر کیسے فراموش کر دیتا جن کے بارے میں ایک شاعر نے کہا اور مجھے بہت پسند آیا کہ :

جناب زہراؑ جوابِ مریم ۔۔۔ جواب زہراؑ جنابِ زینبؑ

جناب زینبؑ کے بعد لیکن ۔۔۔ جواب زینبؑ جوابِ زینبؑ

تو جناب فاطمہؑ کا جناب زہراؑ کا خاتون جنت کا سیدہ کا ذکر جب ہوگا تو جناب خدیجۃ الکبریٰؑ کا ذکر ہوگا۔ جناب زینبؑ کا ذکر ہوگا اور اسلام ابدالآباد تک ان تین ہستیوں کے احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کی تاریخ میں سے ان تینوں مقدس شخصیتوں کے احسانات کو منہا کر دیا جائے تو باقی کیا بچتا ہے میں نہیں بتا سکتا۔

مجھ سے دوستوں نے کہا کہ میں کچھ کہوں۔ مگر میں کیا کہوں۔ لوگ سرکارِ دو عالم فخرِ موجودات سرورِ کائنات امام الانبیاء سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے والدین کے ایمان اور عدم ایمان کی بحث کرتے ہیں۔ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں بے شمار بحثیں چلی ہیں۔ سلف میں خلف تک۔ مگر میں نے اسے ایک نقطہ نظر سے دیکھا اور وہ نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود آپؐ نے کیسے حل کیا خود سرکارِ ختم المرسلینؐ نے کس طرح ہم تک پہنچایا اور کس حسین و جمیل انداز میں پہنچایا۔ باپ کا سایہ نہ تھا تو جناب ابو طالب کو اپنا باپ بنایا اور وہ مجسمِ اسلام بنے۔ قرآن کہتا ہے :۔

هل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کیا ہے اور ہم جو قرآن کو برتر مانتے ہیں۔ ہم کیسے یہ تسلیم کریں کہ جس خدا کے دین پر ابوطالب نے احسان کیا وہ اس کا بدلہ احسان کی صورت میں نہیں دے گا۔ اس طرح ان کو اپنا باپ بنا کر جناب عبداللہ کے ایمان کا مسئلہ بھی خود آپ نے حل کر دیا۔ ابوطالب آپ کے باپ ہیں۔ ان کے ایمان میں کسی مومن کو شک نہیں۔ ان کے ایمان میں مومن کو شک نہیں ہو سکتا۔ میں تو یہ مان سکتا ہوں کہ ان محدثین سے غلطی ہوئی جنھوں نے وہ حدیثیں لکھیں وہ حدیثیں پہنچائیں یا یوں کہیے کہ بنائیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کس نے بنائیں۔ میں یہ مان سکتا ہوں کہ ان سے غلطی سرزد ہوئی۔ وہ بر سرِ غلط تھے لیکن میں ایک لحظہ کے لیے ایمانِ ابوطالب میں شک نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی فرض کیجیے اگر کوئی شخص ظنِ غالب سے کسی غیر مومن کو مومن مان لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔ لیکن اگر کسی مومن کو کوئی شخص کافر قرار دے بیٹھا تو خود اس کے ایمان کی خیر نہیں۔ اس طرح والد کی جگہ جناب ابوطالب کو والد بنا کر خود ایمان عبداللہ کا مسئلہ بھی حل کر دیا اور جب حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات ہوئی۔ سیدہؑ نے گھر سنبھال لیا۔ بچپنے ہی میں گھر سنبھال لیا باپ کی خدمت میں دن رات ایک کر دیے تو سرکارؐ نے فرمایا اور وہ بات فرمائی جو کسی کے لیے آپؐ نے کبھی نہیں فرمائی تھی اور کسی کے لیے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا "ام ابیھا" تم اپنے باپ کی ماں ہو۔ ام ابیھا سیدہ کے بارے میں ارشاد فرمایا اور گویا اس طرح اپنی والدہ کے ایمان کا مسئلہ حل کر دیا کہ جس طرح ایمان میں میری بیٹی سیدۃ النساء ہے خاتونِ جنت ہے اسی طرح حضرت آمنہ کا مقام ہے تو جس طرح میری بیٹی کا ایمان مسلّم ہے اسی طرح میری ماں کا ایمان بھی مسلّم ہے۔

حضرات! لوگ آج مساوات کی بات کرتے ہیں اور جب ہم مساوات کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بیرونی نظریہ ہے جسے درآمد کیا جا رہا ہے۔ کسے خبر کہ جس کی آستین میں خود آفتاب عالم تاب ہو گا وہ دوسرے کے ٹمٹماتے ہوئے دیے کو کیوں رشک و حسد کی نظر سے دیکھے گا۔

جس مذہب کے پاس خاتونِ جنت کی قائم کردہ مساوات ہو جنھوں نے اپنی ملازمہ فضہ کے ساتھ مگر ہمارے لیے لائقِ احترام و عظمت اور ہماری مالکہ کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا کہ ایک دن گھر کے کام وہ کریں اور ایک دن خود آپ کریں۔ اسے آخر اس دورِ معاشیات کے نظریہ مساوات سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ زمانہ بلند ہو کتنا بلند ہو گا۔ جتنا بھی بلند ہو گا وہاں اختتام کرے گا جہاں سے خاتونِ جنت کی مساوات کا آغاز ہو گا۔ اب اس کے بعد یہ شرمانا، یہ جھجکنا یہ مساوات کے اصول کو نظریے کو قبول کرنے سے ہچکچانا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ اپنے ہی گھر کی چیز کو اپنے ہی امتیاز کو اپنی ہی خصوصیت کو غیروں کے سر کیوں منڈھ رہے ہیں، غیروں کا کریڈٹ کیوں بنا رہے ہیں۔ غیروں کے سر پہ یہ سہرا کیوں باندھ رہے ہیں۔

ایک دوست نے اور ایک بات کہی۔ میں تو کچھ سوچ کے نہ آیا تھا۔ میں تو اشعار سن کر یہیں بیٹھ کے سوچتا رہا۔ اور اشعار وہی ہوتے ہیں جو احساس میں تموج پیدا کر دیں۔ انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیں پھر وہ اشعار افکار بن جاتے ہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک دوست نے کہا کہ اہلِ بیتؑ کا نکتہ اور مرکز جنابِ زہراؑ کی ذات ہے یہ شاعری نہیں عینِ حقیقت ہے اس لیے کہ خود سرکارؐ نے بھی یہی فرمایا تھا۔ آپ کے بہت سے ارشادات ہیں جن کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے جن کا نچوڑ یہ ہے جن میں تکرار یہ ہے۔ جن میں حسنِ تکرار یہ ہے کہ "رسولؐ اور فاطمہؑ"، "علیؑ اور فاطمہؑ"، "حسنؑ اور فاطمہؑ"، "حسینؑ اور فاطمہؑ" اس لیے کہ یہ اگر مرکز نہ ہوتا تو رسولؐ کے انوار کو آگے کون پہنچاتا۔ یہ ذات اگر نہ ہوتی تو تجلیات کا انعکاس کربلا کے میدان میں کہاں ہوتا۔ اس لیے اہلِ بیت کا مرکزی نکتہ خاتونِ جنت ہیں اور جس نے کہا ٹھیک کہا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو فرزند بھی آپ کی آغوشِ شفقت سے مچل کر نکلا وہ وہ بنا جس کے بارے میں کہا گیا کہ:۔

شگفتہ گلشنِ زہراؑ کا ہر گل تر ہے
کسی میں رنگِ علیؑ ہے کسی میں بوئے رسولؐ

حاضرین کرام! مجھے احساس ہے کہ آج میں بالکل غیر مربوط کلام پیش کر رہا ہوں جیسے ایک غزل میں الگ الگ شعر ہوتے ہیں۔ میں نے آج بھی گفتگو کے ہر موڑ پر الگ الگ بات کہی ہے۔ الگ الگ نکتہ بیان کیا ہے۔ میں جانتا ہوں (مجھے خط بھی ملے۔ جب میں یہاں آ رہا تھا) کہ یہ اجلاس جنت البقیع میں ہو رہا ہے (اس واسطے سے اس نسبت سے جو کچھ لکھا گیا ہو گا جو کچھ کہا گیا ہو گا۔ آپ جانتے ہیں اس کے دُہرانے کی بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کاش میں اتنا آزاد ہوتا کہ میں کہہ سکتا) لیکن میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ میں نے بچپن میں بہت سی چوریاں کی ہوں گی۔ کچھ یاد آتی ہیں کچھ یاد نہیں آتیں۔ لیکن ایک چوری میں نے شعور میں کی۔ بلوغ کے بعد کی۔ جان بوجھ کر کی سوچ سمجھ کر کی اور اس چوری پر مجھے بڑا فخر ہے۔ مجھے اس پر ندامت کبھی نہیں ہوئی۔ کبھی پشیمانی نہیں ہوئی۔ میں نے چند سال پہلے موچی دروازے میں اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس وقت میں نے کچھ باتیں اور بھی کہی تھیں۔ میں ان پر قائم ہوں مگر ان کو دُہرا نہیں سکتا۔ صرف اشارہ ہی کر سکتا ہوں۔ صرف اس لیے تاکہ دوست یہ سمجھ لیں کہ ادائے فرض سے غافل نہیں ہوں میں جب مدینۃ الرسول میں حاضر ہوا اور آپ کو وہ بحثیں یاد ہوں گی۔ امام ابنِ تیمیہ نے یہ بحث کی ہے اور امام ان کو میں اہلِ علم میں سے ہونے کی وجہ سے کہتا ہوں۔ اس امامت کا مقام اور ہے جو خاندانِ نبوت کا خاصہ ہے کہ حاجی جو عزم لے کر نکلتا ہے نیت کر کے نکلتا ہے زیارتِ روضۂ رسول کی اس کا حج ہو جاتا ہے کہ نہیں۔ یہ تو خیر علما کی باتیں ہیں میں ایک عامی ہوں اور میں اپنی بات سنا رہا ہوں کہ میں نے جب حج کا قصد کیا مدینۃ الرسول میرے پیش نظر تھا۔ اور میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں مکہ مکرمہ کے بعد جب مدینۃ الرسول جاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے مکۃ المکرمہ کی حاضری وضو ہے اور مدینۃ الرسول کی حاضری نماز۔ لیکن جب میں مدینۃ الرسول کا قصد کرتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں اور میرا خدا گواہ ہے کہ ایسا کہتے ہوئے مجھے کسی کی ستائش کی تمنا نہیں ہے۔
ویسے بھی اس گھر کے مداحوں کو داد کم ملتی ہے بے داد زیادہ۔ اس خاندان سے تعلق باندھنے والوں کے لیے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہٹو بچو کی صدائیں سنی ہوں تو میں کہہ رہا تھا کہ جب میں نے مدینۃ الرسول کا

قصد کیا ہے تو میرے پیشِ نظر دو باتیں تھیں۔ ایک دربارِ رسولؐ میں حاضری اور دوسری جناب سیدہؓ کے مزار پر حاضری۔ اور جب میں پہلی مرتبہ پہنچا۔ جنت البقیع میں حاضر ہوا۔ بہت میں نے کوشش کی کہ کس طرح یہاں سے چوری کروں۔ مزار کے اردگرد جو شکستہ روڑے چھوٹے چھوٹے کنکر پتھر پڑے ہیں ایک آدھ میں کسی طرح سپاہی کی نظر بچا کر جیب میں رکھ لوں۔ اس وقت مجھے موقع نہیں ملا کیونکہ پہرا بڑا سخت تھا۔ اور ہم سرکاری ذریعہ سے گئے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ نگہبانی کرنے والے بھی موجود تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ میں ایک مرتبہ لندن سے آتے ہوئے عمرہ کرنے گیا۔ اکیلا تھا کوئی سرکاری نسبت نہ تھی۔ میں پہنچا تو جنت البقیع میں کوئی نہ تھا۔ میں تھا جناب سیدہؓ کا دربار تھا۔ دور سپاہی کھڑا تھا۔ میں نے جاتے ہی ایک چھوٹا سا پتھر جنابِ سیدہؓ کے مزار سے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ آپ یقین مانیں کہ آج اگر اپنی دولت میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے تو جناب سیدہؓ کے مزار کا وہ پتھر ہے۔ میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ آج سے چند سال پہلے میں نے بتایا تھا۔ اس وقت میں بتا سکتا تھا آج نہیں بتا سکتا کہ جناب سیدہؓ کی قبر نے مجھ سے کیا کہا مجھ سے کیا بات کی۔ کچھ کہا میں نے کانوں سے سُنا۔ یہ اس طرح کی سرگوشی تو نہ تھی خاکم بدہن یہ تشبیہ تو نہیں ہو سکتی کہ جیسے جناب سیدہؓ کے والد ماجدؐ نے دُنیا سے جاتے وقت جناب سیدہؓ کے کان میں سرگوشی کی تھی لیکن کسی نہ کسی انداز کی سرگوشی جناب سیدہؓ کے مزار سے میرے کانوں میں پہنچی کوئی حکم ملا۔ کوئی بات کہی گئی۔ میں اس سے غافل نہیں ہوں بحمد اللہ اس قبر کے احترام کے جو تقاضے ہیں مجھ پر منکشف ہیں اور میں ان تمام حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو حکومت کے افراد پر بیرونی ممالک کے معاملے میں عائد ہوتی ہیں ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ ان شاء اللہ وہ وقت آئے گا کہ جب قبرِ سیدہ سے اٹھی ہوئی وہ آواز جو میرے کانوں میں اب تک گونج رہی ہے اس کے تقاضے پورے ہوں گے اور دعا کیجیے کہ آپ بھی اس وقت موجود ہوں میں بھی موجود ہوں اور وہ تقاضے ہم اپنی آنکھوں سے پورے ہوتے ہوئے دیکھ سکیں ۔

محبّانِ اہلِ بیت سے خطاب

"یہ صدارتی تقریر میں نے عید میلاد النبیؐ کے ایک جلسے میں ۵ رمئی ۱۹۷۳ء کو کی تھی جو نشتر پارک کراچی میں مجلسِ محبانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کراچی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ مجھ سے پہلے علامہ رشید ترابی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب کیا تھا جس میں انھوں نے میری ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے قرآنی نظامِ تعلیم کے نفاذ پر زور دیا تھا۔ علامہ مرحوم کا کہنا تھا کہ موجودہ نظامِ تعلیم پر میری تنقید بالکل برحق ہے مگر مجھے یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ اس کی جگہ قرآنی نظامِ تعلیم نافذ ہو۔ میں نے اپنی اس تقریر کے آخری حصے میں اسی طرف بعض اشارے کیے ہیں۔

اتفاق سے جس روز یہ جلسہ منعقد ہوا تھا وہی سلطان فتح علی ٹیپوؒ کا یوم شہادت بھی تھا۔ اس دن کی مناسبت سے بھی پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کے پس منظر میں، میں نے چند نکات اٹھائے تھے۔ مرحوم کے ساتھ نشتر پارک میں میری یہ تیسری تقریر تھی۔ اور مجھے ان کی داد پا کر اس لیے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ یہ ایک سخن شناس کی داد تھی۔"

○

حقیقت یہ ہے کہ آج میں تقریر کرنے کے ارادے سے حاضر نہ ہوا تھا۔ آج میں اپنی کمر میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ یہ درد کچھ مہینوں سے لاحق ہوا ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ کمر کا درد[1] کتنا ظالم ہوتا ہے اور کچھ ہی ہستیاں ہوتی ہیں جو کمر کا درد برداشت کر سکتی ہیں یہ صبر کی منزل تو حسینؑ کی منزل ہے۔ حسینیت کی منزل ہے مگر میں یہاں آیا کہ حضرت علامہ کی تقریر اس درد کا درماں بنے گی اور میں یہ ذکر پاک ان کی زبان سے سنوں گا کہ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔ اور میں خوش ہوں کہ علم میں ڈوبی ہوئی ایک تقریر میں نے آج سُنی۔ اور اس پر بھی بہت شکر گزار ہوں مجلسِ محبانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا کہ اس ذکر پاک میں شامل ہونے کی سعادت کا ایک موقع اس کے اراکین نے مجھے عطا کیا ہے۔ یہ وہ ذکر ہے کہ جو اپنا نتیجہ بھی آپ ہے۔ جو خود مقصود ہے اس سے نتیجہ نکلے تو سبحان اللہ ورنہ یہ خود اپنا نتیجہ آپ ہے۔ یہ وہ لمحے ہیں، ذکر پاک کے لمحے، کہ جن میں عبد اور معبود کے درمیان سے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ جہاں عبد اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جو معبود کا مقام ہے۔ میں سوچ

---

[1] اس میں فاروقی مرحوم کی طرف اشارہ ہے۔

سمجھ کر بول رہا ہوں) اور جہاں معبود اُس مقام پر آتا ہے جو عبد کا مقام ہے کوئی مقام ایسا نہیں فقط ایک مقام کے سوا۔ جتنی عبادات ہیں وہ سب کی سب عبد کے لیے خاص ہیں۔ جتنے اعمال ہیں وہ سب عبد کے لیے خاص ہیں۔ نماز میں' وہ ذات، واحد شریک نہیں ہو سکتی۔ روزہ عبد کا کام ہے۔ معبُود اس میں شریک نہ ہوگا۔ حج' یہ عبد کا عمل ہے معبُود کا عمل نہیں مگر ایک مقام ایسا ہے جہاں عبد اور معبُود دونوں ایک ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اور قرآن کہتا ہے کہ وہ مقام وہ ہے اِن اللہ وملٰئکتہ' یصلون علی النبی یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

اے اہلِ ایمان۔ میں اور میرے فرشتے اپنے حبیب پر سلام وصلوٰۃ بھیجتے ہیں تو تم بھی اس پر سلام وصلوٰۃ بھیجو۔ میں خط نہیں کھینچ سکتا فصل کا' کہ یہ عبد کا عمل ہے کہ معبُود کا عمل ہے مگر یہ وہ عمل ہے کہ جہاں عبدیت اس مقام پر پہنچتی ہے کہ جو ذاتِ صمدیت کا مقام ہے اور مجھے کہنے دیجیے کہ اس میں بھی تحفظ ذہنی نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں بھی کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ کون کیا کہے گا اس کا خیال نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سلام وصلوٰۃ جو محمدؐ و آلِ محمدؐ پہ بھیجا جاتا ہے تو اس میں ہم سب شریک ہیں آلِ محمدؐ میں ہم سب ہما شما من وتو جتنے ہیں۔ عاجز۔ وخاطی وگنہگار رشتم پشتم سب کے سب اس آل کے اندر شریک ہیں۔ اگر یہ اتنا ہی بلند مقام ہے کہ خود خدا اپنے لیے اس مقام کو خاص فرماتا ہے اور بندوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ بھی اس میں شریک ہوں اگر یہ مقام امتیاز اس رسول پاکؐ کا ہے تو اس امتیاز میں اگر سب شریک ہو گئے تو پھر یہ امتیاز کہاں باقی رہے گا۔ اس لیے میں نہیں جانتا کون کس احساس سے کس ایمان سے سلام وصلوٰۃ بھیجتا ہے لیکن میں تو اس ایمان اور اس احساس اور اس شعور کے ساتھ سلام وصلوٰۃ بھیجتا ہوں کہ یہ صاحب بیت کے لیے ہے اور اس کے اہلِ بیت کے لیے۔ یہ ذکر پاک ہو۔ یہ سلام وصلوٰۃ کی بات ہو تو یہ تقاضا کون کر سکتا ہے یہ تقاضا کیسے صحیح ہوگا کہ پھول کی بات کرو خوشبُو

کی بات نہ کرو۔ یہ تقاضا کون کرسکتا ہے کہ درخت کی بات کرو مگر اس کے پھل کی بات نہ کرو
یہ تقاضا کون کرسکتا ہے کہ چاند کی بات کرو مگر چاندنی کی بات نہ کرو۔ اس لیے میں جب
ذکر کرتا ہوں سلام کا صلوٰۃ کا۔ ذکر کرتا ہوں محمدؐ کا تو آلِ محمدؐ کو کبھی اس سے جُدا نہیں کرسکتا
میرے بزرگ مولانا متین صاحب نے دو حدیثیں بیان کیں۔ میں خوش ہوا کہ ذکر بھی آیا،
دگرنہ یہ ذکر نہیں آتا۔ میں ان کو داد دیتا ہوں کہ انھوں نے یہ بات کی برملا کی اور حضرت
علامہ نے اس کی تشریح کی اور اپنے عالمانہ انداز میں کی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں جیسا کہ حضرت علامہ
نے کہا کہ اگر ایک جگہ فرمایا کہ میں سنّت چھوڑے جارہا ہوں اور ایک جگہ کہا کہ میں عترت
چھوڑے جارہا ہوں تو یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ یہ دونوں مترادف ہیں۔ عترت سے سنّت
معلوم ہوئی اور سنت وہی مسلّم ہوگی جسے عترت سندِ جواز عطا کرے۔ ابھی ایک آیتِ
قرآنی کا ذکر ہورہا تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی نُور، کتاب مبین بھی نور، سرکار بھی نور۔ کتاب مبین قرآن،
قرآن موجود ہے نورِ رسالت کی جگہ۔ جب نور اپنی جگہ سے ہٹنے لگے گا نور کی جگہ پھر نُور ہی
لے گا اور وہ رہے گا۔ ہوسکتا ہے کبھی سُورج پر بادلوں کا سایہ پڑ جائے، پرچھائیاں پڑ
جائیں وہ نظر نہ آئے مگر رہے گا نور کی نیابت نُور کرتا رہے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ
کبھی وہ نظر آئے کبھی نظر نہ آئے مگر رہے گا۔ جیسے کہ آفتاب بادلوں میں چھُپ کر بھی آفتاب
رہتا ہے اور وقت آتا ہے کہ بادل چھٹتے ہیں اور آفتاب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔
وقت آسکتا ہے کہ وہ بادل چھٹیں جو ہجر کے بادل ہیں۔ وہ بادل چھٹیں جو فاصلوں کے بادل
ہیں، وہ بادل چھٹیں جو غیابت کے بادل ہیں، وہ بادل چھٹیں جو مادیّت کے بادل ہیں اور
پھر وہ آفتاب عالمتاب طلوع ہو اور ساری دنیا بقعۂ نور بن جائے۔ اس لیے میں نے کہا تھا
حضرت علامہ کہ جب میں ہماشما سے سُنتا ہوں کہ ہم اس زمین پر نور کا نقشہ قائم کردیں گے،
اُجالوں کو پھیلا دیں گے تو مجھے کبھی یقین نہیں آتا۔ ہر مردے وہر کارے کے مصداق ہر شخص یہ کام
نہیں کرسکتا۔ یہ کام وہی کرے گا جس کا یہ ہے اور جب وہ کرے گا تو ہر شخص اپنی آنکھوں

سے دیکھ لے گا کہ یہ کام ہو گیا اور وہی ہے کہ جس کے بارے میں کہا کہ میں عترت کو اور سنّت کو تمھارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں تو دونوں ہم معنی ہیں دونوں مترادف ہیں۔ سنّت وہی ہے کہ جسے عترت سند جواز عطا کرے اور میں آج اگر اس ذکر پاک میں کچھ گھر والوں کا ذکر زیادہ کر رہا ہوں تو اس لیے کہ گھر والے کا ذکر مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے گھر والوں کا ذکر نہ ہو۔ محبت اُس سے معتبر اس وقت تک نہیں جب تک اس کو اس کی اولاد سے محبت نہ ہو میں کسی ایسے شخص کو اپنا محب ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں ہوں جو میرے بچّوں سے محبت نہ کرے۔ میں کسی ایسے شخص کو اپنا خیر خواہ نہیں سمجھ سکتا جو میرے بچّوں کا میری اولاد کا خیر خواہ نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محمدؐ سے محبت کا دعویٰ ہو اور آلِ محمدؐ سے محبت نہ کرے اور پھر وہ آل جو صرف نسبت ہی کی وجہ سے محترم نہ ہو بلکہ خود اپنے ذاتی کمالات کی وجہ سے ہوئی ہو۔ دنیا میں انبیائے کرام جتنے آئے ان سب کو معجزات ملے لیکن جو معجزے ہمارے آقا کو عطا ہوئے وہ کسی کو نہیں ہوئے اور جو معجزہ آلِ محمدؐ کی صورت میں آپ کو عطا ہوا وہ بھی کسی نبی کو عطا نہیں ہوا۔ تاریخ کے سارے ادوار دیکھیں تاریخ میں جتنے خاندانوں کے تذکرے ہیں سب کھنگال ڈالو۔ آدم سے تا ایں دم۔ انسانِ اوّل سے لے کر اب تک اور قیامت تک جتنے خاندان آئے۔ جتنے آئیں گے۔ ماضی حال مستقبل سب زمانوں پہ اپنی بات کو پھیلا کر دیکھیے۔ جتنے خاندان آئے ان میں کوئی خاندان ایسا ہے جو شجاعت میں ممتاز ہے۔ کوئی خاندان ایسا ہے جو سخاوت میں ممتاز ہے۔ کوئی خاندان ایسا ہے جو علم میں ممتاز ہے۔ کوئی خاندان ایسا ہے جو حُسن میں ممتاز ہے۔ کوئی خاندان ایسا ہے جو کمال میں ممتاز ہے لیکن کوئی خاندان ایسا نہیں جو ساری خوبیوں کا حامل ہو۔ وہ صرف ایک ہی خاندان ہے۔ خاندانِ نبوت جس خاندان کے اندر ہر وہ خُوبی ہے کہ جس خوبی سے آدم شناسا ہے اور ہر وہ خوبی ہے جس سے ابھی تک آدم شناسا نہیں ہو سکا۔ یہاں صداقت بھی دیکھو گے۔ شجاعت بھی دیکھو گے۔ علم بھی دیکھو گے۔ عمل بھی دیکھو گے۔ حُسن بھی دیکھو گے۔

کمال بھی دیکھو گے۔ جمال بھی دیکھو گے۔ یہاں تم امامت بھی دیکھو گے۔ یہاں تم دنیا کی ہر وہ خوبی دیکھو گے کہ زمانہ جسے دیکھنے کے لیے ترستا ہے۔ میں جانتا ہوں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بعض ناقدین کا کہنا ہے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ایک چیز کی کمی تھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ایسا کہا گیا ہے کہ اس خاندان کو سیاست نہیں آتی تھی۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ اس خاندان کو سیاست نہ آتی تھی۔ وہ سیاست اسے آنی بھی نہ چاہیے تھی جو میکاولی کی سیاست ہے۔ وہ سیاست اسے آنی بھی نہیں چاہیے تھی جسے زمانہ دجل اور مکر و فریب کے عنوان سے جانتا ہے وہ سیاست کہ جو فریب کاری ہے اُس سیاست کا گزر واقعی اس خاندان میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس میں تو صاف سیدھی بات ہے اس میں کوئی لاگ لپیٹ نہیں۔ اس میں اسلام کے لیے اس میں نظام اسلام کے لیے۔ اگر کلمہ گوئی کا بھی مقابلہ کرنا پڑے اگر ان کے بھی گلے کاٹنے پڑیں تو یہ مقدس ہے اسلام مقدس ہے۔ جو آتا ہے حق کے اصول پر آتا ہے وہ آئے جو جاتا ہے جائے۔ نہ جانے والوں کی پروا ہے نہ آنے والے کی پروا ہے۔ پروا اگر ہے تو اسلام اور نظام اسلام کی ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے فتح نہیں کی۔ فتوحات ہوئیں مگر علیؑ کے عہد میں۔ فتوحات ہیں تم نہیں کہتے ہو کہ ہر چیز تھی لیکن کسی ایک چیز کی کمی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ بڑی فتوحات کے نام ہم گنواتے ہیں۔ سندھ کی فتح تک روم کی فتح تک۔ ایران کی فتح تک۔ کتنے ہی مقامات اس باب میں آئے لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ بدر او راحد کے اندر اسلام کی عظمت کا پرچم لہرانے والا اگر اپنی ذوالفقار کو بے نیام نہ کرتا تو اس کی چمک روم اور فارس کے دروازہ تک کون پہنچاتا اگر خندق میں عمرو بن عبدود کے مقابلے میں نکل کر اس کو دو نیم کوئی نہ کر دیتا تو پھر سندھ کے ریگزاروں تک کسی کے پہنچنے کی توقع ہی کیا ہو سکتی تھی۔ اگر خیبر کا قلعہ ہی سر نہ ہوتا تو پھر دنیا کے دوسرے قلعوں کو سر کرنے کی اُمید ہی تم کہاں باندھ سکتے تھے۔ تم کیسے اس سے کریڈٹ چھین سکتے ہو جس نے ایک عمارت کی بنیاد رکھی ہو۔ اگر بنیاد نہ ہوتی تو عمارت کا تصور کیسے ہوتا۔ اگر علیؓ

کی فتوحات تاریخ اسلام میں شامل نہ ہوں تو خدا کی قسم تاریخ اسلام کا وجود ہی باقی نہ ہو

تو جناب والا جیسا کہ میں نے کہا تقریر کرنا آج میرا مقصد نہیں۔ میں تو اس ذکر پاک کے مبارک لمحوں اور مبارک ساعتوں میں شریک ہونے آیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نظام تعلیم پر تمہاری بحث نظر سے گزری مگر یہ بھی بتانا چاہیے جو ہے اگر وہ غلط ہے تو پھر کیا ہونا چاہیے۔ آپ نے صحیح کہا مگر ہر شخص ہر کام نہیں کرتا۔ ہر شخص سے ہر کام کا اصرار ٹھیک نہیں۔ وہ بھی خدمت کرتا ہے جو راہ چلنے والے کو بتا دے کہ تم جس رستے پر جا رہے ہو یہ غلط رستہ ہے۔ وہ بھی خدمت انجام دیتا ہے جو یہ بتا دے کہ یہ راہ جس راہ پر تم جا رہے ہو یہ منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتی۔ ضروری نہیں کہ وہ یہ بھی بتا سکے کہ منزلِ مقصود کون سی ہے۔ پھر اس کے لیے حضرت علامہ آپ ایسے لوگوں کی ضرورت ہے کہ جو یہ بتا سکتے ہیں کہ اگر یہ رستہ غلط ہے تو پھر منزلِ مقصود کو کون سا رستہ جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ نے جو رستہ بتایا ہے قرآن کا رستہ ہے۔ قرآن کی بنیاد پر نظام تعلیم کا رستہ ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ مجھے وہ بات یاد آ رہی ہے جو میں نے پچھلی دفعہ اسی اسٹیج سے کہی تھی۔ مگر وہ مقام کب آئے گا۔ یہ بات بہت آسان ہے۔ بہت دل کو لگتی ہے۔ یہی بات ہے اور کوئی بات نہیں۔ یہی حق ہے۔ یہی صداقت ہے۔ مگر یہ منزل آئے گی کب؟ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ منزل اس وقت آئے گی جب پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کے اندر یہ تفرقہ ختم ہو جائے گا کہ محمدؐ کا ذکر کرنے کی آزادی ہے لیکن آلِ محمدؐ کا ذکر کرنے کی آزادی نہیں آپ مجھ سے کہہ دیں کہ تم صاحبِ اختیار ہو ایسا کر دو۔ کاش میں ایسا کر سکتا۔ کاش کہ ذہنوں کے اُفق اتنے وسیع ہوتے۔ کاش کہ مریض کا نظامِ ہضم اتنا معتبر ہوتا کہ وہ یہ ڈوز برداشت کر سکتا۔ حضرت علامہ یہ ڈوز بہت سخت ہے۔ آپ نے غور فرمایا ہے یقیناً فرمایا ہے۔ ذکر بہت سوں کا ہوتا ہے۔ ہوتا آتا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ اس دیس میں گورو نانک کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ مجھے کبھی اطلاع نہیں ملی کہ کسی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی ہو۔ میں خوش ہوں کہ یہ اطلاع نہیں ملی۔ اس لیے کہ میں گورو نانک کی عظمت کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ اسی دیس میں دیوالی کے تہوار بھی ہوتے ہیں۔ رام چندر کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ اچھا ہے پیش کیا

مگر کہیں سے مجھے احتجاج کی قراردادیں موصول نہیں ہوئیں۔ اسی دیس میں کرسمس بھی منایا جاتا ہے۔ مسیح کی یاد بھی منائی جاتی ہے اور حضرت علامہ ٹی وی پر تو حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھاتے بھی دکھاتے ہیں کہ عیسائی چاہتے ہیں اس لیے دکھا دو۔ مگر مجھے کبھی کوئی احتجاج کی قرارداد موصول نہیں ہوئی۔ لیکن یہ کیا ذکر ہے۔ یہ کیسا ذکر ہے کہ جب یہ ہوتا ہے تو یزیدیت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے۔ یہ کیا ذکر ہے کہ حسینؑ کے نانا کے کلمہ گریوں کے معاشرے میں حسینؑ کے نانا کو ماننے والے اس کا کلمہ پڑھنے والوں کے معاشرے میں اس ذکر کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا کرتے۔ کیا سیاہ پرچموں سے ڈر آتا ہے۔ کیا کسی خاص ماڈل سے تعصب ہے مگر یہ پرچم ہر رنگ کے پرچم سرخ پرچم، سیاہ پرچم، شب و روز لہرائے جاتے ہیں۔ شب و روز سیاسی پارٹیاں لہراتی ہیں۔ شب و روز بچوں کے ہاتھ میں ہم دیکھتے ہیں۔ شب و روز مختلف ماڈل بنتے اور بگڑتے ہیں۔ کبھی کسی کو تکلیف نہیں ہوئی تو پھر کیا بات ہے۔ پھر تو یہ ذکر اس بات کا پیمانہ ہے کہ اگر معاشرہ اس کو برداشت نہیں کرتا تو گویا یزیدیت موجود ہے۔ یہ ذکر اس بات کا تھا۔ حضرات مجھ پر فتوے لگ جائیں میں فتوے برداشت کرنے کا عادی ہوں۔ میں خوفِ خلق کو شرک سمجھتا ہوں۔ مجھ میں سب عیب ہیں۔ سب خرابیاں ہیں۔ سب خامیاں ہیں مگر اپنی دانست کی حد تک شاید ایک خامی نہیں اور میں اسی پر اپنی نجات کا وسیلہ اور دار و مدار دیکھتا ہوں کہ:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

جو دل میں ہے وہ زباں پر لاؤں گا تو حضرت علامہ! اس وقت قرآن کی بنیاد پر آپ کا مجوزہ نظام تعلیم رائج ہوگا۔ اس معاشرے میں جب محمدؐ کے ساتھ آلِ محمدؐ کا ذکر یہ معاشرہ کرے گا۔ کن برادرانِ یوسف میں گھر کر حضرت علامہ! آپ اسلامی حکومت قائم کرنے چلے ہیں۔ اور اس وقت جو میں نے خرابی کی نشان دہی کی حد تک بات کی ہے۔ وقت آئے گا جب ایسے مفکرین سے آپ کی قوم اکتساب بھی کریگی۔ یہ قوم جو زندوں کی دشمن ہے، یہ قوم جو مُردوں کی قدر کرتی ہے،

آپ ایسا فاضل کسی اور قوم میں ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

حضرتِ علامہ! آپ کی بات میں نے دل پر نوٹ کی ہے۔ آپ کا عالمانہ خطبہ فضا کی وسعتوں میں ارتعاش پیدا کرتا رہے گا اور وقت آئے گا یہ نسل اس سے فائدہ اٹھائے گی۔ آنے والی نسل اس سے فائدہ اٹھائے گی۔ یہی مستقبل کا علم ہے یہی مستقبل کی فکر ہے اسی فکر میں عالم اسلامی کی نجات ہے اسی فکر میں عالم انسانیت کی نجات ہے۔ زمانے کو یہ فکر قبول کرنی پڑے گی اسی فکر کو سینے سے لگانا پڑے گا۔ ہم سے آپ اگر یہ کام، یہ سارے کے سارے کام لینا چاہتے ہیں تو پھر میں کیا عرض کروں کہ آپ ہم سے کیا کیا کام لیجیے گا۔ آج میں آ رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ آج سلطان فتح علی ٹیپو کا دن ہے آج اس کا یوم شہادت بھی ہے آج کے دن سرنگاپٹم سے اسلام کا پرچم اُتار گیا آج کے دن ٹیپو شہید ہوا تھا آج کے دن میسور کا چاند گہنا گیا تھا۔ مجھے ڈر آتا ہے کہیں پاکستان آج عالم اسلام کا میسور تو نہیں ہے۔

حضرات میں ڈرتا ہوں کہ ٹیپو کو جن جعفروں اور صادقوں کا سامنا تھا کہیں آج پاکستان کے میسور میں بھی تو وہ اپنا رول کسی اور انداز میں ادا نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت میسور کا قلعہ سر کر لیا انگریز نے تو اس کے جنرل نے کہا کہ اب ہندوستان پر سالہا سال تک اسلام کا پرچم لہرا نہ سکے گا۔ اب ہمارے جھنڈے کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خدا کی قسم آج یہ پاکستان جتنا کچھ ہے یہ عالم اسلام کا حصار ہے یہ حصار کچھ طاقتیں چاہتی ہیں کہ نہ رہے۔ خدانخواستہ یہ نہ رہا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ عالم اسلام باقی رہ جائے گا۔ آج ہم اس میسور کی حفاظت کر رہے ہیں۔ آج ہم جعفروں اور صادقوں سے نپٹ رہے ہیں آج ہم ان کا مقابلہ کر رہے ہیں آج ذوالفقار علی بھٹو کا رول لیجیے۔ آج فتح علی ٹیپو کا رول لیجیے۔ وقت بتائے گا زمانہ بتائے گا۔ تاریخ گواہی دے گی لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ ٹیپو شہید ہوا تھا یہ ٹیپو غازی بنے گا۔ آپ اس میدان میں ہمارا ساتھ دیجیے اس لیے

کہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے ماننے والوں کی راہ یہی ہے۔ میری سمجھ میں آ سکتی ہی نہیں یہ بات کہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے ماننے والے ان عباؤں اور قباؤں والوں کا ساتھ دیں گے۔ جنھوں نے خونِ حسینؓ کے قتل نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ جنھوں نے اس زمانے میں بھی بادشاہت کو سہارا دیا تھا۔ اور جو آج بھی سرمایہ دارانہ سیاست کو اس کی گرتی ہوئی دیوار کو آخری سہارا دے رہے ہیں۔ میں نہیں مان سکتا کہ شہیدِ کربلا کا ماننے والا سرمایہ دارانہ، ملوکیت پسندانہ سیاست کا حامی ہو سکتا ہے اس لیے آیئے آپ یہ کام کیجیے ہمارے ساتھ مل کر یہ کام ہو جائے گا تو قرآن کی بنیاد پر نظامِ تعلیم بھی بنے گا۔ میں معذرت خواہ ہوں حضرات! کہ میں آج تقریر کر نہیں سکا۔ آج میرا پروگرام تقریر کرنے کا واقعی نہیں تھا۔ میں آج اس ذکرِ پاک کی پُر کیف لمحوں میں شریک ہوا اور علامہ صاحب کی زبان سے یہ علم بھرے الفاظ سننے میں بہک گیا۔ میں دُور چلا گیا۔ مجھے احساس ہے کہ میں اہلِ بیت کی طرف زیادہ چلا گیا مگر یہ جرم ہے میرا پُرانا جرم ہے اور یہ جرم وہ ہے جس کا میں ہمیشہ سے اقراری مجرم رہا۔ اور یہ وہ جرم ہے کہ جس کی بنیاد پر میں اپنے آقا سے ان کا دامن پکڑ کر شفاعت طلب کروں گا اور اس شعر پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں کہ

کوثر مجھے اس جرم سے انکار نہیں ہے
شیدا ہوں دل و جاں سے میں اولادِ علیؓ کا

سفرِ حجاز کے تاثرات

"۱۹۶۵ء میں دیارِ حبیبؐ سے واپسی ہوئی تو غالباً اسی سال پاکستان میں شاہ فیصل کی بھی آمد آمد تھی۔ ریڈیو پاکستان لاہور کی خواہش پر اس موقع پر مختصر تقریر نشر کی گئی تھی۔"

سعودی عرب اور پاکستان کا رشتہ بہت پُرانا ہے۔ ابھی پاکستان کی تحریک کا آغاز تھا کہ مسلمانوں نے ہماری تائید وحمایت کرنا شروع کی۔ پاکستان بنا تو اپنی قومی تاریخ کے ہر مرحلے پر ہمیں ان کا تعاون حاصل ہُوا اور یہ تعاون مادی بھی تھا اور اخلاقی بھی، قلبی بھی تھا اور رُوحانی بھی۔ پاکستان کے پُرامن انقلاب کے بعد یہ رشتہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گیا اور اب اس کی پختگی کا عالم یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت سعودی عرب اور پاکستان کی دوستی میں حائل نہیں ہو سکتی۔

اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے اہلِ پاکستان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ امسال حج کے مبارک موقع پر ۲۴ر مارچ کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک پانچ رکنی وفد بھیجا گیا تھا جس کے قائد وزیر داخلہ وامور کشمیر چودھری علی اکبر خان تھے اور خوش قسمتی سے مجھے بھی اس وفد کا ایک رکن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وفد کے ارکان نے ریڈیائی نشریات، اخباری انٹرویو اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے سے ممالکِ اسلامیہ کے عوام اور اکابر وزعماء کے

سامنے کشمیر اور دوسرے اہم مسائل پر پاکستان کا نقطہ نظر واضح کیا اور اس سلسلے میں انگریزی اور عربی زبان کے ہزاروں کتابچے بھی تقسیم کیے۔ ہم نے متعدد اسلامی ممالک کے سرکاری وفود سے بھی ملاقات کی اور اہلِ پاکستان کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ ان سبھی ملکوں نے پُرزور لفظوں میں تمام اہم مسائل پر ہمارے موقف کی تائید کی۔ ان ملکوں میں اردن، عراق، شام، لبنان، تیونس، مراکش، لیبیا، سوڈان، مالی، موریطانیہ، کیمرون، سینگال، سمالیہ، نائیجریا، الجزائر، ترکی، ایران، انڈونیشیا، فلپائن، عدن، سیلون اور سعودی عرب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

منیٰ کے مقام پر ہم نے بلادِ اسلامیہ کے اکابر وزعما کے اعزاز میں ایک عشائیہ بھی دیا۔ جس میں عالمِ اسلام کے تقریباً پانچ سو راہنماؤں نے شرکت کی۔ اس تقریب میں پاکستانی وفد کے قائد کے علاوہ مُفتیِ اعظم فلسطین، نجف اشرف کے آقائے عبدالباری، لبنان کے مفتیِ اعظم، عرب کے بعض مُقتدر عُلمائے نے جو تقریریں کیں وہ اسلامی اخوت و محبت کا شاہکار تھیں۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم سب ایک ہی ساز کے تار اور ایک ہی درخت کے برگ و ثمر ہیں۔

وفد کے ذمّے ایک اہم ترین مگر خوشگوار فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ اولین فرصت میں سعودی عرب کے قابلِ صد احترام حکمران فیصل اعظم کی خدمت میں حاضری دے کر پاکستان کے صدر گرامی قدر فیلڈ مارشل محمّد ایوب کا ایک اہم مکتوب پیش کرے، اور پاکستان کے عوام اور حکومت کی طرف سے حالیہ جہاد میں عالمِ عرب کی مخلصانہ امداد پر ہدیۂ تشکّر پیش کرتے ہُوئے انھیں پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دے۔ ہمیں اس سلسلے میں دو مرتبہ شاہ فیصل کی خدمت میں حاضری دینے کا موقع ملا اور ہم نے دورانِ ملاقات میں جب بھی اپنے جذباتِ تشکّر و امتنان کا اظہار کیا شاہ فیصل نے یہی فرمایا کہ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے، یہ تو ایک فرض تھا جو ہم نے ادا کیا۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ شاہ فیصل نے پاکستان آنے کی دعوت قبول فرمائی۔ اب وہ پاکستان تشریف لا چکے ہیں اور اس طرح پاکستان کے مسلمانوں کو اپنے ایک عزیز دوست اور عالمِ اسلام کے ایک عظیم مدبّر اور راہنما کا استقبال کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ شاہ فیصل سے ملاقات اور عرب عوام و خواص کے تاثرات سے براہِ راست آگاہ ہونے کے نتیجے میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ پاکستان کے ایک قابلِ فخر اور مخلص دوست ہیں۔ حالیہ حج ہی کے موقع پر اس کا ایک اور ثبوت فراہم ہوا۔ شاہ کی خدمت میں مقبوضہ کشمیر کے ایک مفتی صاحب نے حاضری دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ کشمیر کا دورہ کریں۔ جب شاہ نے جواب دیا تو لوگ ان کی حاضر جوابی پر عش عش کر اُٹھے، شاہ نے فرمایا:

" مفتی صاحب! مجھے کشمیر کے مسلمانوں سے بے پناہ محبت ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب کشمیر آزاد ہو گا سب سے پہلا مسلمان حکمران جو وادیٔ کشمیر میں بطورِ مہمان داخل ہو گا میں ہوں گا۔"

شاہ فیصل عرب عوام میں انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک بہت بڑے اجتماع سے قسم دے کر پوچھا تھا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے کسی موقع پر مجھ سے ملنے کی خواہش کی ہو اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا ہو۔ تو ہزاروں کے مجمع میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو ان کے اس دعوے کی تردید کر سکے۔ وہ ہمیشہ ہفتے میں ایک دن عام کچہری لگاتے ہیں جس میں ہر شخص اپنی فریاد پیش کر کے داد خواہ ہو سکتا ہے وہ اتنی سادہ زندگی گزارتے ہیں کہ وزارتِ عظمٰی کے عہد میں وہ جس مکان میں رہتے تھے، بادشاہ بننے کے بعد بھی اسی مکان میں قیام پذیر ہیں۔ قصرِ شاہی کو انھوں نے مہمان خانہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ بہت سے لوگ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ شاہ فیصل کا ایک فرزند آج بھی ایک کمپنی میں ملازم ہے اور بمشکل ہزار ڈیڑھ ہزار ریال ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔

فیصل المعظم کی یہ خواہش اور کوشش بھی عرب عوام میں ہر جگہ خراجِ تحسین وصول کر رہی

ہے کہ وہ پورے عالمِ اسلام کو متحد کرنے کا علم بلند کر چکے ہیں اور انشاءاللہ وہ وقت دُور نہیں جب اسلامی ممالک ملّتِ واحدہ بن کر کفر کا مقابلہ کریں گے اور ظلمتوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی انسانیت کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوں گے۔ ہمارا وفد جہاں بھی گیا عرب مسلمانوں نے دھڑکتے ہوئے دلوں اور برستی ہوئی آنکھوں سے ہمارا استقبال کیا وہ خُوب جان چکے ہیں کہ پاکستان لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی اساس پر قائم ہُوا ہے اور یہی وہ کلمہ ہے جس نے حالیہ جہاد میں اس کی پشتی بانی کی ہے۔ ہم نے بھی عرب بھائیوں پر واضح کر دیا۔ اور انشاءاللہ پاکستان میں مہمانِ عزیز و عظیم کا عدیم النظیر استقبال اسے مزید واضح کر دے گا کہ پاکستان کی مسلمان قوم کا ایک ایک فرد حرمین شریفین کے ایک ایک ذرّے کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز رکھتا ہے کیونکہ ان میں سے ایک حرم کو اللہ نے ہمارے لیے قبلہ بنایا ہے اور دُوسرا حرم ہمارے ہادیٔ برحق سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب راہ کے ساتھ نسبت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور قومیں کروڑوں اور اربوں روپے خرچ کر کے دوسرے ملکوں میں اپنے لیے اس محبت کا اقل قلیل حصّہ بھی پیدا نہیں کر سکتیں جو محبت اللہ کے دین نے حرمین شریفین اور ارضِ حجاز کے لیے کسی خرچ کے بغیر ہمارے دلوں میں آپ سے آپ پیدا کر رکھی ہے۔ وہ چیز ہے جس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعے سے تمہاری تائید فرمائی اور مسلمانوں کے دل باہم جوڑ دیے۔ اگر تم دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان کے دل نہ جوڑ سکتے تھے۔ مگر اللہ ہی نے ان کے دل جوڑ دیے۔ بے شک وہ زبردست اور حکیم ہے۔"

(بشکریہ ریڈیو پاکستان)

اہلِ بیتِ رسولؐ

"اہلِ بیت سے میری محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ایک زمانے میں بعض لوگوں کی خشمگیں نگاہوں کا احساس ہوا تو میں نے برملا کہا ۔

کوثر مجھے اس جرم سے انکار نہیں ہے
شیدا ہوں دل و جان سے میں اولادِ علیؑ کا

ذکرِ رسول کی طرح میں نے ذکرِ اہلِ بیت میں بیسیوں تقریریں کی ہیں۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ تقریر ۱۹۵۴ء میں موچی دروازے کی ایک اہلِ بیت کانفرنس میں کی گئی تھی۔ بہت سے دوستوں کے پاس ٹیپ کی صورت میں محفوظ ہو گی مگر میرے پاس ان کا ریکارڈ نہیں۔ یہ تقریر اتفاق سے ایک دوست نے بھجوائی جو پشتو زبان کے ایک رسالے کی صورت میں امامیہ مشن لاہور نے شائع کی ہے اور پشتو کے مشہور ادیب امیر حمزہ خان شنواری نے اسے اردو سے منتقل کیا ہے۔ میں نے ایک پشتو دان دوست کے ذریعے سے اردو میں اس کا ترجمہ کرایا ہے اس طرح یہ ترجمہ در ترجمہ ہونے کے بعد خطابت کا اصل جوہر تو کھو چکی ہے مگر پھر بھی اس میں میرے جذبات کی عکاسی ضرور پائی جاتی ہے۔ پشتو کے مطبوعہ رسالے میں امامیہ مشن کے آنریری جنرل سیکرٹری نے شروع میں چند تعارفی سطور بھی لکھی ہیں جو یوں ہیں :"

"اہلِ بیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بزرگی وعظمت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ وہ پاک ہستیاں ہیں کہ اللہ اور رسول کے واضح اور صاف احکامات کی روشنی میں ان کی محبت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس رسالے میں مولانا کوثر نیازی صاحب نے نہایت ہی اختصار سے اہلِ بیت کرام کی فضیلت کے مختلف پہلوؤں پر دلکش واحسن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مولانا موصوف بلند پایہ خطیب، قادر الکلام شاعر، قابلِ ناز ادیب، ایک ذمہ دار صحافی اور ایک شعلہ بیان مقرر ہیں۔ اور اس لیے سوادِ اعظم (اہلِ سنت والجماعت) کے علماء میں وہ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں وہ (اس سے پیشتر) جماعت اسلامی کے سرگرم رکن اور جنرل سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔ اب دینی خدمات میں مصروفیت کے علاوہ ہفتہ وار "شہاب" لاہور کے ایڈیٹری کے فرائض بھی سرانجام دے رہے ہیں۔

برادرانِ ملت سے گزارش ہے کہ اس کتابچے کو اپنے حلقۂ احباب میں تقسیم کریں۔ اللہ اور رسول سے اس (کارِ خیر) کا اچھا اجر ملے گا۔"

جس طرح کہ حضور خاتم الانبیاء نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیگر مختلف صفات کی وجہ سے انبیاء سابقین پر فضیلت عطا کی گئی ہے وہ دنیا میں آخری اور کامل و جامع شریعت لائے۔ انھیں پوری دنیا کے لیے ہادیٔ برحق بنا کر بھیجا گیا۔ ان کی امت کو دنیا کی آخری امت ہونے کا شرف بخشا گیا اسی طرح اہلِ بیت کے معاملے میں بھی حضور کو انبیاء سابقین پر مطلق فضیلت حاصل ہے۔ یہ بات تاریخ کی روشنی میں ایک حقیقتِ مسلمہ کا درجہ رکھتی ہے کہ جس گھر کے وہ لوگ تھے اور جس طرح کے وہ لوگ تھے (جو) نبی آخر الزماں کے حصے میں آئے ویسے اہلِ بیت کسی کے حصے میں نہیں آئے۔ نبیٔ کریمؐ کے بعد تو کوئی دوسرا نبی قطعی طور پر نہیں آسکتا تھا۔ پس نبوت کے علاوہ ایثار و قربانی، شہادت و ولایت اور ایمان و احسان کے جتنے رتبے ممکن تھے خدا نے آلِ محمد کو عطا فرمائے اور یہ بھی ان اعلیٰ رتبوں ہی کا نتیجہ ہے کہ نبی کے اہلِ بیت کا ہر فرد عوام الناس کی آنکھوں میں رسالت ہی کی مانند ضوفشانی کرتا ہوا آتا ہے۔ اور رسالت کے گلشن کا ہر غنچہ نبیٔ کریمؐ کے اخلاق کی خوشبو سے معطر

ہے جس نے یہ کہا اس نے کیا خوب کہا ہے

شگفتہ گلشنِ زہرا کا ہر گل تر ہے
کسی میں رنگِ علیؓ ہے کسی میں بُوئے رسولؐ

دنیا میں مختلف خاندان مختلف صفات کے لیے مشہور و معروف ہیں۔ بعض خاندان علم و فضل میں ممتاز ہیں بعض حکمرانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسے خاندان جو بیک وقت علم و فضل، شجاعت و حمیت، سخاوت و جوانمردی اور دیگر صفاتِ حمیدہ کا مُرقّع ثابت ہوئے ہوں، اس لحاظ سے آسمان کے نیچے اور زمین کے اُوپر جس خاندان کی مثال پیش کی جا سکتی ہے وہ خاندانِ نبی ہے۔ نیکی اور بھلائی میں کون آگے بڑھتا ہے؟ یہ بہت مشکل کام ہے اور اس وقت تو یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب اس کو آگے بڑھانے میں پُوری دنیا کی دشمنی مول لینی پڑے۔ جان و مال کا خطرہ ہو، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ جب نبیِ کریمؐ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو چاروں طرف سے آپ کی مخالفت ہوئی۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ اہلِ مکہ آپؐ کے خُون کے پیاسے ہو گئے اس وقت آپؐ کا ساتھ دینا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس وقت ایمان لانا اور مسلمان کہلوانا ایک ایسا مشکل کام تھا جس کے بارے میں اقبال فرماتے ہیں کہ ہے

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

بعض لوگوں کو تو مسلمان ہونا بہت آسان کام نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ محبت کے اس میدان میں قدم رکھنے کے مترادف ہے جہاں جاں کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ اس مشکل گھڑی میں جب چند چیدہ چیدہ حضرات نے آپ کی دعوت پر آمنّا و صدقنا کہا تو وہ مصائب و تکالیف سے دوچار ہوئے۔ ان میں بھی خانوادہ نبوّت کے افراد پیش پیش تھے۔ والٹیر (فرانس کے فلاسفر) کا قول ہے کہ کوئی شخص اپنے عزیزوں کی نظر میں ہیرو یا لیڈر نہیں بن سکتا۔ یہ کیوں؟

اس لیے کہ اپنے عزیزوں پر اس کی پوری زندگی آشکارا ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اکثر ایک ہی خاندان کے لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے خاندان کا کوئی فرد عظیم انسان بن جائے اور دُنیا میں اس کا جھنڈا بلندی پر لہرائے۔ بڑے بڑے انبیا پر خود ان کے خاندان کے لوگ ایمان نہیں لائے لیکن اس ہیرو (محمدؐ) کی شان ہی سب سے الگ تھی اور ان کے گھرانے کے لوگ بھی ایک منفرد شان کے مالک تھے۔ جس وقت محمدؐ کی زبان مبارک سے توحید کی اذان بلند ہوئی اس وقت جو لوگ آپ کی پیروی وتقلید میں سب سے آگے تھے وہ بھی آپ کے خاندان ہی کے لوگ تھے۔ صبرواستقامت اور پھر اللہ تعالیٰ کی راہ میں صبرواستقامت (یہ) جتنا مشکل کام ہے وہ آپ کو معلوم ہوگا۔ اقبال نے کہا تھا ؎

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

مگر اللہ تعالےٰ کی محبت کے راستے میں دو چار مقامات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو ہر قدم پر ایک نیا امتحان اور ایک نئی آزمائش ہے اور اس راہ پر چلنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے۔ ع

شرطِ اول قدم اینست کہ مجنون باشی

یعنی اس راہ پر چلتے وقت پہلے ہی قدم پر یہ شرط ہے کہ دیوانے ہو جاؤ۔ عقل و فراست سے مُبرّا ہو جاؤ۔ صبرواستقامت کی مثالیں بڑے بڑے لوگوں نے چھوڑی ہیں۔ راہِ خدا میں کئی نیک بختوں نے قربانی اور ایثار کا سنگِ میل رکھا ہے۔ کئی آرے سے چِر گئے۔ کیوں کو گرم ریت پر لٹایا گیا۔ کئی ملک سے باہر نکالے گئے۔ لیکن میں تاریخ کو گواہ کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ تمام دنیا کے مصائب ایک طرف اور واقعۂ کربلا دوسری طرف، وہ واقعۂ کربلا جو پتّے کو پانی کرتا اور خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ کوئی بھی واقعہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ حسینؓ ابن علیؓ نے اللہ کی راہ میں صبرواستقامت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ تا ابد روشنی کا مینار رہے گا۔ اللہ کی

راہ میں صبر واستقامت کا یہ مطلب ہے کہ ناسازگار حالات کی لہر میں بہہ نہ جاؤ۔ اس وقت دائیں بائیں نہیں دیکھو گے۔ چاروں طرف کی مخالفت سے نہیں گھبراؤ گے اور حالات کے تقاضوں کی پرواہ نہیں کروگے۔ یہ نہیں دیکھو گے کہ میری طاقت کتنی ہے اور سامان کتنا ہے؟ دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے یا کم ہے؟ ہوائے زمانہ میرے حق میں ہے یا نہیں؟ محبت کی راہ میں اس قسم کا خیال کرنا بذاتِ خود ایک جرم ہے۔ راہِ محبت میں ایسا سوچنا ایک غلطی ہے۔ عشق ارادہ بلکہ ایک خالص ارادہ ہے۔ یہاں دامنِ خلاصی میں چھپنا کوئی امکان نہیں رکھتا۔ میرے دوستو! اگر آپ غور کریں تو مجھ سے اتفاق کریں گے کہ حسینؓ ابنِ علیؓ نے محبت کی شرط پوری کی کہ آج ان کا نام محبت اور استقامت میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس نفسا نفسی اور زوال پذیر زمانے میں بہت کچھ بھلا دیا ہے لیکن حسینؓ ابنِ علیؓ کا نام ان کے حافظوں سے محو نہیں ہوا۔ ؎

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت   سطوتِ غرناطہ از ہم یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز   تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

یعنی ملک شام کی شوکت اور بغداد کی رونق ختم ہوئی۔ غرناطہ کا دبدبہ بھی لوگوں سے بھول گیا (لیکن) ہماری (زندگی) کے تار ابھی تک مضراب سے لرزتے ہیں۔ اس کے نعرۂ تکبیر سے اب بھی (ہمارے) ایمان تازہ ہیں۔ حکومتیں تو مروں نے بھی کی ہیں اور دوسرے لوگوں نے بھی بڑے اچھے طریقے اور بہتر انداز سے کی ہیں۔ لیکن سوائے اسلام کے ماننے والوں کے تاریخ گواہ ہے کہ کوئی حکمران یا بادشاہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ اقتدار پر فریفتہ نہیں ہے لوگ سر کی بازی لگا دیتے ہیں لیکن اقتدار کی کرسی اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتے۔ لیکن رسولِ کریمؐ کے اہلِ بیت میں سے ان کا ایک فرزند ایسا بھی تھا کہ حکومت پر قبضہ ہوتے ہوئے بھی اس نے اس پر لات ماردی۔ یہ امام حسنؓ تھے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ محض ان کی حکومت کے سبب مسلمان آپس میں دست و گریبان ہوجائیں اور ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔ دنیا والے کتنے

ظالم ہیں کہ اس بے نیازی کے باوجود پاک اہلِ بیت پر ہوسِ اقتدار کا بہتان لگاتے ہیں۔ دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ بڑے اچھے اچھے حکمرانوں پر انگلی اٹھائی جا سکتی ہے لیکن آسمان نے شاذ و نادر ہی دیکھا ہو گا کہ شہنشاہِ دو عالم کی لڑکی اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہو اور اپنے ہاتھوں کے چھالے دکھائے اور عرض کرے کہ "بابا جان! دیکھیے کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں کا یہ حال ہو گیا ہے اور دیکھیے کہ پانی کے مشک ڈھو ڈھو کر پیٹھ داغ داغ ہو چکی ہے۔ بابا جان! مجھے لونڈی دی جائے۔" اور حضور فرمایا کرتے تھے کہ "فاطمہ تمہیں لونڈی نہیں مل سکتی کیونکہ وہ مدینے کے غریبوں اور محتاجوں کے لیے ہے۔" تم پر درود و سلام ہو اے اہلِ بیتِ رسول، تم نے اپنے خون سے اسلام کے چمن کی آبیاری کی۔ اُمتِ محمد قیامت تک تمہارے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتی ۔

محرّم کا پیغام

”محرم الحرام کے موقع پر کی گئی تقریر
مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے“

اسلامی سال تو ہر بار ہی شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ لہولہان مقدس مہینہ اس بار ہمارے لئے جو دکھ اور عبرتیں لے کر شروع ہوا ہے۔ اس سے معرکہ کربلا کے مناظر پھر آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ آج بھی اسیرانِ کربلا کی طرح ترانوے ہزار اہل ایمان گرفتار بلا ہیں۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ کیمپوں میں ان نہتوں پر گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ اُدھر تو کربلا کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ اور ادھر محرم الحرام کی آمد پر امن و امان برقرار رکھنے کے لئے امن کمیٹیاں تشکیل دینے کی اپیلیں کی جا رہی ہیں۔ یہ لہولہو سوچیں جو پہلے ہی صدیوں سے نڈھال ہیں۔ ان خبروں پر شدید کرب سے دوچار ہو جاتی ہیں۔

امن کمیٹیاں وہاں بنائی جاتی ہیں جہاں امن کو خطرہ ہو۔ امن کو خطرہ وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی متنازعہ مسئلہ موجود ہو۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ محرم کے اس مقدس مہینے میں مسلمانوں کے درمیان ایسا کونسا متنازعہ مسئلہ ہے جو امن کے لئے خطرہ بن سکے۔ کون مسلمان ہے حسینؓ جس کے ایمان کا حصہ نہ ہو۔ کون کلمہ گو ہے جس کی رگوں میں عشقِ حسینؓ خون کی طرح نہیں دوڑتا۔ کون سی آنکھ ہے جو امام حسینؓ

کی پیاس کے تصور میں بھیگ کر فرات نہیں بنتی۔ کون سا دل ہے جو حسینؓ کی محبت کو سمیٹنے کیلئے صحراؤں کی طرح پھیل جانے کا خواہشمند نہیں۔ حسینؓ پر اگر کوئی تنازعہ ہو سکتا ہے تو ان کی ذات سے عشق کا تنازعہ ہے۔ اور یہ وہ عشق ہے کہ ہر مسلمان اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا تمنائی ہے۔ حسینؓ پر اگر کوئی تنازعہ ممکن ہے تو اس جذبۂ قربانی پر ممکن ہے جس کی وہ زندہ مثال ہمارے سامنے پیش فرما گئے۔ ہر مسلمان دوسرے سے بڑھ کر اس قربانی کی تقلید کرنا چاہے گا۔ لیکن عشق کے یہ معاملے، محبتوں کے یہ جذبے، احترامات کے یہ سلسلے فساد یا عناد کا موجب نہیں۔ اخوت و اجتماعات کا سبب بنتے ہیں۔ اور اہل درد، اہل عشق یا اہل ارادت کے لئے امن کمیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں امن کمیٹی بنتی تھی ہندوستان میں جہاں کافروں کی طرف سے حسینؓ کی شان میں گستاخی کا اندیشہ تھا۔ امن کمیٹی بنتی ہے اس معاشرے میں جہاں حسینؓ کی عظمت پر اختلاف ہو۔ لیکن جو ملک مسلمانوں کا ہو جس کی بنیاد اسلام ہو۔ جس کا نظریہ اسلام ہو۔ جس کے باشندے مسلمان ہوں وہاں شہادت حسینؓ کا عشرہ شروع ہوتے ہی امن کمیٹیوں کی ضرورت پڑے تو پھر لازماً سوال ذہن میں آتا ہے۔ ہم کسی اجتماعی فریب میں تو مبتلا نہیں۔ اگر ملک کی بنیاد اسلام پر ہے اور حسینؓ کی یاد میں امن کو خطرہ ہے تو پھر یہ مسلمانوں کا معاشرہ کیونکر ہے۔ اگر یہ معاشرہ مسلمانوں کا ہے تو پھر عشرہ محرم سے پہلے امن کمیٹیوں کا قیام اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ بات یہی ختم نہیں ہوتی۔ بات تو یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کون ہے جسے مسلمان ہونے سے انکار ہو۔ کون مسلمان ہے جسے حسینؓ کی عظمت سے انکار ہو۔ جب سارے ہی حسینؓ کے سپاہی ہیں۔ جب سب ہی حسینؓ کے عزادار ہیں۔ جب سب ہی حسینؓ کے غمخوار ہیں۔ جب سب ہی حسینؓ کے پیغام کے علمبردار ہیں۔ جب سارے ہی یزیدیت سے بیزار ہیں تو پھر خطرہ کس سے ہے۔ اگر خطرہ ہے تو پھر ہم کیوں نہ سوچیں کہ خطرہ پیدا کرنیوالے وہی ہو سکتے ہیں جو خود امام حسینؓ کے لئے خطرہ بنے تھے۔

ہاں ہاں تاریخ کی بات کرتا ہوں جو اپنے آپ کو دہراتی نہیں آگے بڑھاتی ہے۔ اگر تاریخ اپنے آپ کو دہراتی تو بار بار حسینؓ پیدا کرتی۔ بار بار کربلا سجاتی۔ لیکن یہ تاریخ کے بس کی بات نہیں کہ

حسینؓ پیدا کرتی۔ بار بار کربلا سجاتی۔ حسینؓ کے سامنے تاریخ لاچار ہے۔ آیئے ایک نظر دیکھیں کہ حسینؓ ہمارے حسینؓ۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسینؓ، مظلوموں کے حسینؓ، شہیدوں کے حسینؓ انسانیت کے حسینؓ آخر میدان کربلا میں آل نبیؐ کے ساتھ، عورتوں اور بچوں کے ساتھ محصور کیوں کیے گئے۔ کیا یزید ان کا احترام نہ کرتا تھا۔ کیا ان پر تلوار چلانے والے بھی ان کا اسم مبارک احترام سے نہ لیتے تھے۔ کیا دن بھر پانی بند کرنے والے یہ نہ جانتے تھے کہ یہ نواسہ رسولؐ ہے۔ اور کیا خود حسینؓ کو علم نہ تھا کہ وہ اپنے اصول ترک کر کے ایک اشارہ بھی کریں تو یزید کی تمام قوتیں ان کے قدموں میں آگریں گی۔

پھر یہ تصادم کیا تھا؟ یہ جنگ کیوں تھی؟ اور قربانی کس لئے تھی؟ محققین سے پوچھیے تو لاکھ تاویلات لے آئیں گے۔ مورخین سے پوچھیے تو تاریخ دھرانے بیٹھ جائیں گے۔ مفکرین سے پوچھیے تو فلسفہ تراشنے لگیں گے۔ لیکن میرے لئے ایک عام مسلمان کے لئے حسینؓ اصولوں کا نام ہے۔ انصاف کا نام ہے۔ ظالم کے خلاف مظلوم کی قربانی کا نام ہے۔ اصول کے لئے جرأت کا نام ہے۔ میں تاریخ سے نہیں پوچھتا۔ میں مفکروں سے نہیں پوچھتا، میں مورخوں سے نہیں پوچھتا۔ میں تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ کو بتاؤ حسینؓ کیا ہے؟ کیا حسینؓ نے ایک پرانے نظام سے ٹکرا کر تاریخ کا رخ نہیں بدلا؟ کیا حسینؓ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ اصولوں پر سمجھوتہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ خواہ اس کے لئے معصوم بچوں اور خاندان رسولؐ کی بیٹیوں کو تکالیف ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ حسینؓ کی جنگ عہدے کی جنگ نہ تھی، نہ اقتدار کی۔ وہ اصولوں کی جنگ تھی۔ وہ حق کی جانب تھی۔ یہ جنگ کر کے حسینؓ نے دنیا کو بتا دیا کہ طاقت کی فتح کا مطلب حق کی شکست نہیں۔ یزید کربلا میں جیت گیا تھا۔ یزید تاریخ میں ہار گیا۔ حسین شہید ہوتے ہیں تو ظلم دفن ہو جاتا ہے۔

آؤ آج حسینؓ کو یاد کریں۔ آؤ آج اس خون کو یاد کریں جو اصول کے لئے کربلا کی ریت میں جذب ہوا۔ دنیا کی نظروں میں اس وقت بھی ہتھیار جیتے تھے، وسائل جیتے تھے۔ دنیا کی نظروں میں وہ خون نہیں تھا جو ریت میں مل گیا۔ وہ اصول نہیں تھا جسے ظلم سے کچلا گیا۔ وہ عزم نہیں تھا جسے پانی

روک کر خشک کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن آج پورے تیرہ سو سال کے بعد دیکھیے، فاتح کون رہا، اور مفتوح کون؟ آج ہتھیاروں سے فتح حاصل کرنے والا یزید ہمیشہ کے لیے مغلوب ہے۔ اور سچائی کیلیے لاش بن جانے والا حسینؓ رہتی دنیا تک فاتح۔ حسینؓ کو یہ فتح کس نے دی۔ میں ایک سادہ مسلمان کی حیثیت میں صرف یہ جانتا ہوں کہ حسینؓ چونکہ حق پر تھے۔ اس لئے فتح ان کا مقدر تھی۔ کربلا کے معرکے برپا ہوتے ہی رہیں گے۔ اگر یزید کے لشکر خاندان رسول مقبولؐ کے جگر گوشوں کو تلواروں سے ٹکڑے کرکے ظلم کا نظام باقی نہ رکھ سکے تو پھر دنیا میں کس کی یہ جرأت ہے کہ وہ ظلم کا سہارا لے کر مظلوم کو کچل سکے۔ حسین نے ہمیں سبق دیا ہے کہ سچائی طاقت کو شکست دے سکتی ہے۔ دیکھو اپنے چاروں طرف پھیلی دنیا کو۔ کتنے یزیدوں نے کتنے اسلحہ جات سے کتنے حق پرستوں کو کچلا۔ لیکن آخر فتح طاقت کو ملی یا حق کو۔ آؤ دیکھو دنیا کا منظر، ہر جگہ ہر مقام اور ہر خطے میں ظلم کے خلاف آواز اٹھ رہی ہے۔ یہ آواز حسینؓ کی آواز ہے۔ پہچانو حسینؓ کو ان آہوں میں، ان کراہوں میں، اور دیکھو مظلوم کا حملہ کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچوں اور قابل صد احترام خواتین کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے ہیں۔ کیا کوئی جارح یا جرنیل اس ڈھب سے میدان جنگ میں اترا۔ ہاں ہمارے حسین اترے کہ خون کی ہولی کھیلنا ان کا مقصد نہ تھا۔ وہ انسانیت کی بقا کے لئے آئے تھے۔ امن کی جنگ لڑنے کے آئے تھے۔ اور امن کی یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی ان کی عورتیں اور بچے کھلے میدانوں میں دشمن کے درمیان گھرے ہوئے ہیں، اور آج بھی ہم امن کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ امن جس کی بنیاد انصاف ہو۔ امن جو خون سے نفرت سکھاتا ہو امن جو قربانیوں کے بعد ملتا ہے۔ وہ جنگ جو کربلا میں شروع ہوئی تھی۔ آج بھی جاری ہے۔ اور دکھی انسانیت آج اس پرسکون دنیا کو تلاش کرنے میں بے چین ہے۔ جسے پیدا کرنے کیلیے حسین نے وہ عظیم قربانی دی جسکی یاد ہم ہر سال مناتے ہیں۔ اور اس کی یاد میں امن کمیٹیاں تو بناتے ہیں لیکن وہ امن حاصل نہیں کر پاتے جسکے لیے حسینؓ نے جنگ لڑی۔ آیئے حسینؓ کے نام پر ہم متحد ہیں تو محرم میں دنیا کو متحد ہو کر بھی دکھائیں۔

آیئے آج خلوص دل سے عزم کریں کہ آنے والا نیا اسلامی سال پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کا سال ہو۔ اتحاد کا سال ہو۔ امن کا سال ہو۔ امن کمیٹیوں کا سال نہ ہو۔

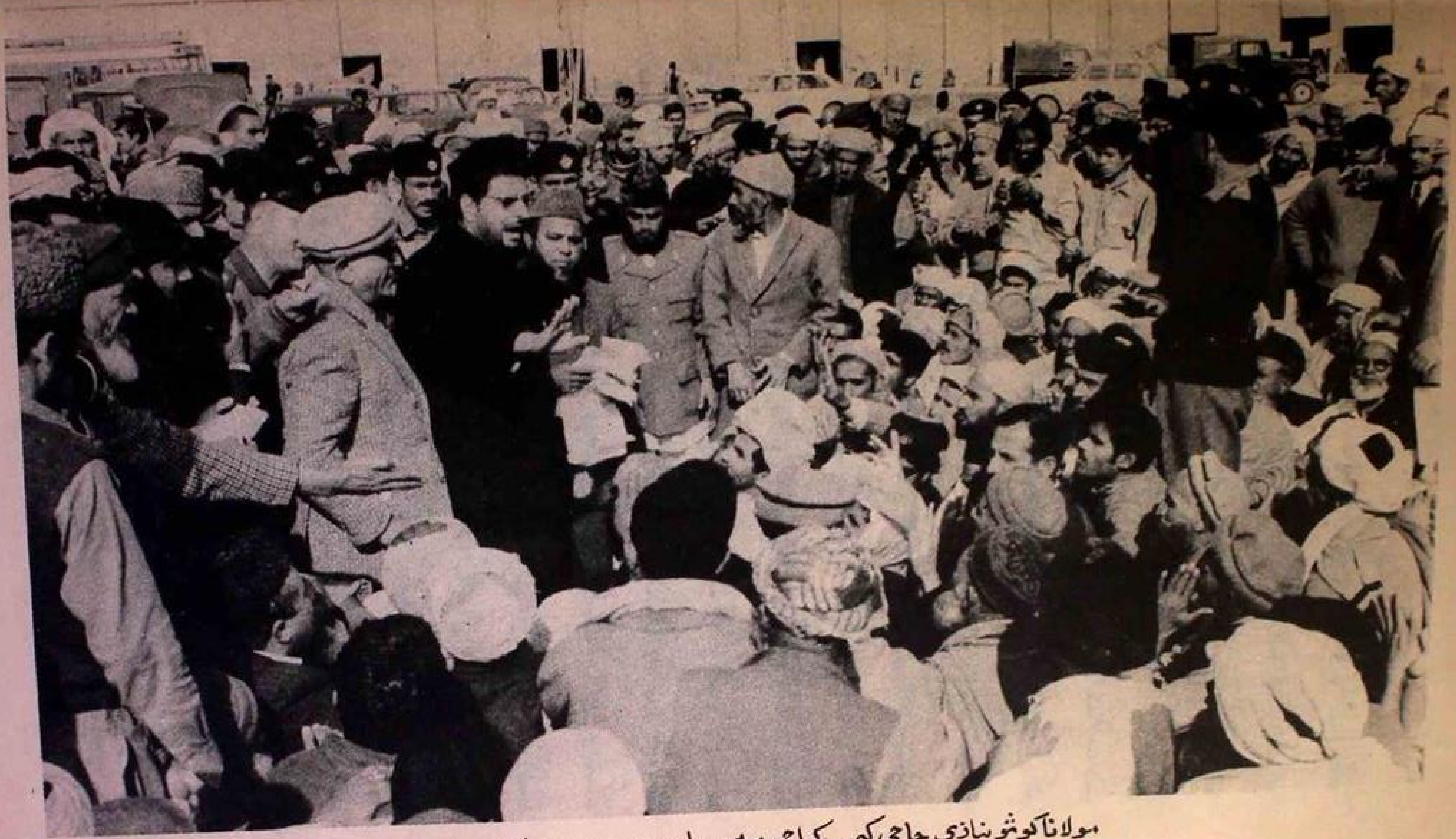

مولانا کوثر نیازی حاجی کیمپ کراچی میں حاجیوں سے خطاب کر رہے ہیں۔

تہران یونیورسٹی میں خطاب ٭

"یہ اس تقریر کا اردو ترجمہ ہے جو میں نے تہران یونیورسٹی کے کلیہ مذہبیات کی دعوت پر فارسی زبان میں کی تھی۔ اس تقریر میں اساتذہ۔ طلبا کے علاوہ ایران کے ممتاز علماء اور دانشور شریک تھے۔ تقریر کے بعد کلیہ کے سربراہ نے ان خیالات کی تائید کی۔

مجھے خوشی ہے کہ ایرانی پریس نے بھی اس تقریر کو بڑی اہمیت سے شائع کیا اور وہاں کے علماء نے بھی کامل موافقت کا اظہار کیا۔"

○

محترم چانسلر صاحب! جناب ڈین صاحب! محترم اساتذہ اور حضرات!

میرے لیے یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ مجھے اس عظیم درس گاہ میں اور سربرآوردہ دانشوروں اور استادوں کے اس بڑے جلسے میں اپنے تہ دل میں موجود چند باتوں کو زبان پر لانے کا موقع ملا ہے۔ اگرچہ میری گوناگوں مصروفیات کی بنا پر جدید فارسی سے میرا تعلق محمد ود رہا ہے لیکن فارسی ادبیات کے شاہکاروں کی کلاسیکی ادبی فارسی سے میں بڑی حد تک واقف ہوں۔ اور مولانا رومی، سعدی اور حافظ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ میری انتہائی مسرت کے دو بنیادی سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ ہمارے اور ہمارے دو ہمسایہ اور قریبی ملکوں کے درمیان بڑے گہرے اور وسیع تعلقات مذہب، ادب، تاریخ، علوم اور ثقافت کے میدانوں میں موجود ہیں۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں جو قومیں انتہائی دلچسپی اور میلان کے ساتھ اسلام قبول کرنے میں پیش قدم ہوئیں ان میں یہی دو غیر عرب اقوام یعنی ایران اور وادیٔ سندھ کی بسنے والی قومیں تھیں۔ پہلی صدی ہجری میں جب مسلمانوں کے لشکر سطح مرتفع ایران سے اسلامی خلافت کے مشرقی حصّوں کی طرف روانہ کیے جاتے تھے جن کی سربراہی عام طور پر عرب جرنیلوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ تو ان لشکروں کے جوانوں کی اکثریت فارسی زبان بولنے والے ایرانیوں پر مشتمل ہوتی تھی جو کرمان۔ سرزمین داور۔ قندھار، سیستان، قصدار اور مکران کے راستوں

اور نواحی علاقوں سے گزرتے ہوئے دریائے سندھ کے سرسبز اور تاریخ الاول علاقوں میں پہنچتے تھے اور ان میں سے بیشتر مختلف وجوہ کی بنا پر ہمیشہ کیلیے انہی علاقوں میں بود و باش اختیار کرلیا کرتے تھے۔

نووارد ایرانیوں کی زبان اس دور میں فارسی ہی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ دوسرے مسلمان نووارد جیسے عرب اور ترک جنکی تعداد ایرانیوں کی نسبت محدود ہوتی تھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ فارسی زبان سیکھتے اور اس میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ اور کچھ ہی مدت بعد جب مشرقی اسلامی سرزمینوں کی حکومت سامانی خاندان کے پاس تھی، پاکستان میں واقع خضدار کے علاقے میں فارسی شاعری نے ایک اونچا مقام حاصل کرلیا اور فارسی شاعری کی تاریخ کی پہلی شاعرہ رابعہ بنت کعب خضداری چوتھی صدی ہجری میں خضدار میں ہو گزری ہے۔ اور یہ وہ شاعرہ ہے جس نے شاعری کی مختلف اصناف میں اپنی استادی کا لوہا منوالیا ہے۔

آل سبکتگین یعنی غزنویوں کے دور میں پہلی مرتبہ ایرانی تمدن۔ ثقافت۔ زبان۔ ادب اور رسم و رواج کی جڑیں غزنویوں کے عروج اور اقتدار کے ساتھ ساتھ سرزمین پاکستان میں پھیلتی گئیں اور اسی عہد میں پانچویں صدی ہجری ہی کی بات ہے کہ فارسی زبان میں تصوّف کی پہلی کتاب کشف المحجوب مصنفہ عظیم صوفی حضرت علی بن عثمان المعروف بہ داتا گنج بخش لاہور میں تصنیف کی گئی۔ سرزمین پاکستان مختلف ادوار میں ایرانی شاعروں، مصنّفوں اور دانشوروں کے لیے پناہ گاہ کا مرتبہ رکھتی تھی جو ان سرزمینوں کی طرف نقل مکانی کرتے اور مختلف بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں ان کی عزت افزائی اور قدردانی کی جاتی تھی۔ ایسے ہی ادوار میں ایک دور وہ بھی ہے جب کہ ایران میں منگولوں کے حملے کے بعد ایران کے متعدد علماء، فضلاء اور دانشور برصغیر کے مسلمان بادشاہوں اور امراء کے درباروں سے منسلک ہو گئے اور اسی زمانے میں فارسی زبان میں پہلی مرتبہ تاریخ اور تذکرے کے باب میں اوّلین کتابیں سندھ اور پنجاب میں لکھی گئیں۔ تاریخ کے موضوع پر فارسی زبان میں پہلی کتاب ابتدائی اسلامی دور کی تاریخ سندھ ہے جو عام

طور پر تاریخ معصومی کے نام سے یاد کی جاتی ہے اور پاکستان میں تصنیف شدہ فارسی زبان کا پہلا تذکرہ محمد عوفی کا تذکرۂ لباب الالباب ہے جو موجودہ بہاولپور میں واقع اوچ کے دربار میں تالیف کیا گیا اور بادشاہ وقت کے حضور پیش کیا گیا۔

بلاشبہ لاہور اور ملتان ایرانی تصوف کی تشکیل و ارتقا کے دو اہم مرکز ہیں کیونکہ پانچویں صدی ہجری میں نثر میں تصوف کی پہلی کتاب کشف المحجوب لاہور میں لکھی گئی اور ساتویں صدی ہجری میں ملتان کے باکرامت اور فیض رساں ماحول میں ایران کے بڑے صوفی شاعر فخرالدین ابراہیم عراقی ہمدانی (متوفی: ۶۸۸ ہجری قمری) کی تربیت ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں ابوالحسن علی ابن عثمان کے لیے لاہور کا ماحول غزنی سے بڑھ کر سازگار رہا۔ درآنحالیکہ وہ اس شہر کے رہنے والے تھے اور اسی طرح فخرالدین ابراہیم عراقی جو عنفوانِ شباب میں اپنے وطن مالوف سے روانہ ہو کر ایران کے مختلف شہروں کا سفر کرنے کے بعد ملتان کی تصوف پرور سرزمین میں پہنچے اور وہیں اپنے پچیس سالہ قیام کے دوران خودشناسی اور خداشناسی کے مراحل اور مدارج طے کیے۔

ایک مرتبہ پھر دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں جبکہ صفوی ایران میں زیادہ توجہ فقہ و تفسیر اور اسلامی علوم پر دی جا رہی تھی۔ ایران کے فارسی شعراء و فضلاء جنھیں اس بات کی اطلاع ہوئی کہ ان کے شعری سرمائے کو برصغیر کے مغل بادشاہوں کے دربار میں عزت افزائی اور قدردانی کے ساتھ قبول کیا جائے گا' رفتہ رفتہ برصغیر کی طرف نقل مکانی کرتے رہے اور ایرانی شاعروں اور مصنفوں کا برصغیر کی جانب ترک وطن کا یہ سلسلہ دسویں صدی ہجری کے اواسط سے بارہویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔

چودھویں صدی ہجری کی ابتدا میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی کی احیاء کے لیے ایک عظیم جدوجہد شروع کی۔ برصغیر کی مسلمان قوم اس دور میں دو طاقتوں سے مقابلہ کر رہی تھی۔ یعنی غیر ملکی حکومت اور مسلمانوں سے چار گنا ہندو آبادی جو برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل تقریباً سات صدیوں تک، اکثر و بیشتر فارسی زبان بولنے والے ایرانی اور ترک نژاد

بادشاہوں اور سلاطین کے تحت زندگی بسر کر چکی تھی۔

پاکستانی قوم نے اپنی وحدت اور یگانگت کا موجودہ مرحلہ مذہب، ثقافت، علوم اور روحانیت کے میدانوں میں گزشتہ تیرہ سو سال میں ایرانی اور فارسی زبان ترکوں سے ورثے میں حاصل کیا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کا ایران کے ساتھ یہ دیرینہ تعلق ہی سبب بنا کہ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے تشکیل پا چکا تو وہ پہلا ملک جس نے پاکستان کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا ایران تھا۔ اور پہلے غیر ملکی سربراہ مملکت جنھوں نے پاکستان کا سب سے پہلے سرکاری دورہ کیا شہنشاہ ایران اعلیٰ حضرت محمد رضا شاہ پہلوی تھے۔

ہماری دو قوموں کے درمیان انہی قریبی روحانی اور معنوی اور جذباتی روابط کے پیش نظر ہم پاکستانی ایرانی قوم کی پہلے سے زیادہ ترقی اور خوشحالی کی جو شہنشاہ آریا مہر کی مدبرانہ قیادت میں حاصل ہو رہی ہے آرزو کرتے ہیں۔ شہنشاہ کی عظیم شخصیت کا پاکستان میں بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت شہنشاہ نے ایک طرف عظیم شاندار روایات کو برقرار رکھا ہے اور دوسری طرف اپنی قوم کے لیے نہایت ترقی پسندانہ قیادت فراہم کی ہے۔ شہنشاہ معظم ایک ایسے رہنما ہیں جو بادشاہانہ شان و شوکت کے ساتھ اس دور کے تقاضوں اور ضرورتوں پر بھی پوری پوری توجہ فرماتے ہیں اور ایران کے سفید انقلاب کا منشور جو اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کے حکم سے جاری ہوا ہے اس کا بیّن ثبوت فراہم کرتا ہے۔

حضرات!

ہماری روحانی اور معنوی وحدت کا بہترین مظہر فارسی زبان و ادب کا وہ لافانی سرمایہ ہے جس میں نہ فقط گزشتہ بارہ صدیوں کی ایران کی ثقافت اور ادب مرقوم ہوا ہے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کا علمی ادبی اور تاریخی ورثہ بھی گزشتہ ایک ہزار سال میں فارسی زبان میں محفوظ کیا گیا ہے۔ فارسی کے عظیم مصنف اور شاعر مثلاً ہجویری لاہوری۔ ابو الفرج رونی، مسعود سعد

سلمان لاہوری۔ امیر خسرو۔ امیر حسن۔ فیض فیاض۔ عبدالقادر بیدل۔ اسداللہ غالب اور علامہ اقبال نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں فارسی زبان کی بہترین تصانیف یادگار چھوڑی ہیں اسی مدت میں فارسی کے سرکردہ شعراء اور مصنفوں کی تصانیف جنھوں نے ایران میں زندگی بسر کی اہالی برصغیر خصوصاً مسلمانوں کی دلچسپی کا باعث رہے اور ہم اسی سبب سے فارسی زبان کے علمی اور ادبی سرمایہ کو انسانیت کا مشترکہ سرمایہ اور ورثہ خیال کرتے ہیں۔

میری خاص دلچسپی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ایرانیوں نے ہمیشہ اسلام کی نشر و اشاعت اور حمایت میں گزشتہ چودہ سو سال میں شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ خندق میں خندق کی کھدائی حضرت سلمانؓ فارسی کی تجویز پر کی گئی تھی اور یہ چیز جزیرہ نمائے عرب کی فوجی حکمت عملی کی تاریخ میں اس وقت تک کے لیے ایک نیا اقدام تھا۔ ہم سب حضرت سلمان فارسیؓ کے اعلیٰ مقام سے واقف ہیں۔ آنحضرتؐ نے آپ کو اپنے اہل بیت میں محسوب فرمایا اور حضرت علیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں انھیں بڑے اہم صوبے کی گورنری پر مامور کیا تھا۔ کربلا کے عظیم سانحہ میں ایرانیوں کا مثبت کردار حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایرانی الاصل زوجہ حضرت شہربانو کی نادر شخصیت میں نظر آتا ہے۔ سرزمین ایران قدیم الایام سے اسلامی افکار کی پرورش کا اور ممتاز آئمہ فقہ تفسیر و حدیث اور اسلامی علوم کے جیّد علماء کا ملجا و ماوا رہی ہے۔

ایران کے موجودہ دورے میں میری یہ دلی خواہش تھی کہ میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے ملوں اور اداروں کا معائنہ کروں لیکن آپ کی یونیورسٹی اور اس فیکلٹی میں آنے کی میری قلبی آرزو بے حد عمیق تھی کیونکہ میں اپنے آپ کو اسلامی علوم کا ایک طالب علم سمجھتا ہوں۔ اور پھر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تہران یونیورسٹی میں اس کے قیام کے بعد ہر دور میں اسلامی علوم کے مطالعہ پر بے حد توجہ کی جاتی رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ نے اسلامی علوم سے متعلق نہایت وقیع کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ انہی اسباب کی بنا پر آپ کی

یونیورسٹی کی اس فیکلٹی کا معائنہ اور یونیورسٹی کے محترم اساتذہ اور عزیز طلبا سے ملاقات کا مجھے بے حد اشتیاق تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کی توجہ چند اہم باتوں کی طرف مبذول کرادوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ موجودہ دور عالمگیر سطح پر بے دینی اور مادہ پرستی کا دور سمجھا جاتا ہے نئی نسل الہامی مذاہب کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہے۔ مثلاً توحید، رسالت، قیامت، وحی، جنت، دوزخ اور ایمانیات کے بارے میں دنیا کے عام لوگ مختلف شکوک وشبہات رکھتے ہیں۔ ان حالات میں اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم اسلام کو مختلف فرقوں کی سطح سے بالاتر کر کے دنیا والوں کے سامنے پیش کریں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں خود مسلمانوں میں مختلف فرقے موجود ہیں لیکن میں ان کو مختلف مکاتیب فکر محسوب کرتا ہوں اور میں نے کبھی بھی انھیں علیحدہ اُمتوں کے طور پر نہیں جانا ہے۔ ان فرقوں کے درمیان اتنے اَن گنت عقائد مشترک ہیں کہ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پچانوے فیصد عقائد ایک دُوسرے سے مُشابہ اور یکساں ہیں اور صرف پانچ فیصد عقائد میں ممکن ہے کسی قسم کا اختلاف پایا جاتا ہو، لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ مذہبی مباحث کے اسٹیجوں سے بیشتر انہی پانچ فیصد اختلافی مسائل کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے اور پچانوے فیصد مُشابہ اور مُماثل عقائد کے بارے میں بہت کم ہی کوئی بات کی جاتی ہے۔ دراں حالیکہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ

يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

یعنی اے اہلِ کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے پس کیا سبب ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر اپنے بنیادی مشترک اصول و عقائد کے بارے میں ایک دوسرے سے متفق العقیدہ نہ ہو سکیں۔

حضرات!

دوسرا مسئلہ جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سائنس اور

ٹیکنالوجی کی وسعت اور ترقی کے نتیجے میں متعدد مسائل پیدا ہوئے ہیں جو پچھلے زمانوں میں بہت کم دیکھے گئے ہیں مثلاً بنکنگ، سود کا تعین، انشورنس، نوٹر گرانی، مختلف طبی مقاصد کے لیے انسانی لاشوں کی چیر پھاڑ، مُردوں کے بعض اعضا کا زندوں میں منتقل کرنا جیسے آنکھ، ایسے مریضوں کو خُون دینا جنھیں خون کی شدید ضرورت ہو۔ ہوائی جہاز میں سفر کے دوران قبلے کی سمت کا تعین رویتِ ہلال، آج کے معاشرے میں خواتین کا مقام، کیونکہ شاید یہ ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کو زندگی کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا جائے اور اس کو ذہن میں رکھتے ہُوئے پردے کا حقیقی تصوّر، مخلوط تعلیم کی درس گاہیں اور ایسے ہی متعدّد مسائل ہیں جن کو اس بات کی ضرورت ہے کہ نئے حالات کے پیشِ نظر دیکھا اور پرکھا جائے۔

بدقسمتی سے عالمگیر سطح پر ابھی مسلمان علماء کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے جو موردِ بحث مسائل کے بارے میں غور و خوض کرنے کے بعد کوئی مناسب فیصلہ کریں تاکہ دُنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے ان کا فیصلہ چراغِ راہ ثابت ہو۔ نئے مسائل کے بارے میں اسلامی دُنیا کے علماء حتیٰ کہ مختلف مسلمان ملکوں کے علما کی آرا مختلف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک فکری انتشار پایا جاتا ہے اور نئی نسل خیال کرتی ہے کہ علمائے دین شاید کسی بات پر متفق ہو ہی نہیں سکتے اور یہ کہ اسلام اس دور کے نئے تقاضوں کا جواب دینے سے نعوذ باللہ قاصر ہے۔ اسی بنا پر مختلف مسلمان ملکوں کے علماء کے درمیان رابطے اور گفتگو کے لیے ایک ایسے ادارے کی تاسیس کی ضرورت عالمگیر اور علمی بنیادوں پر شدّت سے محسوس کی جا رہی ہے جہاں علمی مسائل کو فوری اور کم سے کم وقت میں مطالعہ کیا جا سکے اور ضروری راہنمائی کی جا سکے۔ ہمارے لیے بڑی مسرّت کی بات ہے کہ مسلمان مُلکوں کے درمیان سیاسی اُمور میں رابطہ قائم کرنے اور مذاکرات انجام دینے کے لیے حال ہی میں کچھ ادارے وجُود میں آچکے ہیں۔ لیکن دینی مسائل کے بارے میں غور و خوض کے لیے علمی سطح پر ایک ادارہ قائم ہونا چاہیے جہاں جملہ مسائل غیر جانبدارانہ اور بے لوث طریقے سے مطالعہ کیے جائیں۔

حضرات !

ایک اور نکتہ جو میرے نزدیک اتنا اہم ہے کہ میں اس کا یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عام طور پر عہد حاضر کو معاشیات کا دور کہا جاتا ہے۔ دُنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف ملکوں میں ایک قسم کی بے چینی اور بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف ملکوں میں طرح طرح کے تجربات کیے گئے ہیں لیکن اب تک ناانصافیوں کا خاتمہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ میرے خیال میں اس اسلامی مساوات کا نظریہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے جو محمدؐ و آلِ محمدؐ صلوات اللہ علیہم نے دُنیا کو دیا تھا۔ اس سلسلے میں مخدومہ اور خادمہ کے درمیان مساوات کا بہترین نمونہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پیش کیا۔ آپ گھر کے کام ایک دن خود انجام دیتیں اور دُوسرے دن آپ کی خادمہ جناب فضہ انجام دیتیں۔ جس دن آپ گھر کے کام میں مشغول ہوتیں تو جناب فضہ کے آرام کرنے کا دن ہوتا تھا اس سے بڑھ کر اسلامی مساوات کی کون سی مثال ہو سکتی ہے اور اگر ہم جستجو کریں تو ایسی ہی کچھ اور مثالیں ہم کو مل جائیں گی۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان مقتدا ہیں نہ کہ مقتدی اور ہم اس وقت سے مُقتدی بننے پر مجبور ہو گئے ہیں جب سے محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہم نے کوتاہی برتی ہے۔

حضرات !

اسلامی علوم اور معارف کے بارے میں مطالعات اور تحقیقات کرنے والے مُسلمان ملکوں کے مختلف ادارے خصوصاً وہ جو ایران اور پاکستان میں موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کی بنیادی تقویت کے لیے اپنے مطالعات کے تازہ ترین نتائج سے ایکدوسرے کو مطلع کرتے رہیں۔ مجھے توقع ہے کہ مستقبل قریب میں اسلامی علوم و معارف کے اُستادوں اور طلبا کے وفود کا دونوں ملکوں کی یونیورسٹیوں اور دینی و اسلامی تعلیمات کے اداروں کے درمیان تبادلہ عمل میں آئے گا۔ ہمارا مذہب پُوری طرح ترقی پسند اور ہر طرح کے مسائل کا جواب

دینے کے لیے پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اسلام کے اُصولوں پر غور و خوض کریں اور ان کو جدید معاشرتی مسائل کے ساتھ منطبق کریں۔ بقول علامہ اقبال

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

آخر میں آپ کے حُسنِ سماعت کے لیے میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اگرچہ آج میں پہلی دفعہ آپ کی یونیورسٹی میں آیا ہوں لیکن مجھے اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی دوبارہ آپ سے مُلاقات ہو سکے گی۔ آپ کی عنایت کے لیے ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی گذارشات کو خاتمے پر پہنچاتا ہُوں ؛

اسلامی ریسرچ اور اُس کے تقاضے

”ادارۂ تحقیقات اسلامی (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کے وزارت مذہبی امور کی تحویل میں آنے کے بعد ادارہ کے دانشوروں سے جنوری ۷۵ء میں، میں نے خطاب کیا جس میں ان موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے جو آج کے دَور میں اسلامی ریسرچ کے نقطۂ نظر سے ہماری اہم ضرورت ہیں۔“

میں ڈاکٹر صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنھوں نے بڑے اچھے الفاظ میں مجھے یاد فرمایا۔ اور ادارے کی کارکردگیوں کا ایک ایسا جائزہ پیش کیا جس سے اس کا بخوبی تعارف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اُنھوں نے کہا اس ادارے سے میرا تعارف بہت دیرینہ ہے اور اس کی مطبوعات اور اس کے جرائد کو میں ہمیشہ سے زیر مطالعہ رکھتا رہا ہوں۔ بہت سے اصحاب جو اس ادارے میں کام کرتے رہے ہیں، ان سے میرے ذاتی روابط بھی رہے ہیں اور اب بھی میں بعض لوگوں کو جانتا ہوں۔ اور ویسے بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے جو دینیات کا خاص طور پر طالب علم ہے مجھے ادارے کے کام سے خصوصی شغف ہے اور اس لحاظ سے میرا اور آپ کا تعلق ایک وزیر اور ماتحت ادارے ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر کچھ اور پہلو بھی ہیں جو شناسائی باہمی معرفت اور جان پہچان کے ہیں۔

ادارہ یقیناً بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور ایک زمانہ تھا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ باقاعدہ ہمارے آئین کا جُز تھا۔ اور اس اعتبار سے اس کو ایک بڑا اُونچا مقام حاصل تھا کہ وہ آئینی ڈھانچے کا حصہ تھا۔ اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ اسلامک ایڈوائزری کونسل کو مواد فراہم کرنے میں اور اس کو فیڈ Feed کرنے میں ہمیشہ سے یہ ادارہ بہت اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ اور اس ادارے کی طرف سے بہت سی وقیع کتابیں شائع ہوئی ہیں علمی لحاظ سے جن کا بڑا مرتبہ ہے۔ بعض قدیم علمی ذخائر بھی ایڈٹ کر کے چھاپے گئے ہیں اور علمی دُنیا میں ان کا بھی ایک

مقام ہے۔

مگر ان ساری باتوں سے قطع نظر چونکہ یہاں ہم اس لیے جمع نہیں ہُوئے کہ آپ مجھے خراجِ تحسین پیش کریں اور میں آپ کو خراجِ تحسین پیش کروں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، جہاں تک اس ملک کے باشندوں کا تعلق ہے میں آپ سے صاف لفظوں میں عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ ان میں آپ کے کام کی کوئی پروجکشن Projection نہیں ہوسکی ہے اور وہ آج تک ادارے کی افادیت محسوس نہیں کرسکے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس میں افادیت ہے، لیکن جہاں تک اس افادیت کے اعتراف کا تعلق ہے اس کی نوبت عوامی حلقوں میں اس لیے نہیں آئی کہ آج تک آپ کا کام اور آپ کی ریسرچ کی محنت کے نتائج پاکستانی عوام کے ہاتھوں تک پہنچ نہیں سکے۔

اب تک جہاں تک میرے تخمینے کا تعلق ہے۔ جب سے یہ ادارہ قائم ہُوا ہے۔ یعنی ۶۰۔۱۹۶۱ سے لے کر اب تک اس پر تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ اور اس ڈیڑھ کروڑ روپے کے صرف سے جو نتائج برآمد ہونے چاہئیں تھے وہ برآمد نہیں ہُوئے۔ لوگ اور اس غریب ملک کے لوگ ایک ایسے ادارے سے جس کا کام صرف کثیر سے ہو رہا ہے اس سے کچھ زیادہ نتائج کی توقع رکھتے ہیں۔ جہاں تک قدیم علمی کتابوں کو ایڈٹ کرکے چھاپنے کا تعلق ہے یہ کام اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مگر ملک میں ایسے ادارے موجود ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ خود محکمۂ اوقاف نے بھی (بعض صُوبائی محکمہ ہائے اوقاف نے بھی) یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اُنھوں نے بھی ایسی کتابیں شائع کی ہیں۔ پھر بعض ایسے ادارے ہیں جن کو حکومت کی طرف سے ایڈ دی جاتی ہے اور وہ اپنے طور پر اس طرح کا کام کر رہے ہیں۔ بعض پرائیویٹ ادارے بھی ایسا کام کر رہے ہیں تو یہی اصل کام اس ادارے کا نہیں ہے۔

رہے بعض علمی موضوعات جن پر اس ادارے نے کام کیا ہے تو یقیناً وہ کام قابلِ قدر

ہے۔ مگر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ آپ مجھ سے تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں جانوں کہ آپ کے ادارے نے مجموعہ قوانین اسلام اتنی جلدوں میں شائع کیا ہے اور یہ یہ کتابیں شائع کیں، لیکن اس ملک میں انگلیوں پر ایسے لوگ گنے جائیں گے۔ میں بلا مبالغہ کہہ رہا ہوں، جو اس بات کو جانتے ہیں۔ اس میں کوتاہی کہاں ہے، سیلز آرگنائز نہیں ہوئیں، انتظامیہ کی کارکردگی میں کمی ہے، مطبوعات کی پبلسٹی نہیں ہو سکی، انھیں ایڈورٹائز نہیں کیا جا سکا، یا ہمارے ملک میں مانگ کم ہے ایسی علمی کتابوں کی، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مانگ کم ہونے کی بات تب صادق آتی ہے جب پہلے لوگ جان تو سکیں کہ ایسی کوئی کتابیں آپ کے ہاں شائع ہوئی ہیں، لیکن میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں یہی معلوم نہیں کہ آپ کے ہاں سے کوئی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں یا آپ کے ہاں سے کوئی ایسے جرائد شائع ہوتے ہیں۔ آپ نے فکر و نظر کا نام لیا اور آپ نے اسلامک اسٹڈیز اور الدراسات کا نام لیا۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ یہ جرائد نکلتے ہیں۔

ایسے علمی جرائد یہاں پاکستان سے شائع ہوتے ہیں، دینی جرائد بھی اور علمی جرائد بھی کہ جن کی تعداد ہزاروں میں ہے، ہزاروں کی تعداد میں وہ چھپتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے حلقے موجود نہ ہوں جو ان جرائد کی قدر کرتے ہیں تو وہ جرائد بھی شائع نہیں ہونے چاہئیں اتنی بڑی تعداد میں وہ چھپتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ بعض مخصوص سیاسی اور مذہبی اور فرقی حلقے ہیں کہ جن میں ان کی کھپت ہے، لیکن آزاد غیر جانبدار اور کسی گروہ اور کسی حلقے سے منسلک نہ ہونے والے قارئین کی تعداد بھی اس ملک میں بہر حال موجود ہے اور وہ حلقے بھی جن کا مخصوص نقطہ نظر ہے ان جرائد کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے اگر ان میں وزن ہو۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے ہمارا کام بہت پیچھے ہے کہ ہم اپنی مطبوعات اور اپنے جرائد کا تعارف بیرونِ ملک تو الگ رہا اندرون ملک بھی نہیں کرا سکے تو ایک کام جس کی طرف اب ہمیں خاص طور پر توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ ہم جو لٹریچر چھاپتے ہیں، ہم جو جرائد شائع کرتے ہیں، انھیں اہلِ وطن کے

ہاتھوں تک پہنچائیں اور بیرونی دُنیا میں بھی ہم ان کا تعارف کرائیں اور ان کی سیل کو منظم کریں۔

دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہُوں یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس ادارے کا بنیادی فنکشن Function ریسرچ ہے، لیکن ریسرچ کے کچھ خاص ہدف معین ہونے چاہئیں۔ ریسرچ ایک وسیع ٹرم ہے اور اگر اس کے مخصوص اہداف معین نہ ہوں تو ساری زندگی کھپ جائے گی اور ریسرچ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکے گا۔ میں یہ چاہوں گا کہ یہ ادارہ جہاں علمی اور دینی موضوعات پر ریسرچ کرے وہاں یہ دو تین باتیں خاص طور پر اس کے پیشِ نظر رہیں۔ اور انشاءاللہ اس سلسلہ میں پروگرام چاک آؤٹ کرانے میں پُوری مدد کروں گا۔ اوّل یہ کہ وہ مسائل جو عالم انسانی کو درپیش ہیں اور جن کا حل نہ ملنے کی وجہ سے عالم انسانی حیراں اور سرگرداں ہے ان مسائل کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے۔ اور اس میں تقابلی مطالعہ بھی ہو۔ ان مسائل کو پہلے معین اور مشخص کیا جائے اور اس کے بعد ان موضوعات پر ہم مختلف زبانوں میں لٹریچر تیار کریں جو بلا امتیاز مذہب ہر پڑھے لکھے انسان کو جو اس دُنیا میں رہتا ہے ہم پیش کرنے کے قابل ہو سکیں۔

دوسرا موضوع یہ ہے کہ وہ مسائل جن کا سامنا خاص طور پر عالمِ اسلام کو ہے اور جدید تہذیب اور تمدّن کے بطن سے جو مسائل پیدا ہُوئے ہیں اور جن کی وجہ سے ایک عام مُسلمان پریشان ہوتا ہے کہ ان کو وہ اپنے دینی احکام سے کیسے تطابق دے۔ ان میں ریسرچ کی جائے اور ایسے مسائل کا کہ جن سے عالم اسلام دوچار ہے ان کا ہم حل پیش کریں اور اس سلسلے میں اگر ضرورت پڑی تو میں اس کی کوشش کروں گا کہ ہم ایسے علمی مذاکرے بھی برپا کریں کہ جن میں ہم بین الاسلامی مفکرین کو دعوت دیں اور ان کے اشتراک سے ان موضوعات پر ہم بحث و تمحیص کریں اور اس کے بعد ان نتائج کو انضباط کے ساتھ ہم دُنیا کے سامنے پیش کریں۔

تیسرا ایک شعبہ جس میں اس ادارے کو کام کرنے کی ضرورت ہے، ہر چند کہ اس کا تعلق ریسرچ سے نہیں، وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں، ویسے تو ہر مسلمان ملک میں، مگر

خاص طور پر ہمارے ہاں مذہب کو غلط تصورات اور اوہام کا اسیر بنا دیا گیا ہے۔ بہت سے زوائد کے بوجھ اس پر لاد دیئے گئے ہیں۔ اور نوجوان نسل کو کانسالیڈیٹیڈ فارم Consolidated form میں اگر یہ بتانا ہو کہ دین کیا ہے جو اس کے ذہنی شکوک کا ازالہ بھی کر سکے اور اس کے ذہن میں جو سوالات ہیں ان کا جواب بھی دے سکے اور جو کسی سیاسی غرض سے بھی بالاتر ہو اور جس میں کوئی مخصوص فقہی یا فرقہ وارانہ رنگ بھی نہ پایا جائے ایسا لٹریچر اگر پیش کرنا ہو نئی نسل کے سامنے تو میری نظر میں ایسا لٹریچر موجود نہیں۔ یا تو دین کو کسی ایک شعبے کے گرد گھما دیا گیا ہے اور کل کی تعبیر اور تشریح ایک جز کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔ جیسے سیاست ایک شعبۂ زندگی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ چونکہ اسلام تمام شعبہ ہائے زندگی سے بحث کرتا ہے تو وہ سیاست سے بھی بحث کرتا ہے، لیکن اس ایک شعبے کے نقطۂ نظر سے دین کے دوسرے تمام شعبوں کی تشریح اور تعبیر کرنے سے اس کا توازن درہم برہم ہو جائے گا۔ کچھ اور لوگوں نے دین کو پیش کیا یا تبلیغی لٹریچر لکھا تو اس کے اندر ایسی احادیث اور ایسی روایات اور ایسے فضائل، جن میں ایک ایک وظیفہ پڑھنے پر کئی کئی ہزار شہیدوں کا ثواب ملتا ہے، ایسی باتیں درج کی ہیں کہ جن کو ایک نوجوان کا ذہن قبول کرنے سے ابا کرتا ہے۔ اور وہ دین سے قریب ہونے کے بجائے دین سے دُور ہوتا ہے تو ہمارے ادارے کا ایک شعبہ ایسا بھی ہو جو ایسا لٹریچر تیار کرے جس میں ہم اسلام کو نوجوان نسل کے لیے قابلِ قبول بنا کر پیش کریں۔ اس کے شکوک کا ازالہ کریں، اس کے سوالات کا جواب دیں اس کی مخصوص دُنیا کو سامنے رکھ کر اور یہ لٹریچر بھی پھر آسان زبان میں ہو۔ مختلف زبانوں میں ہو۔ اس کو ہم قیمتاً بھی فروخت کریں۔ اس کو ہم بلاقیمت بھی تقسیم کریں۔ اس کا اہتمام بھی اس ادارے کی طرف سے ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے مالی وسائل محدود ہیں لیکن انشاء اللہ جب آپ یہ کام اپنے ہاتھ میں لیں گے اور جب ہم اپنی مطبوعات اور اپنے جرائد کی سیل کو منظم کریں گے تو مجھے یقین ہے

کہ اس سے ہمیں کافی فائدہ ہوگا۔ پھر جناب وزیر اعظم بھی اسلام کے احیاء میں اور اسلام کو مقتضیات عصر کے مطابق پیش کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایسے تمام پراجکٹس Projects کے لیے ہم ان کا تعاون حاصل کرسکیں گے اور ادارہ یقیناً ترقی کرسکے گا اور دُنیا میں ایک ایسا مرکز بن سکے گا کہ تمام عالم اسلام ہی نہیں بلکہ تمام دُنیا کے اسکالر اور ریسرچ کرنے والے اسے روشنی کا ایک مینار سمجھ سکیں گے۔

یہ میری خواہش ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ سب کا تعاون اس سلسلے میں مجھے حاصل رہے گا۔ اور جیسا کہ میں نے آپ کو کہا آپ سے جو ہماری وزارت کا تعلق ہوگا وہ بیوروکریٹک Bureaucratiq انداز میں بالکل نہیں ہوگا اور نہ افسری اور ماتحتی کا ہوگا۔ مجھے اس کام میں ذاتی دلچسپی ہے اور میں اس ادارے کے ذریعے سے اگر کوئی ٹھوس کام کرا سکا تو میں اسے ذریعہ نجات سمجھوں گا۔ اس لیے میں اُمید رکھتا ہوں کہ آج سے آپ یہ محسوس کریں گے کہ ادارے میں اب ایک نئی زندگی پیدا ہوئی ہے اور نئی زندگی پیدا ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں آپ کو میرا مکمل تعاون قدم قدم پر حاصل رہے گا۔ شکریہ!

اسلامی نظریاتی کونسل سے خطاب

"اسلامی نظریاتی کونسل کے وزارت مذہبی امور میں شامل ہونے کے بعد پہلی مرتبہ کونسل کا جو اجلاس ہُوا، اس میں یہ تقریر ہُوئی۔ اجلاس میں کونسل کے چیئرمین مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان بھی شریک تھے۔"

"جناب چیئرمین، محترم اراکین کونسل! میں آج کسی تفصیلی تقریر کے ارادے سے حاضر نہیں ہُوا۔ اس حاضری کا مقصد آپ سے رسمی ملاقات اور آپ کے مسائل سے آگاہی حاصل کرنا تھا، کیونکہ جب سے اس کونسل کا وزارتِ مذہبی امور کے ساتھ الحاق ہُوا ہے اس کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ یہ اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے میرے لیے ضروری تھا کہ میں آپ کے پاس آتا اور آپ سے تبادلۂ خیال کرتا۔ جہاں تک اس کونسل کا تعلق ہے اس کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس کونسل کو کتنا اہم فریضہ سپرد کیا گیا ہے اور حقیقتاً جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ مسلمانانِ پاکستان کی آرزوؤں کا مظہر ہے

اسلامی معاشرہ کی تشکیل

قیامِ پاکستان کے پس منظر میں جو نصب العین کارفرما تھا، وہ یہی تھا کہ اس کے اندر اسلامی قوانین کی عمل داری ہو اور ان اعلیٰ اقدار پر مبنی ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ماضی میں مختلف حکومتوں کے زمانے میں یہ کونسل چلتی رہی۔ اور لوگوں کو یہ توقع رہی کہ یہ اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں کامیاب ہوگی۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے

کہ اب تک تو سارے زمانے میں یعنی سال ہائے گزشتہ میں جو کام اس کونسل سے متوقع تھا وہ پُورا نہیں ہو سکا۔

عوام کی توقعات

گفتگو کی ایک صورت یہ بھی کہ میں آج آپ سے یہ کہتا کہ کونسل نے اب تک بڑا کام کیا ہے لیکن اس طرح نہ میں آپ کے ساتھ انصاف کرتا نہ اپنے ساتھ اور ایک صورت یہ ہے کہ میں آپ کو ان خیالات سے آگاہ کروں جو حکومت کے بھی ہیں اور عوام کے بھی۔ اور یقیناً آپ کو ان خیالات سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اور وہ خیالات یہ ہیں کہ یہ کونسل زرِ کثیر کے صَرف کے باوجود وہ کام نہیں کر سکی جس کی توقع اس سے قائم کی گئی تھی۔

کونسل کی کارکردگی

شروع سے لے کر اب تک ملا جلا کر تقریباً ۲۵ لاکھ روپے کے قریب کونسل کی سرگرمیوں پر اور اس کی تشکیل پر خرچ ہو چکے ہیں اور ۲۵ لاکھ روپے پاکستان جیسے غریب مُلک کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں، لیکن جب ہم ماحصل دیکھتے ہیں کہ ۲۵ لاکھ کے صرف سے ہمیں کیا حاصل ہُوا تو سوائے چند قراردادوں اور سوائے چند میٹنگز کے، کاغذی کارروائیوں کے سوا قوم کے پلہ کچھ بھی نہیں پڑا۔

اس لحاظ سے آپ کی موجودہ کونسل پر بہت اہم ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ اس تاثر کو اپنے عمل سے زائل کریں اور وہ نیک نامی پیدا کریں جو اس کونسل کے شایانِ شان ہو۔

سابقہ حکومتوں کی لاپرواہی

اس تاثر کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات سے بھی اتفاق ہے کہ گزشتہ حکومتوں کے دوران

کونسل کے لیے وہ مراعات، وہ سہولتیں بھی فراہم نہیں کی گئی جو ضروری تھیں۔ اور اس کا وہ وزن بھی محسوس نہیں کیا جاتا رہا جو ہونا چاہیے اور شاید پچھلی حکومتوں کے معاملے میں یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ وہ اس معاملے میں کچھ اتنی سنجیدہ بھی نہ تھیں۔ شاید اسلامی قوانین کی تشکیل کے معاملے کو ہر حکومت نے وقت ٹالنے کا ایک مسئلہ سمجھے رکھا کہ یہ مطالبہ، یہ خواہش جو لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہیں۔ کسی طرح وقت کے سرد خانے میں ان کو ڈال دیا جائے اور وقت گزاری اور حیلے بہانوں سے کام لے کر ان کی مساعی کو موجودہ حکومت معرض التوا میں ڈال دے۔

لیکن موجودہ حکومت، میں آپ کے تعاون سے یہ کہنا چاہتا ہوں کونسل سے کسی حیلہ جوئی کی طالب نہیں اور ہماری خواہش بھی نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کی اس خواہش کو سرد خانے میں ڈال دیں۔ اس کو مسلسل ٹالتے رہیں، کیونکہ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ لوگوں کے ذہنوں سے فراموش ہو جائے گا تو وہ احمقوں کی جنت میں آباد ہیں۔

یہ مسئلہ لوگوں کے ذہنوں سے کبھی فراموش نہیں ہوگا اس لیے کہ اس سے لوگوں کی زندگی وابستہ ہے۔ یہی ان کی نجات کا ذریعہ ہے اور اسی سے وہ دنیا میں سربلند ہو سکتے ہیں۔ مسلمان ملک اسے چھوڑ دیں تو شاید زندہ رہ جائیں، لیکن اس ملک کی تو بقا ہی اس پر منحصر ہے کہ وہ اس خواب کو شرمندہ تعبیر بنائے، کیونکہ اس کی اساس اور بنیاد ہی یہی نصب العین ہے۔ اسی سے وحدت ملت کا مقصود حاصل ہوگا۔ اور اس سے اقوام عالم میں عزت کا مقام حاصل ہوگا۔

ہمارے لیے مذہب کی اس اہمیت کے پیش نظر موجودہ حکومت نے باقاعدہ آئین میں اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا ہے۔ اس پس منظر میں آپ کو یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری طرف سے آپ کو جملہ مراعات دی جائیں گی، جملہ سہولتیں دی جائیں گی۔ آپ کے ساتھ مکمل تعاون کیا جائے گا جس کے ذریعے آپ اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے۔

اس وزارت سے کونسل کو منسلک

وزارت مذہبی امور سے کونسل کی وابستگی کرنے کا مقصد یہی تھا

اور اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو یہ چاہتے ہیں کہ یہ کام شایانِ شان توجہ حاصل کرے اور سُرخ فیتے کا جو چکر اب تک چلتا رہا ہے۔ اس سے کونسل کو نجات حاصل ہو۔ میں اس بحث میں نہیں جاتا، کیونکہ یہ علماء اور فضلاء کا اجتماع ہے اور آپ سب صاحبان جانتے ہیں کہ اسلامی قوانین کی تشکیل جدید کے لیے ہمیں کن امور پر بطور خاص توجہ دینی چاہیے۔ مگر میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس ضمن میں ہر چند کہ ہر مذہبی گروہ اور مختلف علماء صاحبان اور ان کی تنظیمیں یہ مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ اسلامی قوانین نافذ ہوں، لیکن بدقسمتی سے اب تک اس سلسلے میں کوئی ایسا ٹھوس کام نہیں ہو سکا جسے پیش کرکے ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ ہیں وہ اسلامی قوانین جن کی جدید تدوین کی گئی ہے ـــــ یہاں مختلف مکاتب فکر کو سامنے رکھ کر بھی اور احوال زمانہ کو سامنے رکھ کر بھی اور وقت نے جو چیلنج اسلام کے سامنے لا کھڑا کیا ہے اس کا جواب دیتے ہُوئے بھی اب انھیں بلا تکلف نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ایسی کوئی ایک بھی علمی کاوش جو ان تمام پہلوؤں پر محیط ہو اور مسلمانوں کے ہاں قبول عام بھی حاصل کر سکے۔ بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے ہاں موجود نہیں۔

اسلامی قوانین

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم نے ۲۸ سال کا زمانہ اسلامی قانون کے لیے نعرہ بازی میں بسر کر دیا اور جہاں حکومتوں نے اس سے سیاسی فائدہ اُٹھایا وہاں سیاسی جماعتوں نے بھی اسے سیاست کا آلۂ کار بنائے رکھا اور ٹھوس کام جو ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہو سکا۔

آپ جانتے ہیں کہ وقت برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے بطن سے نئے نئے مسائل جنم لے رہے ہیں۔ نئے نئے ایسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور ان کے بارے میں علماء صاحبان متضاد آراء رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں الجھنیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور حکومت بھی ـــ اور کوئی سی بھی حکومت ـــ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی کہ وہ کس کی بات

مانے اور کس کی بات کو رد کرے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ان تمام مسائل کو جو پہلے سے زمانے میں نہیں تھے اور اب پیدا ہوئے ہیں۔ مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ملت کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے اور اسلام کی روح کے اعتبار سے دیکھا جائے اور ان کا حل تلاش کیا جائے آپ سے بہتر اس بات کو کوئی نہیں جانتا کہ اسلام نے جو قوانین کی تشکیل کا نظام دیا ہے اس میں جہاں ایک طرف ثبات کے کچھ اصول ہیں جو تبدیل نہیں کئے جا سکتے وہاں جزئیات اور تفصیلات کے معاملے میں اس کے ہاں تغیّر کا قانون بھی کار فرما ہے اور اس طرح سے اسلام ثبات و تغیر دونوں کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے جو اور کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ ایسے اصول عطا کرتا ہے جو تبدیل نہیں ہوں گے۔ مگر ان کے دائرۂ کار اور فریم ورک میں آپ آنے والے زمانے کی جزئیات اور تفصیلات کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

فکر اقبال

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور علامہ اقبال کی فکر ہمارے بہترین راہنما ہیں۔ فکر اقبال سے میری مراد ان کا شاعرانہ کلام نہیں بلکہ اس ضمن میں ہمارے بہترین راہنما ان کے خطبات اور لیکچر ہیں۔

ریسرچ کی سہولتیں

اور میں نے اپنی وزارت کو کہا ہے کہ ممکن ہے آپ میں سے بعض اصحاب کے پاس یہ خطبات نہ ہوں جو اصحاب انگریزی میں مطالعہ کرنا چاہیں ان کو انگریزی میں اور جو اردو میں مطالعہ کرنا چاہیں ان کو اردو میں وزارت کی طرف سے ایک ایک جلد پیش کی جائے گی۔ تاکہ وہ اس کا مطالعہ کریں اور یہ اندازہ کریں کہ فکر اقبال سے اسلامی قوانین کی تشکیل جدید کے سلسلے میں کیا روشنی ملتی ہے۔

یہ بات کہ ہم پوری سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اسلامی نظام قوانین کو جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں اس سے ثابت ہے کہ اس آئین میں پہلی مرتبہ اسلامی قانون سازی کے لیے سات سال کی ایک باقاعدہ مدت متعین کی گئی ہے۔ اس کونسل کا فرض ہے کہ وہ اس مدت کے اندر اندر تعزیرات پاکستان کو اسلام کے مطابق بنائے۔

کونسل کی کارکردگی پر رپورٹ

اس سلسلے میں حکومت پر از روئے آئین لازم کیا گیا ہے کہ وہ کونسل کی کارکردگی کی رپورٹ ہر سال قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرے۔

جہاں تک سات سال کی مدت کا تعلق ہے یہ بھی حکومت کی مقرر کردہ مدت نہیں ہے بلکہ تمام جماعتیں مذہبی، نیم مذہبی، سیاسی نیم سیاسی، جتنی بھی جماعتیں قومی اسمبلی میں موجود ہیں ان سب نے متفقہ طور پر سات سال کی یہ مدت تجویز کی ہے بلکہ بعض مشہور مذہبی جماعتیں تو ایسی ہیں جنھوں نے باہر سے تجاویز پیش کیں تو اس کے مقصد کے لیے دس سال کی مدت مقرر کی۔ تو حضرات گرامی! اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ سات سال کے اندر اندر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچائیں اور ملت جو توقعات آپ سے قائم کئے ہوئے ہے انھیں پورا کریں جہاں تک میری وزارت کا تعلق ہے میں آپ کو آخر میں ایک مرتبہ پھر یقین دلاتا ہوں کہ اس معاملہ میں جو سہولت اور جو تعاون آپ کو درکار ہے انشاء اللہ اسے پیش کرنے میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔

عِلمی و ادبی تقاریر

(۱) برِصغیر کی اسلامی ثقافت میں اردو زبان کی اہمیت

(۲) اربابِ علم و دانش کے لیے لمحۂ فکریہ

(۳) اقبال کا عالمگیر پیغام

(۴) آزادیٔ صحافت

(۵) صحافیوں کی ذمّہ داریاں

(۶) قومی زندگی میں ادبی رسائل کی اہمیت

(۷) عربی زبان کی اہمیت

(۸) حالی اور اقبال

(۹) عنایت اللہ مرحوم کی یاد میں

(۱۰) مقامِ انیس

(۱۱) خواجہ فریدؒ کا پیغام

برِّصغیر کی اسلامی ثقافت میں اُردو زبان کی اہمیّت :

”مارچ ۱۹۷۲ء میں لاہور کے مشہور ادارۂ علمی اورنٹیل کالج لاہور کی صد سالہ تقریبات منعقد ہوئیں۔ اردو زبان اور ادب اور مسلمانوں کی تہذیب کے موضوع پر ۱۶ مارچ کو جو سیمینار ہوا، اس میں میں نے یہ خطبۂ صدارت دیا تھا یہ ایک تحریر ہے مگر غالباً تقریر کا انداز رکھتی ہے۔“

اردو زبان جیسا کہ اس باوقار علمی اجتماع کے شرکا بخوبی جانتے ہیں، اس برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک ہزار سال کی باہمی بود و باش، میل جول اور ایک دوسرے کے تہذیبی اثرات قبول کرنے کے نتیجہ میں اپنی موجودہ اعلیٰ اور ترقی یافتہ صورت تک پہنچی جس طرح اس برصغیر میں محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ ہی ایک لحاظ سے پاکستان کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ اسی طرح شمال مغرب کے راستے سے مسلمان فاتحین کی آمد کے ساتھ ہی ایک نئی زبان کی تشکیل کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت باہر سے آنے والوں کی زبانوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ آنے والوں کی زبان عام طور پر فارسی تھی۔ اور یہاں رہنے والوں کی کئی زبانیں تھیں۔ جو باہمی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس لحاظ سے قربت رکھتی تھیں کہ جنوبی ہند کی زبانوں کو چھوڑ کر باقی سب زبانیں سنسکرت کی پروردہ تھیں۔

فارسی اور برصغیر کی یہ علاقائی زبانیں نہ صرف الفاظ، ساخت اور مزاج کے اعتبار سے متباین تھیں۔ بلکہ ان کا رسم الخط بھی قطعاً مختلف تھا۔ اسلیے مسلمانوں اور برصغیر میں بسنے والی

قوموں کے درمیان لسانی مغائرت ایک دیوار بن کر حائل تھی ۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں ارتقائے انسانی کی تاریخی اور تہذیبی قوتیں لسانی فصیلوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں ۔ اور مختلف انسانی نسلیں باہمی میل جول کے ذریعے نئے نئے سانچوں میں ڈھلتی اور نئے نئے تہذیبی لباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں ۔ ارتقائے انسانی کا یہ تہذیبی اور تاریخی عمل اس برصغیر میں بھی بڑے بھرپور انداز میں ظاہر ہوا ۔ اور دوسرے مادی، ذہنی اور روحانی تغیرات کے ساتھ ساتھ زبانوں پر بھی اس کے زبردست اثرات مرتب ہوئے ۔ چونکہ سیاسی طور پر غالب فریق زندگی کے ہر پہلو میں فریق مخالف پر غالب ہوتا ہے ۔ اس لیے برصغیر کی زبانوں اور فارسی زبان کے میل جول میں قدرتی طور پر فارسی زبان کی حیثیت غالب رہی ۔ اور مقامی زبانوں کی حیثیت مغلوبانہ ۔ مقامی زبانوں میں دوآبہ کی زبان جسے برج بھاشا کہا جاتا تھا ۔ اور بعد میں ہندی کہا گیا ممتاز ترین زبان تھی ۔ اس لیے اس زبان پر فارسی زبان کا اثر سب سے زیادہ ہوا ۔ اور ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے قریبی میل جول سے جو نئی زبان پیدا ہوئی ۔ اس میں فارسی زبان کو ہر اعتبار سے فوقیت اور بالادستی حاصل رہی ۔ اور نئی زبان جسے "لشکر گاہوں کی زبان" کی مناسبت سے "اردو زبان" کہا جانے لگا ۔ نہ صرف ساخت اور مزاج کے اعتبار سے فارسی زبان سے بہت قریب ہوئی ۔ بلکہ اس کا ظاہری لباس یعنی رسم الخط بھی فارسی ہی قرار پایا ۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ جن میں غالب اکثریت افعال کی ہے ۔ ہندی بھاشا سے اردو میں داخل ہوئے جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اردو اور ہندی دونوں زبانیں اتنی قریب ہوتی چلی گئیں کہ رسم الخط کے علاوہ عام فہم اردو اور عام فہم ہندی میں کچھ زیادہ فرق نہ رہا ۔

اردو زبان کی تشکیل تعمیر کا سلسلہ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا ۔ لیکن ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے بانی سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات کے بعد تقریباً ایک سو سال کے اندر اندر یہ نئی زبان اتنی ترقی کر چکی تھی کہ فارسی زبان کے عظیم الشان صوفی شاعر حضرت امیر خسرو نے اس زبان میں دوہے کہہ مکرنیاں اور متفرق اشعار کہہ کر

اسے ادبی حیثیت بھی عطا کر دی۔ اس زبان کو اس زمانہ میں ریختہ کہا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی زبان اکبر بادشاہ کے زمانے میں سرکاری کاغذات مال میں نظر آنے لگی۔ اور پھر شاہجہاں کے دور زریں میں اسے اردوئے معلّی کا ممتاز نام دیا گیا۔ اور راج دربار میں اسے پوری قدر و منزلت حاصل ہونے لگی۔ اس کے بعد یہی زبان دکن جا پہنچی جہاں اسے "دکھنی اردو" کہا جانے لگا۔ دکن کے مسلمان بادشاہوں نے اس زبان کو سنوارنے، نکھارنے اور ترقی کے زینوں پر پہنچانے کے لیے جتنی محنت اور جانفشانی کی اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ شاہی درباروں سے ہوتے ہوئے یہ زبان درویشوں اور شاعروں تک جا پہنچی۔ مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد جیسے عظیم المرتبت بزرگوں نے اس زبان کو مسائل تصوف کا وسیلۂ اظہار بنایا۔ اور اس طرح اس زبان کی مقبولیت اور عوامیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مغل حکومت کے آخری دور میں اردو زبان اور ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، ناسخؔ، آتشؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور دوسرے بڑے شعرا، اسی دور میں گزرے ہیں۔ خود آخری مغل تاجدار بادشاہ کم اور شاعر زیادہ تھے۔ اس زمانے میں کاروبارِ سلطنت کی طرف بادشاہ اور امراء کی توجہ کم اور شعر و ادب میں ان کا انہماک زیادہ تھا۔ مغل سلطنت تو ختم ہو گئی۔ لیکن مغل ادب، مغل شاعری، مغل فنون لطیفہ، مغل تعمیرات، یا یوں کہیے کہ مغل ثقافت جو دنیا کی نہایت ترقی یافتہ ثقافتوں میں شمار ہوتی ہے زندہ و تابندہ ہے۔ اور اس کے گہرے نقوش برصغیر کی تمام علاقائی ثقافتوں پر آج بھی موجود ہیں۔ اور مستقبل میں بھی عرصہ دراز تک موجود رہیں گے۔ ان نقوش میں اردو زبان اور ادب کے نقوش خصوصی امتیاز کے حامل ہیں۔ ان نقوش کی پائیداری کا عالم یہ ہے کہ بھارت میں اردو کی آئینی حیثیت کے کمزور ہو جانے کے باوجود وہاں کے عوام و خواص پر اس زبان کی گرفت بدستور نہایت مضبوط ہے۔ اب بھی وہاں کے سیاست دان عوام سے جس زبان میں خطاب کرتے ہیں۔ وہ اردو زبان ہے۔ وہاں

کے درجنوں اخبارات اور رسائل اردو میں شائع ہوتے ہیں. اور تمام ملک میں پڑھے جاتے ہیں. اور اگرچہ اردو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی چھپتی ہیں. اور انہیں ہندی کتابیں کہا جاتا ہے. لیکن انہیں اردو دان بخوبی سمجھ سکتا ہے. خود فارسی رسم الخط میں بھی سینکڑوں کتابیں بدستور چھپ رہی ہیں. اردو کی گرفت کا اندازہ اس چیز سے کیا جا سکتا ہے کہ پچھلے سال شملہ کانفرنس کے موقع پر خود بھارتی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی پریس کانفرنس میں نہایت عمدہ اور شستہ اردو میں خطاب کیا.

حقیقت یہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ سرمایا تھی. اور اس کی آبیاری میں ہندو ادیبوں اور شاعروں نے بھی بھرپور حصہ لیا. اردو ادب کی تاریخ میں بیسیوں باکمال ہندو شاعر گزرے ہیں. نثر نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد جیسی عظیم الشان کتاب لکھی. جسے اردو کے کلاسیکی ادب میں بہت بڑا مقام حاصل ہے. آج کے دور میں فراق گورکھپوری، پنڈت انند نرائن ملا. پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، جوش ملیسانی اور کئی دوسرے سرکردہ ہندو شعراء کی شاعرانہ عظمت مسلم ہے. میرے ضلع کے پسماندہ علاقہ سے اردو زبان کا جو مشہور ترین شاعر اٹھا وہ منشی تلوک چند محروم تھا. محروم کے قابل فرزند اور جانشین جگن ناتھ آزاد آج بھی بھارت میں اردو شعر و ادب کی بے انتہا خدمات سرانجام دے رہے ہیں.

تاہم اردو ادب کا مزاج سرتاسر اسلامی ہے. فسانہ آزاد پڑھنے والے کو اگر یہ نہ بتایا جائے کہ اس کا لکھنے والا ایک ہندو تھا تو وہ کبھی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت کے مسلم معاشرہ کی اتنی بھرپور عکاسی کرنے والا شخص مسلمان نہ تھا. یہ اردو ادب کا اسلامی مزاج ہی تھا کہ گزشتہ ادوار میں تو ہر ہندو شاعر اپنے دیوان کا آغاز حمد، نعت اور منقبت سے کرتا تھا. دور حاضر میں بھی ہندو شعراء نے ایسی ایسی نعتیں کہیں ہیں کہ انہیں مسلمان شعراء کی کہی ہوئی نعتوں کے مقابل فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے. اس دور کے دو ہندو شاعر پنڈت دتورام کوثری اور ہری چند اختر کی نعتیں تو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں. مشاعروں اور ادبی اجتماعات

میں کیا ہندو اور کیا مسلمان سامعین کلمات تحسین کے طور پر سبحان اللہ، ماشاء اللہ اور جزاک اللہ استعمال کرتے ہیں۔ اور عام بول چال میں بھی غیر مسلم ان الفاظ کو نہایت کثرت سے کام میں لاتے ہیں۔

اردو ادب کا یہ اسلامی مزاج ہی درحقیقت اس کے خلاف ہندوؤں کے ایک طبقہ کے تعصب کا باعث ہوا۔ جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا۔ اور پہلی جنگ آزادی کے بعد وہ ایک غیر ملکی سامراج کے انتقام کا نشانہ بنے تو فرقہ پرست ہندوؤں نے سب سے پہلا وار اسلامی اقتدار کے اسی مظہر پر کیا۔ اور ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہندوؤں کے ایک گروہ نے ایک میمورنڈم کے ذریعے اردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کو دفتروں اور حکومتی اداروں میں رائج کرنیکا مطالبہ کیا۔ اس وقت اتفاق سے سرسید احمد خاں بنارس ہی میں متعین تھے۔ اس متعصبانہ غوغا آرائی نے ان کے دل کو بہت صدمہ پہنچایا۔ لیکن وہ برابر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کے لیے کام کرتے رہے۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور میں ہندو طلباء کی تعلیم اور رہائش کا ویسا ہی انتظام تھا جیسا مسلمان طلباء کے لیے تھا۔ اور سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے جو ممتاز علمی ادارہ سرسید نے قائم کیا تھا اس میں بھی کئی ہندو اراکین شامل تھے۔ ان ہندو اراکین نے مطالبہ کیا کہ سائنٹیفک سوسائٹی کی مطبوعات اردو کے بجائے ہندی میں ہوں۔ چنانچہ ۲۹، اپریل ۱۸۷۰ء کو نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں سرسید احمد نے لکھا:

> "مجھے ایک اور خبر ملی ہے جس سے مجھے بہت دکھ اور تشویش ہوئی ہے۔
> بابو شیو پرشاد کے اکسانے پر ہندوؤں نے عمومی طور پر تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو جو اس ملک میں مسلمانوں کی حکمرانی کے مظاہر ہیں ختم کر دیں گے۔"

متعصب ہندوؤں کے معاندانہ عزائم کو مسلمان دشمن انگریزوں نے بڑی تقویت

پہنچائی. چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک متعصب انگریز کلکٹر مسٹر انیتھونی میکڈونل نے بہار میں اردو ادب اور فارسی رسم الخط کی جگہ بہاری ہندی اور کیتھی رسم الخط رائج کردیا. اس کے بعد یہی انتھونی میکڈونل یو پی کا گورنر بن کر آیا تو مارچ ۱۸۹۸ء میں ہندوؤں نے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے بجائے دفاتر میں ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط رائج کیا جائے. ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کے دن سر انتھونی میکڈونل کے حکم سے ان کی حکومت نے ایک قرارداد شائع کی. جس کی رو سے بعض سرکاری اغراض کے لیے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے دی گئی. میکڈونل کا یہ اقدام مسلمانوں کے لیے سخت بے چینی اور اضطراب کا باعث بنا. چنانچہ نواب محسن الملک نے جو سرسید کے بعد مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے. مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کے لیے علی گڑھ کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ کیا. اور اردو ڈیفینس ایسوسی ایشن قائم کی. اس طرح گویا تحریک پاکستان کا آغاز ہی اردو زبان کی محافظت کے جذبہ سے ہوا. اور آج ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جب مسلمانانِ ہند کا کاروان آزادی اپنی منزل کی جستجو میں نکلا تو اس کارواں کی سالار اردو زبان تھی.

آپ جانتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب و ثقافت کے مظاہر میں زبان و ادب کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے. زبان ثقافت کا ایک انتہائی اہم جزو ہے. اور اس کے بغیر ثقافت کی پہچان ممکن نہیں. اردو زبان کو اسلامی ثقافت میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس چیز سے کیا جا سکتا ہے کہ عربی اور فارسی کے بعد علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے. اور خدا کے فضل و کرم سے اس سرمائے میں مسلسل اور متواتر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے. اس سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں جن اداروں نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں انکی تفاصیل میں جانے کی ضرورت نہیں. البتہ اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ آج ہم جس عظیم الشان ادارہ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں یہاں جمع ہیں اس سلسلے میں اس کی خدمات بھی

ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ ادارہ ایک سو سال سے نہایت وقیع کام کر رہا ہے۔ اور اس ادارے کے ساتھ برصغیر کی بعض بڑی شخصیتیں منسلک رہی ہیں جن میں سے علامہ محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال حافظ محمود شیرانی اور خود مفکر پاکستان حضرت علامہ اقبال کے اسمائے گرامی آسمان علم و ادب پر روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ اس وقت بھی ملک میں اس ادارہ سے تعلق رکھنے والی کئی ایسی سرکردہ علمی شخصیتیں خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے زندہ و سلامت موجود ہیں۔ جن کے کارنامے تاریخ علم و ادب میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ یہی ادارہ پنجاب یونیورسٹی کا پیش رو ادارہ تھا۔ اور اس ادارہ نے اردو علم و ادب کے علاوہ عربی اور فارسی علم و ادب کی شمعوں کو بھی اس برصغیر میں روشن رکھا ہے۔ برصغیر کے اسلامی ادب اور اسلامی ثقافت کے لیے اس ادارہ نے جتنا کام کیا ہے اسے دیکھ کر ہمارے دل فخر و مسرت کے جذبات سے معمور ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے تحریک پاکستان کی ابتدا، اردو زبان و ادب کی تحریک سے ہوئی تھی۔ چنانچہ برصغیر کی عظیم سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ نے جہاں مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے جد و جہد کی۔ وہیں اردو زبان کے تحفظ کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ چنانچہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو الہ آباد میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس میں مسلم لیگ نے اردو کے حق میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی:۔

> آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے تمام اردو بولنے والے لوگوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی زبان کے مفادات کے تحفظ کے لیے جہاں جہاں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے شعبوں کا اس سے تعلق ہے کوشش کریں کہ جن علاقوں کی زبان اردو ہے وہاں اس کے بے روک ٹوک استعمال اور ترقی کا علم بلند رکھیں اور جہاں جہاں یہ غالب اکثریت کی زبان نہیں وہاں اختیاری زبان کے طور پر اس کی تدریس کی اور تمام سرکاری دفاتر کچہریوں، قانون ساز اداروں، ریلوے اور محکمہ

ڈاک میں اس کے استعمال کے لیے مناسب اقدامات کا اہتمام کریں۔"

پاکستان کے لیے جدوجہد کے دوران ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ پورے پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔ جب قائد اعظم کی زندگی کے دوران مشرقی پاکستان میں متعصب لوگوں نے زبان کا مسئلہ کھڑا کیا تو قائد اعظم اپنی کمزوری اور نقاہت کے باوجود ڈھاکہ تشریف لے گئے اور انہوں نے وہاں صاف اور واشگاف الفاظ میں فرمایا:-

"میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا رہا ہوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے آپ کی روزمرہ زندگی کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ نہ اس میں خلل پیدا کرے گا۔ بالآخر آپ لوگوں یعنی اس صوبے والوں کا کام ہے کہ فیصلہ کریں کہ اس صوبہ کی زبان کون سی ہونی چاہیئے۔ لیکن میں صاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔ اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو گی۔ جو شخص بھی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم ٹھوس بنیادوں پر متحد ہو کر کام نہیں کر سکتی۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ کی طرف دیکھیے۔"

قائد اعظم نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس پر ان کے بعد آنے والوں نے عمل نہیں کیا۔ اور اس کا نتیجہ ہم سب نے دیکھ لیا ہے۔ ان کے بعد چوبیس برس تک زبان کے مسئلہ پر لوگ جھگڑے کھڑے کرتے رہے۔ اب قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی رہنمائی میں عوامی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اور اس کے ساتھ ہی تمام صوبوں کی سرکاری اور رابطے کی زبان اردو ہو گی۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ قائد اعظم کے فرمان کی روشنی میں ہر انتظامی یونٹ اپنی صوبائی زبان کا تعین کرنے میں آزاد ہے۔ وہ علاقائی ادب و ثقافت کو نشو و نما دینے کا بھی کامل اختیار رکھتا ہے۔ قومی اور صوبائی زبانیں ایک ساتھ قدم بقدم آگے بڑھیں گی۔ مگر اس طرح کہ نہ اردو کی مرکزی حیثیت مجروح ہو گی۔ اور نہ علاقائی زبانوں کے حقوق پامال ہوں گے۔ اس فیصلے پر کچھ

وقت تو ہنگامہ آرائی ہوئی۔ یار لوگ برس ہا برس کے تعصبات کی وجہ سے کھل کھیلے، سندھی اور اردو کے نام پر بھائی نے بھائی کا خون بہایا۔ حالانکہ یہ زبانیں ہی نہیں۔ ہر زبان نفرت کی نہیں محبت کی پیغامبر ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب آنکھوں سے تعصب کی پٹی کھل چکی ہے۔ سالوں سے ملتوی زبان کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ اور پاکستانی قوم لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اپنی منزل کا تعین کرنے کے بعد پوری ہوشمندی سے سرگرم سفر ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی نے انتخابی مہم کے دوران جس زبان کو اپنایا وہ اردو زبان تھی۔ صدر پاکستان نے ملک کے ہر حصے میں اردو زبان کو ہی اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اور ان کی اہم تقاریر سب کی سب اسی زبان میں ہوتی رہیں۔ بلکہ آپ کو یاد ہوگا کہ جس روز انہوں نے ٹوٹے ہوئے جہاز کی ناخدائی قبول کر کے پاکستان کی از سر نو تعمیر کے عزم کا اظہار کیا تھا تو اپنی پہلی تقریر میں اس چیز پر بڑے تاسف کا اظہار کیا تھا وہ اردو کے بجائے انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی واضح کر دی تھی۔ صدارت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد انہوں نے جتنی عوامی تقاریر کی ہیں۔ وہ سب اردو ہی میں ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ قائد اعظم کی مادری زبان گجراتی تھی۔ اور انہوں نے تمام عمر کام انگریزی زبان میں کیا۔ لیکن جب وہ تحریک پاکستان کے لیے اٹھے تو انہوں نے اردو زبان سیکھنا اور اس میں تقریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اصل میں جتنا بڑا کوئی رہنما ہوتا ہے اتنا زیادہ وہ اپنی قوم کے جذبات اور احساسات کو سمجھتا ہے۔ اور ان جذبات اور احساسات کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم صدر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قائم کی ہوئی روشنی میں اپنے عمل کا تعین کریں تاکہ ہماری قوم اور ہمارا ملک بھی ترقی کرے اور ان کے سہارے انفرادی زندگی بھی کامیاب اور بامراد ہو۔

پاکستان پائندہ باد

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی غسل کعبہ کی
مبارک رسم ادا فرما کر خانہ کعبہ سے باہر آرہے ہیں

کراچی میں پی آئی اے کی افتتاحی پرواز کے موقع پر عازمین حج سے خطاب

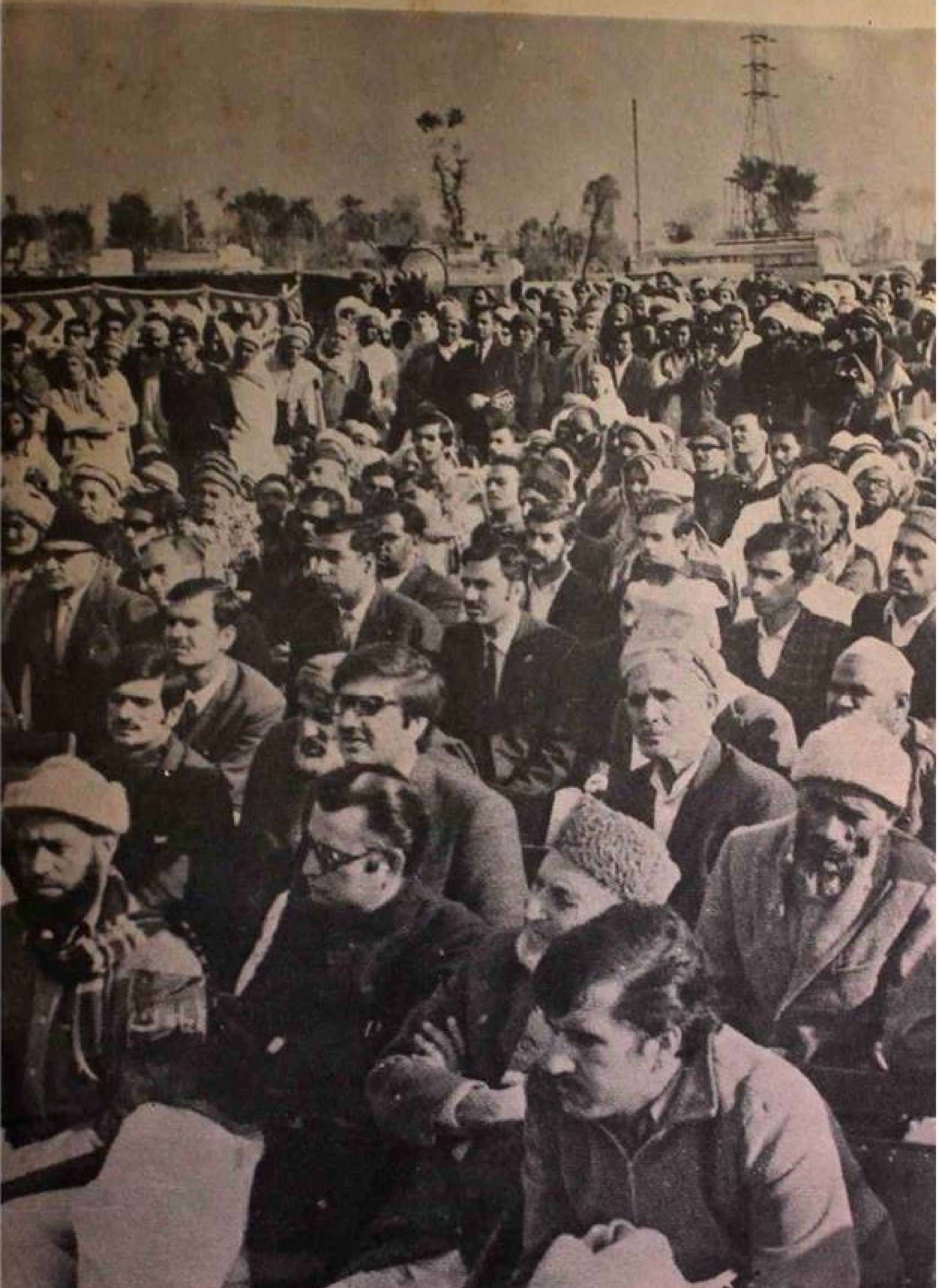

پشاور میں زائرینِ حرم سے خطاب کا منظر ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۳ء

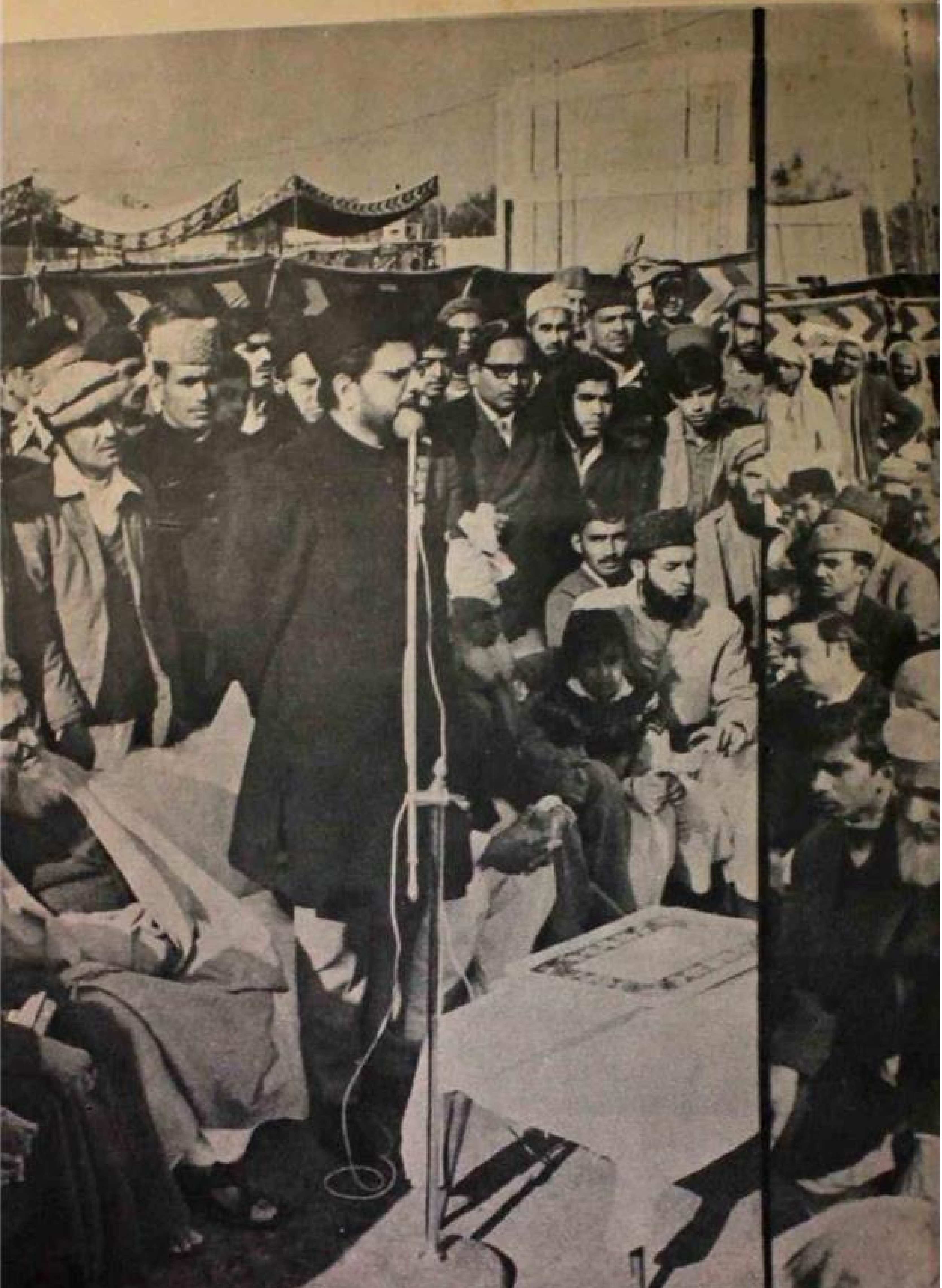

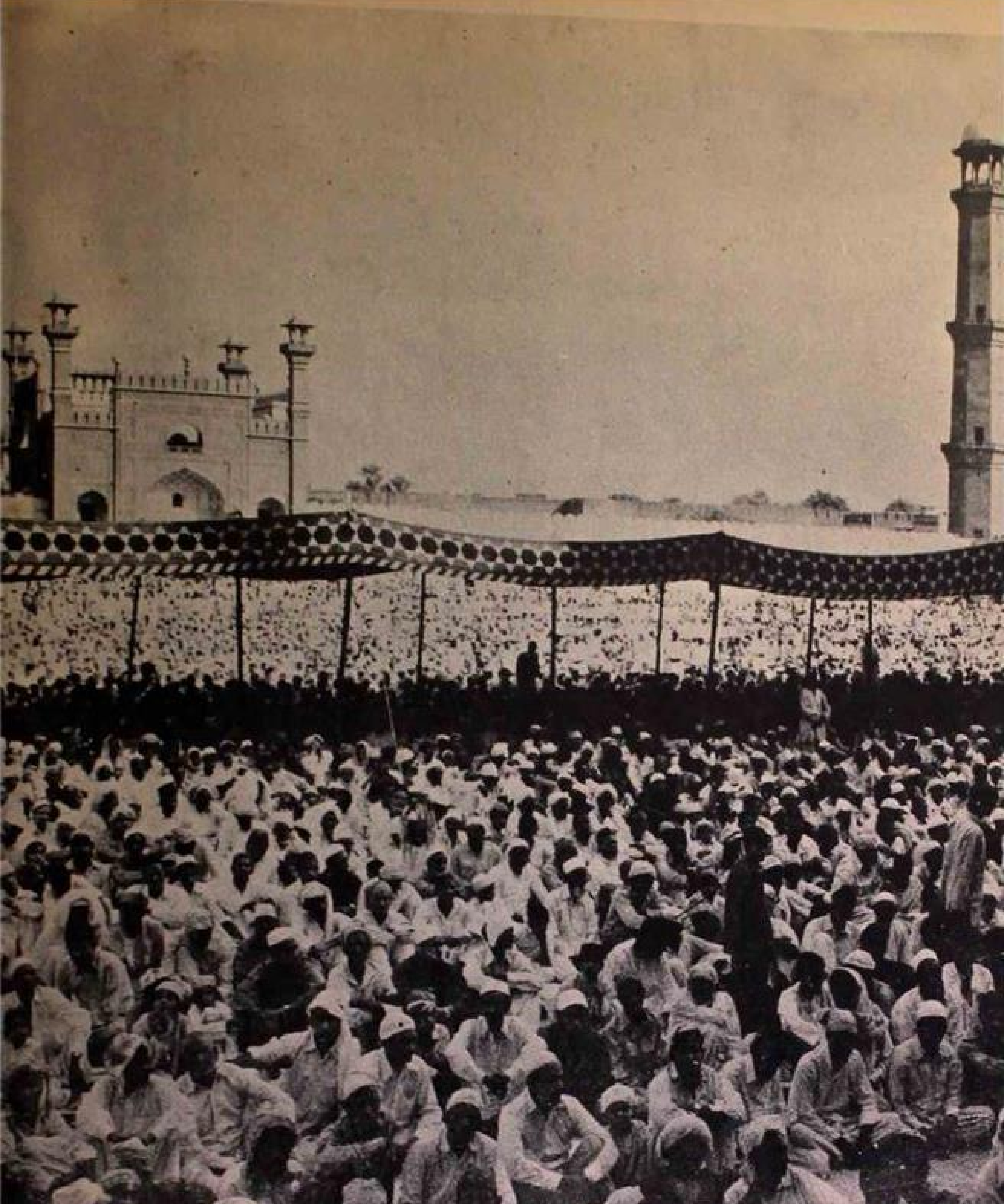

مولانا کوثر نیازی جمعتہ الوداع کی نماز سے پہلے بادشاہی مسجد لاہور میں

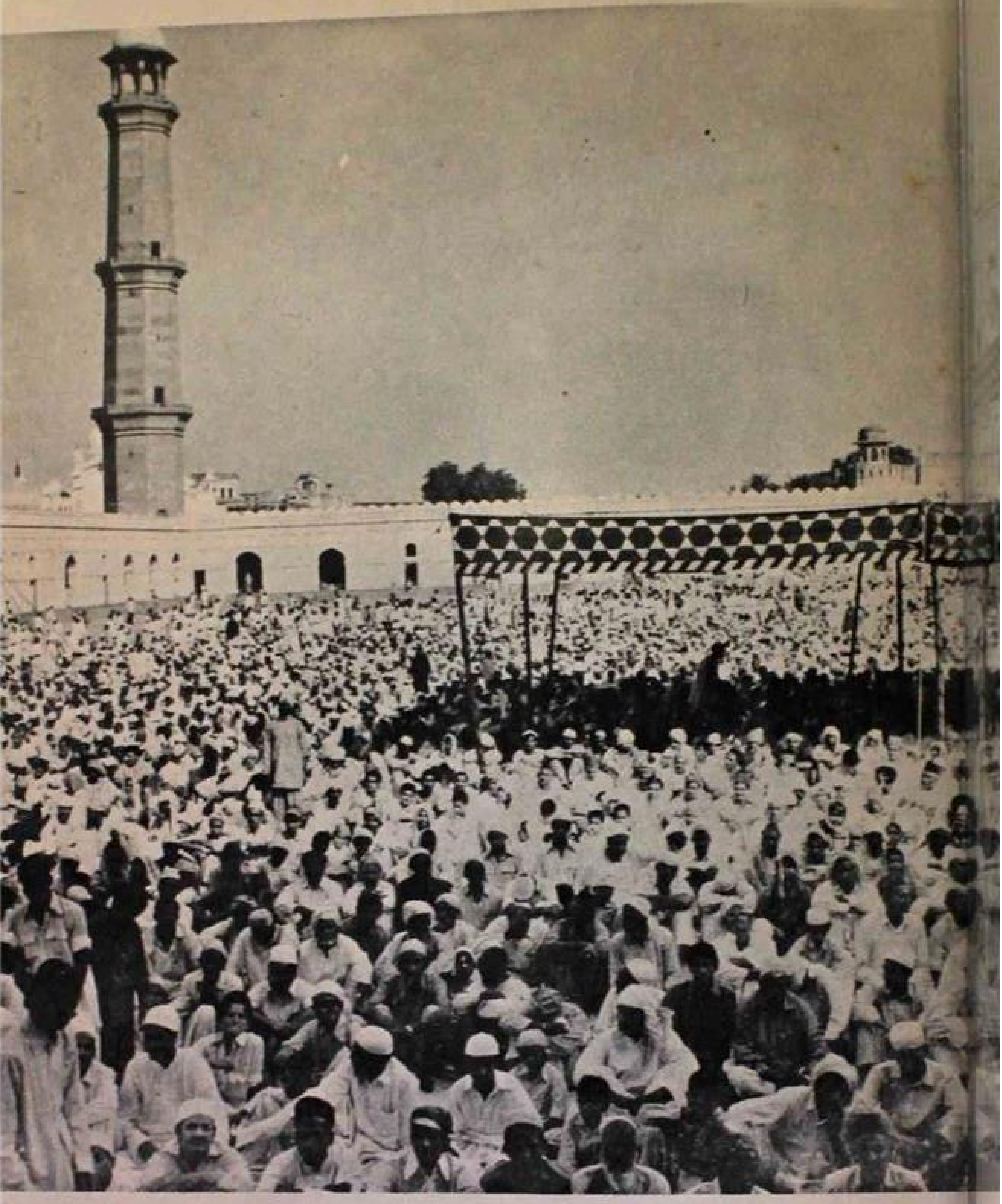

ـسے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء

عیدمیلاد النبیؐ کے موقع پر پشاور میں ایک عظیم الشان جلوس

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی حاجی کیمپ

قیادت کا منظر

چے میں عازمین حج سے خطاب کر رہے ہیں

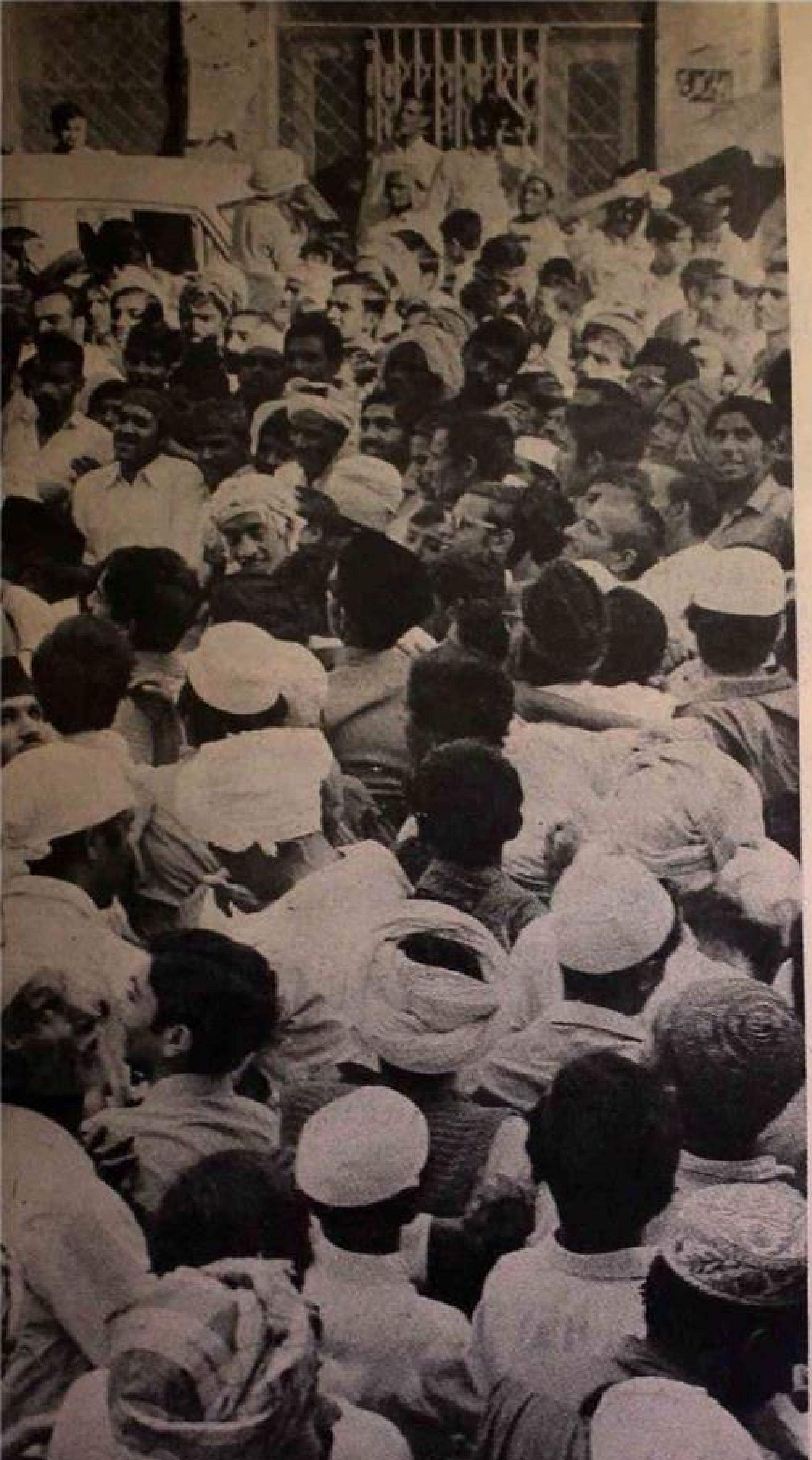

عرب اسرائیلی جنگ میں عرب بھائیوں کی فتح یابی کیلئے نماز جمعہ

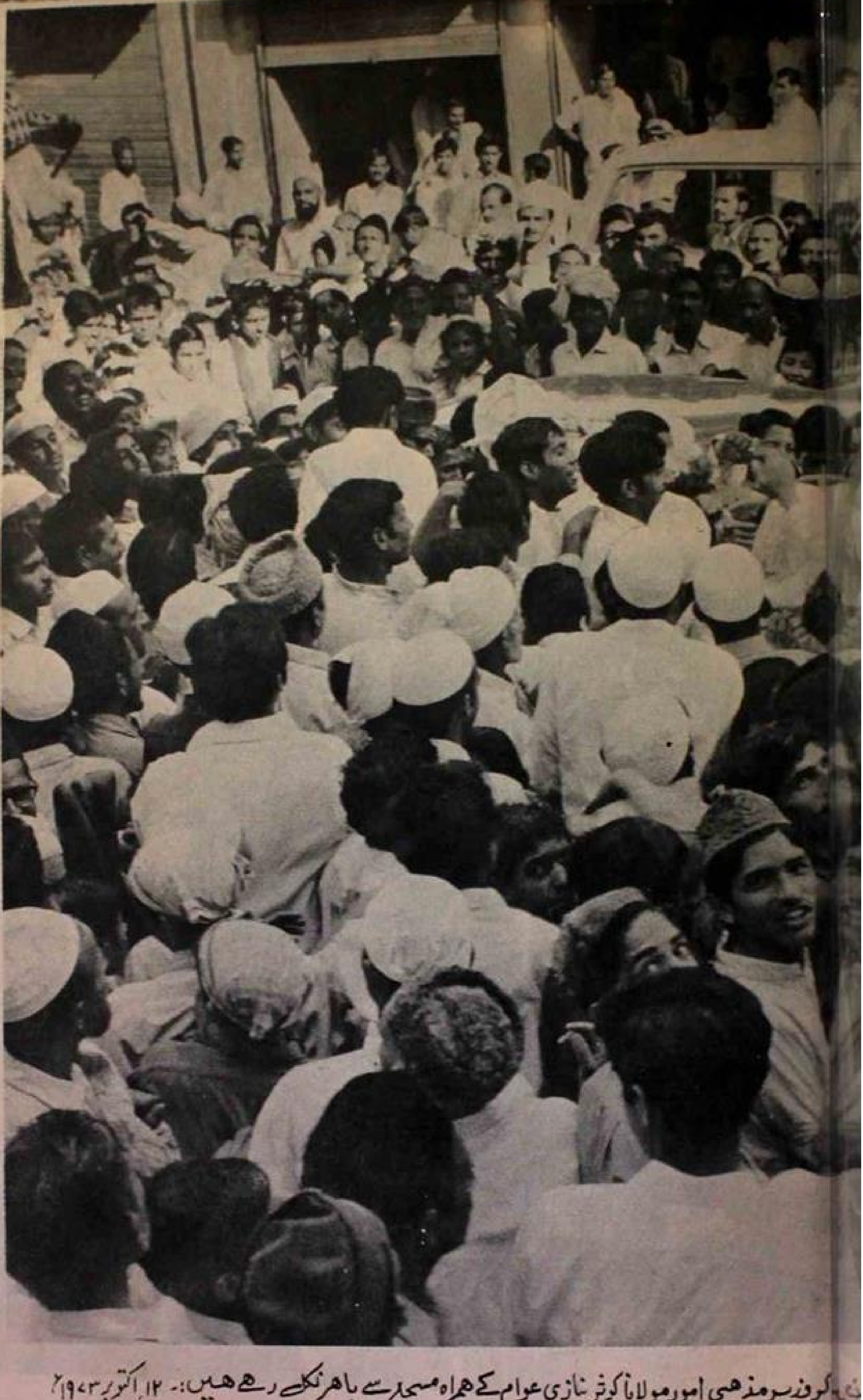

ن، کو وزیر مذھبی امور مولانا کوثر نیازی عوام کے ھمراہ مسجد سے باھر نکل رھے ھیں:- ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء

مرکزی جامع مسجد راولپنڈی میں نماز جمعہ

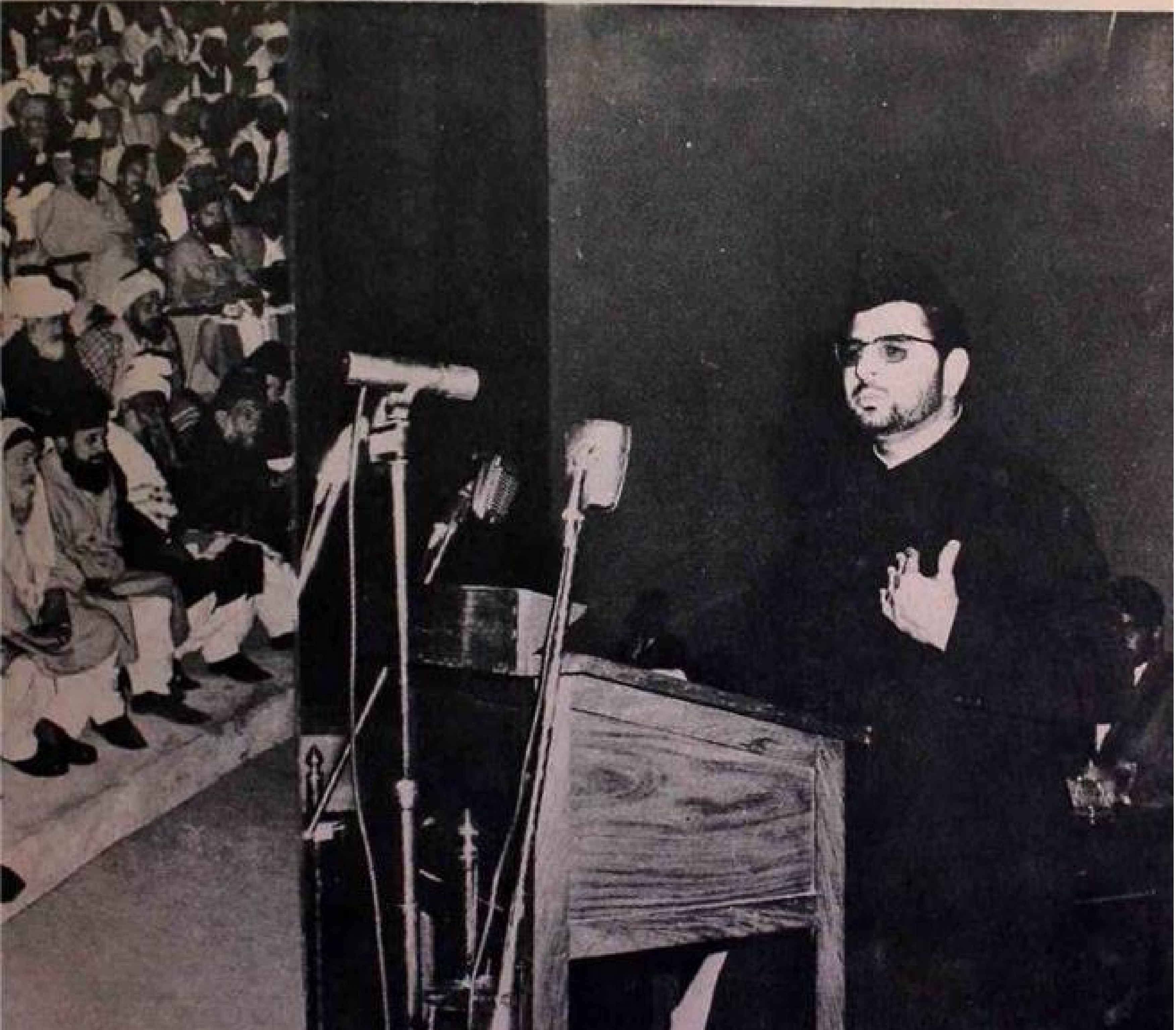

بتماع سے خطاب :- ۳ مئی ۱۹۷۳ء

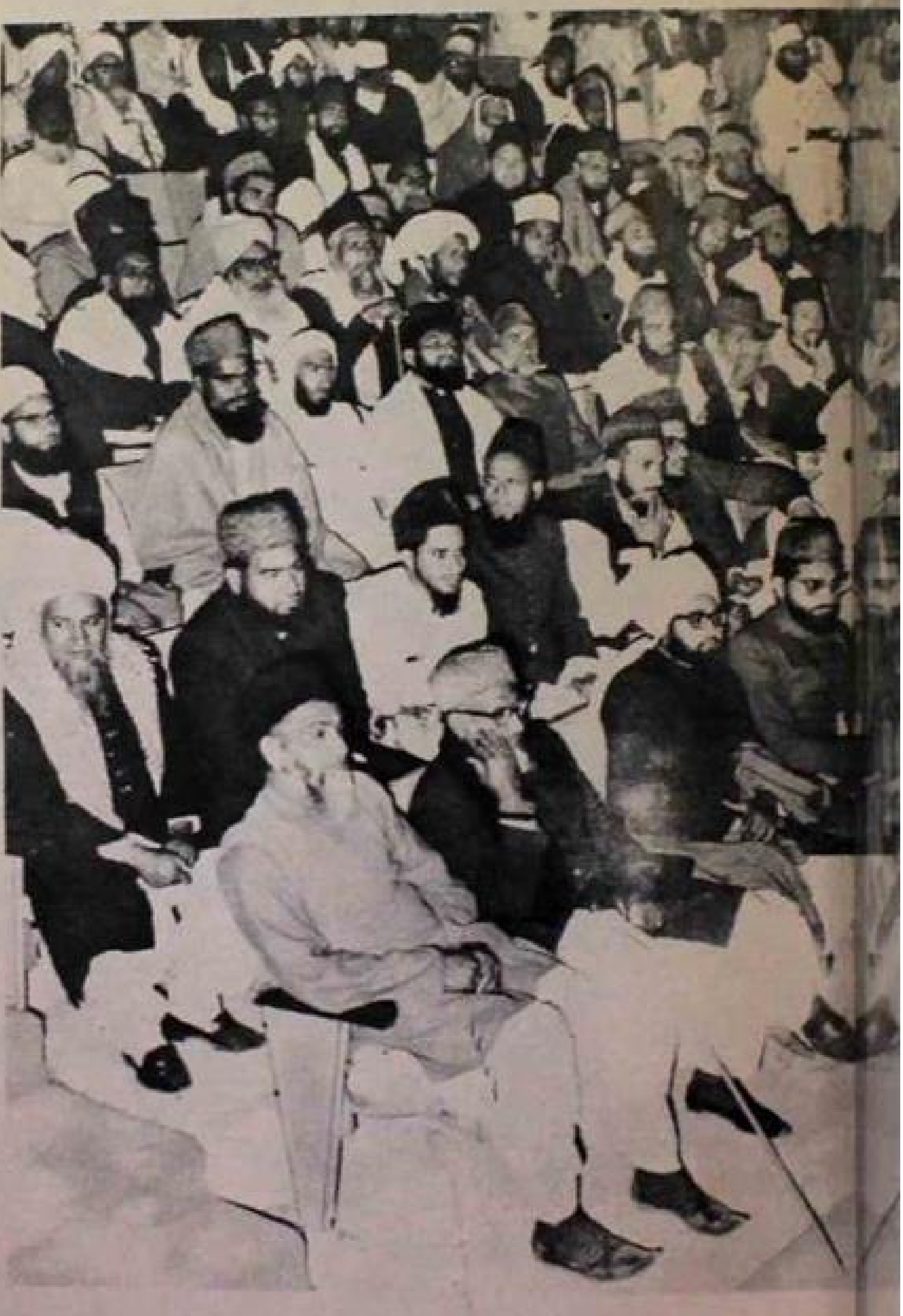

مولانا کوثر نیازی
لیاقت میموریل
ہال راولپنڈی میں
علماء کرام کے
اجتماع سے خطاب کر رہے
ہیں :- یکم مارچ ۱۹۷۳ء

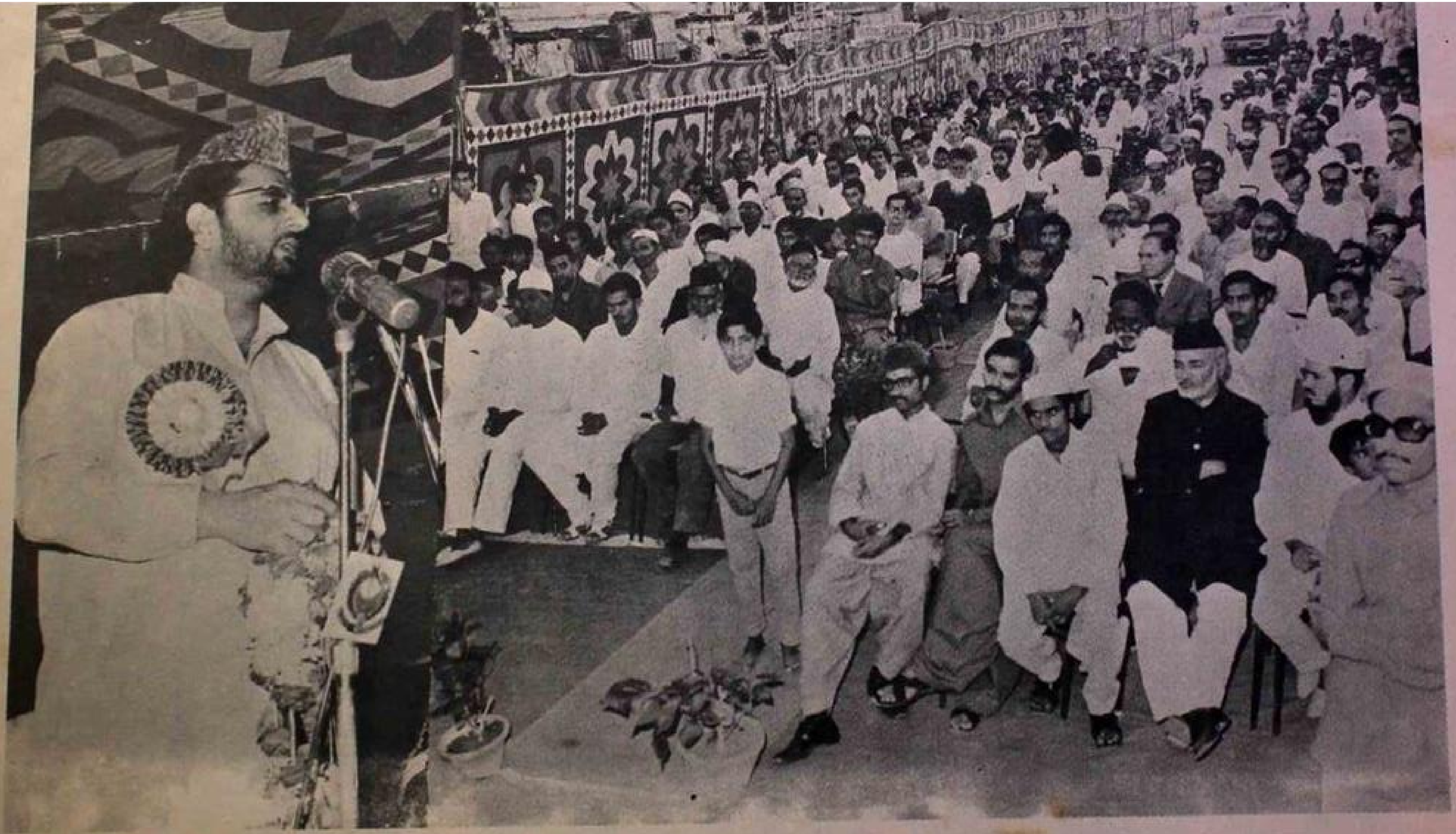

شمالی ناظم آباد کراچی میں مسجد "عثمان غنی" کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب کے موقع پر حاضرین سے خطاب :- ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء

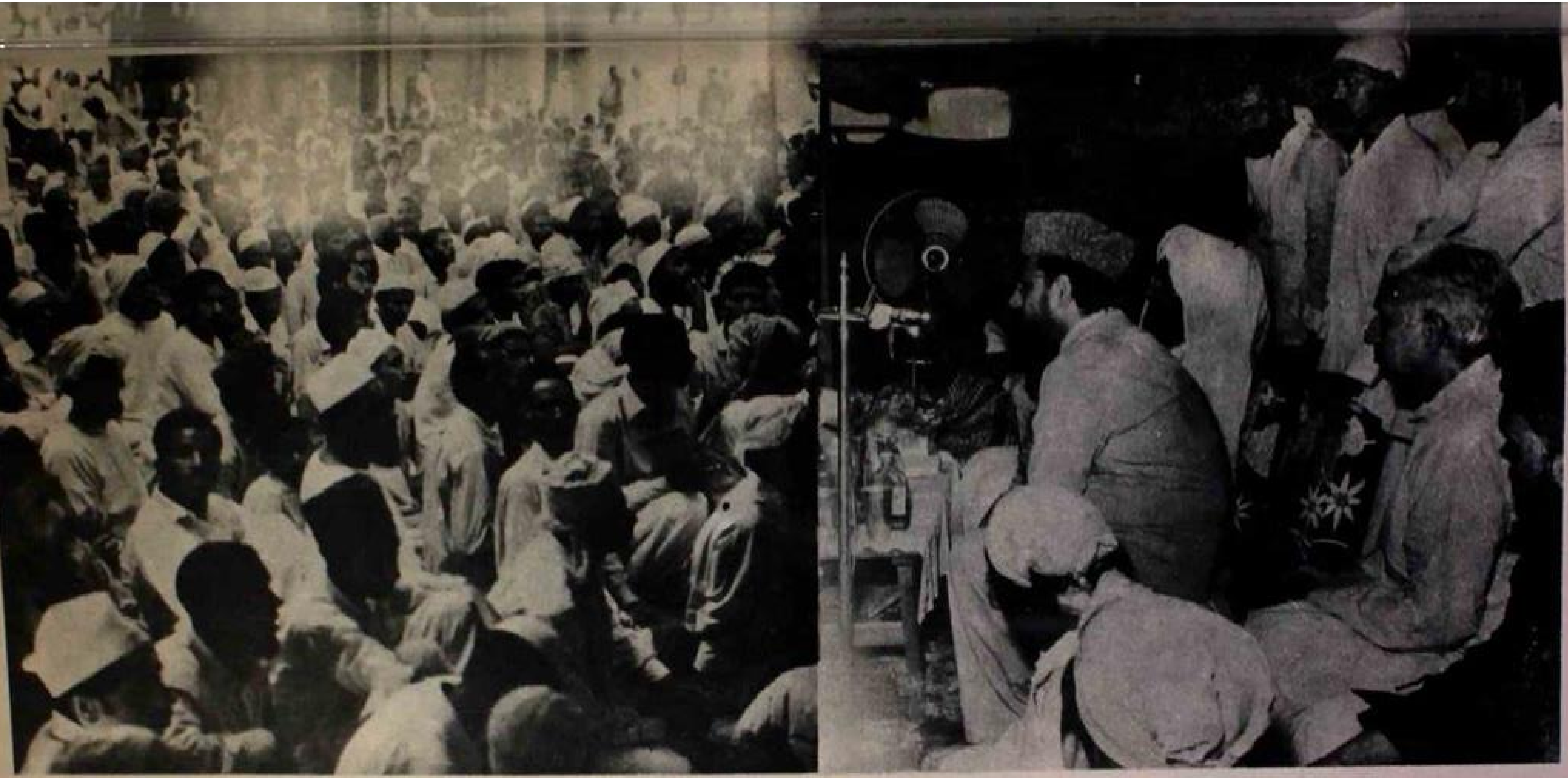

خانقاہ محبوب آباد حویلیاں (ضلع ہزارہ) میں وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی جمعہ کے اجتماع سے خطاب کر رہے ہیں :- ۸ جون ۱۹۷۳ء

پاک مصر اتحاد ایسوسی ایشن
کی ایک تقریب سے خطاب

پریس کلب کراچی میں صحافیوں کے
مسائل پر تبادلہ خیال ، ۱۲ اپریل ۱۹۷۲ء

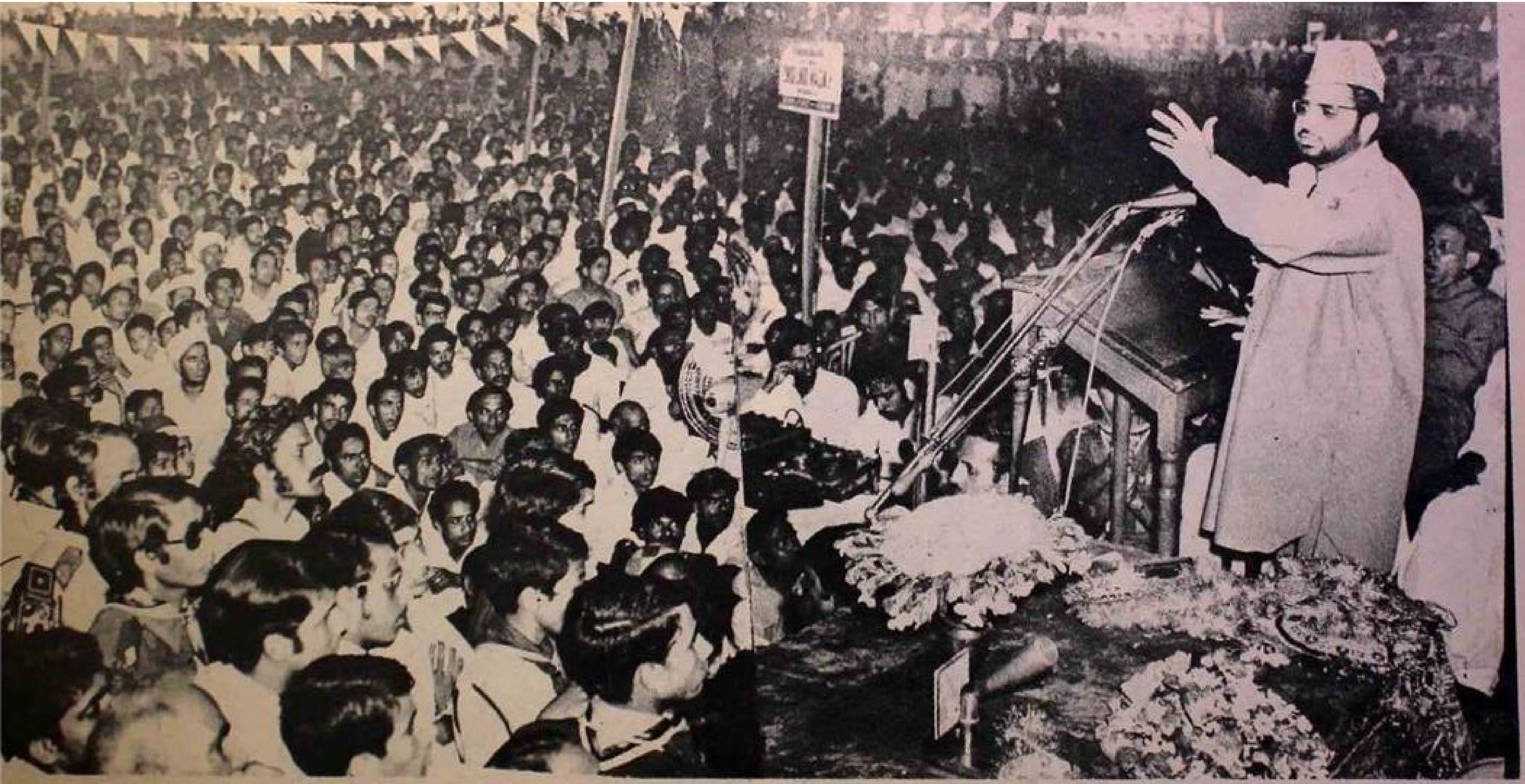

آرام باغ کراچی میں عید میلاد النبیؐ کے جلسے سے خطاب ۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء

اربابِ علم و دانش کیلیے لمحۂ فکریہ

"العلم" کراچی ایک مشہور علمی جریدہ ہے اور سرسید کی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس کا آرگن ——

۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اس کا چوبیسواں سالانہ جشنِ علمی منایا گیا۔ حاضرین میں کراچی کے مشہور دانشور اور اہلِ علم شامل تھے۔ اسی زمانہ میں امرتسر ٹیلیویژن کے قیام کا بڑا چرچا تھا اور بعض حلقے اس ثقافتی یلغار کے خوف سے سہمے جا رہے تھے جو ان کے نزدیک امرتسر ٹیلی ویژن سے شروع ہونے والی تھی۔ اس تقریر میں ان حلقوں کے انھی خدشات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔"

صدر گرامی قدر! جناب الطاف بریلوی صاحب و حاضرین کرام

آپ کے اس منتخب اجتماع میں شریک ہو کر آج میں دلی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ علم سے میرا لگاؤ ایک طالب کی حیثیت سے ہے۔ اور یہ اہل علم کا اجتماع تو "العلم" کے لیے ہوا ہے جو میرے نزدیک اس سرِ حقیقت کا نام ہے جس کا سراغ قرآن حکیم سے ملتا ہے۔ اس لحاظ سے "العلم" کے اس اجتماع میں شریک ہونا میرے لیے بہتر طور وجہ افتخار ہو سکتا ہے۔

"العلم" کے صفحات برسوں سے میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ میں اس وقت بھی اس کا مستقل قاری تھا، جب میری حیثیت وزیر کی نہیں ایک فقیر کی تھی۔ اور جب سے وزیر بنا ہوں میری کوشش

یہ رہی ہے کہ اس ملک سے شائع ہونے والے جرائد کم و بیش میری نظر سے گزرتے رہیں۔ اور یہ میرا فرضِ منصبی بھی ہے۔ "العلم" کی علمی خدمات کا میں قدردان بھی ہوں اور معترف بھی۔ اسکے جلی نقوش جو میرے دل و دماغ پر مرتسم ہیں کبھی محو نہیں ہو سکتے

میں یہ دیکھ کر خوش ہوا ہوں کہ اس اجتماع میں بہت سے ارباب علم و فضل موجود ہیں میری یہ خواہش ہے کہ اس وقت میں ان کی توجہ ان حالات کی طرف مبذول کراؤں جس کا ذکر قبل ازیں سید الطاف علی بریلوی اپنے سپاسنامہ میں کر چکے ہیں۔ اس سپاسنامہ کے بین السطور میں جو حقیقت مجھے بے نقاب نظر آئی ہے اس کی طرف اہلِ علم کو متوجہ کرنا میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔

"العلم" گزشتہ ۲۲ سال سے پابندیٔ اشاعت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ علمی نوعیت کا یہ ایک وقیع جریدہ ہے۔ ملک کے بہترین جرائد میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن یہ دقتوں اور پریشانیوں کا شکار ہے۔ اس کی انتظامیہ کو بھی دشواریاں لاحق ہیں۔ وہ قرضہ سے زیر بار ہے۔ اس کے علاوہ انتظامیہ کو بھی شکایت ہے کہ رسالہ چھپوانے کے لیے کاغذ کی فراہمی سے لیکر بذریعہ ڈاک رسالے کی ترسیل تک اسے طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کئی ایک سنگ گراں راستے میں حائل ہو جاتے ہیں ۔ اور جہاں تک رسالے سے آشنائی کا تعلق ہے۔ اوروں کا تو ذکر چھوڑیے خود ہمارے اہل صحافت بھی اس کے نام سے پوری طرح آشنا نہیں! آخر ایسا کیوں ہے؟ ملک کے علمی و ادبی رسائل سے یہ اغماض کیوں برتا جاتا ہے؟ اس بے توجہی کا سبب کیا ہے۔ اس کے جواب میں دو ہی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ "العلم" اور اس طرح کے دیگر علمی جرائد کی تشہیر و ترویج کے لیے وہ سائنٹیفک طریقے اختیار نہیں کیے جاتے جو دورِ حاضر کا تقاضا ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہم میں تحصیل علم کا شوق نہیں یا ہم طلب علم کے فریضے کو فراموش کر چکے ہیں۔ نہیں! علم حاصل کرنے کی طلب بھی ہے۔ جستجو بھی اور شوق بھی۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن طلب و جستجو کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ البتہ علمی جرائد کی سرپرستی سے ہماری غفلت کا بڑا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی تشہیر و ترویج و تنظیم کے سائنٹیفک اسالیب سے اپنی عدم واقفیت کی بنا پر ہم وہ روش اختیار نہیں کرتے جو ہمارے جدید دور کا تقاضا ہے۔ دوسری بات جو اس

ضمن میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ بازار میں اس جنس کی گاہکی نہیں۔ دورِ حاضرہ کے مقتضی اسلوب کو اپنا لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اصلیت یہ ہے کہ ان جرائد کو پڑھنے والے بہت کم ہیں۔ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس نوعیت کے جرائد کی مانگ اب ختم ہو چکی ہے۔ وہ حضرات جنھیں اعزازی طور پر پرچہ روانہ کیا جاتا ہے، اگر وہ اس کی ورق گردانی ہی کر لیں تو یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ اربابِ علم و دانش کو ان کے فرائض خود آواز دے رہے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ علمی و ادبی جرائد ہمارے ملک میں سخت مشکل حالات سے دوچار ہیں۔ آپ کہیں گے کہ حکومت بھی اس کے لیے کسی حد تک ذمہ دار ہے۔ کیونکہ حکومت پر بھی ان کی سرپرستی کا اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ حکومت سے ایسی کوئی درخواست کی بھی گئی! اب کہیں جا کر یہ مرحلہ آیا ہے کہ ہم اپنے گوناگوں الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ اور اب ایک ایسی منزل سے ہمکنار ہونے کی سعی میں مصروف ہیں جو ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کا سنگِ میل بن کر نمایاں ہو چکی ہے۔ آج ہم اس قابل ہیں کہ اپنی علمی روایات کے پرچم کو بھی سربلند رکھنے کی طرف متوجہ ہوں۔ اسی کے مدنظر ہم نے یہ اہتمام کیا ہے کہ "انجمن ادبی رسائل و جرائد" کا ایک کل پاکستان سالانہ اجتماع ہو۔ جس میں ملک بھر میں شائع ہونے والے علمی و ادبی جرائد کے مدیر شرکت کریں۔ تاکہ حالت کی ابتری کو سنوارنے کے لیے باہمی گفتگو سے کوئی طریقِ کار وضع کیا جا سکے۔ مدیرانہ حیثیت سے میں خود بھی اس اجتماع میں شریک ہوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ مدیران جرائد کے وہ تمام مسائل جو حکومت کی سرپرستی سے متعلق ہیں، انشاء اللہ العزیز ان کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالا جائیگا۔ یہ اجتماع آئندہ مہینے منعقد کرنیکا خیال ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ان جرائد کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو بھی جائے تو کیا ان کی

کھپت میں اضافہ ہو جائے گا؟ ہمارے ذہن کیا اس کے لیے آمادہ ہیں؟ کیا ہماری نئی نسل ان علمی شہ پاروں کو اپنے جیب و داماں کی زینت بنا سکے گی؟ ظاہر ہے کہ حکومت تنہا اس کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے صاحبانِ علم و فضل پر بھی کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں کچھ فرائض انہیں بھی ادا کرنا ہوں گے۔ اگر علم و ادب کی شمع کو فروزاں رکھنا مقصود ہے تو کچھ نہ کچھ انہیں بھی ضرور کرنا پڑے گا۔

اور ــ اگر تنقید و تجزیہ ہی مدنظر ہے۔ یعنی یہی مقصود ہے تو اس کے بہت سے پہلو خود بخود ہی نکل آئیں گے۔ اور بہت سے گوشے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیں گے۔ "جنریشن گیپ" (نسلوں کا تفاوت) کا قصہ درمیان میں آ جائے گا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ اہلِ علم کا مجمع ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ یہاں تشریف فرما ہیں۔ اور رئیس الجامعہ بھی موجود ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ "جنریشن گیپ" کی یہ اصطلاح آجکل بہت چل نکلی ہے۔ ہر وہ بات جس کا حل ذرا دقت طلب ہوتا ہے اسے حل کرنے کے بجائے "جنریشن گیپ" کی آڑ لے کر ٹال دیا جاتا ہے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ نئی نسل میں اب ان چیزوں کی طلب نہیں ہے۔ مانگ نہیں ہے اب، انکی قدر نہیں رہی۔ اسکے باوجود ایک استفہامیہ نشان نگاہوں کے سامنے ابھر آتا ہے کہ یہ جنریشن گیپ کیوں ہے؟ نئی نسل کی نگاہوں میں ان چیزوں کا وقار کیوں گر چکا ہے؟ انکی قدر کیوں کم ہو گئی ہے؟ فاصلے کیوں بڑھ گئے ہیں، منافرت کی اس خلیج کے حائل ہو جانے کا سبب کیا ہے؟ ایک ہی زمانے میں پرانی اور نئی نسل کے درمیان یہ بُعد کیونکر واقع ہوا؟ اسکے جواب میں، اگر صاحبانِ علم مجھے اجازت دیں۔ اور میری اس صاف گوئی کو گستاخی و بے باکی پر محمول نہ کریں تو میں عرض کروں گا کہ جو کام ملک کے اربابِ دانش اور صاحبانِ علم و آگہی کے کرنے کا تھا۔ وہ اسے سرانجام دینے میں بڑی حد تک ناکام رہے ہیں۔ نئی نسل کی طرف سے ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ وہ انہیں کماحقہ پورا نہیں کر سکے۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں آج "جنریشن گیپ" اور "ثقافتی یلغار" ایسی اصطلاحیں وضع ہو گئیں جو ابھی اپنا مفہوم متعین کرنے کی تگ و دو میں مصروف نظر آتی ہیں۔

پنجاب کا مشہور شہر لاہور جسے ہماری تہذیب و ثقافت کی مرکزیت کا شرف حاصل ہے جو صدیوں سے اسلام کی دینی، روحانی اور اخلاقی قدروں کا علم بردار چلا آ رہا ہے۔ سلاطنہ کے دور میں جسے "غزنینِ خورد" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جہاں داتا کا عرفان تجلی ریز ہے اور جہاں شاہ معین الدین کے چلّہ کی سکوت افزائیاں موجزن ہیں۔ اسی لاہور کے متعلق آج یہ شور سننے میں آ رہا ہے کہ وہ بھارت کی ثقافتی یلغار کا ہدف بن کر رہ گیا ہے۔ حال ہی میں بھارت کی حکومت نے لاہور سے چالیس میل دور امرتسر کے مقام پر ایک چھوٹا سا ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کیا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے ہمارے قائم کردہ ٹیلی ویژن کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ابھی تو اس نے جنم ہی لیا ہے ؎ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔

لیکن اس کے باوجود ملک بھر میں ایک شور سا بلند ہے۔ ایک غلغلہ مچا ہوا ہے کہ بھارت نے پاکستان پر ثقافتی حملہ شروع کر دیا۔ اس حملے سے بچنے کے لیے ہماری طرف سے بھی مثبت اقدامات ہونے چاہئیں۔ یہ کرنا چاہیئے۔ وہ کرنا چاہیئے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لاہور کے ٹیلی ویژن ناظرین اگر امرتسر کے اسٹیشن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرام دیکھ لیتے ہیں تو انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ بھارت کی ثقافت کے سامنے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

ثقافت کیا ہے؟ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہ ایک علمی موضوع ہے۔ اس پر وہی حضرات بہتر گفتگو کر سکتے ہیں جو "العلم" کے مسلسل قاری ہیں۔ بصارت و بصیرت کے مالک ہیں۔ علم و آگہی رکھتے ہیں میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ثقافت کسی ملک کے اساطیر، اس کے فنون لطیفہ، اس کے فلسفہ اور اس کے مذہب کے رچاؤ بساؤ کا نام ہے جس کے مظاہر خود اس ملک کے عوام ہوتے ہیں۔ اور جن کی اجتماعی زندگی سے اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ ایک ثقافت دوسری ثقافت سے اسی وقت اثر قبول کرتی ہے جب وہ خود اس کے مقابلہ میں فروتر ہو۔ اس کے محرکات میں معاشی استحصال بھی شامل ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کسی ثقافت پر برتری حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے وہاں کے عوام کا معاشی و سیاسی استحصال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد

ذہنی استحصال کی نوبت آتی تھی۔ جو تہذیبی روایات کو ختم کر دینے کا ایک ذریعہ بن جاتا تھا۔ ہندوستان پر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے برطانوی استعمار نے یہی روش اختیار کی پہلے اس نے معاشی لحاظ سے یہاں قدم جمائے۔ پھر سیاسی اعتبار سے نفوذ کیا۔ اور اس کے بعد ذہنی اور تہذیبی یلغار شروع ہو گئی۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ علم کی روشنی سے ہر طرف اجالے پھیل چکے ہیں۔ رائے عامہ نے بیدار ہو کر اس تمام فرسودہ تکنیک کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب کہیں مادی، سیاسی یا معاشی استحصال ہوتا بھی ہے تو ایک عالم میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس پر احتجاج کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ قومیں برافروختہ ہو جاتی ہیں اور استحصالی قوتوں کا جم کر مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اس خلفشار سے بچنے کے لیے اب یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ پہلے ذہنی طور پر یلغار کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نسبتاً آسان ہے اور قابل مذمت بھی نہیں۔ اس سے کئی طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور جب قومیں ذہنی اعتبار سے مسحور و مرعوب ہو جاتی ہیں تو پھر سیاسی اور معاشی لحاظ سے انہیں زیر دست رکھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

بالفرض اگر ثقافتی یلغار کو کچھ اہمیت حاصل ہے تو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر ایک ثقافت دوسری ثقافت کے مقابلہ میں تندرست و توانا اور برتری کی حامل ہے تو ثقافتی یلغار وہاں بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ غلبہ پانے والی ثقافت کی بنیادیں کمزور ثقافت کے مقابلہ میں زیادہ گہری، مستحکم اور جاندار ہوتی ہیں۔ پاکستانی ثقافت جسے آپ اسلامی ثقافت کا نام دیتے ہیں۔ ذہن و خیالات تک محدود نہیں۔ یہ ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ ثقافت خود ان کے نظریہ مذہب کا منطقی نتیجہ ہے جو ان کا کردار اور زندگی کا طریق کار متعین کرتی ہے۔ اسلامی نظریات کے مطابق روحانی اور مادی زندگی کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ اسلام کا یہ طرز فکر اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ خیال کیا جائے کہ اسلام کی ثقافتی قدریں کمزور واقع ہوئی ہیں۔ غیر جاندار ہیں، غیر مستحکم ہیں۔ ان میں اتنی بھی صلاحیت

نہیں کہ امرتسر میں ایک چھوٹے سے ٹیلی ویژن کا وجود برداشت کرسکیں تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ اسلام کی نہیں کسی اور مذہب کی قدریں ہوں گی۔ اسلامی کلچر تو آپ کے اخلاقی و علمی کردار، آپ کے رسم و رواج، آپ کی طرز زندگی، اور آپ کے مخصوص مقاصدِ حیات کا علمبردار ہے۔ کوئی دوسرا کلچر اس پر غالب نہیں آسکتا۔ آپ کو ہندو کلچر سے خطرہ لاحق ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندو ثقافت اپنے اساطیر سے متاثر ہوئی ہے۔ ہندوستان کی مادی زندگی کے تخیلاتی پیکر یہیں کی مخصوص معاشی اور معاشرتی زندگی سے تشکیل پائے ہیں۔ مسلمانوں کے اجتماعی شعور ولاشعور کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ مسلم ثقافت کی اصطلاحیں اور اس کا تہذیبی سرمایہ ہندو دیو مالا سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام کے دیئے ہوئے جنت اور دوزخ کے تصور سے لیکر میدان کربلا کی ریت کے ذروں تک ہمارے تہذیبی ورثے کی مختلف کڑیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ صدیوں تک ایک ساتھ رہنے سے بھی یہ تہذیبی فاصلہ دور نہ ہوسکا۔ اور ہندو مسلمان کے درمیان مغائرت قائم رہی۔ نظریہ پاکستان بھی اسی مغائرت کا ردعمل تھا جس نے معرض وجود میں آکر یہ اور واضح کردیا کہ دونوں قوموں میں امتیاز موجود ہے۔ غیریت موجود ہے۔ وہ اسلامی ثقافت ہی تھی جس نے سرسید احمد خاں کو بھی دو قومی نظریہ پیش کرنے پر مجبور کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کی تحریک نے قیام پاکستان کے لیے بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ میرا نظریہ محض ان خدمات کو سراہنے تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو پاکستان علی گڑھ کی جغرافیائی توسیع کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک بڑا علی گڑھ ہے۔ اگر آپ اس کے تاریخی عوامل پر غور کریں، اس کے پس منظر کو دیکھیں۔ اس جدوجہد پر نظر ڈالیں جو تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے ہوئی ہے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ ہماری تہذیبی روایات کا جداگانہ تشخص اور ہماری ثقافتی قدروں کی علیحدہ نوعیت ہی تھی کہ ہمارے اکابر زعمائے ملت نے علیحدہ مسلم قومیت کا نعرہ لگایا۔ اندریں حالات یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلم ثقافت جو ایک ہزار سال

تک برصغیر پر حکمراں رہی ہے۔ وہ نہ صرف اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے بلکہ ایک ایسے وجود کی مالک ہے جو اپنی ذات میں ایک للکار ہے۔ ایک چیلنج ہے۔

ہندو ثقافت کو اس لحاظ سے للکار یا چیلنج کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تحریکی عمل سے عاری ہے۔ وہ تو صرف کائنات کی پُر اسرار حقیقتوں کے ساتھ جذب و قبول پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کی ثقافت خود ایک محرکاتی عمل ہے۔ مسلسل آگے بڑھنے کا نام ہے۔ ہندو ثقافت اس پر کسی طرح غلبہ نہیں پا سکتی۔ جدید عمرانی تحقیق کی رُو سے تہذیبی برتری یوں تو ایک لایعنی تصور ہے۔ کیونکہ ہر تہذیب ایک مخصوص خطۂ زمین پر رہنے والوں کے معاشی حالات سے جنم لیتی ہے۔ اور اس گروہ کی معاشی زندگی اور طبقاتی کش مکش کو تیز کرتی ہوئی نئے نئے سانچوں میں ڈھلتی رہتی ہے۔ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی دریافتوں سے یہاں کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، ایک پوری نسل ان کے درمیان پروان چڑھی ہے۔ اس نسل کو جاگیرداری نظام اور اس کے معاشی تضاد ورثے میں ملے تھے۔ اس نسل کا عصر جدید کے تقاضوں سے دوچار ہونا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ وہ صنعتی دور میں داخل ہوئی اور آج اسی عہد کے تقاضوں کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور عوامی حکومت ان تضادات کو جلد از جلد دور کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ پاکستان ہی میں صورت حال نے یہ رخ اختیار کر رکھا ہے۔ بلکہ میری دانست میں تو یہ چیلنج ہندوستان کی نئی نسل کو بھی درپیش ہے۔ ان دونوں نسلوں میں جو واضح فرق ہے وہ صرف پس منظر کا ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت، جس سے آج کے نوجوان کا خمیر اٹھا ہے۔ ہندو تہذیب و ثقافت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہاں معاملہ ثقافت کے فروتر ہونے یا برتر ہونے کا اتنا نہیں جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ جداگانہ اور مختلف ہونے کا ہے۔ اس لیے یہ خدشہ کہ ہماری ثقافت ہندو ثقافت سے مات کھا جائے گی محض بے بنیاد ہے۔ اگر اس پر بھی یہ خدشہ آپ کے ذہنوں پر بدستور سوار ہے تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت ہونی چاہیئے

کہ ہمارے ارباب دانش نے اپنا فرض سرانجام دینے میں کوتاہی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی ثقافت، جداگانہ مسلم ثقافت کے صحیح خطوط سے عوام کو، اپنی نئی نسل کو آشنا نہیں کیا۔ واضح طور پر ان کے سامنے وہ مفہوم نہیں پیش کیا جس سے انہیں قومی انا کا' اپنے جداگانہ تشخص کا اور اپنے علیحدہ وجود کا شعور حاصل ہوتا۔ اگر اب بھی یہ شعور حاصل ہو جائے، ہم یہ جان لیں کہ ہماری قومی اجتماعیت کا راز کیا ہے،' اپنی تہذیبی روایات کی معرفت تک رسائی حاصل کر سکیں اور ثقافت کی اصل منزل ہماری نگاہوں میں آجائے۔ تو اس کے بعد میں کسی ایسے خطرے کو وقعت دینے کے لیے تیار نہیں جو باہر سے ہماری ثقافت پر یلغار کرتا ہوا نظر آئے۔ آپ یقین مانیں کہ وہ ثقافت جو آج پوری دنیا پر حکمران ہے۔ جس نے آج چار دانگ عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔ اسے خود اپنی جغرافیائی حدود میں پناہ نہیں مل سکتی جب تک وہ جداگانہ تربیت کے عرفان وشعور سے بہرہ ور نہ ہو۔ اس لیے سب سے پہلی اور آخری بات یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں، اپنی تاریخی اور مذہبی روایات کو زندہ رکھیں تاکہ ہمیں اپنی قومیت کا۔ صحیح ادراک حاصل ہو۔ بھارت کی طرف سے ثقافتی یلغار کا شور مچانے والے شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ابھی تک، ۱۹۴۷ء کے دور میں ہیں۔ اور جہاں تک بھارت کی تہذیبی یلغار کے نمایاں حربوں کا تعلق ہے وہ من وعن، ۱۹۴۷ء ہی کے حربے ہیں' جنگی مدد سے اپنے خیال کے مطابق وہ ہمیں ماضی کے تہذیبی طلسم میں نظر بند کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک یہ ایک خام خیالی ہے۔ کیونکہ آج ہم ۱۹۷۲ء کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔ زمانۂ آمریت کا ایک لمبا عرصہ گزار کر ہم نے عوامی جدوجہد کو کامیاب بنایا ہے۔ اور جمہوریت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں تہذیبی لین دین یعنی خیالات اور تکنیک سے استفادہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور یہ استفادہ بھی اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ کے دامن میں ادنیٰ کے لیے کچھ موجود ہو۔ اور جہاں تک بھارت کے ٹیلی ویژن کا تعلق ہے تو وہ ابھی تجرباتی دور ہی سے نہیں گزرا۔ ہم اس کا تاثر کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔ یہ تہذیبی یلغار نہیں۔ ایک للکار ہے کہ ہم اس پاکستان کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ جو ہمارا جغرافیہ ہے، ہماری تاریخ ہے۔ ہمارے

تہذیبی ورثے کا امین ہے۔ اور جس کے ماحول میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پاکستان کی اس نشان دہی کے لیے میرے نزدیک ہمارے اہل علم اور اہل قلم کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو جو بھی مدد ہم سے درکار ہوگی۔ جس تعاون کا بھی آپ ہم سے مطالبہ کریں گے۔ ہماری طرف سے اس میں دریغ نہیں کیا جائے گا۔ اور آپ ہر خدمت کے لیے ہمیں آمادہ پائیں گے۔

"العلم" کے راستے میں اس وقت جو مشکلات حائل ہیں۔ ان میں سے فوری طور پر جس مشکل کو میں حل کر سکتا ہوں۔ وہ نیوز پرنٹ کی مشکل ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ "العلم" کی طباعت کے لیے جتنا نیوز پرنٹ آپ کو درکار ہوگا۔ اس کے حصول میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ آپ کی دوسری مشکل جریدے کی ترسیل کے ضمن میں ڈاک خانے سے متعلق ہے۔ میں وزیر مواصلات نہیں کہ اس مشکل کا بھی کوئی فوری حل پیش کر سکوں۔ تاہم میں سید صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کا آئندہ پرچہ انشاءاللہ رجسٹری کے ذریعہ ہی بھیجا جا سکے گا۔ اور اس کی ترسیل کے لیے ان کو زیادہ اخراجات کا زیر بار نہیں ہونا پڑے گا۔ تیسری مشکل جس کا انہوں نے تذکرہ نہیں کیا غالباً سرکاری اشتہارات کی عدم فراہمی ہے۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ "العلم" کو سرکاری اشتہارات بھی ملتے رہیں۔

جہاں تک آپ کے ذمہ واجب الادا قرض کا تعلق ہے۔ اور حکومت سے کم گرانٹ ملنے کا معاملہ ہے تو میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ محکمہ اوقاف میں مرکزی حکومت کی دخل اندازی محض پالیسی بنانے کی حد تک ہے۔ بنیادی طور پر یہ صوبائی سبجیکٹ ہے کیونکہ مزارات، خانقاہیں، مساجد اور درسگاہیں صوبائی حدود میں واقع ہیں۔ ان کی آمدنی اور متعلقہ امور میں مرکزی حکومت کوئی دخل نہیں دیتی۔ البتہ پالیسی وضع کرنے کے معاملات میں ہم ان کی رہنمائی ضرور کرتے ہیں۔ تاہم میں صوبائی حکومت کے محکمہ اوقاف کو "العلم" کے لیے گرانٹ منظور کرنے کی خاطر کہنے کے لیے تیار ہوں۔ اور امید ہے کہ مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوگی۔

رہی سود کی ادائیگی تو میں چاہتا ہوں جتنی جلدی یہ طریقہ ختم ہو سکے بہتر ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کی خوشی کسی کو نہیں ہوگی۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا تعلق صرف آپ کی ذات سے ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ملکی مسئلہ ہے۔ اس ملک کے معاشی نظام کا مسئلہ ہے۔ جب تک کسی ملک میں ایسا نظام قائم ہے جس میں سود کا لین دین ہو تو وہاں کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے وہ معاشی نظام کبھی ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا۔ ہماری آخری اور بہترین کوشش یہی ہوگی کہ ہم اس ملک میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کریں جو سود کے بغیر ہو۔ سودی لین دین کے بغیر ہی یہ نظام چلایا جائے۔ اس طرح ملک کی معاشیات کا، ملک کی مالیات کا انحصار خود بخود ان بنیادوں پر ہو جائے گا جو عین اسلام کی بنیادیں اور اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہوں گی۔

آپ کے ذمہ جو سود کی رقم واجب الادا ہے تو اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ جب تک آپ کو پورا قرض ادا کرنے کے لیے رقم حاصل نہیں ہوتی۔ میں آپ کو سود ادا کرنے کی موازی رقم کہیں نہ کہیں سے جمع کر کے دلواتا رہوں گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک آپ کا قرض ادا نہیں ہو جاتا یہ چار ہزار روپیہ سالانہ سود کی ادائیگی کا انتظام کرنا میری ذمہ داری ہے۔

آخر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں آپ سے رخصت طلب ہوں۔

اقبال کا عالمگیر پیغام

"یہ تقریر ۲۴ سال پرانی ہے۔ ۱۹۶۱ء کے یوم اقبال پر میں نے اقبال کے عالمگیر پیغام پر گفتگو کی۔ صدارت جسٹس ایم۔ ایم۔ جان مرحوم کر رہے تھے آج اس کے مندرجات کو دیکھتا ہوں تو اس لحاظ سے خوشی ہوتی ہے کہ جو بات میں نے ۱۹۶۱ء میں کہی تھی اسی کی تبلیغ آج بھی کر رہا ہوں اور دعا ہے کہ مرتے دم تک اسی عقیدے پر قائم رہوں۔

آرزو دل میں یہ رکھتا ہوں خدا پوری کرے
جب مروں کوثر زباں پر ہو ثنائے مصطفٰےؐ

بعد میں ۱۹۷۳ء کے یوم اقبال پر اقبال اکیڈمی کراچی کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام سے خطاب کیا، وہ تقریر بھی پہلی تقریر میں سمو دی گئی ہے۔"

جناب سید عبدالواحد صاحب۔ مقررین کرام۔ خواتین و حضرات

میرا ارادہ تھا کہ میں آج اپنا لکھا ہوا مقالہ پیش کروں گا۔ لیکن رنگ محفل دیکھ چکا ہوں۔ اور ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اللہ کی مدد اتنی مل چکی ہے کہ اب آپ کو کسی مزید مقالے کی ضرورت نہ ہو گی۔

آپ کہیں گے کہ اللہ کی مدد اور مقالے کا کیا تعلق ہے۔ میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ جو ارشاد کیا گیا ہے کہ "ان اللہ مع الصابرین" اللہ تعالےٰ کی ذات صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو میں نے یہ دیکھا ہے کہ محفل میں مقالہ سننے سے بہتر اور کوئی طریقہ صبر پیدا کرنے کا نہیں ہے۔ اور یہ صفت آج آپ نے اپنے اندر اتنی پیدا کی ہے کہ اب تو مجھے یہ خطرہ ہے کہ اگر اب میں مزید آزماؤں تو کہیں جام صبر لبریز نہ ہو جائے۔

ویسے بھی جس موضوع پر میں نے مقالہ لکھا تھا۔ وہ آج کے زیر بحث نکات سے مختلف تھا۔ میں نے مناسب یہی جانا کہ جو باتیں آپ کے سامنے فاضل مقررین نے بیان کیں۔

کچھ اردو میں، کچھ انگریزی میں — ان کا کچھ ترجمہ کروں، ان کی کچھ تشریح کروں، کچھ ان پر تبصرہ کروں، کچھ جرح کروں، کچھ نقد کروں۔ اور اس طرح اپنے عہد سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں۔

خواتین و حضرات! جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے آپ کو معلوم ہے کہ ہماری زبان نے بہت سے مشاہیر کو جنم دیا ہے اور کئی شخصیتیں ایسی ہیں جو اپنی ندرت اسلوب اور اپنی جدت طرازی کی وجہ سے ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ میر کا رکا تھما لہجہ، غالب کی گہرائی اور گیرائی، مومن کا عشق باوقار، داغ کی زبان دانی اور حسرت، اصغر اور فانی کا رنگ تغزل یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اردو ادب میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بات سب مانیں گے کہ جو مقام ہمارے ادب میں اقبال کو حاصل ہوا۔ اور جو نشست اس ایوان میں ان کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آسکی۔ اس کا سبب کیا ہے؟ آپ اگر غور کریں گے تو اس بات میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اقبال نے مہارت فن کے ساتھ ان اقدار کو شعر کا پیراہن پہنایا جو ہوا، پانی اور روشنی کی طرح ازلی و ابدی ہیں۔ جن پر کبھی کہنگی و فرسودگی طاری نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ ان کا کلام اور خود ان کا مقام زندۂ جاوید ہے۔ مجھ سے پہلے میرے دوستوں نے اس فضا کی طرف اشارہ کیا جس میں اقبال نے آنکھیں کھولیں۔ اس دور کا ذکر کیا جس دور میں اقبال کی پیدائش ہوئی۔ یہ فضا اور یہ دور مغربی استبداد کا تھا۔ اس دور میں فضا پر فرنگی تہذیب بے طرح چھائی ہوئی تھی۔ اور ہر چہار طرف مغربی فکر سے مرعوبیت طاری تھی۔ اور لوگ صرف اسی چیز کو اہمیت دینے کے لیے تیار ہوتے تھے جو مغرب سے درآمد ہوتی تھی۔ درآمد شدہ تصورات کو اساس حیات سمجھا جاتا تھا۔ ذہنی انداز یہ تھا کہ بڑے بڑے اصحاب علم و فضل مغرب کی عینک سے زندگی کے مسائل کا مطالعہ کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ اور ان کی رائے یہ ہوتی تھی کہ "مستند وہ جو پانیئر میں چھپے"۔ ایسے میں جب اقبال نے آنکھیں کھولیں تو قدرتاً وہ بھی اس فضا سے متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے جو شعر اپنے ذہنی سفر کے اولین

مراحل میں اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کہے ہیں۔ ان میں اس ذہنی فضا کا اثر، اس کا پرتو ملتا ہے۔ اس دور میں وطنیت اور قومیت کے تنگ دلانہ فلسفے مغرب سے نکل کر مشرق کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ وہ اشعار جو میرے دوست یوسف خٹک نے تھوڑی دیر پہلے پیش کیے۔ جن میں اقبال نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا راگ الاپا اور سارے جہاں سے ہندوستان کی اس اچھائی کی دلیل یہ دی کہ "ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا" اسلیے کہ ہم اس میں رہتے ہیں۔ یہ ہمارا چمن ہے۔ ہمارا وطن ہے۔ اس لیے یہ سارے جہاں سے اچھا ہے۔ پھر ان کو خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آیا۔ گنگا کی ہر موج کوثر و تسنیم کو شرماتی ہوئی نظر آئی۔ اس ابتدائی دور میں اقبال مغربی خیالات سے متاثر تھے۔ اور ان کا متاثر ہونا فطری تھا۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو بدو شعور کی ہیں جو یوں کہنا چاہیئے کہ ان کے ذہنی طفولیت کے عہد کی ہیں۔ جب ان کا ذہن اور ان کی فکر ارتقا کی منزلوں میں تھی۔ اور نقش اوّل یہ تھا کہ انہوں نے وطن پرستی کے نظریے سے اثر قبول کیا تھا۔

جہاں تک وطنیت کے نظریے کا تعلق ہے اس سے یہ مراد ہر گز نہیں کہ کسی شخص کے دل میں حب وطن کا جذبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ حب وطن ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر شخص اس ہوا سے۔ اس فضا سے مانوس ہوتا ہے۔ جس میں وہ آنکھیں کھولتا ہے۔ جس میں اس کے آبا و اجداد کے نقوش قدم ہوتے ہیں۔ جس کے اندر اس کا بچپن گزرتا ہے۔ اس کی جوانی گزرتی ہے۔ ان گلیوں سے ان راہوں سے۔ ان بستیوں سے ہر شخص کو فطری طور پر پیار ہوتا ہے۔ انس ہوتا ہے، محبت ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی مخالفت کی گئی۔ اسکی ممانعت نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس کی ممانعت کی جائے تو یہ امر خلاف فطرت ہو گا۔

وطنیت کا وہ نظریہ جو اس زمانے میں فروغ پا رہا تھا۔ وہ محض حب وطن پر مبنی نہ تھا۔ وہ جذبہ یہ تھا کہ ایک قوم محض اس لیے گردن زدنی ہے کہ اس نے اور اس کے افراد نے اس مرز بوم خاص میں۔ اس ولایت خاص میں آنکھیں نہیں کھولیں۔ جس میں کسی دوسری

قوم نے آنکھیں کھولی ہیں۔ اس لیے اسے جینے کا حق نہیں ہے۔ اور دریا، سمندر، میدان، پہاڑ جو قدرتی تقسیمیں محض شعوب وقبائل کے لیے، محض سفر کے لیے تھیں ان کو حقیقی تقسیم اور فطری تقسیم بلکہ ذہنی تقسیم بنا دیا گیا تھا۔ انسانوں کو ان دیواروں کی وجہ سے بانٹ دیا گیا تھا۔ علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

لوگ تعصب کرتے ہیں (اور مجھے خود ان کے تعصب پر تعجب ہوتا ہے) وہ کہتے ہیں کہ اقبال ایسا صاحب بصیرت وطنیت کے اس تصور پر فریفتہ کیونکر ہو گیا۔ اس کے کلام میں شروع شروع میں اس طرح کے اجزا رکیوں ملتے ہیں۔ مگر ان معترضین کو یہ معلوم نہیں کہ ازل سے حصول منزل کا رستہ یہاں چلا آیا ہے کہ جو شخص منزل کی تلاش میں نکلے وہ ٹھوکریں کھائے۔ اور جب وہ ٹھوکریں کھائے تو اسے منزل سے ہمکنار کر دیا جائے۔ خوب کہا جس نے کہا۔

کس کو معلوم کہ ہم حسن شناسان ازل　　　کتنے اوہام سے گزرے تو یقیں تک پہنچے

تاہم اقبال کا یہ تاثر زیادہ دیر قائم نہیں رہا۔ یہ دور بہت وقتی اور عارضی دور تھا۔ اور یہ دور اس وقت ختم ہو گیا۔ اس کا سحر ٹوٹ گیا۔ طلسم پاش پاش ہو گیا۔ جب انہوں نے یورپ کو قریب سے دیکھا۔ اسے ہر پہلو سے جانچا، پرکھا، دیکھا۔ اس کی خوبیاں بھی دیکھیں اور خرابیاں بھی دیکھیں۔ اور جب انھیں یورپ کی اس تہذیب کا بنظر غائر مطالعہ کرنیکا موقع ملا جو بظاہر بہت خوبصورت نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی مثال یوں ہے۔ جیسے ایک قبر ہو۔ جس کے اوپر تو سفیدی ہو۔ لیکن اس کے اندر مردہ سڑ رہا ہو۔ جب اقبال نے یورپ کو دیکھا کہ انسان کس طرح بھیڑیا بن گیا ہے۔ اسکے پنجوں سے انسانوں ہی کا خون ٹپک رہا ہے۔ ہوس نے کسطرح انسانوں کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ انسانی آزادی تک کو سلب کیے لے۔ کس طرح ایک قوم کو ایسے غلامی کے طوق پہنا دیئے جاتے ہیں کہ وہ نسلی اور نسبی تعلق اس قوم سے نہیں رکھتی۔ تو پھر انھوں نے ردِ عمل کا اظہار شروع کیا۔ اور یہاں سے ان کی شاعری کے دوسرے دور کی ابتداء ہوئی۔

اقبال کے وہ اشعار آپ کے سامنے ہوں گے جن میں انہوں نے کہا

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال نے یورپ کے فلسفے اور اس کی فکر پر تنقید کی۔ لیکن یہ تنقید اس آدمی کی نہ تھی جس نے محض ساحل سے سمندر کا نظارہ کیا تھا۔ بلکہ یہ تنقید اس شخص کی تھی جو اس سمندر میں کود پڑا تھا۔ اس کی موجوں سے لڑا تھا۔ اس میں اس کا دامن تر ہوا تھا۔ وہ اس کی پہنائیوں کو جانتا تھا۔ وہ اس کے موتیوں کی حقیقت سے بھی آگاہ تھا۔ اور اس کے خزف ریزوں سے بھی واقف تھا۔ یہ اس شخص کا نقد و تبصرہ تھا۔ اس کی تنقید تھی جس نے تہذیب مغرب کو پوری طرح پرکھا تھا۔ اور پھر جب انہوں نے یہاں سے مشرق کا جائزہ لینے کے لیے اس پر نگاہ ڈالی۔ اور انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ عالم اسلام جو انسانوں کے اتحاد کا مشعل بردار تھا۔ اور جس کا فرض منصبی یہ تھا کہ وہ بنی نوع انسان کو راستہ دکھلائے۔ وہ خود بھٹک رہا ہے۔ اور جس کے پاس چشمۂ حیوان ہے۔ وہ خود سراب کی تلاش میں ہے۔ اور جس کی آستینوں میں سورج چھپا ہوا ہے۔ وہ دوسروں کے ٹمٹاتے ہوئے دیوں سے روشنی کا طالب بنا ہوا ہے۔ تو یہاں انہوں نے مشرق کو آواز دی۔ عالم اسلام کو پکارا۔ اور اس کے باہمی اتحاد پر زور دیا۔

وہ بہت سے اشعار آپ کو یاد ہوں گے جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اور

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحر بے کراں کے لیے

اور عبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اور بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دین ہے تو مصطفوی ہے

اقبال نے بتایا کہ عالم اسلام ایک ملت واحدہ ہے۔ اور ہند، روم و شام کی بجائے اس کا وطن خود "اسلام" ہے۔

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او را بجز اسلام نیست

اقبال نے یہ دیکھا تو اس کے غم و الم کی انتہا نہ رہی کہ ہم جو عالمگیر قدروں کے حامل تھے خود رنگ و نسل کے تفرقوں کے شکار ہو گئے۔ اس نے سلمان فارسی کا واقعہ یاد دلایا کہ جب ان سے کسی نے ان کے نسل و نسب کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ میں "سلمان ابن اسلام" اقبال کے نزدیک یہ جواب اکیلے سلمان کا جواب نہیں تھا۔ اس کے پیچھے در اصل اسلامی تہذیب بول رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔

فارغ از اب وام و اعمام باش
ہم چو سلماں زادہ اسلام باش

اقبال نے بتایا کہ ہماری ملت کی اساس رنگ و نسل پر نہیں ہمارے دل میں مضمر ہے۔

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است
ملت ما را اساس دیگر است
ایں اساس اندر دل ما مضمر است
مدعائے ما مآل ما یکیست

ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یکدل و یکجان شدیم

اقبال نے بتایا کہ کس طرح انسانیت آج بھی بت پرستی اور بت گری میں مشغول ہے۔ اور کس طرح نسل آدم کو ان بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے موت کے بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ انہوں نے دعوت دی کہ وحدت اللہ اور وحدت آدم کے فلسفہ جان بخش سے سرشار ہو کر اٹھو اور ان بتوں کو چکنا چور کر دو۔

اے کہ می داری کتابش در بغل
تیز تر نہ پا بہ میدان عمل،
فکر انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے
کاید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند،
پیش ہائے ایں بت نا ارجمند
اے کہ خور دستی ز مینائے خلیل
گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیل
بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ہو بزن

یہ سارے اشعار اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب اقبال نے وحدت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے یہ پیغام دیا۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا پیغام محدود تھا۔ اور اقبال صرف مسلمانوں کا شاعر تھا۔ اقبال نے انسان کو انسان کی نگاہ

سے نہیں دیکھا بلکہ عقیدے کی عینک لگا کر دیکھا۔ اس کے سامنے انسانوں کی وحدت نہ تھی۔ انسانوں کی بہبود نہ تھی۔ بلکہ صرف مسلمانوں کی بہبود تھی۔ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی اور سطح بینی پر مبنی ہے۔ اگر آپ بنظر غائر اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں۔ تو آپ کو نظر آئیگا کہ اقبال نے وحدت آدم پر بھی زور دیا ہے۔ اور میں یہ نہیں مان سکتا کہ جو شخص وحدت اللہ کو مانتا ہو۔ وہ وحدت آدم سے منکر ہو جائے۔ جو شخص توحید پر ایمان رکھتا ہو۔ وہ ساری انسانیت کو ایک آنکھ سے نہ دیکھے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک خدا کو ماننے والا انسان کو ایک جیسا ماننے سے انکار کر دے۔ اقبال نے اپنے کلام میں جگہ جگہ عظمت آدم کے ترانے گائے ہیں۔ اور عظمت آدم کی نوید سنائی ہے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

مگر اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ عظمت آدم کی بات تھی۔ اور اگر اقبال نے وحدت اسلامی کو بنیاد بنایا ہے تو اس لیے کہ وحدت آدم کی منزل سر کر سکے تاکہ وہ اپنے اس نصب العین کو حاصل کر سکے۔

آپ کو اقبال کی شاعری میں تین دائرے نظر آئیں گے۔ اس مختصر دور کو چھوڑ کر جو محدود وطنیت کا دور تھا۔ پہلا دائرہ وحدت قومی کا ہے۔ اس کی شاعری کا دوسرا دائرہ وحدت اسلامی ہے۔ اور وحدت انسانی اس کی شاعری کا تیسرا اور آخری دائرہ ہے۔ ان تینوں دائروں کو ایک دوسروں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص وحدت اسلامی کی منزل پر پہنچے بغیر وحدت آدم کے دائرے میں داخل ہو۔

وحدت آدم ایک بہت دل خوش کن خیال اور ایک نہایت بلند تصور ہے۔ اور کائنات کی حکومت پوری دنیا کی حکومت اور ایک حکومت اس کے تصورات آج کے بعض مفکرین نے بھی پیش کیے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ نصب العین کچھ اصولوں کی مدد سے حاصل ہو سکتا

ہے۔ یہ نصب العین کسی نظریے کی بنیاد پر حاصل ہو گا۔ کسی فکر کی بنیاد پر حاصل ہو گا۔ اور وہ نظریہ صرف وہی نظریہ ہو سکتا ہے جس میں رنگ کا سوال نہ ہو۔ جس میں نسل کا سوال نہ ہو۔ جس میں نسب کا سوال نہ ہو۔ جس میں طبقات کا سوال نہ ہو۔ جس کے اندر کسی ایک دور کا سوال نہ ہو۔ ایسی فکر جو ازلی و ابدی ہو۔ ایسی فکر جو بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔ جو ایسا فریم ورک دے جو قیامت تک ساری دنیا کو پیش آنے والی ارتقائی منزلوں میں ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کوئی کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ جب اقبال نے اسلام کا پیغام دیا تو اس نے اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ اور وہ زمانے کے ارتقاء کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس لیے کہ زندگی ایک ندی کی مانند رواں دواں ہے۔ جامد نہیں ہے۔ یہ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تاریخ کا سفر جاری ہے۔ ارتقاء کا سفر جاری ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ارتقاء کسی چیز میں ہے۔ ارتقا زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور مطالبوں میں ہے۔ یا ارتقا ذرائع و وسائل میں ہے۔ میں اس کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ بھوک انسانی زندگی کا بنیادی تقاضہ ہے اور اس کی ضرورت ہے۔ مگر کھانوں کا تنوع ان کی ورائٹی، ان کے اندر خوش رنگی، دل آویزی لذت۔ کشش یہ وسائل کی بات ہے۔ جہاں تک بھوک لگنے کا سوال ہے۔ اس میں کوئی ارتقا نہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورت وہی ہے جو پہلے انسان کی تھی اور وہی آج بھی ہے۔ ارتقاء ان ذرائع وسائل میں ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ جہاں تک ادبی صداقتوں کا تعلق ہے وہ اٹل ہیں۔ وہ غیر متبدل ہیں۔ تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ وہ تبدیل نہیں ہونا چاہئیں۔ وہ کل کے انسان کی ضرورت کو بھی پورا کرتی تھیں، وہ آج کے انسان کی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہیں۔ وہ بین الاقوامی سچائیاں ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ جس طرح ہوا، روشنی اور پانی میں قدامت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

جدید و قدیم کا یہاں کوئی سوال نہیں ہے۔ اقبال نے جو پیغام دیا ہے وہ یقیناً ارتقار بدوش ہے۔ ارتقار بآغوش ہے۔ اور یہ وہ قدریں ہیں جو انسانی ضروریات کا واحد تشفی بخش جواب ہیں۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اگر آپ خود ان قدروں پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ بنیادی ہیں۔ یہ اٹل ہیں۔ ان میں ارتقار کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کائنات کے تمام ارتقائی مراحل پر محیط ہونے کی اہلیت وصلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ ایسا ایک فریم ورک دیتی ہیں۔ جس میں انسان زمانے کے ارتقار کا ساتھ دے سکے۔ بلکہ زمانے کے سفر کو آگے بڑھا سکے۔ تو اگر اقبال نے وحدت اسلامی کا پیغام دیا تو یہ مقدمہ تھا۔ یہ زمزمۂ اولیں تھا اس بہار کا جسے وحدت آدم کہتے ہیں۔ اور اقبال نے جب مکے کی خاک سے یہ پیغام دیا کہ

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

تو اصل میں وہ وہاں اس امتیاز کو واضح کر رہا تھا کہ جب تک جمعیت آدم کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ جمعیت اقوام سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اور یہ مسئلہ جنیوا سے حل نہیں ہوسکتا بلکہ مکے کی خاک سے ہوگا۔

حضرات گرامی! یہ ہیں وہ تین مرحلے جو اقبال کی شاعری میں آپ کو نظر آئیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس مرحلے میں ہیں۔ آج پاکستان کے مسلمان اقبال کے ہم وطن۔ اقبال کے مخاطب اول یہ کس مرحلے میں کھڑے ہیں۔ پہلے مرحلے میں ہیں۔ دوسرے مرحلے میں یا تیسرے مرحلے میں ہیں۔

ہمیں احتساب کرنا چاہیئے۔ ہمیں جائزہ لینا چاہیے۔ ایک طریقہ وہی ہے مایوسی کا، قنوطیت کا۔ اور سوئپنگ ریمارکس پاس کرنے کا، سب کو برا کہنے کا۔ سب کو لتاڑنے کا، غلط دیکھنے کا، غلط دکھانے کا یہ طریقہ بہت آسان ہے۔ لیکن اقبال اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ:۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویران سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی،

اور یہ حقیقت ہے۔ تاریخ نے اسے ثابت کر دیا ہے۔ جن جان گسل حالات سے گزر کر یہ مضمحل قوم آئی ہے۔ وہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ قوم ایک زندہ قوم ہے۔ اس قوم کے افراد میں تمام تر تکلیفوں، مشکلوں، آزمائشوں اور امتحانوں کے باوجود تب و تاب زندگی ہے۔ یہ قوم شاہراہ تاریخ پر ابھی تک قدم آگے بڑھا رہی ہے۔ باوجود اس کے ہزار مزاحمتوں کا سامنا ہے۔ لیکن کوئی شے ہے جو اس کو یہ سفر جاری رکھنے پر مجبور کر رہی ہے اور جس نے اس کو زندہ رکھا ہے تو جہاں تک اس قوم کا تعلق ہے۔ اس کے بنیادی مزاج کا تعلق ہے وہ یاس کا مزاج نہیں۔ وہ قنوطیت کا مزاج نہیں۔ وہ مزاج امید کا ہے۔ وہ مزاج توقع کا ہے۔ وہ مزاج فصل بہار کی آمد آمد کا ہے۔ وہ مزاج اچھے مستقبل کی نوید دینے کا ہے۔ وہ مزاج خزاں کا نہیں بہار کا ہے۔

میں مطمئن ہوں اگرچہ خراب ہے ماحول
خزاں کے بعد کا موسم بہار ہوتا ہے

یہ اس قوم کا مزاج ہے یہ اس قوم کی نفسیات ہے۔ جہاں تک وحدت قومی کا تعلق ہے ان سارے پچھلے واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ہماری تاریخ کا عظیم ترین المیہ ہیں میں یہ کہتا ہوں کہ آج ہم اس وقت جس مقام پر کھڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد آج تک اس سے زیادہ پر امید مقام اور کوئی نہیں آیا۔ میں یہ بات ماضی قریب کے واقعات کو نظر انداز کر کے کہہ رہا ہوں۔ جہاں تک وحدت قومی کا تعلق ہے۔ پاکستان آج ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ پاکستان آج ایک نظریاتی وحدت ہے۔ اس سے بحث نہیں۔ اس کی خواہش نہیں۔ اس پہ نقد و جرح نہیں کہ انتظامی وحدت کیوں نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک جغرافیائی وحدت بھی ہے۔ اور یہ ایک نظریاتی وحدت بھی ہے۔ اب وہ فاصلے نہیں ہیں۔ نہ رسل و رسائل

کے مسائل کہ یہاں کے عوام اپنے ملک کے دوسرے حصے میں کیسے پہنچیں۔ اب وہ سوال نہیں رہا۔ کہ وہاں تک وہ پہنچے جو ذرائع و وسائل رکھتا ہو۔ اور اپنے پاس اثاثہ و سرمایہ رکھتا ہو۔ اب یہاں زبان کا بھی کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔ اب یہاں نظریہ بھی ایک ہے۔ نظریہ پہلے بھی ایک تھا۔ لیکن اب ایسی صورت ہے کہ آپ اپنے ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنے میں کسی طرح کی مزاجی اجنبیت یا لسانی دقت محسوس نہیں کرتے۔ اب آپ ان چاروں علاقوں پر نظر دوڑائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک علاقے والوں کی شادیاں دوسرے علاقے میں ہوتی ہیں۔ اور دوسرے کی تیسرے علاقے میں ہیں۔ اس طرح سماجی رشتوں کے لحاظ سے بھی یہ علاقے باہمی طور پر مضبوط ہیں۔ میں ان لوگوں سے جو سیاسی اختلافات رکھتے ہیں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیں۔ باادب کہوں گا کہ اب اگر آپ دیکھیں تو یہ پہلا موقع ہے کہ ایسی حکومت برسراقتدار آئی ہے۔ جو چاروں صوبوں میں یکساں فالوئنگ رکھتی ہے۔ ایک ایسا لیڈر ملک میں موجود ہے جو چاروں صوبوں میں اپنی فالوئنگ رکھتا ہے۔ یہ وحدت قومی کا مرحلۂ اولیٰ ہے۔ اور اس کے بعد ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم دوسرے مرحلے میں بھی داخل ہو چکے ہیں۔ جہاں تک وحدت اسلامی کا تعلق ہے۔ اقبال نے ایک زمانے میں کہا تھا کہ :۔

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

میں کہتا ہوں کہ اگر اقبال اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ہوتا تو شاید کہتا کہ :۔

لاہور ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

اور نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر کو متحد کرنے کی جو آرزو اقبال کی تھی وہ آرزو جو وادی نیل و فرات سب پر محیط تھی۔ اس آرزو کو اگر پہلی دفعہ عملی جامہ پہنایا گیا

تو یہ حقیقت ہے کہ پچیس سال میں پہلی مرتبہ اس اسلامی سربراہی کانفرنس کی صورت میں جو حال میں ہوئی. اس طرح وحدت اسلامی کی ایک ایسی بنیاد فراہم ہوئی ہے جو آگے چل کر بہت اہم نتائج کا پیش خیمہ بنے گی. اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اسوقت تاریخ کے ایک پر امید مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں. تاریخ کے ایک اہم موڑ پر ہیں. ایسے موڑ پر جبکہ دنیا دوسرے نظاموں سے مایوس ہو چکی ہے. غیر مطمئن ہو چکی ہے. جبکہ ہر چہار طرف سے بے اطمینانی ہے. ہر چہار طرف سے بے سکونی ہے. دولت کی ریل پیل ہے. لیکن انسان کے دل کا سکون عنقا ہے. ایک ایسا مرحلہ دنیا میں ہر چہار طرف دکھائی دے رہا ہے. انسانیت ایک ایسی منزل پر ہے کہ وہ نسخہ شفا تلاش کر رہی ہے. ہر جگہ لوگوں نے اپنے اپنے سسٹمز کو آزما لیا ہے. لیکن ان میں اتنی کتربیونت کی ہے. اتنی تراش خراش کی ہے. اتنا اسے مسخ کیا ہے. اتنا اس کا حلیہ بگاڑا ہے. اتنی اس میں تبدیلیاں کی ہیں کہ اگر آج وہ لوگ قبروں سے اٹھ آئیں جنہوں نے یہ فلسفے پیش کیے تھے. یہ نظریے دیئے تھے تو وہ اپنے فلسفوں اور نظریوں کو پہچاننے کی ہمت نہ کر سکیں گے. یہ عالم ہے جبکہ آج ہم وحدت قومی کی منزل سے ہوتے ہوئے وحدت اسلامی کی طرف بڑھ رہے ہیں.

میں یقین رکھتا ہوں کہ انشاء اللہ وہ وقت جلد آئے گا جب وحدت اسلامی کے نتیجے میں ہم وحدت انسانی کا منظر بھی دیکھیں گے اور ہم جس طرح وحدت اللہ پر ایمان رکھتے ہیں. اسی طرح وحدت آدم کا نظریہ بھی اس کائنات میں متحقق ہو گا. اور اقبال کی وہ آرزو پوری ہو گی جو اس کی شاعری میں کروٹیں لے رہی ہے. لیکن اس کے لیے میں آخر میں یہ گزارش کروں گا. ملک کے دانشوروں سے بھی، ادیبوں سے بھی صحافیوں سے بھی، اہل فکر سے بھی، حکمرانوں سے بھی منتخب نمائندوں سے بھی، سماجی کارکنوں سے بھی. اور ہر فرد قوم سے بھی کہ اس منزل تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے. اس منزل تک پہنچنا محض جذباتی نعروں کے بل بوتے پر ممکن نہیں ہے. اس کے لیے پتے مارنا ہو گا. اس کے لیے محنت کی عادت ڈالنا ہو گی. اس کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا ہو گا. اس کے لیے بے شمار مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑے گا.

اقبال نے کہا تھا۔

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

لیکن اس میں دو چار نہیں بلکہ بہت سے مشکل مقام آئیں گے۔ جذباتیت مسئلے کا حل نہیں ہے۔ محض نعروں سے فضا تبدیل نہیں ہو سکتی۔ محض تخریب سے تعمیر ناممکن ہے محض آرزوؤں سے تقدیریں نہیں بدلتیں۔ اس کے لیے ہر شخص کو اپنا فرض خود ادا کرنا ہو گا۔ اپنا فرض دوسرے کے کھاتے میں ڈالنے کی عادت ترک کرنا ہو گی۔

اس کے لیے سب سے پہلے نظام تعلیم کو بدلنا ہو گا۔ میں یہ کریڈٹ اپنی حکومت کو نہیں دیتا۔ اور شاید میری حکومت یہ کریڈٹ لینے کے لیے تیار بھی نہیں ہے کہ نظام تعلیم تبدیل ہو گیا ہے۔ نظام تعلیم تبدیل کرنے کے لیے بجید غور و خوض کی ضرورت ہے۔ اور نظام تعلیم کو بالکل نئے انداز میں بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہ نظام تعلیم جو رائج ہے یہ ناقص ہے۔ عہد غلامی کی یادگار ہے۔ یہ ہماری ضرورتوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس نے مسٹر اور ملا کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اس نظام تعلیم نے ہماری ملت کو دو طبقوں میں بانٹ دیا ہے۔ جدید و قدیم کی تقسیم پیدا کر دی ہے۔ اس نے مسٹروں اور ملاؤں کی کھیپ بنا دی ہے۔ اس نے کالجوں سے وہ نوجوان پیدا کیے ہیں۔ جن کی ایک آنکھ یعنی دنیا کی آنکھ روشن ہے۔ دین کی آنکھ روشن نہیں۔ اس نے مذہبی مدرسوں سے فاضلوں کی وہ کھیپ پیدا کی ہے۔ جن کی مذہب کی آنکھ روشن ہے۔ مگر دنیا کی روشن نہیں۔ یہ ایک "انکھا" نظام تعلیم ہے۔ "یک چشمہ" نظام تعلیم ہے۔ اس نظام کو بدلنا پڑے گا۔ اسے ختم کرنا پڑے گا۔ تب جا کر ہمارے ملک کے مسئلے حل ہوں گے۔

اور دوسرے مرحلے میں ہمیں پوری طرح یکسوئی کے ساتھ اس فکر کو اپنے سینے سے لگانا ہو گا۔ جو اقبال کی فکر تھی۔ قائد اعظم کی فکر تھی۔ محمد مصطفٰے کی فکر ہے۔ جو قرآن کی فکر ہے۔ جو اسلام کی فکر ہے۔ جس پہ یہ ملک قائم ہے۔ یہ نزاع ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا چاہیئے۔

اور جن لوگوں کے دماغ میں یہ خیال ہو۔ وہ کہیں بھی ہوں، کسی جگہ بھی ہوں۔ کسی پناہ گاہ میں بھی ہوں۔ ان کو یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیئے کہ فکر اقبال کے سوا، فکر قائد اعظم کے سوا، فکر اسلام کے سوا، فکر محمدی کے سوا۔ کوئی اور فکر اس ملک میں قائم ہو سکتی ہے اور پرورش پا سکتی ہے۔ اور یہاں نافذ ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے سب کو چوکنا رہنا ہو گا۔ اس کے لیے محتسب بننا ہو گا۔ اس کے لیے اپنے دل میں جذبہ پیدا کرنا ہو گا۔ اور یہ نزاع کسی کو پیدا کرنے کی اجازت نہیں دینا ہو گی۔ کہ کوئی یہ کہے کہ یہاں اس فکر کے علاوہ کوئی دوسری فکر چل سکتی ہے۔

ہمیں اچھائیاں کسی جگہ سے بھی لینے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ ہمیں اچھی باتیں کسی جگہ سے درآمد کرنے میں تامل نہیں ہے۔ ہم وسیع القلب لوگ ہیں۔ ہمارا سینہ ہم مسلمانوں کا سینہ بادشاہی مسجد کے صحن کی طرح فراخ ہے۔ ہم مسلمانوں میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ ہم علم کو شرقی اور غربی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے۔ ہم اس کو محض علم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور علم جہاں سے بھی ہو گا ہم حاصل کریں گے۔ ہم لفظی جنگ میں نہیں الجھیں گے۔ اور اگر کوئی ہمیں الجھانا چاہے تو ہم الجھنے سے انکار کر دیں گے۔ ہم اس فکر کو، ہر اس نظریے کو، ہر اس فلسفے کو، ہر اس تعلیم کو جو ہم یہاں رائج کرنا چاہیں گے۔ اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ اگر معیار پر کوئی چیز کھری اترتی ہے تو وہ ہماری ہے۔ اور اگر اس پر کھری نہیں اترتی تو ہم اسے ٹھکرا دیں گے۔ اب خواہ اسے کوئی اسلامی سوشلزم کہے، خواہ مساوات محمدیؐ کہے۔ خواہ کوئی خلافت راشدہ کا نظام کہے۔ کہنے والے ہزار باتیں کہیں، اپنی اپنی اصطلاحیں لائیں۔ لیکن بنیاد یہی ہو گی، کسوٹی، یہی ہو گی، ترازو یہی ہو گا۔ جو اس ترازو میں پورا اترے گا وہ ہمارا جو اس میں پورا نہیں اتریگا وہ ہمارا نہیں۔ یہ بات بھی ہماری قوم کو ایک مرتبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے کر لینا ہو گی۔ اس کی پرواہ نہیں کہ کچھ لوگ ہر دور میں مخالف بھونکتے ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ آوازیں ہمیشہ اختلاف کی پیدا ہوتی ہیں۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ لیکن جہاں تک فکری اتحاد کا سوال ہے۔ مجھے امید ہے

کہ قوم اپنے اندر کوئی رخنہ نہیں پڑنے دے گی۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ ہمیں وحدت آدم اور وحدت انسانی کی طرف بڑھنے سے پہلے خود پاکستان کو ایک ماڈرن اسلامی ریاست بنانا ہوگا۔ اب تک نعرے بازی بہت ہو چکی۔ اسلام اسلام بہت پکارا جا چکا۔ اس کی بہت دہائی دی گئی، بہت ایکسپلائٹ کیا گیا۔ لیکن وہی بات صادق آتی ہے جو اسد ملتانی مرحوم نے کہی تھی کہ:۔

نام خدا ہماری زبانوں پر چڑھ گیا
اتنا کہ اس کی یاد دلوں سے اتر گئی

ہم نے خدا خدا زبان سے بہت کہا۔ مگر روشنی سے دلوں کو منور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ہمیں اب یہ عملاً کرنا ہوگا۔ اسلامک آئیڈیالوجیکل کونسل بن چکی ہے۔ میرے سامنے میرے وہ دوست بیٹھے ہیں جو اس میں شریک ہیں۔ اور اسلامی آئیڈیالوجیکل کونسل کو اب قوم کی خواہش کے مطابق وہ نظام ترتیب دینا چاہیئے جس کے اصول، جس کے خطوط ہمیں اسلام نے عطا کیے ہیں۔ اور میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ خطوط اگر اس دور میں کہیں سے مل سکتے ہیں تو وہ فکر اقبال سے مل سکتے ہیں۔ جن کے اندر اقبال نے ماڈرن تھاٹ (جدید طرز فکر) کو سامنے رکھ کر اسلام کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اور حرکت و ثبات کا ایک ایسا متوازن نظام دیا ہے۔ جس کی روشنی میں ہم اپنے اصولوں سے وابستہ رہتے ہوئے زمانے کے ارتقاء کا ساتھ دینے کی صلاحیتوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔ اگر پاکستان کو ماڈرن اسلامی ریاست بنانے کے لیے ہم نے اس فکر اقبال کو اپنے سامنے رکھا تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں کامیابی ہی ہوگی۔

اب اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل ہمارے علماء کو بھی اور ان جدید قوانین سے بہرہ ور قانون دانوں کو بھی اس نکتہ اتصال پر آنا ہوگا۔ اور اس کی بات ماننی ہوگی جس نے جدید علوم سے بھی سیرابی حاصل کی۔ اور جس کا سینہ نور الہام سے بھی مستنیر ہے۔ اور قرآن کے

علوم سے بھی مستنیر ہے۔ ہمیں اس کی فکر کو اساس بنا کر پاکستان کو عملاً جدید اسلامی ریاست کی صورت دینا ہوگی۔ اگر ہم نے اپنے سامنے یہ تین مرحلے رکھ کر غور و فکر سے تلاش و تفحص سے ہمت و جرأت سے کام لیا، احتیاط اور احتساب سے کام لیا تو مجھے یقین ہے کہ ہم آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف بڑھیں گے جو وحدت اسلامی کی منزل ہے۔ وحدت آدم کی منزل ہے۔ وحدت انسانی کی منزل ہے۔ اور جب ہم اس دن یوم اقبال منائیں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ حقیقی یوم اقبال ہوگا۔

حاضرین کرام! میں آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ باتیں تم کہہ تو رہے ہو، تم کر دو، تم حکومت میں ہو۔ لیکن آپ کی طرف سے یہ بات کہنا آسان ہے۔ مگر آپ اس کے سارے پہلوؤں کو نگاہ میں رکھیں۔ میرے لیے یہی فخر بہت ہے کہ میں منزل کا حدی خواں ہوں جو وحدت اسلامی اور وحدت انسانی کی منزل ہے۔ میرے لیے یہی سعادت بہت بڑی ہے کہ میں اس گم گشتہ کارواں کی گرد راہ کو چومتا اور آنکھوں سے لگاتا ہوں جو ہمیشہ سے انسانیت کے لیے سرمۂ چشم بصیرت بنی رہی ہے۔ اور اگر کوئی منزل تک پہنچا نہیں سکتا۔ اور صرف منزل کا پتہ بتاتا ہے تو وہ بھی ادائے فرض ضرور کرتا ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک میرے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کا تعلق ہے، جہاں تک اس کے ساتھیوں کا تعلق ہے۔ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ ہم پاکستان کو وحدت قومی کے مرحلے سے آگے بڑھا کر وحدت اسلامی کی منزل تک لے جائیں گے۔ اور انشاءاللہ وحدت اسلامی کے بعد اسے وحدت انسانی کی طرف لے جانے کے لیے ہم اپنے جسم و روح کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ درست ہے کہ مشکلیں اور زحمتیں درپیش ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آج وہ باتیں پوری طرح آپ کے سامنے نہیں ہیں جو ہونا چاہیئے تھیں۔ آپ کی بہت سی توقعات ابھی تک پوری نہیں ہو سکیں۔ آپ روزے رکھتے ہیں۔

ابھی تک ان کے مطابق بہت سے گوشوں میں اندھیرے ہیں. لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں. میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا. میں اس دور کو امید کا دور سمجھتا ہوں. اور اپنے دو شعر آپ کی نذر کرتا ہوں. میرا پیغام یہی ہے. اور غالباً یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ رجائیت جو فکر اقبال کا امتیاز ہے. اس کی روشنی میں یہ پیغام اقبال کا بھی ہے کہ :۔

ابھی حیات کو تاریکیوں نے گھیرا ہے
جدھر بھی آنکھ اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

اور

شب سیاہ سے اہل سفر نہ گھبرائیں
شب سیاہ کی آغوش میں سویرا ہے

آزادیٔ صحافت

"یہ جولائی ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ اپوزیشن پارٹیوں نے اعلان کیا کہ وہ یکم اگست ۱۹۷۲ء کو یومِ آزادیٔ صحافت منائیں گے۔ ادھر صدر ذوالفقار علی بھٹو نے بھی پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس خیال کی تائید کی اور پارٹی کی طرف سے بھی انھوں نے یہ دن منانے کی ہدایات جاری کر دیں۔ اس طرح اپوزیشن جو سیاسی مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی بھٹو صاحب نے اسے بہت حسن و خوبی کے ساتھ ناکام بنا دیا میں نے اس موقع پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا، مگر یہ خطاب ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اصولوں سے ہٹ کر تحریری مسودے کی بجائے بالکل برجستہ اور فی البدیہہ تھا۔ اتفاق سے ٹیلی ویژن والوں نے ریکارڈنگ کے بعد جب اسے آزمائشی تجربے کے طور پر ٹیلی کاسٹ کیا تو اس میں فنی نقطۂ نظر سے کئی تصویری خامیاں تھیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں دوبارہ یہ تقریر ٹیلی کاسٹ کراؤں (جس کا کوئی مسودہ میرے پاس نہ تھا) یہ بات کتنی مشکل تھی اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں کبھی ایک تحریر کے گم ہو جانے کی صورت میں اسے دوسری مرتبہ تخلیق کرنا پڑا ہو۔"

آج آزادیٔ صحافت کا دن منایا گیا مگر آزادیٔ صحافت کا حقیقی دن وہ تھا جس دن اس ملک میں آمریت کی زنجیریں ٹوٹی تھیں جس دن برسوں کے انتظار کے بعد عوام کے ووٹوں سے منتخب شدہ ایک حکومت برسرِ اقتدار آئی تھی۔ لیکن دیر آید درست آید، کچھ عرصہ کے بعد ہی سہی۔ چلیے ہمارے دوستوں کو یہ تو یاد آیا کہ صحافت کی آزادی کا دن منانا چاہیے۔ اور جب اس عوامی حکومت کے ایک جونیئر پارٹنر نے جو دو صوبوں کی ایک مخلوط جماعت کا سربراہ ہے۔ جب یہ تجویز پیش کی کہ آزادیٔ صحافت کا دن منایا جائے تو صدر ذوالفقار علی بھٹو نے فی الفور اس تجویز کو قبول کر لیا۔ انہوں نے ہدایت کی کہ قومی ذرائع ابلاغ سے آزادیٔ صحافت کے حقیقی حدود خال واضح کیے جائیں۔ انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی شاخوں کو ہدایت کی کہ وہ اس موقع پر صحافی کارکنوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کریں جنھیں آج تک اخبارات کے مالک ساہوکاروں اور سیٹھوں نے غصب کیے رکھا ہے۔ آج دن بھر لال سیاہ پرچموں سے فضا معمور رہی۔ آزادیٔ صحافت کا غلغلہ برپا رہا اور عوامی حکومت نے اس دن کو کامیاب

بنانے کے لیے پوری طرح جدوجہد کی اور ہم یہ جدوجہد کیوں نہ کرتے۔ ہم اس جدوجہد میں اب سے تو شریک نہیں، برسوں سے شریک ہیں۔ اس وقت بھی ہم شریک تھے۔ جب اس ملک کے گلی کوچوں میں لاکھوں محنت کشوں، کسانوں، مزدوروں، غریبوں کے جلوس بپھرے ہوئے طوفانوں کی مانند امڈ آئے تھے۔ جب اس ملک میں آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد کی جا رہی تھی۔ مگر صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کا مقبوضہ پریس اس جدوجہد کی ایک چھوٹی سی خبر بھی چھاپنے کا روادار نہیں تھا۔ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی لاکھوں کے مجمع میں تقریر اس قدر بھی اخبارات میں جگہ پانے کی حقدار نہیں سمجھی جاتی تھی جس طرح ایک بی ڈی ممبر کا بیان چھپتا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ صحافت کی آزادی کی قدر ضروری ہے۔ عوام کو ان کے حقوق دلانے کے لیے کسقدر ضروری ہے۔ اور ہم آزادیٔ صحافت کا یہ دن کسطرح نہ مناتے۔ ہم نے اسوقت بھی آزادیٔ صحافت کی جدوجہد کی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اسوقت بھی اسکا پرچم بلند کیا تھا جب کچھ لوگ اس ملک کے اندر نظریۂ پاکستان کے نام پر مذہب کے نام پر لوگوں کا رزق چھیننے کے درپے تھے۔ جب میکارتھی ازم کا دور دورہ تھا۔ جب اخبارات سے چن چن کر وہ لوگ نکالے جا رہے تھے جنھیں ترقی پسند سمجھا جاتا تھا جنھیں ایک مخصوص سیاسی نقطۂ نظر کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ مطالبے ہو رہے تھے ریڈیو کی تطہیر کی جائے ٹیلی ویژن کی تطہیر کی جائے۔ اور ان لوگوں کو نکال باہر کیا جائے جو معاشی انصاف چاہتے ہیں جو اس ملک میں پسے ہوئے عوام کے حقوق کے محافظ ہیں۔ ہم نے یہ جدوجہد اس وقت بھی کی تھی جب سینکڑوں صحافی کارکنوں کو بیروزگار کرنے کے بعد ان کو سڑکوں پر لا کھڑا کیا گیا تھا۔ ان کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ ان کے بچے فاقوں کا شکار تھے۔ وہ فٹ پاتھ پر کپڑے بیچ رہے تھے۔ اور یہ لوگ جو آج آزادیٔ صحافت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے کپڑے خریدنے تک کے روادار نہ تھے۔ اس وقت یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی تھا کہ جو پھر لاکھوں کا جلوس لے کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان غریب صحافیوں کے پاس پہنچا تھا۔ اور ان کے کپڑے خریدے تھے۔ ان کی جدوجہد میں شرکت کی تھی۔ ان کو یقین دلایا تھا کہ ان کے حقوق کی حفاظت

کی جائے گی۔ ان کے لیے سرمایہ دار مالکوں کا مقابلہ کیا جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ جب عوامی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو صدر بھٹو نے ہر چند کہ کوئی مطالبہ نہ تھا۔ ہر چند کہ کوئی جلوس نہ نکل رہے تھے۔ کوئی جدوجہد نہ ہو رہی تھی۔ صحافیوں کی طرف سے کوئی پریشر نہ تھا۔ کوئی دباؤ نہ تھا۔ کراچی کے جلسۂ عام میں یہ اعلان کیا کہ آج سے اخبارات آزاد ہیں۔ آج سے پریس اینڈ ونس کا رسوائے زمانہ طریقۂ کار ختم کر دیا گیا ہے۔ آج سے اخبارات کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے خیالات کا دل کھول کر اظہار کریں۔ جس فلسفۂ حیات کی چاہیں تشہیر کریں۔ جس سیاسی طرزِ فکر کو چاہیں اپنائیں۔ جس سیاسی پارٹی کے پروگرام کی تائید کرنا چاہیں کریں۔ اس اعلان کے بعد دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ جن صحافی کارکنوں کو بڑے بڑے اخبارات سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ انہوں نے حکم دیا کہ ان صحافیوں کو واپس روزگار پر بلایا جائے۔ ان کا حق ان کو دیا جائے۔ چھینا ہوا حق دیا جائے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ جو سرمایہ داروں کے چنگل میں تھا۔ جس پر صنعت کار قابض تھے۔ جو اپنی روپہلی مصلحتوں کے مطابق غریب کارکنوں کی آزادئ ضمیر کو کچل رہے تھے جو ان سے ذہنی بیگار لے رہے تھے۔ اس نیشنل پریس ٹرسٹ کے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں اور مالکوں کو ختم کر کے عوامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے اسے عوام کے ٹرسٹ کی حیثیت دی۔ اس کا ایک چیئرمین مقرر کیا گیا تاکہ سرمایہ داری کے منحوس سائے اس ٹرسٹ کی پاکیزگی، اس کی عظمت کو ملوث نہ کر سکیں۔ اس ملک کی ۲۵ سال کی تاریخ میں پہلی مرتبہ صحافیوں کو اس کثرت سے صدر بھٹو اپنے ساتھ اپنے دورے پر لیے جانے لگے۔ ہر جگہ انہوں نے ان کو اہمیت دی تاکہ وہ خود ان کے سفر کا مشاہدہ کر سکیں۔ ان کی بات چیت کا مشاہدہ کر سکیں۔ قریب کے حالات کا مشاہدہ کر سکیں۔ لوگوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔ اور ۲۵ سال میں پہلی مرتبہ یہ شرف بھی ان ہی نے صحافیوں کو عطا کیا۔ عطا نہ کیا۔ یہ ان کا حق تھا جو ان کو ملا۔ شملہ کے تاریخی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے جہاں انہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے اکابرین کو جمع کیا۔ ان سے رائے لی۔ ان کی باتیں سنیں۔ ان کو باتیں سنائیں۔ وہاں انہوں نے ملک بھر کے صحافیوں کو بھی بلایا۔ مری میں

ان سے بات چیت بھی کی۔ ان سے ڈائیلاگ کیے۔ ان کو اندرونِ خانہ باتیں بتائیں۔ ان کو کانفیڈنس میں لیا۔ ان سے مشورے لیے۔ اس طرح پہلی مرتبہ ۲۵ سالہ قومی تاریخ میں صحافیوں کو یہ احساس ہوا کہ وہ کاروبارِ مملکت میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ ان کا مقام تھا جو ان کو ملا تو پھر آزادیٔ صحافت کا یوم اگر ذوالفقار علی بھٹو نہ مناتا۔ اگر اس کی عوامی حکومت نہ مناتی تو کون تھا جس کو یہ حق پہنچتا کہ وہ یہ دن منانے کی کوشش کریں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صحافت کو آزاد کرنیکا اعلان جو تاریخی اعلان تھا۔ اس سے کچھ سیاسی عناصر نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان صحافیوں نے ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ جو سیاسی کارکن تھے۔ مگر انھوں نے صحافی کا روپ دھار رکھا تھا۔ ان لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آزادیٔ رائے کو اس بات کا مفہوم پہنا لیا کہ صحافت بے لگام ہونے لگی۔ انہوں نے صدر بھٹو اور ان کے ساتھیوں پر کیچڑ اچھالنے کا مشغلہ اختیار کیا۔ ان کے اہلِ خانہ تک کو معاف نہ کیا۔ ان پر باقاعدہ دشنام طرازی کی گئی۔ ان کے کردار کو مسخ کر کے غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔ ایسے صحافیوں کو بلایا گیا کہ آؤ بات کریں۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ ہمیں مطمئن کر دیا مطمئن ہو جاؤ۔ مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے انہوں نے اتنی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ حکومت کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے۔ اور حکومت کا نقطہ نظر سننے کی کوشش کرتے۔ آخر صبر کی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر وہ مرحلہ آتا ہے۔ جب رواداری بے غیرتی بن جاتی ہے۔ اور ہم لوگ روادار ضرور ہیں مگر بے غیرت نہیں۔ اور اس ملک میں کوئی قانون سے بالاتر تو نہیں ہے۔ کوئی افسر بالاتر نہیں ہے۔ کوئی وزیر بالاتر نہیں ہے۔ کوئی سفیر بالاتر نہیں ہے۔ جو بھی قانون کی خلاف ورزی کرے گا پکڑا جائے گا دھر لیا جائے گا۔ اسے تعزیر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اگر کچھ لوگوں نے سندھ کے حالیہ نزاع کو جو ہماری تاریخ کا، قومی تاریخ کا افسوسناک باب ہے۔ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اگر انھوں نے مختلف طبقات کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اگر انھوں نے مسلمان کو مسلمان سے لڑا دیا۔ اگر انھوں نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا تو پھر قانون کیوں نہ حرکت

ہیں آتا۔ کیا حکومت خاموش تماشائی بنی رہتی۔ اور کچھ لوگ امن وامان کو نذرِ آتش کر دیتے، ملک کو تباہی اور بربادی کے کنارے پر لاکھڑا کر دیتے۔ یہ آزادیٔ صحافت نہیں ہے۔ آزادی صحافت ہمیں عزیز ہے۔ مگر وطن کی قیمت پر عزیز نہیں ہے۔ ہم آزادیٔ صحافت چاہتے ہیں۔ مگر وہ آزادی جو عوامی مفادات کے تابع ہو ــــ وہ آزادی جو غریبوں اور محنت کشوں کے فائدہ کے لیے ہو۔ وہ آزادی جو وطن کے استحکام اور سالمیت اور وقار اور سربلندی کے لیے ہو۔ وہ آزادی نہیں کہ جس کی وجہ سے ملک کے اندر بدامنی پیدا ہوا، فساد پیدا ہو، غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ جس کے اندر شکر رنجیاں بڑھیں۔ جس کے اندر لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں۔ آخر آزادیٔ صحافت آزاد قوموں کا بھی تو شیوہ رہی ہے۔ ان قوموں نے بھی آزادیٔ صحافت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ جن قوموں کو بحران سے گزرنا پڑا ہے۔ جن قوموں نے شکست کا منہ دیکھا۔ جن قوموں نے ہماری طرح راکھ کے ڈھیر اور لاشوں کے انبار ورثے میں پائے۔ ان قوموں سے بھی تو ہمیں آزادیٔ صحافت کے طور طریقے سیکھنے چاہئیں۔ برطانیہ، جرمن اور فرانس کی آزادیٔ صحافت بھی تو ہمارے لیے اپنے اندر کچھ سبق رکھتی ہے۔ یہ جرمن کا پریس ہی تو تھا۔ لٹے پٹے جرمن کا پریس جس نے اپنی حب الوطنی کے جذبہ سے کام لیتے ہوئے مزدوروں کے اندر یہ ہمت پیدا کی۔ یہ عزم پیدا کیا کہ وہ کئی کئی گھنٹے بلا اجرت کام کریں گے۔ بلا معاوضہ کام کریں گے۔ جب تک جرمن اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا یہ جرمن کا پریس ہی تو تھا۔ جس نے مزدوروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ نو دس سال تک سٹرائیک کے حق سے دست بردار ہو جائیں۔ کیونکہ جرمنی کو کام کی ضرورت تھی۔ جرمنی کو محنت کی ضرورت تھی۔ کیا آزادیٔ صحافت کا یہ مفہوم ہم نہیں لے سکتے۔ ہم اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ اس آزادیٔ صحافت کی ہم کو ضرورت ہے۔ وطن جس مرحلے سے گزر رہا ہے یہ آزادیٔ صحافت ہے۔ جس کے لیے ہمیں جدوجہد کرنا چاہیے۔ آج یومِ آزادیٔ صحافت منایا گیا۔ لیکن کون کہتا ہے کہ پاکستان کی صحافت آزاد نہیں۔ دنیا کے کسی ملک میں صحافت کی آزادی کی وہ مثال پیش نہیں کی جا سکتی جو پاکستان میں صحافت کی آزادی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پچھلے ۲۵ سال کو دیکھیے سنسر مارچ ۱۹۷۱ء میں بھی

لگا تھا۔ ایک آمر نے لگایا تھا جو زبردستی ہمارے سروں پر مسلط ہو گیا تھا۔ اور اس وقت یہ سنسر لگا تھا جب مشرقی پاکستان خون میں نہا رہا تھا۔ جب اس کے اندر آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ آہن و آتش کا تماشا رچایا جا رہا تھا۔ جب اس کے اندر مظلوموں کی آہیں اور کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس وقت جب پاکستان کے بازو کو ملک سے کاٹنے کی سازش پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی تھیں۔ اس وقت سنسر لگایا گیا تھا۔ لیکن کیا کسی جیالے مالک نے۔ اخبار کے کسی سیٹھ نے اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کی کہ سنسر کے قانون کی خلاف ورزی کرے یا اتنی جگہ خالی چھوڑ دے کہ جو سنسر کی زد میں آتی تھی۔ یا اس کی جگہ۔ قینچی کا نشان بنا دے۔ اور یہ تاثر دے کہ یہاں سنسر سے کام لیا گیا ہے۔ اور اخبار پر پابندی اس زمانے میں بھی تو لگی تھی۔ جب ایک آمر یہاں اپنا تسلط جمائے ہوئے تھا۔ غریبوں کا اخبار تھا۔ محنت کشوں کا اخبار تھا، مزدوروں کا اخبار تھا۔ اس کے مزید کم عوامی تحریک مساوات کا ترجمان تھا۔ لاہور سے ایک روزنامہ اخبار تھا۔ اس پر بھی پابندی لگی تھی۔ اس کی اشاعت بھی معطل کر دی گئی تھی۔ کسی مالک کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنے کارکنوں کو کہتا کہ اخباروں کو بند کر دو اور ہڑتال کرو۔ اور سڑکوں پر نکل آؤ۔ کوئی سٹرائیک نہ ہوئی۔ کوئی جلوس نہ نکلا، کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ لیکن آج سنسر کا قانون نافذ ہوا، خالی جگہ چھوڑ دی گئی تاکہ لوگوں کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ یہ اخبار بڑا جیالا اور بڑا بہادر ہے۔ اس نے اپنے ہاں دیکھیے کتنی خالی جگہ چھوڑی یہاں سے سنسر نے اس کی اشاعت کے مواد کو کاٹ دیا۔ اور ہڑتال ہوئی۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخباروں نے بھی ہڑتال کی۔ حکومت اتنی فراخ دل تھی۔ اتنی روادار تھی کہ اس نے ان پر بھی دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ اس ہڑتال میں شریک نہ ہوں۔ آخر وہ اپنی کلاس اسٹرگل سے کیوں علیحدہ ہوتے۔ کیونکہ وہ اپنے طبقہ سے جداگانہ بالکل منفرد راستہ اختیار کرتے۔ سٹرائک ہوئی، کھلے بندوں ہوئی۔ سنسر کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی۔ پھر بھی حکومت نے رواداری سے کام لیا۔ فراخدلی سے کام لیا۔ اس سلسلے میں اس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس سلسلے میں اس نے کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ لیکن آزادئ صحافت کے جلوس نکالنے والے صحافی دوستوں سے بھی تو میں

کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ ہمارے ساتھ ہیں ہم ان کے ساتھ ہیں۔ مجھے خبر ہے وہ صدر بھٹو کے منشور کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آج بھی ان کی اکثریت اس منشور پر ایمان رکھتی ہے جو اس عوامی حکومت کا منشور ہے۔ آج بھی انہیں صدر بھٹو کی قیادت عزیز ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی سے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن انہیں اپنی صفوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ کچھ لوگ، کچھ نقاب پوش لوگ ان کی صفوں میں ایسے گھس آئے ہیں جو اپنی سیاسی اغراض کے لیے ان کے کندھوں کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کراچی میں اسٹرائیک کے موقع پر جو جلوس نکلا۔ اس جلوس میں جو نعرے لگائے گئے جو سیاسی نعرے لگائے گئے۔ ان نعروں کو اگر سنا جاتا گوش ہوش سے سنا جاتا تو صحافی دوستوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ کون لوگ ہیں جو نعرے بازی کر رہے ہیں۔ اور ان کے عزائم کیا ہیں۔ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ اس سازش کی کڑی تھی جو پچھلے دنوں میں عوامی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کی گئی تھی۔ اور جس میں کچھ شکست خوردہ عناصر شریک تھے۔ صحافی کارکن یہ بھی پسند نہیں کر سکتے کہ ان کی جدوجہد کو ان کی ٹریڈ یونین کو کچھ سیاسی عناصر اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کریں۔ یقیناً ہمارے صحافی دوستوں کو اس بات کا احساس ہو گا کہ پریس لاز ختم ہونے چاہئیں جو پہلے سے چلے آرہے ہیں۔ ان کا استعمال نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ پریس لاز ہم نے بنائے ہیں؟ یہ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے بنائے ہیں ـــ؟

یہ پچیس سال سے چلے آرہے ہیں۔ یہ ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔ ہم ان کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ہم ان کو اسٹڈی کر رہے ہیں۔ ہم نے ہر جگہ اخبارات کے کارکنوں سے ان پر بات چیت کی ہے۔ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ کن کن پہلوؤں پر ان کو اعتراضات ہیں کن کن پہلوؤں کی وجہ سے ان کو تکلیف ہے۔ اس لیے ہم نے پاکستان کے ۴۲ نامور ایڈیٹروں کے دستخطوں سے دی جانے والی تجاویز کو اپنانے کا اعلان کیا تھا۔ چند دن پیشتر ہم نے کہا تھا وہ تجاویز جو ۴۲ مدیرانِ جرائد نے دی ہیں جن میں ہر طبقۂ خیال کے ایڈیٹر شامل ہیں۔

ہم ان کو دیکھیں گے۔ ہم ان کو پرکھیں گے۔ ہم انھیں قبول کریں گے۔ ایک پریس کونسل بنائی جائے گی۔ برطانیہ کے انداز کی ایک پریس کونسل۔ ایک آزاد قوم کے شایان شان پریس کونسل اور اس کے اندر حکومت اور پریس کے باہمی معاملات کا تجزیہ کیا جائے گا۔ مشورہ کیا جائے گا۔ اور سارے معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ پریس کونسل جلد قائم ہوگی اور جب قائم ہوگی تو یہ سارے معاملات کو طے کرے گی۔ اور جب پریس کونسل نے اپنے ذمہ یہ کام لیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ساری تلخیاں۔ وہ سارے جھگڑے، وہ سارے اختلافات ختم ہو جائیں گے کہ جن اختلافات کو آج کچھ لوگ پیدا کر کے ہوا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے میں صحافی کارکنوں سے عرض کروں گا۔ ان سے اپیل کروں گا۔ ان سے مطالبہ کرونگا کہ وہ محسوس کریں کہ موجودہ عوامی حکومت سے زیادہ آزادئ صحافت کا اور کوئی علمبردار انھیں ہے اور کوئی ترجمان نہیں ہے۔ اور کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ عوامی صحافت فروغ پائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کارکن صحافی پھلیں پھولیں، حقوق حاصل کریں، ملک و ملت کی خدمت کریں۔ مگر جن اداروں میں وہ کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں کے مالکوں کو بھی تو وہ مجبور کریں کہ ان کی آزادئ ضمیر کو نہ کچلیں۔ اور اپنے اخباروں کی پالیسیاں ایسی نہ بنائیں کہ جن کے نتیجہ میں خلفشار پیدا ہو۔ جن کے نتیجہ میں استحکام وطن پر آنچ آئے۔ اور جن کے نتیجہ میں انکے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ جن کے نتیجہ میں لوگ مبالغہ آرائیاں کریں۔ اور جن کی وجہ سے نفرت ایک دوسرے سے کرنے لگیں۔ یقیناً صحافی چاہتے ہیں کہ ان کے اخبارات کی پالیسیاں بدلیں۔ یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ سیٹھوں اور ساہوکاروں کے چنگل سے نکل کر وہ خود اپنے اخباروں کے مالک بنیں۔ اور میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ساہوکاروں نے صنعت کاروں نے، سرمایہ داروں نے، سیٹھوں نے اپنے طور طریقے نہ بدلے۔ اگر انھوں نے عوامی حکومت کے خلاف سازشی عناصر کی اسکیم کا حصہ بننے کی کوششیں جاری رکھیں تو پھر انھیں جان لینا چاہیئے کہ حکومت کمزور نہیں ہے۔ ہم ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔ قانون میں اتنی سکت ہے، اتنی طاقت

ہے کہ وہ ان کو کیفر کردار تک پہنچا سکتا ہے۔ اور ایسی سکیمیں ہمارے سامنے ہیں۔ اگر ان میں تبدیلی نہ آئی جن کے نتیجہ میں ہم کارکن صحافیوں کے مشورہ سے ان کی مدد سے ان کی خواہش کے مطابق اخباروں کا نظام بنائیں گے، چلائیں گے۔ ان کو انفرادی ملکیت کے چنگل سے نکالیں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہوش کے ناخن لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ عوام کی خواہشات اور جذبات سے روگردانی نہیں کریں گے۔ وہ عوامی سیلاب کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اور تعمیری تنقید کریں گے۔ اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کرنے کے لیے اپنے فرائض کا احساس کرنے کی کوشش کریں گے۔ آج آزادئ صحافت کا دن تھا۔ آج بہت سے جھنڈے فضا میں لہرائے۔ بہت سی آوازیں سنی گئیں۔ بہت سے خطیبوں نے خطبے دیئے۔ بہت سے لیڈروں نے بیانات جاری کیے۔ بہت سے جلسے ہوئے۔ لیکن کارکن صحافی یقیناً جھنڈوں میں اور تقریروں میں فرق کرنا جانتے ہیں۔ جھنڈے کچھ وہ ہیں جو آج بلند ہوئے۔ اور آوازیں کچھ وہ ہیں جو آج بلند ہوئیں۔ مگر ایک جھنڈا وہ تھا جو سالوں پہلے بلند ہوا۔ وہ تھا ان کے تحفظ کے لیے۔ ان کے حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے۔ ان کی محبت میں آزادئ صحافت کے لیے۔ اور وہ جھنڈا ذوالفقار علی بھٹو کا جھنڈا تھا۔ وہ جھنڈا پاکستان پیپلز پارٹی کا جھنڈا تھا۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں جو آج اپنی اغراض کے تحت صحافیوں کے محبوب اور منظورِ نظر بننے کی کوشش کر رہے ہیں یقیناً ان میں اور پاکستان پیپلز پارٹی میں، ذوالفقار علی بھٹو کی جدوجہد میں فرق کرنا جانتے ہیں۔ انہیں خبر ہے کہ دھواں وہ بھی ہے جو سگریٹ سے پھیلتا ہے اور دھواں وہ بھی ہے جو آہوں سے پھیلتا ہے۔ لیکن اس دھوئیں میں بہت فرق ہے۔ صحافیوں سے زیادہ کون اہل نظر ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں ان سے کہوں گا کہ ؎

اے اہلِ نظر فرق کرو عشق و ہوس میں
سگریٹ کا دھواں اور ہے آہوں کا دھواں اور

صحافیوں کی ذمّہ داریاں

"پی پی آئی کے جناب معظم علی کی دعوت پر ۱۴ر جولائی ۱۹۷۳ء کی شام کو شاہراہ کمال اتاترک میں پریس انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام میں نے پریس آڈیٹوریم کا افتتاح کیا۔ اس مختصر تقریب میں کراچی کے کم و بیش تمام صحافی موجود تھے۔" انہیں خطاب کرتے ہوئے مَیں نے کہا تھا:۔

○

مَیں پریس انسٹی ٹیوٹ کے منتظمین کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اپنے آڈیٹوریم کے افتتاح کے لیے مجھے دعوت دی اور اس طرح میرے لیے بہت سے شناسا چہروں کو یکجا دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں اس طرح کے ایک ادارے کی بے حد ضرورت تھی اور ضرورت ہے۔ جس طرح کا ادارہ اس پریس انسٹی ٹیوٹ کی صورت میں قائم کیا گیا ہے اور اس ادارے کے زیرِ اہتمام آج آڈیٹوریم کا افتتاح ہو رہا ہے جس میں صحافیوں کو صحافت کی جدید تکنیک سکھائی جائے گی۔ بدقسمتی سے جہاں ایک طرف ہمارے ہاں بہت سے قدآور صحافی موجود ہیں اور ایسے اخبار نویس میدانِ عمل میں ہیں جنہیں اپنے فن میں مہارت حاصل ہے اور وہ اپنے شعبے کے تمام معاملات پر پوری طرح حاوی ہیں وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صحافت میں ایسے لوگ بھی در آئے ہیں جنہیں صحافت کی صحیح تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا اور کسی استاد کے آگے انہوں نے زانوئے

تمیز بھی تہہ نہیں کیا۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے صحافت بدنام بھی ہوئی اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کو جو اس شعبے میں آنا چاہتے ہیں یا جو اس میدان میں قدم رکھنا چاہتے ہیں یہ بتایا جائے کہ صحافت بھی ایک سائنس ہے یہ بھی ایک علم ہے اور اس کے لیے بھی ریاضت اور عملی تربیت کی ضرورت ہے۔ اور آج ہماری صحافت جس طرح ایک ماڈرن سائنس (علم جدید) بن چکی ہے اس سے ان سارے نئے صحافیوں کو جو اس میدان میں نوآموز ہیں روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ ایک بڑی اچھی بات جو پریس انسٹی ٹیوٹ کے پیش نظر ہے وہ عطائے وظائف ہے۔ انہیں بیرونی تعلیم کے لیے صحافیوں کو بھجوانا، انہیں فوٹوگرافی اور دوسری ٹیکنیکل تعلیم دلوانی ہے اور ان کاموں کے لیے ان کی مالی اعانت ضروری ہے۔ یہ سارے امور بہت اچھے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ پریس انسٹی ٹیوٹ میں صحافیوں کی تربیت کے دوران یہاں لیکچروں کا اہتمام کرتے وقت اور تمام دوسری سرگرمیوں میں بھی یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ان چیزوں سے نئے یا زیر تربیت صحافیوں میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ جس پیشے کو اختیار کر رہے ہیں وہ محض ایک پروفیشن نہیں ہے۔ وہ محض ایک پیشہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ مقدس روایات بھی وابستہ ہیں اور اس کے ساتھ کچھ فرائض بھی ہیں۔ وہ فرائض کیا ہیں؟ وہ مقدس روایات کیا ہیں؟ یہ تفصیل طلب گفت وگو ہوگی اور مجھے اس لیے بھی اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اہل علم کا اجتماع ہے اور آپ میں سے بہت سے بزرگ اخبار نویس مجھ سے کہیں زیادہ اس موضوع کو بہتر طور پر جانتے ہیں لیکن ایک بات جو میں خاص طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرائض کے ضمن میں کم و بیش ہر نوآزاد اور ترقی پذیر ملک کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس میں اہلِ صحافت سے لے کر اس شعبے تک جس میں نسبتاً بالغ نظر لوگ آتے ہیں عہد غلامی کی حکومتوں اور غلامی کے بعد کی یعنی اپنی قومی حکومتوں کے ساتھ سلوک روا رکھنے میں وہ امتیاز نہیں برتتے جو دورِ آزادی اور دور غلامی میں ہونا چاہیے۔ یہ طرز عمل ایک فیشن بھی بن جاتا ہے۔ اور جہاں جذبہ ہوتا ہے وہاں یہ چیز کچھ بہت زیادہ مبالغہ آمیز بھی ہو جاتی ہے کہ حکومت کے خلاف ضرور بات کی جائے یا حکومت پر نکتہ چینی کی جائے اور اگر کوئی اچھے

پہلو ہوں تو ان کے بارے میں بھول کر بھی کلمۂ خیر نہ کہا جائے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص یہ کہدے کہ یہ اخبار نویس یا یہ اخبار تو حکومت کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے یا حکومت کا ایجنٹ بن گیا ہے یقیناً یہ عادتیں غلامی کے زمانے کی باقیات میں سے ہیں۔ جہاں غیر ملکی حکومتیں ہوتی ہیں بیگانوں کی حکومتیں ہوتی ہیں اور حکومت اور عوام میں خلیج حائل ہوتی ہے۔ وہاں اہلِ صحافت، اہلِ علم اور تمام بالغ نظر لوگوں کے فرائض مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن آزادی کے بعد جہاں حکومت پر تعمیری نکتہ چینی ہونا چاہیئے تعمیری تنقید ہونا چاہیئے۔ وہاں اہلِ صحافت کو اپنے اندر یہ حوصلہ بھی پیدا کرنا چاہیئے کہ اچھے پہلوؤں کو سراہا جائے اور ان کی بنا پر حکومت کی حوصلہ افزائی کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اہلِ صحافت ہرگز ہرگز ایک سیاسی جماعت نہیں ہیں۔ ان میں اور سیاسی جماعتوں میں بہت بنیادی اور بیّن فرق ہے مجھے یہ بھی کہنے کی اجازت دیجیئے کہ ہم اہلِ صحافت میں (مجھ سمیت) کچھ ایسے لوگ در آئے ہیں جو سیاسی کارکن پہلے ہیں اور اخبار نویس بعد میں۔ میں نے جہاں تک صحافت کو سمجھا ہے (بزرگ اخبار نویس اس سے اتفاق کریں گے) وہ یہ ہے کہ صحافی پہلے صحافی ہے اور بعد میں وہ سیاسی کارکن ہے یا اس کا اپنا کوئی سیاسی نظریہ ہے کم سے کم جس وقت اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے آپ کو صرف اور صرف صحافی محسوس کرتا ہے۔ رپورٹنگ سائڈ پر تو خاص طور پر جب وہ رپورٹ کرتا ہے تو اس پر اس کے اپنے ویوز کی پرچھائیں نہیں پڑنی چاہیئے۔ اسے اپنی رائے دوسرے کے منہ میں نہیں ڈالنی چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں چونکہ ابھی نومشقی کا دور ہے آزادی کی روایات ابھی رچ بس نہیں سکیں اس لیے (یہاں سب کی بات نہیں کرتا) جہاں ہمارے ہاں بہت سے اچھے رپورٹر ہیں (جن کی رپورٹنگ یقیناً بین الاقوامی معیار پر بھی اچھی طرح جانچی پرکھی جا سکتی ہے اور اُسے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے) وہاں ایسی رپورٹیں بھی ہوتی ہیں کہ جن کے اندر رپورٹ کرنے والا اپنی بات کہتا ہے اور جب وہ شخص جس کو رپورٹ کیا جاتا ہے دوسری صبح اخبار اٹھا کے دیکھتا ہے تو اسے رپورٹ میں بھی ایڈیٹوریل کا انداز محسوس ہوتا ہے اسے ایک شذرہ تو دکھائی دیتا ہے۔ لیکن رپورٹ نظر نہیں آتی۔ اس طرح اس طرزِ بیان کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے جسے اوداریوں میں پیشِ نظر

رکھا جاتا ہے کہ آیا اس کا انداز اس طرز کی تقریر کا ہے جو موچی دروازے اور نشتر پارک میں کی جاتی ہے یا وہ ایک متین سنجیدہ صاحب فکر صحافی کے رشحات قلم کا حاصل ہوتا ہے۔ جس کے اندر تنقید بھی ہوتی ہے اور دعوت فکر بھی۔ مگر دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ۔ جس میں منزل کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ راستے کی مشکلات کا خیال بھی ہوتا ہے یہ سارے پہلو ایسے ہیں اور اس طرح کے بہت سے ایسے پہلو بھی ہیں جو گفتنی ہیں۔ اور بعض پہلوؤں سے شاید ناگفتنی بھی۔ ان پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ پریس انسٹی ٹیوٹ تربیت اور لیکچرز کا اہتمام کرتے وقت اگر ان سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھے تو میں سمجھوں گا کہ وہ صحافت کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ یہ بات یقیناً ہمارے اہل صحافت کے ذہن میں بٹھائی جانی چاہیئے کہ صحافت کوئی اس طرح کا پیشہ نہیں ہے جیسے بڑھئی ہوتے ہیں یا لوہار ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ جہاں روزی کمانے کا ذریعہ ہے جہاں قوت لایموت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہاں اس سے روح کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ وہاں اس سے انسان کو روحانی مسّرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کو صحیح طریقہ سے سرانجام دے اور اس پیشے کے جو مقتضیات ہیں ان کو پُورا کرے تو یہ ذریعہ روزگار بھی ہے اور یہی ذریعہ عبادت بھی بن سکتا ہے۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مَیں آپ کے آڈیٹوریم کی اس افتتاحی تقریب میں بڑی خوشی کے ساتھ شریک ہوا ہوں۔ اور وزارت اطلاعات کی طرف سے آپ کے پریس انسٹی ٹیوٹ کے لیے بارہ ہزار روپے کا حقیر عطیہ بھی پیش کرتا ہوں۔

"قومی زندگی میں ادبی رسائل کی اہمیت"

"پاکستان کی انجمنِ ادبی رسائل نے اپنی ۱۹۷۴ء کی سالانہ کانفرنس میں مجھے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کرنے کی دعوت دی۔ چونکہ یہ کانفرنس ادیبوں اور اہلِ قلم کی ایک نمائندہ کانفرنس تھی۔ اس لیے مناسب یہ سمجھا گیا کہ تقریر ایک تحریری خطبے کی صورت میں ہو۔ کوشش یہ بھی تھی کہ تحریر میں تقریر کا رنگ بھی نمایاں رہے"۔

○

صدر گرامی، معزز اراکین انجمن ادبی رسائل،

خواتین و حضرات!

انجمن ادبی رسائل و جرائد کے اس کنونشن میں شرکت کی دعوت کے لیے میں منتظمین انجمن کا بیحد ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے اس اہم تقریب کے لیے مجھے یاد فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی اور سرکاری مصروفیات کے ہجوم میں جب کبھی مجھے اہل قلم کے درمیان مل بیٹھنے کا کوئی موقع ملتا ہے تو میں اسے یوں غنیمت جانتا ہوں کہ یہ ملاقات ہمیشہ میری روحانی تازگی کا موجب ہوتی ہے۔ میری زندگی میں جہاں قومی و ملکی سیاست کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہاں میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ میں فی الحقیقت خود بھی قلم ہی کا مزدور ہوں۔ اور اس قلم کی عفت کے لیے میں نے حتی المقدور ظلم اور تاریکی کے خلاف آواز اٹھائی اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ بھی میری ذہنی توانیں اس جذبہ کی بقا کے لیے وقف رہیں گی۔ ہر چند کہ اس میں ہر گام پہ زبان کٹتی ہے اور انگلیاں فگار ہوتی ہیں۔

مگر خامۂ خونچکاں حق بات لکھنے سے نہیں رکتا۔ آج پھر میں اپنے آپ کو اپنے ہمسفروں کے درمیان پاکر ایک گونہ قلبی سکون محسوس کرتا ہوں کہ قلم کا رشتہ دراصل قلب و ذہن ہی کا رشتہ ہوا کرتا ہے۔ اہل قلم کی دعوت پہ مجھے سر کے بل بھی چل کے آنا پڑے تو میں اپنے آپ کو رہ نوردِ شوق ہی سمجھوں گا کہ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔

آج کی تقریب ادبی رسائل و جرائد کے مسائل کے بارے میں ہے۔ ادبی جرائد کی اہمیت کسی بھی تہذیب یافتہ معاشرے میں بحث طلب نہیں۔ ادبی جرائد معاشرے کے ان تجربوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو اہل قلم کی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں وارد ہوتے ہیں۔ ان رسائل میں زندگی کے وہ گہرے نقش ملتے ہیں جو اہل فن اپنا خون جلا کر اور شب بیداری کے مرحلوں میں سے گزر کر ثبت کرتے ہیں۔ یہ تجربات انسانی زندگی کے گہرے مشاہدے اور انسانی وجود سے گہری وابستگی کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ فرق ہے جو عام صحافتی تحریروں اور ادبی پرچوں میں ہوتا ہے۔ صحافتی تحریریں وقتی اور ہنگامی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جبکہ ادب کا تاثر وقت کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اچھے اور اعلیٰ ادب کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ زمانوں پہ حاوی ہوتا ہے۔ اور ہر دور میں زندہ اور بامعنی ہوتا ہے سعدی، شیکسپیئر، غالب، اقبال، لطیف بھٹائی، خوشحال خاں خٹک اور دوسرے سبھی بڑے اہلِ قلم کسی ایک دن میں نہیں ہر عہد میں جیتے ہیں۔ اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ یہ لوگ وقت کے ساتھ ساتھ مکان کی قید سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے افکار کسی ایک قوم یا معاشرے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ ساری دنیا ان کی مخاطب ہوتی ہے۔ ان کے فن کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ لازوال اور ابدی ہے۔ وقتی اور ہنگامی تحریریں اس خصوصیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ ادبی تخلیقات قوم کی مزاج شناسی کا بہترین پیمانہ ہوتی ہیں اور اعلیٰ ادبی رسائل انفرادی اور اجتماعی کردار کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ادب بدی کی قوتوں کے خلاف جہاد کا دوسرا نام ہے۔ کارلائل نے ادب کے کردار پر

پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا۔

"سستے ادب کے مقابلے میں اعلیٰ ادب کی تخلیق جان جوکھوں کا کام ہے یہ اندر اور باہر کی تاریکی سے جنگ کرنے کا عمل ہے۔ اور بعض اوقات یہ جنگ بہت سخت صورت اختیار کر لیتی ہے۔"

ہمارے اپنے یہاں ادبی رسائل و جرائد نے تاریکی کے خلاف جہاد کی ایک بہت بڑی روایت قائم کی۔ اس عمل میں ان رسائل نے قوم کے اذہان کی تربیت اور اس کے کردار کی نشوونما میں تاریخ ساز رول ادا کیا۔ ابوالکلام کے الہلال و البلاغ، مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد اور ظفر علی خاں کا زمیندار اگرچہ روزمانہ اخبارات کی صف میں آتے ہیں، مگر ان اخبارات کو ان معنوں میں صحافتی پرچے کہنا درست نہیں۔ جن معنوں میں آج ہم ان سے مراد لیتے ہیں۔ یہ دور وہ تھا جب ادب و صحافت کے درمیان ہمارے رسائل و اخبار میں کوئی واضح تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ یہ اخبارات زبان و بیان اور علمی سطح کے معاملے میں آج بھی دنیا کے اعلیٰ ترین پرچوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ادبی رسائل کا بنیادی رول علمی و ادبی ذوق کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ ہم اگر بھولے نہیں تو ہمارے پرانے ادبی رسالوں اور اخبارات نے ادیب سازی کے رول کو بخوبی ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ یہ پرچے اپنے معیار کی حفاظت میں کبھی کوئی کمی نہ ہونے دیتے تھے۔ کسی نئے لکھنے والے کی تحریر کا ان پرچوں میں چھپ جانا ہی اس تحریر کی عمدگی کی سند سمجھی جاتی تھی۔

خواتین و حضرات! ہماری قومی ثقافت میں علمی و ادبی رسائل کی روایت ایک عظیم روایت ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد بلاشبہ سر سید احمد خاں مرحوم مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ اور اگر علی گڑھ اس تحریک کا نکتۂ اولین تھا۔ جو اس برعظیم میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ مملکت کے قیام پر منتج ہوا تو یقیناً رسالہ "تہذیب الاخلاق" اس تحریک کا نقیب اولین تھا۔ اس رسالے کے اجرار سے صحافت و ادب کے درمیان

واضح تقسیم کا آغاز ہوا۔ "تہذیب الاخلاق" ہی وہ ذریعہ ابلاغ تھا۔ جس نے ہماری قوم کے مایہ ناز مشاہیر محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، حالی اور شبلی کو دنیائے علم و ادب میں روشناس کیا۔ جن کی تحریروں نے مسلمانوں کی زخم خوردہ قوم کو ایک نیا ولولہ، آہنگ اور عزم عطا کیا۔ اس رسالے کی کامیابی اس کے موضوعات کی ہمہ گیری اور رنگارنگی کے علاوہ ایک واضح نصب العین تھا۔ اور وہ نصب العین ایک سیاسی طور پر شکست کھائی ہوئی قوم کو مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکالنا۔ اور ان کی اپنی تہذیب و ثقافت پر اعتماد بحال کرانا تھا۔ موضوعات کے اعتبار سے اس رسالے میں علم و ادب سے لے کر تعلیم و تدریس، مذہب، اخلاقیات اور سیاسی نصب العین پر سیر حاصل مقالات شائع ہوتے تھے۔ یہ "تہذیب الاخلاق" ہی کی روایت تھی جسے آگے بڑھانے کے لیے لاہور سے "مخزن" "پھول" اور "تہذیب نسواں" دہلی سے "عصمت" لکھنؤ سے "تمدن" حیدر آباد سے "شیرازہ" اور "اردو" اور کلکتہ سے "الہلال" نے مسلمانوں کی تہذیبی، ادبی اور فنی صلاحیتوں سے اظہار کے لیے نئے نئے مواقع اور نئے اسالیب پیش کیے۔ سر عبدالقادر مرحوم اور مخزن ہی نے اقبال کو متعارف کیا۔ اور "مخزن" ہی کے صفحات سے اقبال نے اپنی حیات آفرین شاعری سے مسلمانوں کے قلوب کو پھر سے زندہ رہنے کی تمنا عطا کی۔ "مخزن" ایک رسالے سے زیادہ ایک تحریک کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس رسالے کی بدولت اردو ادب نئی اصناف شعر و سخن سے آشنا ہوا۔ مغربی ادب کے تراجم بھی اس میں شائع ہوئے جس کی بنا پر اردو دان طبقہ مغربی افکار سے روشناس ہوا۔

ادبی رسائل کی اس لو سے نئے چراغ روشن ہوئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان گلہائے رنگارنگ کی خوشبو تمام ملک میں پھیل گئی۔ لاہور سے "نیرنگ خیال" "ہمایوں" "خیالستان" "ہزار داستان" "عالمگیر" "ادبی دنیا" "شاہکار" "رومان" "ادب لطیف" دہلی سے "ساقی" "کلیم" اور "ادیب" لکھنؤ سے "نگار" اور "نیا ادب" بھوپال سے "افکار" پٹنہ سے "ندیم" ڈھاکہ سے

"جادو" حیدر آباد سے "سب رس" آج بھولے بسرے نام سہی، لیکن ادب، فن اور علم کی تاریخ میں یہ نام کبھی نہیں مٹ سکتے۔ ان رسائل میں سے ہر رسالے کا ایک اپنا کردار تھا۔ ان کے چہرے الگ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب کوئی نیا ادبی پرچہ بازار میں آتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا گویا ملک میں ایک اہم واقعہ رونما ہو گیا ہے۔ ان پرچوں کی اشاعت کا انتظار شدت سے ہوتا تھا۔ مگر یہ دور تو ان مدیروں کے ساتھ ہی لد گیا۔ جو ان پرچوں کے روح رواں تھے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

اس دور کے تمام ادبی پرچوں کی عظمت کا سبب یہ تھا کہ یہ نہ صرف اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے تھے۔ بلکہ ان کے پیش نظر فرد اور معاشرے کی تربیت اور فکر و نظر میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنا بھی تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان ادبی رسالوں نے قومی فکر کو خاص سانچوں میں ڈھالنے کے لیے بہت بڑا کام کیا۔ اور وسعت نظر اور پختگی کردار کی تشکیل میں نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ ان کے پیش نظر محض خالی خولی ادبیت نہیں تھی۔ اور نہ ہی ایسے خیالات و افکار کی ترویج تھی۔ جس سے سستی رومانیت اور خود فریبی جنم لیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ان رسائل اور ان میں لکھنے والوں کے سامنے قوم کی امنگیں اور آدرش، ان کی اپنی زندگی کے مسائل اور وہ حقیقتیں تھیں جن کا تعلق تمام بنی نوع انسان سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان رسائل کے پیش نظر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رہا۔ جس کی تکمیل میں وہ کوشاں رہے۔ ان کی یہی مقصدیت ہماری ادبی و ثقافتی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

دوسری جانب جدوجہد آزادی سے پیدا ہونے والی مقامی تحریکوں کے آغاز اور باہر کی دنیا کے انقلابی فلسفوں کے اثرات کے تحت ادب کے افق پر جرائد کی صورت میں نئے ادبی ستارے طلوع ہوئے جن میں زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کیساتھ

ایک نئے شعور کا اجالا پھیل گیا۔ یہ شعور نئی حقیقتوں کا ترجمان تھا۔ نیا دور، سویرا۔ ادب لطیف اور نقوش اس نئے احساس کے ترجمان تھے جو برصغیر میں طبقاتی کش مکش اور عوامی بیداری کے ساتھ ابھرا تھا۔ اور جس میں استحصالی قوتوں کے خلاف ایک منظم جنگ کا اعلان ہوا۔ یہ یہ رسائل "ادب برائے زندگی" کے نقیب تھے۔ اور زندگی کی ترجمانی میں انہوں نے فنی تقاضوں کو قربان نہ کیا۔ اور ادب کو پروپیگنڈہ بننے سے روکے رکھا۔ وگرنہ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کے زمانے میں ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا جب ادب پارٹی مینی فسٹو بن گیا تھا۔ اور ادب سے زیادہ محض نعرہ لگنے لگا تھا۔ مگر پاکستانی ادیبوں نے مانگے تانگے کے نظریات کو رد کر دیا اور ایسے ادب کی تخلیق پر اصرار کیا جس کی جڑیں ہمارے قلوب و اذہان میں پیوست ہوں اور جو یہاں کے عوام کے جذبات سے ہم آہنگ ہو۔

پاکستان کے پچھلے ۲۵ برسوں میں ان چند معیاری جرائد نے جن میں نیرنگ خیال، نیا دور، سویرا، اردو ادب، ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، العلم، عصمت، نقوش، اوراق فنون، افکار، قندیل، سنگ میل وغیرہ اہم ہیں۔ زبان و ادب کی خدمت جس عزم و ہمت سے کی اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ یہ رسائل زیادہ تر ذاتی اور انفرادی کوششوں ہی کے نتیجے میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور آج کے اجتماعی صنعتی دور میں رسالے شائع کرنے کی صنعت کو انفرادی سطح پر چلانا یقیناً بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔

ادبی محاذ پر ابھی یہ انفرادی سرگرمی جاری تھی کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ڈائجسٹوں کا آغاز ہو گیا۔ یہ ڈائجسٹ مختصر سے عرصے میں برساتی کیڑوں کی طرح نکل آئے۔ اور اس قدر عام ہوئے کہ ہر گھر سے یہ پرنالہ بہنے لگا۔ یہ رسائل عام طور پر بھی بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ہماری نظموں کی طرح ایک بندھے ٹکے فارمولے کے مطابق ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ یہ فارمولا کچھ اس طرح کا ہے کہ جاسوسی کہانیاں، شکاریات، جنگ عظیم، جنسیات، سیاسی انٹرویو اور اس کے ساتھ مذہب کی پیوند کاری۔ اور مغربی رسائل میں شائع ہونے والے ہیجان انگیز

مواد کے ترجموں کا ایک مرکب تیار کر کے کثیر تعداد میں شائع کر دیا جاتا ہے جو دھڑا دھڑ بکتا ہے۔ بلاشبہ ایسے رسائل کی اشاعت سے اعلیٰ معیاری ادب کی اشاعت پر برا اثر پڑا ہے۔ اس سرگرمی کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کئی ڈائجسٹوں نے بد مذاقی اور سستے ادب کو رواج دے کر برُے اور بھلے کی رہی سہی پہچان بھی ختم کر دی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے فحاشی کے رجحان کو بھی تقویت ملی ہے۔ جس سے نئی نسل کی روحانی و جذباتی صحت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس قماش کے رسالوں کے رواج پا جانے سے سنجیدہ علمی و ادبی رسائل و کتب کے مطالعہ کی طرف سے توجہ ہٹ گئی ہے۔ اور نئی نسل صحت مند ادب کی بجائے گھٹیا اور چیپ ادب کی قاری بن کے رہ گئی ہے۔ ان رسائل کا مقصد توہمات، فحاشی، رومان پرستی اور بے یقینی پھیلانے کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ سطحی، پست اور جنسی تحریروں نے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جس سے ہماری ثقافتی اقدار، دینی روایات اور ہمارے سماجی توازن کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اس بڑھتے ہوئے فتنے کا سدباب بےحد لازمی ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم اس فتنے کی سرکوبی کے لیے سخت سے سخت اقدام اٹھانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں وہ شاید آپ کے علم میں بھی ہوں۔ میں نے خود وزیر اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے ملک کے تمام مدیران اخبار و رسائل کو ذاتی خطوط لکھے کہ وہ از راہ کرم فحش تحریروں، تصویروں اور اشتہاروں کی اشاعت سے پرہیز کریں۔ ہم نے آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی اور آل پاکستان نیوز پیپر کانفرنس سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ اپنے ممبران پر اخلاقی دباؤ ڈالیں۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میری اپیل اور تمام معروضات صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ میں اب واشگاف الفاظ میں ان سماج دشمن عناصر کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ انھیں قوم کی ذہنی صحت کو مفلوج کرنے کی اب زیادہ مہلت نہیں دی جائے گی۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ ان رسائل کے مدیران کرام اور پالیسی میکر

میرے اس انتباہ پر اپنی روش بدل لیں گے ورنہ مجھے قومی اسمبلی کے سامنے اس خطرناک رجحان کو لانا ہو گا۔ اور پھر ہم قانون کے ذریعے ان سرگرمیوں کے لیے باقاعدہ سزا تجویز کریں گے۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوں۔ اور قانون اور انتظامی مشینری کو حرکت میں لائیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ ایسے تمام رسائل اپنے آپ کو خود ہی ایک ضابطہ اخلاق کا پابند بنالیں خود احتسابی کا باقاعدہ نظام وضع کریں۔ اور ملک میں صحت مند علمی و ادبی روایات کی ترویج و ترقی کا موثر ذریعہ بنیں۔ جب حکومت کوئی قدم اٹھاتی ہے تو پھر یہی گروہ آزادیٔ اظہار کے نام پر واویلا شروع کر دیتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ آزادیٔ اظہار مادر پدر آزادی کا نام نہیں ہوتا۔ معاشرتی اقدار اور اخلاقی ضابطے صحت مند معاشرے کی بقاء کے لیے بہر طور لازم ہوتے ہیں۔

آج کے ادبی رسائل کے مدیروں کو اس خطرناک رجحان کا شدت سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ ادبی پرچوں میں بھی دلکشی پیدا کریں۔ انہیں اپنے جرائد میں موضوعات کو وسعت دینا چاہیئے۔ ادبی رسائل کی نامقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان رسائل میں تنوع نہیں پایا جاتا۔ خالص ادبی تحریروں کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی مضامین بھی شائع ہونا چاہئیں جو مذہب، فلسفہ، سیاست، تاریخ، سماجیات، عمرانیات، نفسیات اور اسی طرح کے دوسرے علوم پر محیط ہوں۔ یہاں میں آپ کی توجہ امریکہ اور برطانیہ میں شائع ہونے والے چند اعلیٰ ادبی جرائد کی طرف دلاؤں گا جن میں سے بعض پچھلے سو برس سے شائع ہو رہے ہیں۔ اور ان کے معیار اور پسندیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ برطانیہ میں انکاؤنٹر (Encounter) کنٹیمپوریری آفیرز ContemporaryAffairs جرنل آف دی ایچ جی ویلز سوسائٹی Journal of H. G. Wells Society جیسے جرائد ہیں۔ ادھر امریکہ میں سیوائے ریویو Savoy Review اینٹاک ریویو Antique Review سیچرڈے ریویو Saturday Review پارٹیزن ریویو اور صد سالہ قدیم ادبی رسالہ

پہلا ـــــ ہیں۔ یہاں کوئی موازنہ مقصود نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے اور ان ممالک کے حالات میں بہت فرق ہے۔ مگر اہم خوبی ان رسائل کی یہ ہے کہ ان میں آپ کو اعلیٰ پائے کی ادبی نگارشات کے ساتھ ساتھ علمی مضامین بھی پڑھنے کو ملیں گے جو ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے لیکر فنون لطیفہ کے تمام شعبوں تک پھیلے ہوں گے۔ ان رسائل میں موسیقی، مصوری، فلم، تھیٹر اور کتابوں پر تجزیے اور تبصرے بھی ہوتے ہیں۔ اور یوں یہ جرائد ہر ذوق اور ہر طبقۂ فکر کے لیے دلچسپی کا عمدہ اور سنجیدہ مواد پیش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ادبی رسائل موضوع کے اعتبار سے بہت محدود ہو کے رہ گئے ہیں۔ جس سے ان میں وہ اپیل نہیں رہی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ادبی رسائل انفرادی کوششوں سے ہی چل رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کے لیے آج یہ ممکن نہیں کہ وہ اشاعت اور پھر اس کی فروخت تک کے تمام مراحل خود ہی طے کر سکے۔ اور پھر اس کام کے لیے کثیر سرمایہ بھی درکار ہے۔ یورپ اور امریکہ کے جن ادبی پرچوں کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے۔ ان میں بیشتر جرائد یونیورسٹیوں کیطرف سے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کی اشاعت کے لیے کارپوریشنز اور فاؤنڈیشنز قائم ہیں۔ جن میں مختلف حصہ دار سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ یہی وہ وجہ ہے کہ ان ممالک میں پرانے رسائل ابھی تک سو سو برس سے چل رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے یہاں بڑے سے بڑا جریدہ بھی کسی نہ کسی سٹیج پر پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔ مدیران کرام کو اس بارے میں ایسی تجاویز پر غور کرنا چاہیئے اور حکومت بھی یقیناً غور کرے گی کہ ادبی رسائل کسی ایک فرد کی ذات پر منحصر رہنے کی بجائے اداروں سے متعلق ہو جائیں۔ اور یہ ادارے اہل قلم اور سرمایہ کاروں کے تعاون سے معرض وجود میں آ سکتے ہیں۔ اور ان پرچوں کو تجارتی خطوط پر چلانے کے منصوبے تیار ہو سکتے ہیں۔

مگر اس سے بھی اہم چیز جس کی کمی ہمارے علمی و ادبی رسائل میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ

نصب العین اور مقصد کے تعین کا فقدان ہے۔ مقصد سے مراد کسی مخصوص سیاسی یا سماجی نظریے کی اندھا دھند پیروی نہیں۔ جب میں مقصد کا لفظ فکری سرگرمی کے پس منظر میں استعمال کرتا ہوں تو اس سے مراد صرف یہ ہے کہ ہمارے فکری و ذہنی اظہار کے سوتے اس عظیم نظام فکر کے داعی ہونے چاہئیں۔ جس کے نام پر ہم نے ایک الگ معاشرہ پاکستان کے نام سے قائم کیا۔ ہماری فکر کے ڈانڈے جب تک ہماری تہذیبی و ثقافتی روایات سے مختلف ہوں گے۔ ہماری تہذیب کی صحیح آبیاری نہیں ہو سکے گی۔ ثقافت کا مسئلہ ایسا پیچیدہ نہیں جتنا ثقافت کے نام لیواؤں نے اسے بنا دیا ہے۔ کسی تمدن (سولائزیشن) میں جو شے بمنزلہ روح یا جوہر کام کرتی ہے وہ اس کا کلچر ہوتا ہے۔ جس طرح کا کلچر ہو گا اسی طرح کا تمدن رونما ہو گا۔ کلچر پائیدار اور مستحکم بنیادیں رکھتا ہو گا تو تمدن میں بھی اسی نسبت سے پائیداری کارفرما ہو گی۔ گویا ایک لحاظ سے ثقافت اور تمدن کا ایک دوسرے کے ساتھ گوشت اور ناخن کا رشتہ ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری ثقافت کی جڑیں اسلام کے ترقی پذیر تصور میں پیوست ہیں۔ اور یہی تصور ہماری آگہی کا سرچشمہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں بعض دانشور اسلام کے نام ہی سے الرجک ہیں۔ اور ان کے اعصاب پر اس نام کا خوشگوار اثر مرتب نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے اسلام کو رجعت اور روایت پرستی کا کوئی فرسودہ نظام سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اگر وہ اسلامی فلسفۂ حیات کا مطالعہ احساس کمتری اور تعصب کی عینک کے بغیر کر سکتے تو ان پر صاف روشن ہو جاتا کہ اسلام کے نظریات کی مختلف توجیہیں اور شکلیں ہیں۔ اس کی ایک صورت ہمارے سامنے وہ ہے جو جامد ہے۔ یہ اسلام کا ایسا تصور ہے جو بدلتے ہوئے حالات میں حرکت اور ثبات کا صحیح امتزاج پیش نہیں کرتا توہمات اور اندھی عقیدتوں کا شکار ہو کر بے عملی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک "اسلام" وہ ہے جس میں سرمایہ داری بھی جائز قرار دی جاتی ہے۔ اور لامحدود نجی سرمائے پر پابندی حرام سمجھی جاتی ہے۔ یہ بھی کہنے کو اسلام ہی کی شکل ہے۔ مگر اسلام کو فقط ان صورتوں میں

پہچاننا یقیناً گمراہی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اسلام اگر کوئی جامد تصورِ حیات ہوتا یا وہ طبقاتی نظام سے پیدا ہونے والی ناانصافیوں کو حق بجانب قرار دیتا تو وہ کب کا مر چکا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں۔ اسلام اگر زندہ ہے تو اپنے اسی وصف اور انہی خوبیوں کی بنا پر زندہ ہے جن کی بدولت اس کے نظامِ فکر میں نت نئے بدلتے ہوئے تقاضوں کو سمونے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو اور حالات کو آگے بڑھانے کی صلاحیت ہمیشہ قائم رہی ہے۔ جو تصورات اور نظریات تاریخ کے تقاضوں کے دھارے کو موڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ عجائب گھروں کی زینت بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ان دانشوروں کو اسلام کی ترقی پذیر قوتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ وہ اسلام جو متحرک اور رواں دواں ہے۔ جو زندگی کی مثبت قدروں کا امین ہے اور جو بدی کی قوتوں سے ہر دم نبرد آزما ہے۔ وہ اسلام جو جہالت، غربت، جبر اور استحصال کو روا نہیں رکھتا۔ جو زندگی کو آگے لے جانے والی قوتوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اور جمود و بے عملی کا دشمن ہے۔ ہماری ثقافت کو توانائی اسلام کے انہی نظریات سے مل سکتی ہے جو ہمارے ملی استحکام اور بقا کی اساس ہیں۔ ایک مغربی مفکر کے قول کے مطابق "ثقافت ایک ایسا عمل ہے جو ہمیں ذاتی و اجتماعی اظہار کے قابل بناتا ہے"۔ پس ادب جو ہماری ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ اپنے اظہار میں اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ پاکستانی تہذیب سے اپنا رشتہ نہیں جوڑتا اور پاکستانی تہذیب سے رشتہ جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ فنکار اس ملک کی نظریاتی اقدار کو جزوِ ایمان بنائے اور اس قوم کی اجتماعی شخصیت ہی میں اپنا تشخص تلاش کرے۔ تاریخ سے استفسار کیجیے۔ وہ آپ کو بتائے گی کہ مسلمان جب تک زندگی کے اس ترقی پسند اسلامی تصور کو سینے سے لگائے رہے۔ وہ علوم و فنون کے میدان میں دنیا کی امامت کرتے رہے۔ یورپ جس کی مصنوعی چکا چوند سے آج بڑے بڑوں کی نظریں خیرہ ہیں خود اس کے منصف مزاج اہلِ قلم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ نے مختلف میدانوں میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے خرمن ہی سے خوشہ چینی کی ہے اپنی مشہور کتاب Making of Humanity (تشکیلِ انسانیت)

میں رابرٹ بریفالٹ کا یہ اعتراف قابلِ غور ہے۔ جس میں وہ صاف صاف یہ کہتا ہے:۔

"اسلامی تہذیب و تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں۔ اور اس کی ابتدا اس وقت سے ہو جاتی ہے۔ جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئیں۔"

میں مدیرانِ جرائد اور ان میں لکھنے والے تمام اہلِ قلم سے گزارش کروں گا کہ وہ کتابوں اور رسالوں کی ترتیب و تصنیف میں اسلام کی حقیقت پسندانہ اقدار و نظریات کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ امید ہے کہ یہ رویہ اختیار کرنے سے ہمارے ادیب کو ایک جہت ملے گی۔ اور جب جہت کا تعین ہو جائے تو منزل کا حصول آسان ہو جایا کرتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی ثقافت کی ارفع و اعلیٰ اقدار ہمارے ادب میں یوں جاری و ساری ہونی چاہئیں جیسے رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ ان قدروں کا اظہار فنی چابک دستی اور کمالِ ہنر کے ساتھ ہونا چاہیئے، ورنہ تو پھر ادب' ادب نہیں رہتا۔ نعرے بازی بن جاتا ہے۔

یہاں یہ غیر مناسب نہ ہوگا کہ میں تخلیقِ ادب اور ابلاغ کے مسئلے کے بارے میں بھی کچھ کہوں کہ یہ ادبی جرائد اور ان کے قارئین کے رشتے کی ایک بنیادی شرط ہے۔ ہمارے آج کے ادبی رسائل میں ایسی تحریریں شائع ہوتی ہیں جن میں ابہام کی کثرت ہوتی ہے۔ آج کے قاری کو اگر اپنے لکھنے والوں سے یہ شکایت ہے کہ ان کی تحریریں سمجھ میں نہیں آتیں تو اس مسئلے کی طرف ہمارے ادیبوں کو بجا طور پر توجہ دینا چاہیئے۔ جب ادیب اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ لفظ ہی اس کا واحد ذریعۂ ابلاغ ہے تو اسے لفظ کی حرمت کا پاس ہونا چاہیئے۔ اور وہ اسے یوں استعمال کرے کہ اس کا لفظ پڑھنے والے تک بھی پہنچے۔ اگر ادیب اپنے قاری تک پہنچ ہی نہیں پاتا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بحیثیت ایک ادیب اپنے بنیادی فرض کی ادائیگی میں ناکام رہا ہے۔ بعض ادیب اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے علامتی ادب کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ صوفی شعراء کا کلام علامتی

ادب کی بہترین مثال ہے۔ مگر یہ وہ شاعری ہے جو دیہات کے ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی تک بھی پہنچتی ہے۔ اور دوسری جانب وہ ادب عالیہ کا حصہ بھی ہے۔ کچھ اس قسم کا توازن ہمیں اپنے انداز بیان میں پیدا کرنا ہوگا تاکہ ہمارے ادب میں عوام کو اپنی امنگوں اور آرزوؤں کا عکس نظر آسکے۔ اور جہاں وہ عام فہم ہو وہاں معیار کے اعتبار سے ان ادبی و فنی اقدار کا بھی حامل ہو۔ جن سے ایک تحریر ادبی تحریر کہلائے جانے کی مستحق ہوتی ہے۔ اور یہ معیار اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب بسیار نویسی سے پرہیز کیا جائے۔ جارج ایلیٹ نے درست ہی کہا تھا کہ:۔

"میرے نزدیک ادب کی تخلیق میں بسیار نویسی کا فعل ایک سماجی جرم ہے۔"

خواتین و حضرات! اب میں ان مسائل کی طرف آتا ہوں جن کا ذکر میرے دوست اور صدر مجلس استقبالیہ جناب سید الطاف علی بریلوی نے اپنے خطبہ میں کیا ہے۔ میں نے ان مسائل کی روشنی میں پیدا ہونے والے تمام مطالبات کو بغور سنا ہے۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کا تفصیلاً جائزہ بھی لوں گا۔ اور مجھ سے جس قدر ہوسکا میں ان مطالبات کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ بھی فروگزاشت نہیں کروں گا۔

آپ نے مطالبہ کیا ہے کہ تمام رسائل۔ وہ ماہنامہ ہوں، دو ماہی ہوں، سہ ماہی ہوں یا ششماہی ان کو نیوز پرنٹ کا کوٹہ دیا جائے۔ اور اس کی قیمت کم سے کم متعین کی جائے۔ ابھی تک صورت حال یہ تھی کہ حکومت نے روزناموں اور ماہوار رسالوں کے لیے کاغذ کے مختلف نرخ رکھے تھے۔ ماہوار رسالوں کو نسبتاً مہنگے داموں کاغذ دستیاب ہوتا تھا۔ مگر اب یکم مئی سے یہ تفریق ختم کردی جائے گی۔ اور آئندہ ایک ہی نرخ پر سب کو کاغذ ملے گا۔ دو ماہی، سہ ماہی اور ششماہی رسالوں کو نیوز پرنٹ مہیا کرنے کی حکومت پابند نہیں ہے۔ مگر میں ان رسائل کو بھی کاغذ کی دستیابی کے معاملے میں اسی قسم کی سہولتیں دینے کے لیے پوری کوشش کروں گا۔ اس کے علاوہ جہاں تک آپ کے اس مطالبے کا تعلق ہے کہ ادبی رسالوں

کو اشتہارات فراہم کیے جائیں۔ اور انہیں "آڈٹ بیورو" کی عائد کردہ شرائط سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ تو اس سلسلے میں بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان جرائد کو بھی اب اشتہارات دیئے جائیں گے۔ اور ادبی رسالوں کے آڈٹ کا ایک معیار مقرر کیا جائے۔ اور دوسرے اخبارات و رسائل کی نسبت ان کے نرخ مقرر کرنے کے لیے الگ فارمولا مرتب ہو گا تاکہ محدود اشاعت کے باوجود ان رسائل کو کاغذ اور اشتہارات کے حصول میں آسانیاں ہوں۔

ایک مطالبہ یہ بھی کیا گیا ہے ماہناموں کے علاوہ دوماہی، سہ ماہی اور ششماہی رسالوں کو بھی ڈاک خانہ کی رعایتی رجسٹریشن کی سہولت مہیا کی جائے۔ اس معاملے میں میں وزارت مواصلات سے سلسلہ جنبانی کروں گا۔ اور یہ سہولت دینے کے لیے کہوں گا۔

اسی طرح تمام وہ مطالبات جن کا تعلق دوسرے محکموں سے ہے ان کو متعلقہ محکموں تک پہنچانے میں تاخیر نہیں کروں گا۔ اور ان معاملات میں ان سے رابطہ رکھوں گا تاکہ وہ سب کے سب پورے ہو جائیں۔ اور اس طرح وہ قرض بے باق ہو جائے جس کا بوجھ آج آپ نے میرے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔

رہا معاملہ بیرونی ممالک میں بھیجے جانے والے ثقافتی وفود میں شمولیت اور سرکاری تقریبات میں مدعو کیے جانے کا تو اس سلسلے میں آئندہ ایسے تمام مواقع پر ادبی رسالوں کو بھی نمائندگی دی جائے گی۔

ان کے علاوہ کچھ ایسے مطالبات بھی ہیں جن کا تعلق مشاورتی جائزہ کمیٹیاں تشکیل کرنے سے ہے۔ ان تجاویز کا جائزہ لینے کے لیے میں پہلے ہی وزارت اطلاعات کے اعلیٰ حکام پر مشتمل ایک سب کمیٹی قائم کر چکا ہوں۔ جو پندرہ مئی تک اپنی سفارشات مجھے پیش کر دے گی۔

آخر میں حضرات گرامی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ادبی دنیا کو جو مشکلات درپیش ہیں آپ کی حکومت کو ان کا پورا احساس ہے۔ اور وہ پہلے ہی ان مشکلات کے حل کے لیے

اپنی کوششوں کا آغاز کر چکی ہے۔ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو اہل قلم کے مسائل سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور حال ہی میں عوامی حکومت نے بعض ادیبوں کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ماہانہ وظائف مقرر کیے ہیں۔

آپ کو یہ جان کر بھی خوشی ہو گی کہ مستقبل قریب میں ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کا ایک کل پاکستان کنونشن منعقد کرنے کی تجویز بھی حکومت کے زیر غور ہے جس میں اپنی تمام مصروفیات کے باوجود جناب وزیر اعظم بھی بنفس نفیس شرکت فرمائیں گے۔ اس کے بعد آپ کے دل کے کسی گوشہ میں یہ شک نہیں آنا چاہیئے کہ آپ کی حکومت ادب، ادیبوں اور ادبی جرائد کو ان کا حقیقی مقام دینے میں کسی درجہ میں بھی بخل سے کام لے گی۔

عربی زبان کی اہمیّت

"یہ وہ خطبہ ہے جو میں نے پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی یونین کے عہدے داروں کی تقریب حلف برداری میں دیا تھا۔ اس موقع پر پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر عبد العلی خاں موجود تھے۔ اس خطبے میں عربی زبان کی بلاغت کے بارے میں میں نے جو بعض نکات بیان کیے ہیں وہ حقیقت میں میرے طبع زاد نہیں بلکہ علمائے سلف کی ریسرچ کا صدقہ ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خطبہ بھی تحریری نہ تھا۔ چند پوائنٹس کی مدد سے ایک فی البدیہہ تقریر تھی۔

اسی طرح کی تقریر پاکستان نیشنل سنٹر کراچی میں عربی کلاس کے افتتاح کے موقع پر بھی ہوئی، بعد میں ان دونوں تقریروں کو مدغم کر کے یک جان کر دیا گیا۔"

الحمد لله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین من یومنا ھذا الیٰ یوم الدّین

خواتین و حضرات! مجھے پاکستان نیشنل سنٹر کراچی کے عربی کورس کی اس کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے بیحد مسرت ہو رہی ہے۔ اور میں اس بات پر بھی خوش ہوں کہ میں اپنے سامنے جو چہرے دیکھ رہا ہوں، وہ بیشتر نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح نئی نسل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ انہیں اسلام سے محبت نہیں ہے یہ بالکل غلط ہے۔ جہاں تک عربی زبان کی تعلیم اور تدریس کا تعلق ہے۔ یہ نکتہ میرے تمام دوستوں نے آپ کے سامنے بیان کیا۔ جو مجھ سے پہلے تشریف لائے کہ قرآن حکیم کی زبان عربی ہے۔ اور اس لحاظ سے مسلمانوں کا جو تعلق عربی زبان سے ہو سکتا ہے وہ بالکل ایک بدیہی امر ہے، ایک فطری امر ہے۔ اور ہر شخص آسانی سے

اسے سمجھ سکتا ہے۔

عربی زبان سے کم از کم میں جو عقیدت اور محبت رکھتا ہوں اس کے اسباب محض جذباتی نہیں۔ اس کے اسباب لسانی بھی ہیں، علمی بھی ہیں، دینی بھی ہیں، سیاسی بھی ہیں اور اقتصادی بھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے کلام کو، اپنے پیغام کو عالم انسانیت تک پہنچانے کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں کیا؟ اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

"انا انزلنہ قرآنا عربیا"

"ہم نے نازل کیا ہے اس قرآن کو عربی میں"

اس کا مفہوم بعض لوگوں کے نزدیک یہ لیا جاتا ہے کہ یہ ایک فصیح زبان ہے لیکن واضح مفہوم اس کا جو ہر شخص سمجھ سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی میں اتارا۔ لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا پیغام، الہامی پیغام جسے رہتی دنیا تک انسان کے تمام مسائل کو حل کرنا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام عقدوں کو کھولنا ہے۔ اس کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ ایک جواب تو سادہ ہے کہ اس لیے کہ چونکہ قرآن حکیم کے مخاطب اول عرب تھے۔ مگر سوال پھر پیدا ہوگا کہ عرب ہی کیوں مخاطب اول تھے۔ اور اس طرح سوال کا جواب نہ مل سکے گا کہ عربی میں قرآن کیوں اترا؟ جو پیغام ازلی اور ابدی ہے۔ جو رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ جس میں کسی طبقے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جسے کبھی فنا لاحق نہیں۔ اور جو کتاب، کتاب زندہ ہے، تو اس کے لیے لازمی اس نے ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا ہوگا کہ جو رہتی دنیا تک کے لیے ہو۔ جو زبان، زبان زندہ ہو۔ اور جس میں ہر طبقے اور گروہ کے لوگوں کی پیاس بجھانے کی صلاحیت موجود ہو۔

آپ ان کتابوں کی زبانوں کا حال دیکھیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ الہامی ہیں یا الہامی تھیں۔ اگر آپ ویدوں کو ان میں گننا چاہیں تو آپ انہیں بھی شامل کر لیں، انجیل

کو دیکھ لیں، تورات کو دیکھ لیں۔ آج دنیا کا کونسا علاقہ ایسا ہے، دنیا کے کس علاقہ کا کون سا شہر اور کونسا گاؤں اور کس شہر کا کونسا کوچہ ایسا ہے جس کے اندر وہ زبان بولی جاتی ہے، جو وید کی زبان تھی، جو انجیل کی زبان تھی، جو تورات کی زبان تھی؟ وہ سب زبانیں مردہ ہو چکی ہیں۔ فنا کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کتابوں کا تعلق اس وقت کے لوگوں سے تھا۔ اس زمانے کے لوگوں سے تھا۔ ان کا تعلق وقت کے ساتھ نہ تھا کہ وہ ابد تک زندہ رہتیں اور ہمیشہ ہمیشہ لوگوں کے قلب و دماغ پر ان کا قبضہ جاری رہتا۔ ان زبانوں کو مٹا دیا گیا۔ یا یہ مٹ گئیں تو اس لیے ایسا ہوا کہ ان زبانوں میں جو الہامی کلام نازل ہوا تھا، وہ وقتی تھا۔ وہ ایک محدود زمانے کے لیے تھا۔ ایک محدود گروہ کے لیے تھا۔ وہ زمانی و مکانی قیود سے بالاتر نہ تھا۔ اور اسے ہمیشہ کے لیے نہیں رہنا تھا۔ اس لیے جو زبانیں اس کے لیے منتخب کی گئیں وہ زبانیں ہی ایسی تھیں جو ہمیشہ رہنے والی نہ تھیں۔ اور ان پہلے پیغاموں کا چلا جانا ہی بہتر تھا کہ آخری پیغام آنے والا تھا۔ اس لیے وہ پیغام کہ جو ہمیشہ کے لیے تھا۔ اس کے لیے ہی یہ سعادت مقرر ہوئی کہ وہ ایک ایسی زبان میں نازل ہو جو فنا اور زوال کے تمام تر تغیرات سے ماورا ہو۔ اس مقصد کے لیے میں اہل علم و ادب سے اشارۃً یہ گزارش بھی کروں گا۔ کہ وہ ان زبانوں کو بھی دیکھیں جو مشہور ادیبوں اور شعراء کی زبانیں رہی ہیں۔ اور جن میں دنیا کے مختلف ممالک کے بے انتہا شاہکار تصنیف ہوئے ہیں۔ ان زبانوں کا کیا حشر ہوا ہے؟ اس کو بھی نگاہ میں رکھیں۔ فراعنہ کی قبطی زبان کا کیا حشر ہوا؟ ہومر کی یونانی زبان کا کیا حشر ہوا؟ عیسائیوں کی لاطینی زبان کا کیا حشر ہوا؟ یہودیوں کی عبرانی زبان تھی، اس کا کیا حشر ہوا؟ یہ تمام زبانیں آپ کو نظر آئیں گی کہ فنا ہو چکی ہیں۔ لیکن قرآن حکیم اس زبان میں نازل ہوا کہ چودہ سو سال اس کتاب پاک کو اترے ہوئے اور نازل ہوئے ہو گئے ہیں۔ لیکن آج بھی اس کی زبان پر فرسودگی اور قدامت کی کوئی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ آج عالم عرب یا کسی ملک کے لیے وہ زبان جس میں قرآن حکیم نازل ہوا ہے ہرگز ہرگز اجنبی نہیں، ہرگز ہرگز۔

پرائی نہیں۔ لہٰذا وہ پیغام جسے ازلی اور ابدی پیغام کی حیثیت حاصل ہے جو لافانی ہے، جو لازوال ہے، جو حیات بخش ہے، جو حیات افروز ہے۔ اس پیغام کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی کہ جس طرح کتاب زندہ ہو ویسے ہی وہ زبان بھی زندہ ہو۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

آں کتاب زندہ قرآن حکیم!

تو ایک کتاب زندہ کے لیے زبان زندہ کی ضرورت تھی۔ کتاب زندہ زبان زندہ کے بغیر کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے جس کا علم ماضی، حال اور مستقبل سب پر حاوی ہے۔ ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا جو زندہ ہے۔ اور جس کے اندر حیات و نمو کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اور جو اس پیغام کے مفاہیم اور مطالب کو اپنی آغوش میں سمیٹنے کی تمام تر جرأت رکھتی ہے، حوصلہ رکھتی ہے۔ جس کا دامن اتنا وسیع ہو سکتا ہے ٹھیک ہے آپ میں سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ انگریزی زبان بھی تو موجود تھی۔ انگریزی زبان اب بھی موجود ہے۔ اور مجھے انگریزی زبان سے کوئی چڑ نہیں۔ اس سے نفرت نہیں۔ زبان کوئی سی بھی ہو، وہ نفرت کی شے نہیں ہے۔ وہ نفرت نہیں سکھاتی۔ محبت کا پیغام دیتی ہے۔ زبان سے تعصب وہی کرتا ہے جس کا سینہ درد سے ناآشنا ہو۔ زبانیں تمام تر محبت کی آئینہ دار اور محبت کی پیغامبر ہیں۔ انگریزی بھی ایک ایسی زبان ہے۔ جس کے اندر اس وقت سائنسی اور علمی ذخائر اتنے ہیں کہ کوئی قوم اگر علمی اور سائنسی اعتبار سے ترقی کرنا چاہتی ہے تو اسے نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جو انگریزی زبان سے تعصب رکھتے ہیں۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ ہم انگریزی زبان نہ سیکھیں۔ لیکن یہ الگ بحث ہو جائے گی کہ انگریزی زبان سیکھتے ہوئے ہم احساس کمتری میں کیوں مبتلا ہوں۔ اور اس کی تہذیب اور اس کے تمدن کے آگے ہم کیوں اپنے آپ کو درماندہ اور پسماندہ سمجھ لیں؟ یہ الگ بحث ہو جائے گی۔ انگریزی زبان کے بارے میں جو لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ بہتر جانتے ہیں کہ اولڈ انگلش کو آج اگر کسی انگریز کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اسے ایک نئی زبان تصور کرے گا۔ یہ تفاوت

اور یہ فرق صرف تین صدیوں میں ہوا ہے۔ تین سو سالوں میں انگریزی زبان میں اتنا تغیر آگیا ہے کہ اولڈ انگلش آج کے انگریز کے لیے ایک نئی زبان ہے۔ دوسری زبان جو علمی ہو سکتی ہے وہ فرینچ ہے۔ لیکن فرینچ کے بارے میں ایچ پی سکاٹ اپنی کتاب جس کا ترجمہ اردو میں "اخبار الاندلس" کے نام سے ہو چکا ہے۔ میں لکھتا ہے کہ فرینچ کے تمام نہیں تو بیشتر محاورے اور الفاظ عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا عربی زبان حقیقت میں وہ زبان ہے جس کو ام الالسنہ کہا سکتا ہے۔ زبانوں کی ماں کہا جا سکتا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ عربی زبان میں ہر زبان کے بے شمار الفاظ موجود ہیں۔ ایک مصنف نے ان الفاظ کو گنا ہے جو انگریزی زبان کے ہیں اور عربی زبان میں موجود ہیں۔ ان کی تعداد انہوں نے چار سو سے زیادہ شمار کی ہے۔ لہٰذا عربی زبان ایک ایسی زبان ہے جو دوسری زبانوں سے ہمہ پہلو امتیاز رکھتی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ آج چودہ صدیوں کے بعد بھی قرآن حکیم کی زبان کسی بھی عرب ملک کے لیے ویسے ہی سمجھی جانے کے قابل ہے۔ جیسے وہ چودہ سو سال پہلے تھی۔ اس میں قدیم اور جدید کا کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ زبان اگر اس کو پرکھا جائے اور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر ہر پہلو میں کوئی نہ کوئی ضابطہ اور کوئی نہ کوئی قاعدہ موجود ہے۔ اس کے ہر حرف اور شوشہ میں فصاحت اور بلاغت کے ہزار اسلوب ہیں۔

عربی زبان کی فصاحت اور بلاغت اور اس کے دامن کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے میں صرف دو مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ پہلی مثال لغت کی کتاب "تاج العروس" ہے۔ اس لغت کے اندر ایک لاکھ بیس ہزار الفاظ اور ان کے مادے موجود ہیں۔ عربی لغت کی بہت سی اور ضخیم کتابیں بھی ہیں۔ جن میں ان الفاظ کے علاوہ بھی ہزاروں الفاظ ملتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ عربی زبان ایک زندہ اور متحرک زبان ہے۔ اور جس طرح زندہ وجود میں نئے نئے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جیسے درخت میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ اسی طرح عربی زبان میں نئے نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس موجودہ سائنسی اور تکنیکی دور میں نئے الفاظ کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔

تمام دوسری زبانوں کے برعکس عربی میں ایسے مؤثر قاعدے موجود ہیں. جن کی رو سے دوسری زبانوں کے الفاظ کو معرب کر لیا جاتا ہے. جس کے بعد ان الفاظ میں کسی قسم کی اجنبیت اور غرابت نہیں رہتی.

دوسری مثال مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم کے وزیر ابوالفیض فیضی کی لکھی ہوئی قرآن حکیم کی تفسیر ہے. جسے مفسر نے "سواطع الالہام" کا نام دیا ہے. اور عرف عام میں اسے تفسیر غیر منقوط کہا جاتا ہے. یہ تفسیر ارسٹھ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے. اس تفسیر میں فاضل مفسر نے یہ اہتمام رکھا ہے کہ لاکھوں الفاظ پر پھیلی ہوئی کتاب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس میں کوئی نقطہ دار حرف آیا ہو. یہ تفسیر جہاں فیضی صاحب کے علمی کمال کی دلیل ہے وہاں عربی زبان کی وسعت کی بھی ایک نہایت روشن مثال ہے. کسی دوسری زبان میں یہ امکان نہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم و فاضل انسان ایک اتنی بڑی کتاب لکھ سکے جو موضوع کے اعتبار سے اتنی اہم اور معنی کے اعتبار سے اتنی وسیع ہو. اور ساری کتاب میں اسی زبان کے نصف سے زیادہ حرف سرے سے استعمال ہی نہ ہوئے ہوں. ایک بڑی ضخیم کتاب تو کجا کوئی شخص کسی دوسری زبان میں اس اہتمام کے ساتھ چند صفحات بھی تحریر نہیں کر سکتا. یہاں میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کر دوں کہ عربی میں کل حروف ابجد اٹھائیس ہیں، جن میں سے نقطے والے حروف پندرہ اور غیر منقوطہ صرف تیرہ ہیں.

ان مثالوں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عربی زبان کتنی وسیع اور کتنے عظیم ممکنات کی حامل ہے. میں تو ایک طالب علم ہوں. لیکن جو علمائے لغت ہیں. اور عربی زبان پر جنہیں عبور حاصل ہے. انہوں نے اس کی فصاحت و بلاغت کے بہت سے پہلو گنوائے ہیں. مثال کے طور پر آپ اس کے حروف ابجد کو لیں. آپ دیکھیں گے کہ اس کے حروف بھی کچھ خاص معانی دیتے ہیں. جیسے "م" ہے. تو میم عربی زبان میں جمعیت کا مفہوم دیتا ہے. اور ویسے بھی اگر آپ میم بولیں تو لب مل جاتے ہیں. اس لیے وہ الفاظ جن میں میم شامل ہوا ہے. علمائے لغت نے

بتایا ہے وہ بھی جمعیت کا مفہوم دیتے ہیں جیسے "ام" تو "ام" ماں بھی ہے۔ اور درخت کا تنا بھی۔ ماں بچوں سے لیے جمعیت ہے۔ اور تنا شاخوں کیلیے۔ اسی طرح غم یعنی وہ غم جو قلب میں جم جاتا ہے۔ پیوست ہو جاتا ہے۔ اس کو عربی میں "حم" کہتے ہیں۔ اسی طرح ضم۔ ایک چیز کا دوسری چیز میں مل جانا ضم کہلاتا ہے۔ اسی طرح امام یعنی وہ شخص جس پر جماعت کا اجتماع ہو جائے۔ جس پر جمعیت متفق ہو جائے، وہ امام ہے۔ اسی طرح آپ الف کو لیں۔ الف کی خصوصیت یہ ہے کہ جب آدمی اسے ادا کرتا ہے تو مد کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن الفاظ میں یہ داخل ہرتا ہے۔ ان میں بھی مفہوم کی یہ جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ جیسے طویل لمبے کو کہتے ہیں۔ لیکن جب طوال کہیں گے تو بہت لمبا، کبیر، بڑا۔ لیکن کبار کہیں گے تو بہت بڑا۔ یہ اس کے حروف کی خاصیت ہے اور پھر یہی نہیں کہ اس ــــــــــــــ

کے حروف ہی میں یہ خصوصیات ہیں۔ اس کے اعراب میں بھی یہی اثر ہے۔ زیر، زبر اور پیش سے بھی۔ یہ بہت سے مفہوم اجاگر کرتی ہے۔ بہت سے معانی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے ادب کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیش اس کے ہاں قوی تر ہے۔ پھر زبر اس سے کم اور زیر اس سے بھی کم۔ اور ان کے اختصاص سے۔ حتیٰ کہ جزم کے اختصاص سے اس کے ہاں معانی کی دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "سَبَق" Sabaq دوڑ میں آگے نکلنے کو کہیں گے۔ لیکن "سَبَقَ" Sabaqa وہ روپیہ جو دوڑ پر لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح "حَمَل" Hamal بوجھ جو آسانی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ جو پھل درخت اٹھاتا ہے وہ بھی اسی سے تعبیر ہوتا ہے۔ لیکن اسی کو جب "حِمل" Himal کہیں گے تو وہ بوجھ جس کا اٹھانا دشوار ہوتا ہے۔ سورہ یوسف میں ہے

"وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْم"

"اور جو شخص اس کو لا کر حاضر کرے گا۔ اس کو ایک بار شتر ملے گا اور میں اس کے دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔"

تو حَمَل Hamal اونٹ کا بوجھ ہوا۔ زیر سے حمل کہہ کر اس کے مفہوم میں یہ بات

پیدا کردی ہے۔ اسی طرح حُب Hoob محبت ہے جو دشوار ہے۔ مشکل ہے۔ لیکن زیر سے حِب Hib یعنی وہ محبوب مراد ہے جو کہیں بار خاطر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آپ غور کرتے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ وہ زبان ہے جس کے اندر جزم زیر، زبر اور پیش کے اختصاص سے مفاہیم کی دنیا میں عجیب تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ اس زبان کے ہر حرف میں غور کیا گیا ہے۔ اور اس کے اندر بڑی بصیرت سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد بے شمار الفاظ اس زبان کے ایسے ہیں کہ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہیں۔ اور بہت سے معانی ایسے ہیں کہ جن کے لیے کئی کئی الفاظ ہیں۔ اور پھر ان الفاظ کے اندر کوئی نہ کوئی امتیازی بات اور کوئی نہ کوئی خصوصیت بھی موجود ہے۔ اگر آپ "عین" کے لفظ کو دیکھیں تو لغت میں اس کے معانی اکادن گنائے گئے ہیں۔ اور اکادن معانی میں آفتاب، آنکھ اور چشمہ وغیرہ۔ بے شمار ایسے معانی ہیں جس کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ مثال کے طور پر شہد کے لیے عربی زبان میں اسی الفاظ ہیں۔ مگر ہر لفظ جو استعمال ہوتا ہے اس کا جداگانہ کوئی قرینہ ہے۔ اور دوسرے لفظ سے کوئی فرق ضرور ہے۔ مگر مفہوم وہی ہے۔ اسی طرح سانپ کے لیے دو سو الفاظ ہیں۔ شیر کے لیے پانچ سو الفاظ ہیں۔ تلوار کے لیے ایک ہزار الفاظ ہیں۔ مگر ہر لفظ کا مفہوم جداگانہ امتیاز اور اختصاص بھی رکھتا ہے۔ یہ عربی زبان کی فصاحت اور بلاغت کا انداز ہے۔

اگر آپ لسانی اعتبار سے دیکھیں تو آپ پر اس زبان کی فضیلت دوسری زبانوں پر واضح ہو جائے گی۔ اور آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لیے اس زبان کا انتخاب کیوں کیا؟ اس لیے کہ اس کی کتاب زندہ ہے۔ اس کے لیے ایک زندہ زبان کی ضرورت تھی۔ اور عربی سے زیادہ زندہ زبان اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین وجوہ کی بناء پر عربی زبان سے محبت رکھو ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی میں ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔ ایک اور

مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: لسان الله یوم القیامة عربی یہی عربی زبان ہو گی۔ یہی لسان اللہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی زبان قیامت کے دن عربی ہو گی۔ اس سے عربی زبان کی فضیلت، اس کا شرف اور مقام واضح ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے ساتھ مسلمانوں کا کیا تعلق ہونا چاہیئے۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ زبان حقیقت میں تمام مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ اس لیے کہ سرکار ختم المرسلین سے ہم مسلمان اپنے ماں باپ سے بھی بڑھ کر محبت کرتے ہیں۔ یہی حکم بھی ہے اور یہی امر واقعہ بھی ہے۔ آج بھی جن نوجوانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مذہب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے ان کے سامنے اگر ان کے باپ کے شان میں گستاخی ہو جائے تو ممکن ہے وہ گوارا کر لیں۔ لیکن ان کے آقا و مولا کی شان میں کسی سے گستاخی ہو تو آج بھی وہ اس کی زبان کو گدی سے کھینچ نکالیں گے۔ آج بھی نوجوان اور ہم گنہگار سب اپنے ماں باپ سے بڑھ کر اپنے آقا سے محبت رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اُمہات المومنین ہیں، ہماری مائیں ہیں۔ یہ زبان ان کی ہے۔ اس لیے یہ ہماری مادری زبان ہے۔ ہماری ماؤں کی زبان ہے۔ لہٰذا مادری زبان سے تعلق ہونا چاہیئے۔ مادری زبان سے بیگانگی اچھی نہیں۔ اس لیے دینی لحاظ سے، لسانی لحاظ سے عربی زبان کی بڑی اہمیت ہے اور اس سے جس کسی مسلمان کو عقیدت ہے تو اس کی عقیدت Rational ہے۔ سمجھ میں آسکتی ہے کہ کیوں ہے۔

اس کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ سیاسی لحاظ سے بھی اس زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ خاص طور پر ہم پاکستانیوں کے لیے یہ بہت عظمت رکھتی ہے۔ اور اس کے اندر مادی لحاظ سے بھی ہمارے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ اس لیے کہ یہ عالم عرب کی زبان ہے۔ اور تنہا عالم عرب کی زبان نہیں اری ٹیریا، حبشہ، افریقہ کے ساحلی ممالک جزائر مڈغاسکر، انڈونیشیا، ملائشیا وغیرہ میں مقامی زبانوں کے بعد دوسری زبان جو سمجھی جاتی ہے۔ وہ عربی ہے۔ پھر یہ وہ زبان ہے جو آذربائیجان، ترکستان، بخارا، ایران، افغانستان اور کئی دوسرے ممالک میں کئی سو سال تک

سرکاری زبان رہ چکی ہے۔ اس لیے وہاں کے لوگ بھی اس زبان کو سمجھتے ہیں۔ اور جب ہم یہ زبان اختیار کرتے ہیں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس طرح بے شمار مسلمان اور دوسرے ملکوں سے ہمارا رابطہ استوار ہوتا ہے۔ حال ہی میں ہمارے ہاں اسلامی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی داغ بیل ڈالنے کا شرف جمال الدین افغانی کو ہوا تھا۔ جنہوں نے سب سے پہلے اس کے لیے کوشش کی تھی۔ اس کے لیے تکلیفیں اٹھائیں اور مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ وہ جمال الدین افغانی جو کہ عالم اسلام کے سب سے بڑے اخبار نویس تھے۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ اس علاقے کے کم از کم سب سے پہلے اہم اخبار نویس تھے تو بھی غلط نہ ہو گا۔ جنہوں نے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے کوششیں کیں۔ اور جن کا خواب آج شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد سے جہاں بہت سے دوسرے امور پر غور و فکر کی نئی نئی راہیں کھلی ہیں وہاں ہم نے کچھ ایسے حقائق کا مشاہدہ بھی کیا ہے جو اس سے پہلے صرف نظریاتی طور پر ہمارے ذہنوں میں محفوظ تھے۔ علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے فرمایا تھا:-

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہے سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک،
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

نظریاتی طور پر تو ہم سمجھتے تھے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں چند ایسی قدریں مشترک ہیں جو انہیں ملت واحدہ کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ لیکن عملاً ہم پر اس اسلامی کانفرنس نے واضح کیا ہے کہ عالم اسلام میں قدر مشترک بھی ہے اور درد مشترک بھی۔ قدر مشترک عقیدہ ہے نظریہ ہے۔ ایمان ہے۔ اور یہی نظریہ اب تیسری دنیا کا نظریہ بن رہا ہے اور بنے گا۔ اور تنہا یہی توانا اور جاندار نظریہ ہے۔ یہی صحت مند نظریہ ہے جو آخر کار عالم انسانیت کو اپنی آغوش میں لے گا۔ اسی نظریے پر عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہے۔ یہ نظریہ اسلام کا نظریہ ہے۔ اسلام کے

ترقی پسند تصور کا نظریہ ہے۔ میں اسلام کے ساتھ ترقی پسندی کے الفاظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ بدقسمتی سے اسلام کی جو مختلف تشریحیں کی گئی ہیں ان سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اسلام ترقی کا مخالف ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے زیادہ ترقی پسند عالم انسانیت میں اور کوئی مذہب نہیں۔ اسلام کا ترقی پسند نظریہ ہی وہ نظریہ ہے جو عالم اسلام کی قدر مشترک ہے۔ اور اسی پر آگے چل کر تمام انسانیت کی فلاح و بہبود کا دار و مدار ہے۔ اس کے بعد ہم میں درد مشترک بھی ہے۔ کیونکہ ہم جتنے مسلمان ملک ہیں ان سب کا مشترک دشمن ایک ہے۔ اور وہ ہے سامراج۔ سامراج نے ہر ملک کو گھاؤ لگائے ہیں، چرکے لگائے ہیں اور آج بھی ان زخموں سے لہو بہہ رہا ہے۔ اور یہی درد مشترک ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم آپس میں متفق ہوں۔ متفق ہونے کے لیے جو مثبت بنیاد ہے وہ نظریاتی اور ایمانی ہے۔ اس اسلامی کانفرنس کے بعد یہ لازم ہو گیا ہے کہ ان ملکوں میں جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے پاکستان کے لوگ اس زبان کو سیکھیں۔ اس زبان میں بات چیت کریں۔ اور اس زبان کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں۔ اسلیے سیاسی نقطہ نگاہ سے بھی عربی زبان کی اہمیت پاکستان اور اہل پاکستان کے لیے بہت زیادہ ہے

پھر میں آپ سے عرض کروں گا کہ ثقافتی لحاظ سے بھی عربی زبان عالم اسلام کے لیے تو اہمیت رکھتی ہی ہے، پاکستان کے لیے بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ آپ جانتے ہیں کہ آزادی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آزادی وہ ہے جو جسمی آزادی ہے اور دوسری اسمی آزادی ہے۔ اس آزادی کے معنی یہ ہیں کہ غیروں کا ظاہری غلبہ ختم ہو جائے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پاکستان کے لوگ اس نعمت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ اور فکری اور جسمانی لحاظ سے آزاد ہیں۔ ایک غیر قوم نے جس طرح بزور شمشیر ہمیں حلقہ بگوش بنا رکھا تھا۔ آج اس حلقے کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ اور یہ چیز ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔ لیکن ایک آزادی وہ ہے جو محض جسمی اور اسمی نہیں بلکہ حقیقی آزادی ہے۔ یہ حقیقی آزادی باطنی آزادی ہے، روحانی آزادی ہے، ثقافتی آزادی ہے، اور اقتصادی آزادی ہے۔ اور جب تک کوئی قوم یہ آزادی حاصل نہیں کر لیتی

وہ حقیقت میں آزادی کے تمام ثمرات اپنی جھولی میں نہیں ڈال سکتی۔ اس حقیقی آزادی، اس ثقافتی آزادی اور اس اقتصادی آزادی کے لیے اب عالم اسلام قدم آگے بڑھا رہا ہے۔

اسلامی کانفرنس نے امراض کی صحیح تشخیص کر دی ہے۔ وہ امراض افلاس اور جہالت ہیں اسلامی کانفرنس نے طے کیا ہے کہ ان امراض کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے اسلامی بنک کے قیام کی تجویز پیش کی گئی ہے تاکہ عالم اسلام کے اقتصادی وسائل کو یکجا کر کے تمام مسلمانوں کو اس طرح کے جتنے مسائل درپیش ہیں انہیں حل کیا جائے۔ اسی اقتصادی آزادی کے ذریعے ہمیں ثقافتی آزادی بھی حاصل ہو گی۔

ثقافتی آزادی کے ضمن میں ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سولھویں صدی عیسوی تک سائنس کی تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں۔ اور عربی زبان ہی سے اہل مغرب نے سائنسی علوم حاصل کیے اور اپنی قوموں کو ترقی دی۔ اور اپنے ملکوں کو استحکام بخشا۔ انہی کتابوں کے ذریعے علوم و فنون کی اشاعت ہوئی۔ لیکن افسوس آج ہم اپنے اس ثقافتی ورثے سے ناآشنا ہو چکے ہیں اور غیروں کو بچشم حسرت دیکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے ماضی کے اندر کیا کیا موتی ہیں۔ اور ہم دوسروں کے خزف ریزوں کے پیچھے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمیں سائنسی علوم آج اہل مغرب کے توسط سے ہی حاصل کرنے چاہئیں۔ کیونکہ انہی علوم کے ذریعے ہم اپنے اندر قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں وہ علوم بھی حاصل کرنے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد کی کتابوں میں ہیں۔ اور جنہیں ہم حاصل نہیں کر رہے۔ یہ علوم ہمیں اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم عربی زبان سے آشنا ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے علوم و فنون کا بیش بہا سرمایہ زیادہ تر عربی زبان میں ہی محفوظ ہے۔

اسلامی کانفرنس کے بعد اگر ہمیں اس کے ثمرات کو سمیٹنا ہے، اگر ہمیں ان ملکوں سے قریب تر ہونا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم عربی زبان سیکھیں تاکہ ہم ان ملکوں کے زیادہ قریب ہو سکیں۔ ان کے ہاں ہمارے جو لوگ آتے جاتے ہیں وہ یہ زبان سیکھنے کے بعد ان

کے اور زیادہ قریب ہو جائیں گے۔ یہ بالکل صحیح بات تھی جو ہمارے وزیرِ اعظم نے کہی تھی کہ:

"عالمِ عرب کی دولت اور وسائل اور پاکستان کی محنت۔ یہ دونوں چیزیں اگر یک جا ہو جائیں تو ایک نئی طاقت جنم لے سکتی ہے۔"

اور وہ نئی طاقت انشاء اللہ جنم لے گی۔ اور اس نئی طاقت کے جنم لینے ہی میں عالمِ انسانیت کی نجات ہے۔ اور ان دکھوں کا مداوا ہے جن میں دنیا گھری ہوئی ہے۔ جن میں دنیا پھنسی ہوئی ہے۔ اس لیے اگر ہمیں اس نئی طاقت کا سہارا لے کر قدم آگے بڑھانا ہے تو ہم عربی زبان سے اغماض نہیں کر سکتے۔ اعراض نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہر حال میں اس زبان کو اپنانا ہو گا۔

مجھے احساس ہے کہ نوجوان نسل کو یہ اشتباہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ عربی زبان بہت عظیم ہے۔ مگر اس کا سیکھنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ وہ بے شمار ایسے علماء کو اپنے گرد و پیش دیکھتے ہیں۔ جن کے دلوں کے ساتھ ان کی کمریں بھی خدا کی راہ میں جھک گئی ہیں۔ یہی زبان پڑھتے پڑھتے۔ لیکن وہ عربی کے دو لفظ بھی نہیں بول سکتے تو وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لوگ اس پر قادر نہیں ہیں تو ہم کیا سیکھیں گے۔ یہ زبان تو بڑی مشکل ہے۔ نحو و صرف کے قاعدے، گردانیں اور ضربیں یہ بڑی مشکل بات ہے۔ زبان بڑی اچھی ہے۔ لیکن سیکھنا اس کا بڑا محال ہے۔ یہاں مجھے پھر شیخ جمال الدین افغانی کے ان مقالات کا خیال آتا ہے۔ جن میں انہوں نے ہندوستان کے علماء کے طریقۂ تعلیم پر بڑی عمدہ طنز کی تھی۔ یہی درد جو آج آپکو محسوس ہوتا ہے، شیخ جمال الدین افغانی کو بھی محسوس ہوا تھا۔ وہ شمشیر برہنہ تھے اور حرف برہنہ کہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اپنے دور میں وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھرتے رہے اور لوگوں نے انہیں کہیں جم کر بیٹھنے نہ دیا۔ اور خود علماء بھی ہر جگہ سے ان کو نکالنے کے درپے رہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ یہ ہندوستان کے علماء بھی عجیب ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ یہ علم و حکمت کی کتابیں پڑھتے ہیں اور شام سے صبح تک چراغ کی روشنی میں "شمس بازغہ" پڑھتے رہتے

ہیں۔ لیکن اگر ان سے پوچھو کہ جب چراغ کی روشنی میں پڑھ رہے ہو۔ اگر اس چراغ کی چمنی اس کے اوپر سے اتار لی جائے تو یہ دھواں دیتا ہے۔ اگر چمنی اوپر رکھ لی جائے تو یہ دھواں نہیں دیتا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ تو یہ انہیں معلوم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ فقہ پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں۔ اور فقہ وہ علم ہے جو ملک کے قوانین سے متعلق ہے۔ جو ملک کے نظام سے متعلق ہے۔ اور اس کا بندوبست کرنا سکھاتا ہے۔ لیکن ان علماء کا حال یہ ہے کہ یہ ملک تو ایک طرف رہا ایک چھوٹا سا ادارہ بلکہ اپنا گھر بھی چلانے کے قابل نہیں۔ پھر شیخ نے کہا کہ یہ علم بیان پڑھتے ہیں۔ اس کی کتابیں رٹتے ہیں اور رٹاتے ہیں۔ مقصد اس کا یہ بھی ہونا چاہیئے تھا کہ انہیں زبان سے لگاؤ پیدا ہو۔ اور زبان کی فصاحت و بلاغت سے کچھ یہ بھی بہرہ ور ہو جائیں۔ لیکن حال ان کا یہ ہے کہ دو جملے بھی یہ بول نہیں سکتے۔ لہٰذا ٹھیک ہے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ عربی زبان مشکل ہے تو کم از کم شیخ کے الفاظ میں واقعہ یہی ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے والوں نے اسے مشکل بنا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن جب قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ:۔

"ولقد یسرنا القرآن"

"کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ آسان بنا دیا ہے"۔

جب قرآن آسان ہے تو قرآن کی زبان بھی آسان ہونی چاہیئے۔ اگر قرآن آسان ہے اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ آسان ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جو اس کی زبان ہے وہ مشکل ہو۔ قرآن خود بھی آسان ہے۔ اس کی زبان بھی آسان ہے۔ البتہ پڑھنے کے طریقے جو قدیم ہو چکے ہیں۔ فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اب انہیں خیر باد کہہ دینا چاہیئے۔ طریقہ جدیدہ کے مطابق اب ہمیں عربی زبان پڑھنی چاہیئے۔ آخر اس بچے کو زبان کون سکھاتا ہے۔ جو ایک گھر میں آنکھ کھولتا ہے۔ کوئی اسے گرامر نہیں پڑھاتا۔ کوئی اسے صرف و نحو نہیں پڑھاتا۔ اور آہستہ آہستہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولتے بولتے چند سالوں میں وہ فرفر خوبصورت

رداں زبان بولنے لگتا ہے تو ڈائریکٹ انداز سے ہی زبان سیکھی جا سکتی ہے۔ عربی زبان سیکھنے کے لیے اب بے شمار کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ طریقہ الجدیدہ فی تعلیم العربیہ حضرت الاستاذ محمد امین المصری کی ہے۔ اور اس طرح کی اور بہت سی کتابیں ہیں۔ جن کے ذریعے سے عربی زبان کی تحصیل اب بہت آسان ہے۔ لہٰذا میں آپ سے استدعا کروں گا کہ آپ عربی سیکھیں۔ اور اسے اپنا دینی، قومی، ملکی، سیاسی اور اقتصادی فریضہ سمجھیں۔ سیاسی اور اقتصادی جب میں کہتا ہوں، تو اس میں یہ بات یعنی آزادی بھی شامل ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ آزادی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آزادی وہ ہے جو جسمانی آزادی ہے۔ اسمی آزادی ہے، ظاہری آزادی ہے۔ انگریز آئے انہوں نے ہم پر حکومت کی۔ ہم نے آزادی کی جدوجہد کی۔ وہ چلے گئے۔ ظاہراً ہمیں آزادی مل گئی۔ لیکن آزادی کی ایک دوسری قسم بھی ہے جو زیادہ گہری اور مخفی ہے۔ وہ آزادی روحانی آزادی ہے۔ باطنی آزادی ہے۔ کسی قوم کی روح تب آزاد ہوتی ہے۔ جب وہ دوسری قوم کے ثقافتی اور اقتصادی غلبے سے نجات پاتی ہے۔ اگر ہم ظاہراً آزاد ہو جائیں مگر غالب اور حکمران قوم کی ثقافت اور اس کے اقتصادی غلبے سے ہم نجات حاصل نہ کر سکیں تو یہ آزادی نامکمل ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آج ظاہراً ہم آزاد ہیں۔ لیکن ابھی تک ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے ہمیں پوری آزادی نصیب نہیں ہو سکی۔ یہ ثقافتی آزادی، اقتصادی آزادی، روحانی آزادی اور باطنی آزادی ہمیں اسی وقت نصیب ہو گی، جب ہم اپنے علمی ورثے سے آشنا ہوں گے۔ جب ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارے پاس کتنا بڑا سرمایہ ہے۔ جب ہم احساس کمتری سے نکلیں گے۔ جب ہم غلامانہ ذہنیت کو خیر باد کہہ دیں گے۔ جب ہم ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا قرار دینا چھوڑ دیں گے۔ جب ہم نقد و نظر کی کسوٹی پر ہر شے کو پرکھنا شروع کریں گے۔ جب ہم یہ جانیں گے کہ سولہویں صدی عیسوی تک سائنس کی تمام تر کتابیں عربی زبان میں تھیں۔ اور یورپ نے ان سے فیض حاصل کیا تھا۔ اہل مغرب نے عربی زبان سے ہی ان تمام علوم کو حاصل کیا۔ اور اپنی قوموں کو ترقی دی۔ اور اپنے ملکوں کو استحکام بخشا۔ انہی کتابوں کے ذریعے سے مختلف علوم پھیلے۔ لیکن

آج افسوس یہ ہے کہ ہم اپنے ثقافتی ورثے سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اور غیروں کو بچشم حیرت دیکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہمیں کوئی تعصب نہیں ہے۔ ہمیں سائنس کے ان علوم کو جن پر اہل مغرب کا قبضہ ہے۔ سیکھنا ہے تاکہ ترقی کر سکیں۔ ہمیں اپنے اندر سائنسی قوت پیدا کرنی ہے۔ یہ بات اسلام کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ علوم وفنون جو ہمارے آباؤ اجداد کی کتابوں میں ہیں، اور جنہیں ہم حاصل نہیں کر رہے۔ انہیں بھی ہمیں حاصل کرنا ہے۔ اور وہ اس وقت حاصل ہوں گے۔ جب ہم عربی زبان سے آشنا ہوں گے۔ اور اس زبان کو سیکھیں گے جس میں بیشتر علوم وفنون کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ آج بدقسمتی سے غیر ممالک میں تو ان کتابوں کا چرچا ہے۔ مگر ہمارے اپنے مسلمان ملکوں میں کوئی ان کا پوچھنے والا بھی نہیں۔ جب ہمیں معلوم ہو گا کہ جو چیز بھی آج خیر ہے، اچھی ہے اور سچی ہے وہ حقیقت میں ہماری تھی اور ہماری ہے۔ ہمیں اس سے تعصب روا نہیں رکھنا چاہیئے۔ ہمیں اس سے تعصب نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے طالب علم اور نوجوان اپنے ماضی کے علمی ورثے کو کھنگالیں، دیکھیں اور غور کریں کہ ان کے دامن میں کتنے چمکتے ہوئے موتی ہیں۔ مگر وہ دوسروں کے خزف ریزوں پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھیں کہ ہم آج دوسروں کے چھوڑے ہوئے نشانات قدم پر ٹامک ٹوئیے مار رہے ہیں۔ ہم تو حقیقت میں قوموں کے رہنما بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ہم کہ جو آج دوسروں کے چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کرتے ہیں۔ حقیقت میں ہم زمانے کو اپنے خوانِ نعمت سے کھلانے کے لیے آئے تھے۔ ہم کہ جو دوسروں کے ٹمٹماتے ہوئے دیوں سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ خود ہمارے دامن سے بھی کبھی درخشاں آفتاب طلوع ہوا کرتے تھے۔ اور یہ یقین صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم عربی زبان سیکھیں۔ اور عربی زبان جانیں۔

تو حضرات گرامی! یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر عربی زبان سے میں محبت رکھتا ہوں اور جب پاکستان نیشنل سنٹر کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر زاہد ملک نے مجھے اس کلاس کے افتتاح

کی دعوت دی تو میں تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر یہاں حاضر ہوا۔ کیونکہ عربی زبان کے فروغ کے لیے کوشش کرنا حقیقت میں عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوشش کرنا ہے اور پاکستان کی مضبوطی اور پاکستان کے استحکام کے لیے کوشش کرنا ہے۔ یہ ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا بھی ہے۔ اور ہماری قومی سیاست کا تقاضا بھی ہے۔ اس میں ہمارے دین کی بھی ترقی ہے۔ اور ہماری دنیا کی بھی ترقی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ۲۵ سالوں میں پہلی مرتبہ آئین سازوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور پاکستان کے آئین میں عربی زبان کے فروغ کے لیے ایک شق شامل کی گئی۔ اور میں اس پر اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شق میں نے پیش کی تھی کہ عربی زبان کے فروغ کی ذمہ داری حکومت کی ہو گی۔ یہ حکومت کے ذمہ ہو گا کہ وہ عربی زبان کو فروغ دے۔ یہ ہمارے آئین کا حصہ ہے۔ اس لیے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عربی زبان کو فروغ دے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت عوامی امنگوں پر پورا اترنے والے اس آئین کو عملی جامہ پہنانے کا جو جذبہ اور عزم رکھتی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آئین کے نفاذ کو ابھی زیادہ عرصہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ قرآن حکیم کی صحیح طباعت کا قانون نافذ ہوا۔ اور اس کے بعد اب عربی زبان کی تدریس کے وعدے پر عمل شروع ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہم نے یہ طے کیا ہے کہ عربی زبان کے فروغ کے لیے پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اہم سنٹر قائم کریں گے۔ جن میں عربی زبان کو جدید طریقے سے پڑھایا جائے گا۔ اور انشاء اللہ جلد ہی ریڈیو اور ٹی وی سے بھی عربی زبان کی تعلیم دی جائے گی تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ عربی سیکھ سکیں۔

میں آخر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور پاکستان نیشنل سنٹر کے منتظمین کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہمیں جو بھی وسائل اختیار کرنا پڑیں یا جتنے بھی مصارف برداشت کرنا پڑیں ہم ان سے دریغ نہیں کریں گے۔ اور عربی زبان کی تدریس کے شائقین کو مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

حالیؒ اور اقبالؒ

"۱۹۴۷ء میں پانی پت سے تعلق رکھنے والے کچھ احباب نے حسبِ سابق یونیورسٹی سینٹ ہال لاہور میں یوم حالی منایا اور برادر گرامی ڈاکٹر مبشر حسن کی وساطت سے یہ خواہش کی کہ میں اس کی صدارت کروں۔ حالی کا مطالعہ کئے ایک مدت گزر چکی تھی، لہٰذا میں نے اپنی وزارت کے ایک دو ادیب افسروں سے کہا کہ وہ اس موضوع پر ایک تقریر لکھ دیں مگر جب تقریب سے چند گھنٹے پہلے میں نے اس تقریر کا مطالعہ کیا تو وہ میرے کام کی نہ نکلی۔ اس پر فوری طور پر حافظے میں جو چند تاثرات تھے اس کی بنیاد پر میں نے یہ خطبۂ صدارت دیا۔"

○

جناب صدر! خواجہ حبیب صاحب! حاضرین مجلس!

آج مجھے اپنی گفتگو کا آغاز ایک اعتراف سے کرنا چاہیئے۔ بے پناہ مصروفیتوں کی وجہ سے حالی کے کلام سے ایک مدت سے لاتعلقی سی ہو گئی تھی۔ غالباً مڈل اور میٹرک میں ان کی کتابیں پڑھیں۔ پھر جب اردو کا ایک امتحان دیا۔ تب ان کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ اور اس کے بعد سے کوئی ایسا موقع نہ ملا تھا کہ کبھی تفصیل سے ان کے ساتھ صحبت ہوتی۔ میں اپنے رفیق ڈاکٹر مبشر حسن کا ان کے غیاب میں ممنون ہوں۔ اور خواجہ حبیب صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کے اصرار سے پرانی یادیں پھر تازہ ہوئیں۔ اور ضرورتاً مجھے کچھ وقت بزم حالی میں بسر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ایک دو روز قبل اپنی منسٹری کے ایک فاضل افسر سے یہ کہا کہ وقت میرے پاس نہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ شاید میں کتابوں کی بھی ورق گردانی نہ کر سکوں گا۔ اس لیے آپ ایک تقریر لکھ دیجئے۔ اور

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہی وزیروں کا شروع سے طریقہ رہا ہے۔ اور آخر تک انشاء اللہ رہے گا۔

میں نے وہ مسودہ رات بڑے اہتمام سے اپنے کاغذات میں رکھا۔ اور آج صبح جب میں نے اسکا مطالعہ کیا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ وہ اس قابل نہ تھا کہ میں آپ کے سامنے پڑھتا اور اسے چھپا سکتا کیونکہ یہ میرا لکھا ہوا نہیں تھا۔ بہر طور اس کے بعد مجھے یہ تلاش ہوئی کہ کچھ کتابیں ملیں۔ کچھ کتابیں ساتھ بھی تھیں۔ کچھ کتابیں یہاں سے ملیں۔ اور چند گھنٹے میں نے آج حالی کے افکار کے ساتھ بسر کیے۔ اور حقیقت ہے کہ ذہن سے زنگ اترا۔ اور قلب و دماغ مستنیر ہوئے۔ اور اس کے لیے میں جناب خواجہ صاحب آپ کا اور آپ کے ارکان کا بیحد شکر گزار ہوں۔

مجھ سے پہلے بہت سے دوستوں نے جس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اس میں اقبال اور حالی ساتھ ساتھ چلتے ہیں گویا آج کی بزم حالی کا مرکزی نقطۂ بحث حالی اور اقبال تھے۔ حالی اور اقبال کے کلام اور ان کے افکار کا اور ان کی جد و جہد کا بھی جائزہ لیا جائے تو سرسری طور پر سطحی نگاہ میں جو فرق انسانی ذہن قبول کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک مسابقت کا شاعر ہے ایک مطابقت کا شاعر ہے۔ ایک نے۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

کی نغمہ سرائی کی دوسرے نے۔

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز"

کا نغمہ الاپا۔ اور آگے اس کی بہت سی توجیہیں بھی ہیں۔ ایسی توجیہیں بھی کی جا سکتی ہیں کہ حالی نے مطابقت کی بات کیوں کی اور اقبال نے مسابقت کی کیوں کی۔ کچھ لوگوں نے کہا اس لیے کہ حالی کے دور میں مغربی علوم کا اضمحلال اور اس کے کمزور گوشے لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے۔ یہ ان علوم کا دور آغاز بھی تھا اور دورِ عروج بھی۔ اور ہر شخص مغربی علوم سے مرعوب تھا۔ نقد و نظر سے کام لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اس لیے حالی نے بھی ملت

اسلامیہ کی نجات اس میں سمجھی کہ مغربی علوم سیکھے جائیں۔ اور اس راستے سے قافلے کو آگے بڑھایا جائے۔ مگر اقبال کے زمانہ میں مغربی علوم اپنی تمام تر ظاہری چکا چوند کے باوجود اپنے وہ گوشے بے نقاب کر چکے تھے جن میں ظلمتیں صاف صاف نظر آتی تھیں اور ۱۹۱۹ء میں آئین سٹائن نے جو نظریہ اضافت پیش کیا تھا۔ اس کے بعد تو بہت سے بودے اور کمزور پہلو بے نقاب ہو گئے تھے۔ اور اہل نظر برابر تنقید سے کام لے رہے تھے۔ اور اس طریق فکر کو اپنا چکے تھے کہ لوگوں کو مغربی علوم سے مرعوب ہونے کے بجائے نقادانہ ان کا مطالعہ کرنے اور ان کا جائزہ لینے کی دعوت دیں۔

یہ ساری توجیہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ حالی نے مطابقت کی بات کی۔ اور اس سیاق سباق میں اقبالؒ کی مسابقت کو اس کا حریف بنایا جائے۔ جب کبھی فنون جنگ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات نظر آتی ہے کہ کبھی کبھی ہزیمت اور شکست خوردگی کے بعد سپہ سالار جنگی تدبیر کے طور پر اپنا لشکر پیچھے بھی ہٹاتے ہیں۔ اور پیچھے ہٹنے کی بات بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنا بھی جنگ ہی کا ایک داؤ گھات ہوتا ہے۔ جنگ ہی کی ایک تدبیر ہوتی ہے۔ اور اپنی پسپا طاقتوں کو یکجا کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ کوئی شخص اس عمل کے متعلق خیال کر سکتا ہے کہ یہ تو سراسر شکست کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن وہ دراصل یہ اقدام سانس لینے اور آگے قدم بڑھانے کے لیے وقفہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یعنی "آگے چلیں گے دم لے کر" والی بات ہوتی ہے۔ اور حالی نے مطابقت کی جو بات کی حقیقت میں وہ ایسے ہی سپہ سالار کا انداز تھا۔ جس نے اپنے لشکر کو شکست خوردگی کے عالم میں دیکھا۔ اور اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ذرا دم لے۔ لشکر کو پیچھے ہٹائے۔ اس کو برباد نہ ہونے دے۔ اور پھر تازہ دم ہو کر دشمن پر ایسا شبخون مارے کہ اس کو تہس نہس کر دے۔

اقبال اور حالی کا جائزہ لیا جائے تو دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں قدر مشترک

بھی رکھتے ہیں۔ اور دونوں درد مشترک بھی رکھتے ہیں۔ دونوں کے ہاں ایک قدر ہے، ایک نظریہ ہے، ایک اصول ہے جس پر دونوں کا ایمان ہے۔ اور دونوں اس کے ثناء خواں ہیں۔ دونوں اس کے ترجمان ہیں۔ اور وہ نظریہ، وہ اصول، وہ قدر اسلام کی خاطر ہے۔ مسدس میں حالی نے تین ادوار پیش کیے ہیں ماضی، حال اور مستقبل اور اگر یہ کہا ہے کہ،

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی صبا اک ایک

یا حالی نے جب عظمت رفتہ کی مرثیہ خوانی کی تو اقبال کے کلام میں ابھی جبیب اللہ اوج وہ حصے پڑھ رہے تھے جن میں انہوں نے بھی اس انداز سے اندلس اور قرطبہ کے اندر اپنی عظمت رفتہ کو آواز دینے کی کوشش کی۔ اگر اقبال نے ہسپانیہ کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا کہ،

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

تو یہ اسی انداز کی مرثیہ خوانی ہے۔ اسی انداز سے عظمت رفتہ کا ماتم ہے جس انداز سے حالی مسدس میں ہمیں سرگرم نوا نظر آتا ہے۔ لیکن دونوں جہاں عظمت رفتہ کے مرثیہ خواں ہیں وہاں شوکت آئندہ کے ترجمان بھی ہیں۔ اور وہ ملت کے مستقبل کے لیے ایک ہی نظریہ کو اپنی امیدوں کی آماجگاہ سمجھتے ہیں کہ ملت پھر سے دامن مصطفیؐ سے وابستہ ہو جائے اور ملت پھر سے اسلام کو اپنے سینے سے لگا لے۔ تبھی وہ شاہراہِ تاریخ پر آگے قدم بڑھا سکتی علامہ اقبال دو قومی نظریے کے ترجمان تھے۔ لیکن سخت ناانصافی ہو گی اگر سرسید کی تحریک کو سرسری نظر سے پڑھا جائے اور سرسید کی اور ان کے رفقاء کار کی ان خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے جو دو قومی نظریے کو اولین سیاسی تصور کے طور پر ہندوستان میں عام کرنے کے لیے انہوں نے انجام دیں۔ سرسید مرحوم نے ایک زمانہ میں شروع شروع میں کانگرس میں مسلمانوں کو شامل ہونے سے روکا۔ مسلمانوں پر اس زمانے میں شورش پسندی طاری تھی۔ وہ

بھنائے ہوئے تھے۔ ان کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ ایسے میں اگر وہ اس تحریک آزادی میں شامل ہوتے تو اس کے نتائج کیا نکلتے اور انگریزوں کے ساتھ انکی معاندانہ روش کیا رنگ دکھاتی۔ سرسید کے سامنے یہ انداز تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی لوہا گرم نہیں ہوا۔ یہی حکمت عملی یعنی یہی ایک بیدار مغز قیادت کی بات ہے کہ وہ اپنی طاقت کو اندھا دھند کہیں ٹکرا نہ دے ورنہ اس کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکلیں گے ٹھیک ہے خلوص بڑی اچھی چیز ہے۔ ہماری تاریخ میں بہت سی شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے مخلصانہ طور پر ملت کی قیادت کی ہے۔ خلوص جو حکمت کے بغیر ہوتا ہے وہ آخرت میں تو ضرور قدر پانے کا مستحق ہے۔ لیکن دنیا میں اس کی کچھ قیمت نہیں۔ خلوص وہ معتبر ہے جو حکمت کے ساتھ ہو تب وہ دنیا میں بھی خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔ اور آخرت میں بھی اس کا وزن بہت ہوتا ہے۔ یہاں بہت سے قائدین تھے جنھوں نے آواز دی۔ دلوں کو گرمایا۔ اپنی خطابت سے اپنی عسکریت سے بے شمار سرفروشوں کو اکٹھا کیا۔ لیکن حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے اس ریزہ ریزہ اکٹھی کی ہوئی دولت کو انھوں نے جس طرح لٹا دیا جس طرح ان سرفروشوں کو استعماری قوتوں سے ٹکرا دیا۔ اور اس کے جو نتائج تاریخ نے ہمارے سامنے بہم پہنچائے ہیں۔ وہ ہماری سیاسی تاریخ کی ایک دردناک داستان ہے۔ سرسید احمد خاں جانتے تھے کہ یہ وقت نہیں ہے کہ مسلمان اس وقت سیاست میں حصہ لیں۔ انھوں نے علیگڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ اور ۳۰ سال بعد جا کر علیگڑھ کالج سے وہ نسل نکلی۔ وہ تعلیم یافتہ نسل جو مغرب کے حربوں کو جانتی تھی۔ جو انگریزوں کے علوم سے باخبر تھی۔ جو ان کے طرز فکر سے آگاہ تھی۔ جو ان کی زبان میں بات کر سکتی تھی۔ جو ان کی زبان میں جواب دے سکتی تھی تب کہیں جا کر مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس طرح اگر میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستان حقیقت میں علی گڑھ کی توسیع ہے۔ علی گڑھ کی ایک جامع تاریخ کا نام ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ ہم اقبال کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ حالی کی نظم شکوہ ہند پڑھیں تو اسکے اندر مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس کروٹیں لے رہا ہے۔

تھی ہماری قوم و ملت رسم و عادت سب جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو ناآشنا

ہندوستان کو خطاب کر کے اس زمانے میں اگر حالی نے یہ کہا تو جداگانہ قومیت کا تصور اور کیا چیز ہے جسے حالی جیسے پیش کر سکتے تھے۔

اس لیے یہ کہنا کہ حالی نے اور سرسید نے اور ان کے عظیم رفقاء نے مطابقت کی بات کی حقیقت میں صحیح نہیں ہے۔ یہ ان کے اندازِ فکر کو سمجھنے کی بات ہے۔ یہ اس گہرائی تک نہ پہنچنے کی وجہ سے ہے جو ان کے فکر میں کارفرما تھی۔ ان کی تدبیروں میں کارفرما تھی۔ اور جس کی وجہ سے مستقبل کا مورخ آج نہیں تو کل ان کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گا۔

اقبال اور حالی کی قدر مشترک ایک ہے۔ اور دونوں کا درد مشترک بھی ایک ہے دونوں مسلمانوں کی زبوں حالی پہ روتے ہیں، دونوں اشک فشاں ہیں، دونوں گریہ کناں ہیں، دونوں اپنی ملت کو غیروں کا نخچیر دیکھ کر دل پارہ پارہ رکھتے ہیں۔ دونوں کی شاعری کے اندر وہ فضا پائی جاتی ہے جو اس حزن اور غم سے عبارت ہے جو حزن اور غم مسلمانوں کی غلامی کی وجہ سے ان کے افکار میں پیدا ہوا۔ اس لیے میں اقبال اور حالی کو دو حریفوں کی صورت میں نہیں دیکھتا بلکہ حقیقت میں دونوں کو ایک ہی رستے کا راہی سمجھتا ہوں۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ منزل دونوں کی ایک تھی۔ نصب العین دونوں، کا ایک تھا۔ ان کے طریقے الگ الگ تھے۔ ان کی راہیں الگ الگ تھیں۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کیلیے ذرائع الگ الگ تھے اور وہ ذرائع اپنے اپنے دور کے لحاظ سے صحیح تھے۔ اگر اقبال اپنے دور میں حالی کا انداز اختیار کرتے تو تاریخ اور وقت سے مطابقت نہ رکھ پاتے۔ اور اگر حالی اپنے دور میں اقبال کا انداز اختیار کرتے تو وہ بھی تاریخ کے دھارے کا ساتھ نہ دے سکتے۔ اس لیے جو ہوا بجا ہوا

اپنے وقت پر ہوا۔ اور دونوں کا اتنا احسان ہماری ملی تاریخ اور ادب سیاست پر ہے کہ اس سے ہم قیامت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

حاضرین کرام! اقبال اور حالی کا جب ہم موازنہ کرتے ہیں۔ اور جب ان کا ہم بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ایک بات میں تو شاید میں اپنے آپ کو اس دور کے ایک مشہور نقاد کا ہم خیال محسوس کرنے لگتا ہوں۔ جنھوں نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ نئی نسل مسدس کو اپنے کتب خانے کی اوپر کی شیلف میں رکھ دے۔ شاید اس لیے بھی کہ اقبال نے اس لَے کو اتنا آگے بڑھایا اور اس قدر درجۂ کمال پر پہنچایا کہ اس کے بعد اس طرز کی شاعری گردِ بن جاتی ہے۔ اگر چہ بجائے خود مسدس کے اندر ایسے ٹکڑے ہیں جو لافانی ہیں جو لازوال ہیں۔ بات فکر کی کر رہا ہوں۔ بات اس نظریے کی کر رہا ہوں۔ ماحول کی کر رہا ہوں کہ جو مسدس حالی کے اندر کارفرما ہے۔ وگرنہ

وہ نبیوں میں رحمتؐ لقب پانے والے

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

کا ایک بند ہی ادبی لحاظ سے اور شعری لحاظ سے اتنا وقیع ہے کہ شاید اس نوع کی جتنی شاعری ہے وہ ایک طرف ہو۔ اور یہ بند ایک طرف ہو تو اس کا پلڑا بھاری رہے گا۔ لیکن فکر کے لحاظ سے اقبال نے اس کو اس ارتقار پر پہنچا دیا ہے کہ لوگ اس کی فضا میں گم ہو کر کسی اور طرف دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اور شاید اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی اور حالی کے ساتھ حادثہ ہی یہی ہوا۔ جب انھوں نے غزل سرائی شروع کی تو غالب، مومن اور ان کے ممدوح مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے لوگ تھے جن کے ہوتے ہوئے حالی کی آواز دب گئی۔ حالی کی شخصیت نہ ابھر سکی۔ جیسے ایک بڑ کے درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا پودا نظر نہیں آتا۔ اور جب حالی کی فکر کے ارتقار کا وقت آیا تو اقبال نغمہ سرا ہو چکے تھے۔ اور ان کی شہرت اتنی پھیل گئی کہ لوگوں نے ان سب نوا گران آرزو کو بھلا دیا بلکہ نظر انداز کر دیا۔

جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک دبستان فکر تھا۔ پھر سیرت نگاری میں بھی انھوں نے ایک دیانت دارانہ اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی تھے جن کی زبان حقیقت میں قند پارسی ہے۔ اور نثر شعر کا بدل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ "آب حیات" میں کہیں کہیں وہ انصاف کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے استاد کا ادب ان پر اتنا غالب ہے۔ اور اس قدر وہ اس کے احسانات سے دبے ہوئے ہیں کہ سیرت نگاری میں بھی ان کے احسانات کا بار اپنے کندھوں پر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن حالی نے سیرت نگاری کا جو انداز اختیار کیا اس میں جہاں دیانت ہے، جہاں امانت ہے، جہاں سلاست ہے۔ جہاں سیرت نگاری کے جدید اسالیب ہیں وہاں اس قدر عمق ہے۔ اسقدر گہرائی ہے۔ اسقدر گیرائی ہے کہ اس کے بعد بھی لوگوں نے سیرت نگاری کی ہے لیکن انکی کتابیں حالی کی سیرت نگاری کا پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ پھر اس کے بعد کم سے کم میری نظر میں تو کوئی وجہ اشتباہ نہیں۔ بہتر فیصلہ سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ اور دوسرے نقادان کرام کر سکتے ہیں کہ حالی کی غزل اقبال کی غزل سے یقیناً ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ ٹھیک ہے اقبال کے تغزل کا بھی اپنا ایک انداز ہے۔ لیکن وہ تو خود کہتے ہیں "مرا یاراں غزل خوانے شمر دند" لیکن حالی کی غزل میں جو سلاست ہے اور جو شیرینی ہے۔ جو مٹھاس ہے، جو رچاؤ ہے، جو فن ہے، جو زبان ہے، جو حیاداری کا ماحول ہے، جو مشرقیت کی لاگ لپٹ ہے جو اس انداز کا حجاب ہے کہ خود اپنے سے بھی وہ کوئی بات چھپاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا جواب نہیں ہے۔ اور وہ جو ایک ناقد کا میں حوالہ دے رہا تھا کہ مسدس حالی فلاں شلیف میں رکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حالی کی غزل بھلائی نہیں جا سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک ہم اس کی غزل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالی کی غزل کے اندر جو بات پائی جاتی ہے وہ ایسی ہے کہ اس دور کے غزل گو اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ آنے والے دور کے غزل گو بھی اس سے سیکھ سکیں گے۔ اور جب آج ہم

سے مختلف جو اس دور میں شعر و ادب سے کوئی مس نہیں رکھتے۔ اور خطبوں میں شعر بھی پڑھتے ہیں تو خالد علوی صاحب معاف کریں۔ غلط پڑھتے ہیں۔ مگر خالد علوی غلط نہیں پڑھتے اور جو شعر و ادب کو بھی شاید فاسقانہ اور صالحانہ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور جو چوب خشک مسجد ہیں۔ نہ سوختی نہ فردختی۔ حالی ان سے بالکل مختلف تھے۔ اور ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں مجھے افسوس ہے ہم نے انھیں بھلا دیا۔ خود میں نے آج اپنے اوپر حیف کی کہ اتنے عرصے تم نے اسے بھلائے رکھا۔ تم نے بھی اس کے افکار کے گلشن تازہ میں چہل قدمی کی کوشش نہ کی۔ اور آج میں نے اپنے دامن افکار کو اس کی گل چینی سے بھرا اور مجھے احساس ہوا کہ حالی ایسا شاعر ہے جو حال کا بھی شاعر ہے ماضی کا بھی شاعر تھا، مستقبل کا بھی شاعر ہو گا۔ آج ٹھیک ہے کہ اس کا یوم منانے کے لیے ہمیں بہت جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اور بہت کم لوگ ہیں جو ابھی تک اس کی زبان سمجھتے ہوں۔ اور اس کی گفتگو سمجھنے کی صلاحیت یا خواہش رکھتے ہوں۔ لیکن بزم حالی کو میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر زندگی رہی تو سال آئندہ یوم حالی پورے پاکستان میں ملک گیر سطح پر منایا جائے گا۔

افکار حالی سے ابلاغ کی ساری مجلسیں آراستہ ہوں گی۔ اور حالی کی حقیقت اور اس کی عظمت سے پوری طرح قوم کو روشناس کرایا جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ اور میں انشاء اللہ اس وعدہ کو پوری طرح نبھاؤں گا۔ آپ یقین مانیں کہ حالی کے متعلق آپ کے اس اجلاس نے میرے احساس کو بیدار کر دیا ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو آئندہ یہ احساس ہمیشہ بیدار ہی رہیگا۔

عنایت اللہ مرحوم کی یاد میں

"روزنامہ "مشرق" کے بانی عنایت اللہ مرحوم میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ زندگی میں یہ دن بھی دیکھنے تھے کہ اپنے کتنے ہی پیاروں کی برسیاں منانے کے لیے زندہ رہوں۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے اتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

عنایت صاحب کی دوسری برسی پر یہ تقریر اسی کسک کی آئینہ دار ہے۔"

○

الحمد لله ربّ العلمین والسّلام علیٰ سیّد المرسلین وعلیٰ الہٖ و

اصحابہ اجمعین من یومنا ھذا الیٰ یوم الدین

جناب زبیری صاحب ۔ خواتین و حضرات !

ایک شعر بہت مشہور ہے اور کسی حد تک فرسودہ بھی ۔ نہ میں نے کبھی اسے پسند کیا اور نہ اس کے مفہوم پر میں نے یقین کیا مگر کچھ عرصہ سے مجھے اس میں معنویت بھی نظر آتی ہے اور اس میں حسن بھی ملتا ہے ۔ شعر وہی ہے جو آپ سب جانتے ہیں ۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

زندگی کے اس مختصر سفر میں ایسے ایسے دوست اور ایسے ایسے پیارے بچھڑ گئے کہ اب یوں لگتا ہے جیسے سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں اور میرا حال اس مسافر کا سا ہے جو قافلے سے بچھڑ کر ایک تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا ہو ۔ دوستی بڑا عجیب رشتہ ہے دوست مر جاتے ہیں مگر دوستی

نہیں مرتی۔ دوست فنا کی گھاٹ اُتر جاتے ہیں مگر دوستی فنا کے گھاٹ نہیں اترتی۔ دوستوں کی زندگی میں دوستی ایسے ہے جیسے اندھیروں میں ایک چمک اور مرنے کے بعد ایسے ہے کہ نہ مٹنے والی جان گسل کسک۔ دوست کی زندگی میں دوستی پھول ہے اور اس کے مرنے کے بعد ایک زخم۔ اور پھول اور زخم میں بڑی مشابہت بھی ہے۔ اس لیے اگر میں آج کے تقریروں کے بارے میں اپنا حال اس شعر کی صورت میں ؎

لختے بر داز دلِ گذرد ہر کہ زپیشم
من قماش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

لیکن عنایت صاحب سے تعلق صرف میرا ہی تو نہ تھا ان کا غم غمِ ذات ہی تو نہیں غمِ حیات بھی تو ہے غمِ دوستاں ہی نہیں غمِ دیگراں بھی ہے۔ آپ نے سنا کہ انھوں نے مشرق سے لے کر مغرب تک جو صحافت کے پھول کھلائے تو ان کا غم مشرق والوں ہی کا غم نہیں مغرب والوں کا بھی غم ہے۔ ان کا غم سب کا غم ہے۔ اور اس نقطہ نظر سے جب میں عنایت کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں سے تیرہ چودہ سال کی رفاقت کے سمندر میں سے جو چند سیپیاں چننے کے قابل ہی ہو سکا ہوں وہ یہ ہیں جو میں پیش کروں گا۔

اس دورِ ابلاغ میں پریس کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پریس پر اور انفرمیشن میڈیا پر جیسا کہ میرے دوست ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے کہا عنایت صاحب کی بدولت اور ان کی صحبت کے فیض سے مجھے کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ اور یہ اجتماع جو ابتدا میں شعبہ صحافت کا اجتماع بھی تھا اور اس میں اہلِ صحافت بھی موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ پریس کے بارے میں اور اس کے فرائض کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ بہت وسیع ہے اور اسے آسانی سے چند لفظوں میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ پریس کا کام کیا ہے؟ آپ پڑھیں تو لکھنے والے لکھتے ہیں کہ رائے عامہ کو گائیڈ کرنا، رائے عامہ کو ٹیچ کرنا اور اس کو انفارم کرنا، اس کو ایجوکیٹ کرنا، اس کو انٹرٹین کرنا، اس کو انسپائر کرنا، اس کو پروٹیکٹ کرنا اور رہنما جانے رائے عامہ کے ضمن میں اور کیا کیا کرنا صحافت میں شامل ہے۔ یہ ایک وسیع سوال ہے۔ اور

صحافت رائے عامہ کو دیتی بھی اور رائے عامہ سے لیتی بھی ہے۔ رائے عامہ سے اس کے جذبات لیتی ہے، اس کی خواہشات لیتی ہے، اس کے مطالبات لیتی ہے۔ اور اسے دیتی ہے اپنے ویوز، اپنی رائے، اپنی ججمنٹ، اپنا فیصلہ۔ وہ صحافت جو صرف دیتی ہے وہ بھی مکمل نہیں جو صرف لیتی ہے وہ بھی مکمل نہیں۔ جب تک کہ لین دین میں وہ پوری طرح ٹھیک طرح اس معیار پر پوری نہیں اُترتی مکمل صحافت کہلانے کی حق دار نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صحافت ایک آئینہ ہے جس میں معاشرہ نظر آتا ہے۔ مگر آئینہ ہی نہیں وہ آئینہ اگر ہے تو ان معنوں میں بھی ہے کہ وہ معاشرہ ہی کی آئینہ نہیں ہے بلکہ معاشرہ کو آئینہ بھی دکھاتی ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتی کہ کیا ہے وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ حال ہی کی علمبردار نہیں ہے وہ مستقبل کی بھی غماز ہے۔ اور ان وسیع تر ذمہ داریوں اور مفاہیم و مطالب میں جب میں عنایت صاحب کی کنٹری بیوشن کو دیکھتا ہوں تو بہت کم لوگ بعض پہلوؤں میں مجھے ان کے مدِمقابل نظر آتے ہیں بلکہ بعض پہلوؤں میں وہ یکتا ہیں منفرد ہیں۔ اور ان تجربات میں کوئی شخص ان کا شریک نہیں۔ سب سے پہلی بات تو میں ان کے کردار میں وہ دیکھتا ہوں، جو ہر حقیقی آدمی میں ہوتی ہے کہ وہ خود ساز تھے سیلف میڈ تھے وہ ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے انھیں وہ بیساکھیاں حاصل نہ تھیں جو سرمایہ کی صورت میں، خاندان کی صورت میں، برادری کی صورت میں ترقی کرنے کے لیے زندگی کے سفر میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔ وہ ایک دوست کے لفظوں میں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کی اور انھوں نے حقیقت یہ ہے کہ غریبی میں ہی نام پیدا کیا، غریبی میں زندگی بسر کی غریبی میں رہے اور غریبی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے مرتبے، مقام کی بات الگ ہے ان کے رکھ رکھاؤ کا معاملہ دوسرا ہے ان کی ذوقِ نفاست کی بات اور ہے لیکن عملاً وہ غریب رہے غریب مرے اور مجھے وہ شعر اقبال کا یاد آتا ہے کہ

میرا پیام امیری نہیں غریبی ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

عنایت صاحب نے عزیبی میں نام پیدا کیا، دُوسری بات جو اُن کی خصوصیت میں سے ہے وہ نُدرت ہے۔ وہ کبھی کسی کی راہ پر نہیں چلتے۔ وہ جو شعر ہے

تراشش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن حرام است

اپنے تیشے سے خود انھوں نے اپنی منزل تراشی، اپنا رستہ تراشا اس لیے کہ دوسروں کی راہ پر چلنا ان کے لیے حرام تھا، چبائے ہوئے لقموں کی جگالی کرنا ان کے نزدیک نفاست سے بعید تھا۔ اور اسی لیے انھوں نے جو اخبار نکالا وہ ندرت ہی ندرت تھا اور اس اخبار میں انھوں نے تمام ذرائع ابلاغ کا مقابلہ کیا وہ جانتے تھے کہ ٹی وی کا دور ہے، یہ ریڈیو کا دور ہے۔ یہ ڈائجسٹوں کا دور ہے۔ یہ شعر و ادب کا دور ہے۔ انھوں نے اپنے اخبار میں وہ تمام خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے جو ان تمام ذرائع ابلاغ سے دلچسپی رکھنے والوں کا دامن کھینچ سکیں۔ ٹی وی اور ریڈیو والے جائیں کہ ریڈیو اور ٹی وی پر کیا آرہا ہے اور کیسا ہے اور اس میں نقد و نظر کے نئے نئے زاویے کیا ہیں اور وہ تمام تر مواد جو ڈائجسٹوں کی زینت بنتا ہے اور ان کے قارئین کے لیے دامن کشی کا باعث بنتا ہے وہ بھی اس اخبار میں موجود ہے۔ وہ آپ نے سنا کہ بچّوں کا، عورتوں کا اخبار۔ اور دینی ذوق رکھنے والوں کا اخبار، ٹانگے والوں کا اخبار، چھابڑی والوں کا اخبار اور صدر شعبۂ صحافت کا اخبار، سب کا اخبار سیاست دانوں سے لے کر طالب علموں تک کا اخبار وہ تھا جسے عنایت صاحب نے لکھا۔

اور عنایت صاحب کی تیسری خصوصیت یہ تھی جس کی طرف ڈاکٹر صاحب نے بھی اشارہ کیا کہ وہ طالب علم تھے صحافت کے طالب علم رہے اور طالب علم مرے۔ میں نے کبھی انھیں تیرہ چودہ سال کی اس دوستی میں نہیں دیکھا جب وہ کچھ نہ کچھ سیکھنے کے موڈ میں نہ ہوں، جب انھوں نے اس فن پر نئی آنے والی کوئی نہ کوئی کتاب نہ پڑھی ہو اور اس کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ جب وہ بیرونی سفر پر گئے ہوں اور انھوں نے صحافت کے نئے نئے افق دیکھنے کی تمنا ظاہر نہ کی ہو ان کا کوئی اور

مشغلہ نہ تھا ان کا اوڑھنا بچھونا صحافت تھی وہ ایک طالب علم تھے۔ اتنا وسیع المطالعہ شخص صحافت کے فن پر پریس کی ترقی پر اس کے جدید شعبوں پر میں نے اپنی زندگی میں اتنا وسیع المطالعہ شخص اور کوئی نہیں دیکھا اور جب میں کہتا ہوں کہ میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا تو ماضی کی بات تو میں اتنے وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن کہتے ہیں کہ وزارت اطلاعات میں بڑے بڑے جغادری ماہرین صحافت اور ماہرین فن جمع کیے جاتے ہیں اور جمع رہتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کا حق محفوظ رکھتا ہوں لیکن میں ان ساری معلومات کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں جو ایک وزیر اطلاعات کو حاصل ہو سکتی ہیں کہ عنایت صاحب کا اس پہلو میں کوئی مقابل مجھے نظر نہیں آتا ایک اور خوبی جو ایک صحافی کی بھی خوبی ہے ایک انسان کی خوبی تھی ایک دوست کی خوبی تھی وہ یہی تھی کہ وہ ایک درویش تھا ایک درویش جو کبھی اپنے پاس زائد چیزیں نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہمیشہ اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیتا جس کے پاس کبھی اچھا قلم محفوظ نہیں رہا اچھے بٹن محفوظ نہیں رہے۔ اچھی ٹائیاں محفوظ نہیں رہیں۔ جو جب کبھی یہ تحفے پاتا اور دیکھتا کہ میری ضرورت سے زیادہ ہیں تو اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیتا اس نے جائیداد نہیں بنائی۔ اس نے دولت اکٹھی نہیں کی اور اس کے ساتھی بتا سکتے ہیں کہ وہ بنک بیلنس نام کی کسی چیز سے آشنا نہ تھا۔ اس کا ذاتی اثاثہ کچھ نہ تھا وہ کبھی اپنے ذاتی مکان میں نہیں رہا۔ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہا وہ ایک پرندہ تھا جو آزاد تھا آزاد فضا میں اڑتا تھا کبھی ایک درخت پر کبھی دوسرے درخت پر لیکن کبھی کسی درخت پر بسیرا نہ کیا۔ کسی پہ آشیانہ نہیں بنایا۔ مجھ سے ایک مرتبہ کہا کہ میں نے ایک ماہر نفسیات سے اپنا انالسز کرایا ہے لندن ہی میں بات ہو رہی تھی اور اس نے میرے عوارض کی بنیاد ایک بات بتائی ہے۔ میں نے کہا عنایت صاحب کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ تم میں سنس آف پوزیشن Sense of Possession نہیں ہے تم میں ملکیت کا، اپنی ذاتی ملکیت کا احساس، شعور، طلب، شوق نہیں ہے۔ تم کسی چیز کو اپنا نہیں بنانا چاہتے ملکیت نہیں بنانا چاہتے۔ یہ ایک درویش کی ہی خوبی ہو سکتی ہے اور ان میں

ایک اور خوبی یہ تھی اور یہ اس خوبی کا تتمہ ہے اور درویشی کا لاحقہ اور اس کا لازمہ ہے کہ وہ ایثار مجسم تھے۔ اپنے لیے کچھ نہیں بنایا مگر ہمیشہ یہ فکر رہی اور یہ خیال رہا کہ میرے ساتھی ضرور کچھ بنا لیں میرے ساتھیوں کا ضرور کچھ بنے۔ جس خاندان کے یعنی مشرق کے خاندان کے وہ سرپرست تھے اپنے لیے کچھ نہ بنایا مگر اپنے خاندان میں سے ایک ایک ممبر کے لیے بنانے کی کوشش کی اور جب معلوم ہوا کہ فلاں نے کچھ بنایا ہے تو خوش ہوئے دوستوں میں ذکر کیا چرچا کیا اور اس طرح دوسروں کی خوشی میں اپنی خوشی ڈھونڈی دوسروں کے دکھ میں اپنا دکھ محسوس کیا اور دوسرے اگر چہرے پر مسکراہٹ لیے ہوتے نظر آئے تو عنایت صاحب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کا نور دکھائی دیا۔ یہ عنایت صاحب تھے۔ میرے دوستوں نے مجھے بتایا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ انھوں نے انٹرویو دیا تھا اسے میں بھول چکا تھا۔ ٹی وی پر ایک انٹرویو دیا تھا اگر مجھے یاد دلایا جاتا تو میں ٹی وی والوں سے کہتا اگر وہ اتنے سمجھ دار ہیں اگر انھوں نے وہ آواز محفوظ رکھی ہو جو امر ہے تو میں ان سے کہتا آج وہی ٹی وی انٹرویو پھر سے ٹیلی کاسٹ کرتے۔ لیکن آج اگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ پروگرام بن چکے ہیں تو میں اہتمام کروں گا ٹی وی والوں سے کہوں گا کہ ان کے پاس اگر وہ انٹرویو ہے تو کل پاکستان کے تمام ٹی وی سٹیشنوں سے اسے ٹیلی کاسٹ کریں۔

میرے دوستوں نے کہا کہ میں ان کا قریبی دوست تھا اور مجھے مشرق والوں کے لیے مکان ڈھونڈنا چاہیے۔ ان کے لیے نیا مکان بنانا چاہیے میں تو اس سے بڑھ کر مشرق والوں کے لیے چاہتا ہوں۔ اور کیا خبر کہ میں اس کا آغاز بھی کر چکا ہوں اور کیا عجب کہ وہ چیز کہ جس کے بیج بوئے گئے ہیں وہ نشوونما پائیں اور آپ دیکھیں کہ وہ صحیح خراج تحسین جو میں اپنے مرحوم دوست کو پیش کر سکتا ہوں وہ میں نے پیش کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں نیشنل پریس ٹرسٹ کے ضمن میں میرے لیڈر جناب بھٹو کا وعدہ تھا میرا وعدہ تھا ہم نے اس کا آغاز کیا کہ ٹرسٹ کے جو سیٹھ مالکان تھے جو انڈسٹریلیسٹ مالکان تھے جو سرمایہ دار مالکان تھے انھیں ہٹایا اور کارکن صحافیوں

کرے در پے ٹرسٹ کا چیئرمین بنایا لیکن میں ابھی یہ نہیں کہتا کہ اس وعدے کو پوری طرح ہم نے ایفا کر دیا ہے۔

یہ اس کا آغاز ہے لیکن میں جانتا ہوں مجھے اپنے لیڈر کی فراست پر اس کے لفظوں پر بھروسہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وقت آئے گا۔ ان کے عہد میں آئے گا ان کے پیریڈ میں آئیگا جب ٹرسٹ کے اندر جو اخبار ہیں ان کے کارکنوں کو ملیں گے اور مشرق بھی مشرق کے کارکنوں کا اخبار ہے۔ اور آخر میں ایک حرف اس شعبۂ صحافت کے بارے میں بھی کہ جنھوں نے ازراہِ کرم ہمیں قبائے فضیلت پہنائی اور بہت سے مطالبات کیے۔ میں صرف اس موقع پر اس طالب علم کے لیے کہ جس نے صحافت کا یہ میڈل لیا ہے یہ پیشکش کرتا ہوں کہ حکومتِ امریکہ کی طرف سے ابھی حال ہی میں حکومتِ پاکستان کو صحافت کے چند وظائف چند سکالرشپ یہاں کے قابل صحافیوں کو دیے جانے کا اہتمام ہوا ہے۔ میں اس میں ایک سکالرشپ مسٹر رمضان اظہر کو دیتا ہوں۔ اور ایک آفر تھا ٹ بھی جو ضیا صاحب کے قصور کی وجہ سے پہلے مجھے نہیں سوجھا۔ انھوں نے یاد نہیں کرایا مشرق میں ایک صحافی تھے ہمارے دوست اور مشرق کے مشہور کارکن مسٹر اشرف طاہر اور جواں سالی میں انھوں نے وفات پائی میں ان کے لیے اسی مہینے سے وزارتِ اطلاعات کی طرف سے تین سو روپے ماہانہ کے وظیفہ کا اعلان کرتا ہوں۔

مقامِ انیس

"دبستانِ انیس راولپنڈی کی طرف سے یکم دسمبر ۱۹۷۴ء کو اُردو زبان کے عظیم شاعر میر ببر علی انیس کی صد سالہ (۱۸۷۴ - ۱۹۷۴ء) برسی کے موقع پر لیاقت میموریل ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ یہ تقریر اسی جلسے میں کی گئی۔ اس کا متن ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے تیار کیا گیا ہے"

دانشورانِ گرامی اور حاضرینِ مجلس!

میں انیس نہیں کہ ان کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ کہہ سکوں ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

انیس پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ میں کوئی نئی بات نہ کہہ سکوں گا۔ مگر کچھ باتوں کو اپنے انداز میں کہنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

کہا یہ جاتا ہے کہ بدقسمتی سے انیس کو اردو شاعر سمجھنے کے بجائے مذہب کا شاعر سمجھ لیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں، کاش ایسا ہوتا، یہ بدقسمتی نہیں! بدقسمتی تو یہ ہے اور میں حرفِ برہنہ کہہ رہا ہوں کہ بعض کم نظر، کم بین اور کم سواد لوگوں نے اسے مذہب کا شاعر سمجھنے کی بجائے مذہب کے ایک مکتبِ فکر کا شاعر سمجھ لیا ہے۔ وگرنہ یہ بات نہ ہوتی کہ آج انیس شناسی تو رہی ایک طرف انیس کا نام جاننے والے بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں جو حیرت زدہ ہو کر پوچھتے ہیں کہ آج یہ انیس کے سلسلے میں جو صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے، یہ انیس کون ہے؟ اور جو لوگ انیس کو جاننے والے ہیں۔ انہوں نے بھی معذرت کا انداز اختیار کرتے ہوئے یہ کہا کہ انیس نے واقعاتِ کربلا میں لکھنؤ کے معاشرے کی رنگ آمیزی کی ہے اور بس۔ لیکن میں اس سے مختلف زاویۂ نظر رکھتا ہوں۔ میں نے انیس کو پڑھا ہے اور مجھے یہ پورا احساس ہے کہ میں نے جو ٹوٹی پھوٹی اردو زبان سیکھی ہے وہ انیس سے سیکھی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں تیسری

چوتھی جماعت کا طالب علم تھا تو انیس پڑھا کرتا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ آج بھی جب میں کبھی اپنے ذاتی غم کے لیے کوئی پناہ گاہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں تو کلام انیس پڑھتا ہوں، جیسے میدانِ کربلا میں ۷۲ نہیں ۷۳ نفوس تھے اور شاید انیس جسم کے لحاظ سے نہ سہی رُوح کے لحاظ سے اس معرکے میں ضرور شریک تھا۔

انیس مزاج شناسِ اہلِ بیت ہے اور اس نسبت سے مزاج دانِ خیر ہے کہ خیر کا تصوّر اہلِ بیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اہلِ بیت کو خیر سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ تُعرفُ الاشیاء باَضدادِھا۔ چیزیں اپنی اضداد کے واسطے سے ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ خیر کو سمجھنے کے لیے شر کا سمجھنا بہت ضروری ہے اور اس اعتبار سے جہاں انیس مزاج دانِ خیر تھے وہاں شر کو بھی خوب پہچانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے معرکۂ کربلا کو رُوح کی آنکھ سے دیکھا تو اس طرح دیکھا کہ جیسے وہ فی الواقعہ ہوا تھا۔ اور جب ہم انیس کے وہ بول پڑھتے ہیں جو اشقیاء کی زبان سے کہلوائے گئے، اُن کلمات کا اندازہ کرتے ہیں جو اہلِ بیت سے صادر ہوئے، وہ صبر دیکھتے ہیں جو حسینؓ اور حسینؓ کے گھر والوں نے کیا۔ وہ جبر دیکھتے ہیں جو یزیدیوں نے روا رکھا تو ہمیں محسوس ہی نہیں ہوتا بلکہ یقین آجاتا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اور اس کے علاوہ تصویر کا کوئی دوسرا رُخ ممکن ہی نہیں تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انیس کا کلام الہامی نظر آتا ہے۔ ایسے واقعات اور باتیں ان پر القاء ہوئیں۔ ایسی فضا اور ماحول کا ان پر الہام ہوا جو آج سے صدیوں پہلے بیت چکا تھا مگر انیس نے عرب سے دور ایک غیر عرب معاشرے میں بیٹھ کر اس کا تماشا کیا اور اسے دیکھا۔

اسی ضمن میں اُردو زبان کے متعلق بھی گفتگو ہوتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اُردو ادب میں انیس کا مقام متعیّن کیا جائے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میر انیس کے

دادا میر حسن کی مثنوی بدرِ منیر آیا سحر البیان تھی کہ نہیں لیکن میں اتنا تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سحر البیان میر حسن کے خاندان کا شرف تھا اور اگر مثنوی کے ذریعہ یہ بات ثابت نہیں ہوئی تو انیس کی ولادت کی صورت میں یہ بات ضرور پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ جب میں انیس کے بیان کو دیکھتا ہوں۔ ان کی زبان کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ زبان کا کوئی جادوگر یا ساحر ہے جو لفظوں کو زندگی عطا کر رہا ہے۔ لفظوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور پورا منظر کھنچ کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ لفظ بول اُٹھتے ہیں اور انیس کے قلم سے نکل کر لفظوں کے اندر کلام کرنے کی قوت آجاتی ہے۔ ایک نقاد زبان نے ٹھیک لکھا ہے کہ معمولی سے تین لفظ ہیں۔ کیا، کہاں اور کچھ۔ ان تین لفظوں کو انیس نے جس طرح نظم کیا ہے۔ اس سے زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شیفتہ نے جب میر انیس کا وہ مصرعہ سنا جس میں 'کیا' نظم ہوا ہے تو انیس سے کہا تھا کہ اب مرثیہ ختم ہو گیا۔ اس 'کیا' کے بعد اب اور کوئی کیا کہے گا!۔ وہ مصرع کیا تھا، چشمِ تصوّر سے غور کیجیے۔ امام حسین علیہ السلام میدانِ کربلا میں شہید ہونے کے لیے جب یزیدی لشکر کے سامنے تشریف لاتے ہیں تو اس وقت تنہائی کا جو عالم تھا، انیس نے اُسے یوں بیان کیا ہے ؎

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اس مصرع کی شرح و بسط میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن انیس کا مدّعا پھر بھی تشنۂ تفسیر ہی نظر آئے گا۔ لفظِ 'کہاں' کی اعجاز بیانی دیکھنا مقصود ہے تو انیس کا یہ شعر دیکھیے۔

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ   چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اس شعر میں 'کہاں' کی معنویت اتنی بلیغ ہے کہ دوسرے شعرا کے دواوین اس پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ لفظِ 'کچھ' کا استعمال بھی دیکھیے۔ حسین علیہ السلام کے ایک ساتھی جنابِ حُر کا دمِ آخر ہے۔ موت کو نیند بنا دینے والے حسینؑ کو وہ آواز دیتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

کچھ اُڑھا دیجیے مولا، مجھے نیند آتی ہے

میں زبان کی لطافتوں کا رمز آشنا نہیں اور نہ میں اہل زبان میں سے ہوں۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ زبان کے لحاظ سے "کیا، کہاں اور کچھ" کو میر انیس نے جس طرح نظم کیا ہے، اُردو زبان اس کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔

لوگ کہتے ہیں کہ انیس مرثیہ گو شاعر ہے لیکن کسی نے یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ انیس نے مرثیہ نگاری میں کیا کیا علوم سمو دیئے ہیں۔ جب وہ جنگ کی بات کرتے ہیں تو جنگ کی جملہ اقسام، متعلقہ الفاظ، اُن کے لیے تراکیب، ہتھیاروں کے نام، آلاتِ حرب کی نوعیت۔ ان سب کو دیکھا جائے تو فنِ سپہ گری کی ایک لغت تیار ہو سکتی ہے تنہا جنگ، دو بدو جنگ، یلغار، گھمسان کی لڑائی، معرکہ آرائی، مبارزت طلبی۔ کیا کیا بات ہے جو انیس نے پیدا نہیں کی اور وہ کون سا پہلو ہے جسے نہیں نبا ہا۔ جس پہلو کو بھی پیش کیا ہے، اس طرح پیش کیا ہے جس طرح فنونِ جنگ کا کوئی ماہر اسے پیش کر سکتا ہے۔ کیا یہ بات فنونِ جنگ پر کامل نظر رکھے بغیر پیدا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح "شیر" کا لفظ ہے۔ انیس نے شیر کو کیا کیا نام دیتے ہیں اور اس کے لیے کیا کیا لفظ استعمال کیے ہیں۔ یہی نہیں شیر کے بولنے کے لیے۔ اس کے بپھرنے کے لیے، اس کے گرجنے کے لیے، اس کے جوش میں آنے کے لیے، اس کے ہونکنے کے لیے، اس کے جھپٹنے کے لیے، اس کے ترائی میں بیٹھنے کے لیے، اس کے ڈکارنے کے لیے اور اس کے دیگر مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کے لیے انیس نے کیا کیا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کوئی شخص جو علم الحیوانات کا ماہر نہ ہو وہ یہ بات پیدا نہیں کر سکتا۔ انیس مرثیہ گو تھے لیکن انسانی نفسیات کا جو علم انیس کے پاس ہے۔ شاید ہی کسی اور کے پاس ہو۔ کم سے کم اُردو شاعری میں تو اس کی نظیر اور اس کی مثال میرے پاس نہیں ہے کہ انسانی نفسیات میں اتنا بڑا ماہر کوئی شاعر پیش کیا جا سکے۔

یہ تو رہا زبان و بیان کا معاملہ۔ جہاں تک بعض دوسرے پہلوؤں کا تعلق ہے مثلاً

فردوسی سے انیس کا موازنہ تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اگر انیس یونان میں ہوتا تو ہومر سے بڑا شاعر ہوتا۔ اگر انگلستان میں ہوتا تو شیکسپیئر سے زیادہ اس کی پرستش ہوتی اگر ایران میں ہوتا (کسی ایرانی دوست کی دلشکنی مُراد نہیں)، تو لوگ فردوسی کو بھول جاتے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ "کیا کہا؟" اور "کس طرح کہا؟" فردوسی کو جو مقام "کس طرح کہا" میں حاصل ہے، اُس سے مجھے انکار نہیں لیکن "کیا کہا" میں فردوسی انیس کا پاسنگ بھی نہیں۔ کردار شیکسپیئر کے ہاں بھی ہیں۔ کردار فردوسی کے بھی ہیں لیکن وہ سب کردار خود ان کی اپنی تخلیق ہیں۔ ان کرداروں کے خالق وہ خود ہیں لیکن انیس اپنے کرداروں کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔

آج زمانہ انسانیت سے مایوس ہے۔ انسان کی انسانیت ختم ہو رہی ہے۔ اعتبارِ بشریت اٹھتا جا رہا ہے۔ آپ عظمتِ آدم کے گُن گاتے رہیئے۔ عملی طور پر دیکھیئے تو انسان کی بشری صفات زوال آشنا نظر آئیں گی۔ اسی لیے کہ انسانیت کے وہ اعلیٰ کردار جو انیس کے کردار ہیں بہ تمام و کمال آدمیّت کے سامنے نہیں لاتے گئے۔ میں اور کرداروں کی بات نہیں کرتا۔ کلامِ انیس سے صرف تین کردار منتخب کرتا ہوں جو وفا کے اور ایثار کے کردار ہیں۔ ان میں ایک کردار جنابِ حُر کا ہے، دوسرا جنابِ عباسؑ کا اور تیسرا جنابِ زینبؑ کا۔ یہ تینوں کردار وفا کے سمبل ہیں۔ ایثار کی علامت ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جنابِ حُر کی وفا ایک دوست کی وفا ہے۔ جنابِ عباسؑ کی وفا بھائی کی وفا ہے اور سیدہ زینبؑ کی وفا ایک بہن کی وفا ہے۔ ایثار و وفا کے ان تینوں کرداروں کو انیس نے جس طرح پیش کیا ہے۔ کاش کہ ہم میں ہمّت ہوتی، کاش کہ ہم تعصبات سے اتنے بلند ہوتے کہ وفا کے ان مظاہر کو، ایثار کے ان کرداروں کو، محبّت کی ان علامتوں کو دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کر سکتے! میں آپ کو ان تینوں کرداروں کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانا چاہتا ہوں جو کلامِ انیس سے مترشح ہوتی ہے۔ جنابِ حُر جو آخری

وقت میں تشریف لاتے ہیں اور بقول بائیبل "کتنے آگے ہیں جو پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے پیچھے ہیں جو آگے نکل جائیں گے۔" کے مصداق ہیں۔ موت انہیں سامنے نظر آرہی ہے۔ حق کو قبول کرتے ہیں اور اُس وقت بڑھ کر جامِ شہادت کو لبوں سے لگاتے ہیں جبکہ بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ انیس نے اُن کے آخری لمحوں کی جو منظر کشی ہے۔ کردار نگاری کے لیے منظر کشی ایک جز ہے۔ ایک ضمیمہ ہے۔ اسے آپ علیحدہ بھی بیان کر سکتے ہیں لیکن جہاں کردار نگاری ہوگی وہاں منظر کشی کا ہونا ضروری ہے۔ ہنگام نگاری بھی آئے گی۔ حالات و کوائف بھی پیدا کیے جائیں گے۔ محرکات کی کارفرمائی بھی ہوگی۔ اور دیکھا جائے تو انیس نے اپنے کلام میں ان تمام مراحل کو بیان کیا ہے۔ اور کمال خوبی سے انہیں نباہا ہے۔ انیس کا ایک شعر ہے جس میں کہیں محبت کا لفظ استعمال نہیں ہوا، کہیں وفا اور ایثار کا تذکرہ نہیں آیا لیکن شعر کا مفہوم یہ ظاہر کرتا ہے جیسے وفا کا سمندر اُبل رہا ہو، محبت کے سوتے رواں ہوں اور ایثار کا قلزم جوش مار رہا ہو۔ عرصۂ مسافت طے کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ جنّت کی طرف جانے کا رختِ سفر باندھا ہوا ہے اور دنیا میں کسی سے تعلق بھی ہے۔ اس تعلق کو نباہنا بھی ملحوظِ خاطر ہے اور سفرِ آخرت بھی نگاہوں میں ہے۔ ایک ایسا منظر پیدا ہو چکا ہے کہ اردو شاعری میں مجھے اپنی بے بضاعتی کے احساس کے باوجود کوئی شعر اس شعر کا ہم پلّہ نظر نہیں آتا۔ جنابِ حُر کے بارے میں میر انیس کہتے ہیں ؎

طائرِ رُوح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

جنابِ عباسؑ کے کردار کو دیکھیے۔ کیا رشتوں کا احترام ہے، کیا تعلق ہے۔ یہ کس سماج کا نقشہ ہے کہ بھائی کو بھائی نہیں کہتے۔ آقا کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہی نہیں، جب جنابِ علی اکبر سے پہلے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں تو نہ صرف امام حسین علیہ السلام کے لیے آقا کا لفظ استعمال کرتے ہیں بلکہ جنابِ علی اکبر کے لیے بھی احترام و منزلت کا وہی

جذبہ کارفرما نظر آتا ہے ؎

پہلے رضا ملے تو بہت نیک نام ہوں   آقا یہ شاہزادہ ہے اور میں غلام ہوں

اور پھر منّت سماجت کرتے ہیں۔ ان کے احسانات یاد دلاتے ہیں۔ وفائے عباسؑ کی جو تصویر میر انیس نے کھینچ دی ہے میں اس کی مثال کہاں سے لاؤں۔ یہ کردار بھی بے مثال ہیں اور جس شاعر نے انہیں پیش کیا ہے وہ بھی بے مثال ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسدس میں بند کے جو آخری دو مصرعے ہوتے ہیں وہ ٹیپ کے مصرعے ہوتے ہیں۔ لیکن میں جب کلام انیس کو دیکھتا ہوں، جب کبھی ان کا لکھا ہوا مرثیہ پڑھتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص دریا کے کنارے کھڑا ہو اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ لہر کہاں سے اٹھی، کہاں تموّج میں آئی اور کہاں گم ہو گئی۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ لہر نے کہاں جنم لیا اور کہاں آگے بڑھی۔ ایک صاف اور شفاف روانی ہے جو اس کی نگاہوں میں کوندتی رہتی ہے۔ یہی حال کلام انیس کا ہے۔ مجھے کہیں اس میں ٹیپ کا بند نظر نہیں آتا۔ میرے لیے اس کا ہر بند ٹیپ کا بند ہے۔ ایسے ہی ایک بند میں میر انیس جناب عباسؑ کی زبان سے سفارش کے لیے کیا کیا احسانات گنواتے ہیں۔ اور سفارش بھی کس بات کی چاہتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں جانے کی۔ دیکھیے کن لفظوں میں، کس انداز سے، کس ادب واحترام کے ساتھ اور کس قرینے سے یہ کہتے ہوئے جنگ کی اجازت چاہتے ہیں۔

پالا ہے مجھ کو یا شہِ دلگیر آپ نے   کی ہے ہمیشہ پیار سے تقریر آپ نے
بندھوائی ہے کمر میں یہ شمشیر آپ نے   بخشی ہے سب میں عزّت و توقیر آپ نے

وقتِ مدد ہے آج بھی امداد کیجیے
بندہ سمجھ کے اب مجھے آزاد کیجیے

جنگ کے میدان میں جانے کے لیے یہ اسلوب بیان کہ ع

بندہ سمجھ کے اب مجھے آزاد کیجیے

یہ انیس کے سوا اور کہیں مشکل ہی سے نظر آئے گا اور پھر یہ کردار نگاری، یہ نفسیات کا عالم اور یہ کشمکش جذبات کا اظہار اور پیرایۂ بیان کا نکھار کہ جناب عباس بچوں کی پیاس برداشت نہ کرتے ہوئے دریائے فرات کی طرف جاتے ہیں اور گھوڑا پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ لڑتے بھڑتے، دشمنوں کو مارتے، ان کے سر قلم کرتے اور ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے ہیں۔ اس موقع پر انہیں کیا خیال دامنگیر ہے؟ پانی سامنے موجیں لے رہا ہے۔ تین دن کی پیاس سے لب خشک ہیں، حلق میں کانٹا سا محسوس ہو رہا ہے۔ مشک بھرنے کے لیے پانی میں ڈال دی ہے۔ پانی پی سکتے ہیں مگر اللہ رے احساسات کا عالم!

فرما کے یہ سمند کو ڈالا فرات میں — گویا خضر اتر گئے آبِ حیات میں
دریا دل ایسا کون ہوا کائنات میں — تسمہ پکڑ کے مشک بھری ایک بات میں

مشک کو ہاتھ سے نہیں پکڑا۔ بلکہ اس کے تسمے کو پکڑ کر مشک کو پانی میں ڈبو دیا ہے۔ ایسا کیوں کیا؟ انیس اس کا سبب بیان کرتے ہیں۔

سیراب جب تلک کہ شہِ بحر و بر نہ ہوں
منظور تھا کہ ہاتھ بھی پانی سے تر نہ ہوں

پانی کی بہتی ہوئی چادر نظر میں ہے۔ بچوں کی پیاس کا بھی خیال ہے۔ دل و دماغ میں ایک کشمکش بپا ہے۔ انیس نے جس خوبصورتی کے ساتھ اس کشمکش کو بیان کیا ہے۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ اور جناب عباس علمدار کا جو مرقعِ سیرت ہماری نگاہوں میں ہے۔ اس کے لحاظ سے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ احساسات اس وقت جناب عباس کے نہیں تھے۔ انیس نے لکھنؤ کو کہیں عرب کی چمک دمک کے لیے استعمال نہیں کیا۔ انیس نے جو کچھ کہا، میں سمجھتا ہوں وہی ہوا بھی۔ انیس نے روح کی آنکھ سے جو کچھ دیکھا تھا، وہ اسی طرح وقوع پذیر بھی ہوا تھا۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ ان کرداروں کی

عظمت کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہو سکتا ہے کہ انیس نے جو تصویر پیش کی ہے اُس میں مُو بمُو کوئی مبالغہ نہیں۔ ایک منظر ملاحظہ ہو۔

گرمی میں تشنگی سے کلیجہ تھا آب آب　　تڑپا رہا تھا قلب کو موجوں کا پیچ و تاب
آجاتے تھے قریب جو ساغر بکفِ حباب　　کہتا تھا منہ کو پھیر کے وہ آسماں جناب

عباسؓ! آبرو میں تری فرق آئے گا
پانی پیا تو نامِ وفا ڈوب جائے گا

میں اس بند کے شعری لوازمات اور لفظی نزاکتوں میں جانا نہیں چاہتا اور اس کے اندر جو حُسن ہے میں اس کی تشریح بھی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ اہلِ ادب اور علم بیان کے ماہروں کا کام ہے۔ مجھے تو اس جذبۂ وفا کا اظہار مقصود ہے جو حضرتِ عباسؓ کے احساسات سے ہوا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی وفا کا کوئی اور کردار ہو سکتا ہے؟

وفا کا تیسرا بے مثال کردار جنابِ زینب سلام اللہ علیہا کا کردار ہے۔ یہاں دو جذبوں کے درمیان کشمکش ہے۔ ایک طرف ادائیگی فرض کا جذبہ ہے کہ خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا جنابِ امام کا ہاتھ سیدہ زینب کو تھما کے رخصت ہوئی ہیں کہ بیٹی تم بڑی ہو۔ میرا حسین اب تمہارے سپرد ہے۔ اس طرح جنابِ زینب سید الشہداء کی بہن بھی ہیں اور ماں کے فرائض بھی انہیں پورا کرنے ہیں۔ پنج تن پاک کے اس آخری تنِ پاک کی حفاظت بھی انہی کو کرنا ہے۔ یہ ادائے فرض ہے۔ دوسری طرف ماں کی ممتا بھی ہے۔ عون و محمد کی محبت کا سوال بھی در پیش ہے۔ ان دونوں جذبوں کے اندر تصادم کا ہونا کشمکش کا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ لیکن وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ انیس کا کام فقط رُلانا ہے۔ انیس صرف رُلاتا ہے اور اس انداز کی مرثیہ نگاری کرتا ہے کہ رونے رُلانے کے سوا اُس کے ہاں اور کچھ نہیں ملتا۔ تو یہ ایک الگ مبحث ہے کہ میں اُس کے متعلق کچھ کہوں۔ میرے نزدیک غمِ حسین میں رونا اور رُلانا خود

اپنے دل کی سیاہی کو دھونا ہے اور جب بھی میں نے کلامِ انیس کو پڑھا تو مجھے یہی محسوس ہوا ہے کہ انیس نے پہلے تو غمِ حسین کو غمِ ذات بنایا۔ پھر اس غمِ ذات کو غمِ کائنات بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس غم کو میں تمام غموں کے لیے ڈھال سمجھتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ تذکرۂ غم کے علاوہ انیس نے جو کردار نگاری کی ہے اور اپنے کرداروں کے ذریعہ جو سبق دیا ہے وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین سبق ہے۔ سیدہ زینب کے بیٹوں عون و محمد میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ علَم ہمارے ہاتھ میں آئے۔ عہدے کا جھگڑا وہاں بھی ہے۔ منصب کی خواہش وہاں بھی ہے۔ ایک آرزو وہاں بھی ہے لیکن کیسی ؟ تمنا وہاں بھی ہے لیکن مسابقت کی۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی۔ مقابلہ ہے اس بات میں کہ کون پہلے مرے گا اور مرے گا تو کس اعزاز کے ساتھ مرے گا۔ علَم ہاتھ میں لے کر کون اپنے آقا پر جان دے گا۔ دین کی راہ میں قربان ہوگا ؟ اور ماں جب اپنے ان نونہالوں کی گفتگو سنتی ہے تو اسے معاً یہ خیال آتا ہے کہ یہ ننھے منے حسینی فوج کے سپاہی لڑنے جائیں گے تو میدانِ جنگ میں ان کے لاشے تڑپتے ہوئے نظر آئیں گے ہر ماں کے دل میں ان حالات کے تحت یہ خیال پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ اپنے بچوں کو سمجھاتی ہیں۔ نصیحت کرتی ہیں۔ یہاں ادائے فرض اور ماں کی مامتا میں جو کشمکش پیدا ہو جاتی ہے انیس کس حسن و خوبی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے سیدہ زینب کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخرِ روزگار — زیبا نہیں ہے وصفِ اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار — دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

اور جب انہیں شہادت کی خبر ملتی ہے۔ میدانِ جنگ میں بچوں کی لاشیں

خاک و خون میں مل جانے کی اطلاع ہوتی ہے، اُس وقت ایک طرف ماں کی ممتا اُبھر آتی ہے تو دوسری طرف بھائی کی محبت دامنگیر ہو جاتی ہے۔ ان دونوں جذبوں میں جو کشمکش ہے جنابِ زینب محبت و ایثار کا سراپا بن کر اس سے اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور فرماتی ہیں۔

بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں میں بین | بے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسین
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نورِ عین | کیونکر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہِ مشرقین

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے

خیال اس بات کا نہیں کہ میرے بیٹے شہید ہو گئے۔ ملال یہ نہیں کہ میری گود اُجڑ گئی۔ بچوں کے لاشے تڑپ رہے ہیں، وہ پھول خزاں کی زد میں آ چکے ہیں۔ خیال کوئی دامنگیر ہے تو صرف اتنا کہ اگر میں روئی تو جنابِ علی اکبر بھی روئیں گے۔

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ یہ مجھ کو ہے کہ برادر بھی روئیں گے

یہ وفا کا مرقع جو انیس نے کھینچا ہے، جنابِ زینب کی سیرت سے ہم آہنگ ہے اور انسان کا ایمان اور اس کا یقین یہ کہہ اٹھتا ہے کہ انیس نے جو کچھ لکھا، برحق لکھا ہے اور انیس کی کردار نگاری کے مقابلہ میں دنیا کے کسی شاعر کی کردار نگاری کو اس لیے پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے کردار خود ان کی مخلوق ہیں۔ اس نسبت سے جو فاصلہ اور جو فرق ان کے کرداروں میں اور انیس کے کرداروں میں ہے وہی فرق ان کی شاعری میں اور انیس کی شاعری میں ہے۔

میرے نزدیک یہ کہنا غلط ہے کہ انیس مذہب کے شاعر تھے۔ ایک مکتبِ فکر کی بات نہیں اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف ایک زبان کے شاعر تھے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ شاعر تھے اور دنیائے انسانیت کے لیے ان کی شاعری ایک پیغام کی حامل ہے

ایک ایسا پیغام۔ لازوال پیغام جہاں قدم قدم پر آپ کو انسانیت کا درس ملے گا مودتِ بشر ملے گی۔ وہ احترامِ بشر ملے گا جس کی آج زمانے کو ضرورت ہے۔ جو لوگ انیس کے کلام میں صرف رونے کی باتیں دیکھتے ہیں اور محض سُنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں انہیں چاہیے کہ کلام انیس پڑھیں، تعصب کی آنکھ سے نہ پڑھیں، تعصب کی عینک اُتار کر پڑھیں اور پھر دیکھیں کہ انیس نے ایک ایک مقام پر انسانیت کو کیا پیغام دیا ہے۔ ایک دو مقامات کو دیکھیے۔ موقع یہ ہے کہ امام حسین تنِ تنہا فوجِ اشقیاء سے نبرد آزما ہیں۔ ذوالفقار دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی ہے۔ مخالفوں کو شجاعتِ حیدری کا نقشہ نظر آ رہا ہے۔ بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ الامان والحفیظ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ اتنے میں کوئی شخص حسین کو رسول کا واسطہ دیتا ہے۔ انیس اس مقام کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس شور میں سُنا جو رسُولِ خدا کا نام • پڑھ کر درود آپ نے بس روک لی حسام
فرمایا خیر، تم سے خدا لے گا انتقام عاجز نہیں یہ بیکس و مظلوم و تشنہ کام
کیا چیز سر ہے، بات میں ہم لوگ مرتے ہیں
دیکھو اس اختیار پہ یوں صبر کرتے ہیں

جنابِ عباس بظاہر کسی بات پر کچھ ناخوش سے ہیں۔ اُن کے تیور بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور وہ شمشیر بکف دشمنوں سے لڑنے کے لیے میدان میں آجاتے ہیں تا کہ ترائی کی جگہ اپنے پاس رہے اور دشمنوں کے پاس نہ جانے پائے۔ اس موقع پر حضرت امام جنابِ عباس کو تلقین فرماتے ہیں۔ دیکھیے اس تلقین میں کیا کچھ نہیں ہے! کیا آپ کو اسمیں آدمیت نظر نہیں آتی ہے؟ کیا اسمیں انسانیت کی تمام قدریں موجود نہیں ہ؟ کیا اس میں آپ کو صبر کے وہ کمالات دکھائی نہیں دیتے جنہیں دیکھنے کے لیے زمانہ ترس رہا ہے؟ روتے رلانے کے مواقع پر انیس ان پہلوؤں کو جس طرح پیش کرتے ہیں۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ جناب امام حضرت عباس کو

تسکین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہے گرچہ ان کی بے ادبی قابلِ سزا — پر تم پسر رحیم کے ہو، بخش دو خطا
جنگل ہو یا ترائی ہو، ہے ہر جگہ خدا — مظلوم کو، غریب کو غصّے سے کام کیا

کیا بے بسی اور بے کسی کا منظر کھینچا جا رہا ہے اور اس منظر کو لفظوں کے ذریعہ کس طرح نگاہوں کے سامنے لایا جا رہا ہے۔

کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
ہم کو نبی کی روحِ مطہّر کا پاس ہے

اور پھر جب حضرت امام یہ دیکھتے ہیں کہ جناب عباسؑ بہت خشمگیں ہیں تو ایک دوسرے انداز سے بات ہوتی ہے اور وہ انداز یہ ہے۔

آؤ تمہیں قسم ہے جناب امیر کی — بگڑو نہ سرکشی سے سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی — سب سے جدا ہی چاہیئے منزل فقیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

وقت اور حالات کا تقاضا ہی یہی ہے کہ الگ تھلگ ڈیرہ ڈالا جائے۔ ہمارے ساتھ شہِ خیبر شکن کی بیٹیاں ہیں۔ یہ مخدّراتِ عصمت ہیں اور ہماری منزل بھی اگر الگ تھلگ ہوگی۔ تو یہ شرم و حیا کے تقاضوں کے اور عفّت و عصمت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔

ان شواہد کی روشنی میں کلامِ انیس کو کسی مکتبِ فکر سے وابستہ کرنا بلکہ کسی مذہب سے وابستہ کرنا، کسی زبان سے وابستہ کرنا انیس کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ آج زمانے کو ان اعلیٰ قدروں کی ضرورت ہے۔ آج زمانے میں اعتبارِ بشریت ختم ہو رہا ہے آج انسان سے انسان مایوس ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر اس مایوسی کا طلسم توڑنا ہے اگر

اعتبارِ بشریت کو قائم رکھنا ہے۔ اگر زمانے کے سامنے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے نمونے پیش کرنے ہیں تو پھر کلامِ انیس کو عام کرنا ہوگا۔ انیس کے کرداروں کو عام کرنا ہوگا اور زمانے کو ان کی طرف دعوت دینا ہوگی۔

مَیں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کلامِ انیس میں کس ثقافت کی جھلک ہے۔ مَیں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہاں جو رشتوں کا احترام ہے، جو ادب آداب ہیں، انسانی کردار کی جو اعلیٰ قدریں یہاں پائی جاتی ہیں۔ اپنے اور بیگانے کے ساتھ یکساں محبت و مودت کا جو انداز ہے۔ اس میں گفتگو کا جو طریقہ ہے، وقت وقت کے لیے جو علیحدہ اسلوب اور قرینہ ہے، اس میں جو تہذیب نظر آتی ہے۔ پیار اور محبت کی بات کرنے کے لیے جو مختلف اسالیب دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو جب میں دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ ان دانشوروں کو آواز دینی چاہیے جو آج پاکستان کے اس معاشرے میں یہ نعرہ بلند کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت کوئی چیز نہیں ہے۔ ایسے دانشوروں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ دُور جانے کی ضرورت نہیں آؤ! اسلامی ثقافت کی جھلک دیکھنا چاہتے ہو تو کلامِ انیس میں دیکھو، انیس اسلامی ثقافت کا آئینہ ہے!

اور اس اسلامی ثقافت کو عام کرنے کے لیے، اسے مقبول بنانے کے لیے، اس کا دائرہ اپنے ملک سے بڑھا کر ایران تک اور ایران سے بڑھا کر ساری دنیا تک پھیلانے کے لیے آپ کتاب خانۂ انیس قائم کریں، آپ عزاخانۂ انیس قائم کریں۔ آپ شفاخانۂ انیس قائم کریں۔ آپ آشیانۂ انیس قائم کریں۔ مَیں اس آشیانے کے لیے ایک ایک تنکا جمع کرنا اپنے لیے وجہِ سعادت سمجھوں گا۔

خواجہ فریدؒ کا پیغام

"یہ ایک تقریر ہے جو ملتان میں جشنِ فریدؒ
کے موقع پر کی گئی، تقریر اصلاً سرائیکی
میں تھی کہ وہ میری بھی مادری زبان ہے۔
اُردو میں یہ اسی تقریر کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے۔"

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ سرائیکی بولنے والے علاقے کے روحانی بادشاہ ہیں۔ لاکھوں انسانوں کے دلوں پر ان کی شاعری کی لطافتوں کا قبضہ ہے۔ ان کی محبت اور سوز سے معمور کافیاں زخمی روحوں کے لیے مرہم بنتی ہیں۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ویسے ہی تو نہیں کہا ہے کہ :

گلشنِ عشقِ چشتیاں بہ طپید
شعلہ اش خواجۂ غلام فرید

ہر کہ از عشق جرعۂ نہ چشید
او چہ داند کہ چیست خواجہ فرید

مرغ فکرم ز آشیاں بہ پرید
نالہ ہائے فرید چوں بشنید

رہبر عاشقان پاک سرشت
شاہد عاشقان بزمِ وحید

سُرمۂ چشم شد بخاری را
خاک پائے غلام خواجہ فرید

حضرت خواجہ فریدؒ کے علمی مقام فکری مرتبہ اور شاعرانہ عظمت کو پیش نظر رکھیں تو خواجہ فرید سرائیکی زبان کے "رومیؒ" نظر آتے ہیں۔ ان کا کلام اُمید زندگی اور حرارت

کا پیغام اور عمل کی دعوت ہے۔ کلام کیا ہے مسیحائی ہے۔ کہتے ہیں۔

اُٹھی بھی فریدا شاد دل
مونجھا کو نہ کر یاد دل

جھوکاں تھیں آباد دل
ایہا نینھہ نہ دسی ہک منٹی

کیا حرارت ہے۔ وہ اس طرح جگا رہے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ مُردوں کو جگا رہے ہوں کہ قم باذن اللہ۔

اُٹھی۔ بھی فریدا شاد دل

خواجہ صاحبؒ جب نعت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے ہیں تو ہمیں جامی رحمۃ اللہ علیہ یاد آجاتے ہیں۔

جیندیں عرب شریف ڈٹھو ہے
لہندیں سکدیں سر نہ گیو ہے

سوہنٹے سانول یاد کیتو ہے
ہار سنگھار سہاندے بن

یا۔

دیس عرب دا۔ ملک طرب دا
سارا باغ بہار

یا۔ آپہونتم جیندیں مکے
ایں شہر مبارک بچے

آیا شہر مدینہ
یا کہتے ہیں کہ سکھ دی سیج سہایم
گیا ڈکھڑا دیرینہ

خواجہ صاحبؒ سفرِ حج کی کیفیات ایسی فراغت کے ساتھ لکھتے ہیں جیسے وہ "فری حج پالیسی" کے زمانے میں مدینہ تشریف لے گئے ہوں۔ یہ بات اس لیے ہے کہ جب بھی خواجہ صاحبؒ حج کے لیے گئے بہت سے لوگوں کو اپنے خرچ پر اپنے ساتھ لے گئے۔

حضرات!

کچھ لوگ حضرت خواجہ صاحبؒ کو صرف سرائیکی زبان کا شاعر سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہوگی کہ اتنی عظیم المرتبت شخصیت کو ہم اپنی تنگ نظری کی عینک سے دیکھیں۔ خواجہ فریدؒ کی فکر علاقائی نہیں آفاقی ہے۔ ان کی سوچ ایک محدود علاقے کے لیے نہیں۔ ان کا کلام سندھی زبان میں بھی ہے اور بیکانیری اور مارواڑی میں بھی۔ ان کے اُردو کلام کا مجموعہ اور دیوان بھی صورت پذیر ہو چکے ہیں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان کی بصیرت نے مستقبل کے مزاج کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ اُنھوں نے شروع ہی سے عوام کی زبان میں بات کی ہے۔ اس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ دریائے سندھ کے مچھیروں سے لے کر کوہ سلیمان کی ترائیوں کے محنت کشوں اور روہی اور تھل کے چرواہوں تک سب غریب عوام جناب خواجہ فریدؒ کے کلام سے براہ راست فیض حاصل کرتے اور راحت اُٹھاتے ہیں۔

یہاں یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ ان کے زمانے میں سابق ریاست بہاول پور کی سرکاری زبان حیدر آباد دکن کی طرح اُردو تھی، لیکن چونکہ خواجہ صاحبؒ کے مخاطب عوام تھے اس لیے اُنھوں نے اپنی بات سرائیکی زبان ہی میں کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح حکیم الامّت علامہ اقبالؒ نے اُردو کے علاوہ فارسی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، کیونکہ وہ اپنی بات بہت سی مسلمان قوموں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ صرف خواجہ صاحبؒ کا احسان ہے کہ اُنھوں نے اس زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور اس کو معرفت اور تصوف کے خزانوں سے معمور کر دیا۔ اگر آپ

سندھی کو پسند فرماتے تو دیوانِ فرید سندھی میں ہوتا۔

بات علاقائی تعصب کی ہو رہی تھی۔ یہ بات حضرت خواجہ صاحبؒ کے مسلک کے خلاف ہے کہ وہ اس طرح کی تقسیم اور محدود پیمانے کی کوئی بات سوچیں۔ خواجہ فریدؒ میں تنگ نظری نہ تھی اور نہ ہی کسی طرح کی لسانی تفریق ان کے سامنے تھی۔ آپ کا وصال ۱۹۰۱ء میں ہُوا تھا۔ یہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا۔ اس وقت صرف ایک ہی مسئلہ سامنے تھا کہ گورے حاکموں کو واپس بھیجو۔ سو خواجہ صاحبؒ نے اپنی ذمہ داری پُوری فرمائی۔ اُنھوں نے امیرِ بہاول پور سے کہا کہ

اپنڑی نگری آپ وسا توں
پٹ انگریزی تھانے

اردو دیوان میں اُنھوں نے اس طرح کے اشارے کئی جگہ کئے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

بہار آئی کہو صیاد سے حکم فغاں دیوے
میرے ہاتھوں میں اب بہر خدا میری عناں دیوے
نہ گُل نہ لالہ و ریحاں نہ نسریں چاہتا ہوں میں
مگر رخصت مجھے اک بار طرف آشیاں دیوے

ایک بڑی بات جس کو میں حضرت خواجہ فریدؒ کی عظمتِ فکر اور بصیرت کا اعجاز کہوں گا یہ ہے کہ آپ نے اپنے کلام کے ذریعے روہی اور تھل کے غریب عوام کو بھرپور "اعتماد" عطا کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے چیزوں کا مفہوم بدل دیا۔ مثلاً روہی یا خشک ریگستان کانٹوں اور خاردار جھاڑیوں، گرمی اور پیاس کا نشان ہے۔ خواجہ صاحبؒ سے پہلے روہی کے ساتھ وحشت اور ویرانی کا خیال آیا کرتا تھا لیکن اُنھوں نے روہی کی محبت کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر روہی کو ایک ادب پرور اور رومان نواز جگہ بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کے لوگ اپنی ویرانیوں اور محرومیوں سے نفرت کرنے کی بجائے اس سرزمین

کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اُنھوں نے روہی میں بارش کا تصوّر شامل کرکے وہ رومانیت پیدا کی ہے جو پہاڑی علاقوں میں برف باری اور پرسکون سمندر میں کشتی رانی سے پیدا ہوتی ہے۔

روہی وٹھڑی مینگھ ملہاراں
بوٹے بوٹے تھئیاں گلزاراں
شالا موڑم دوست مہاراں
بھاگ سہاگ دا موسم آیم

حضرت خواجہ فریدؒ کا اصل میدان تصوّف ہے۔ آپ ابن عربی اور منصور کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ فلسفہ تصوف کی نزاکتوں سے ہٹ کر دیکھا جائے تو خواجہ غلام فریدؒ کے کلام میں ایک کامل انسان کا تصوّر ملتا ہے۔ کسی جگہ آپ اس (انسان کامل) کو مومن کہتے ہیں اور کسی جگہ قلندر۔ ایک جگہ تو اُنھوں نے پُوری صفائی سے اس کی تصویر کھینچی ہے۔

اے ہن قلندر روز و شب
بے خودی میں خود غرق
چاہت نہ ذات صفات دی
اک شان وحدت جی مرک

پاکیزہ فکری اور پاکبازی کا ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

صاف مبرّا غیر خیالوں
پاک عیالوں، آلوں، مالوں
راسخ وجدوں، ذوقوں حالوں
وہ وہ مستیندی اے مستی

ایک طرف سرائیکی زبان کی مٹھاس، شیرینی اور گھلاوٹ ہے اور دوسری طرف خواجہ فریدؒ کا وجدان اور ان کا حسن خیال۔ ان چیزوں نے مل کر کلامِ فرید کو محبّت، اتحاد، یکجہتی

اور یگانگت کا ایک مؤثر پیغام بنا دیا ہے۔ یہ پیغام پاکستانی عوام کے لیے اسلامی فکر کا ایک حسین اور لطیف مرقع ہے۔

حضرات !

میں یہاں ثقافتوں کی مجاوری کا ذکر بھی کروں گا۔ ثقافت پسند دانشور ملک کو چار ثقافتوں میں تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔ کوئی موقع ہو وہ اپنی بات کو ضرور آگے رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی ثقافت رنگارنگ مہکتے پھولوں کا ایک باغ ہے اور اس باغ میں ہر پھول اپنا رنگ رکھتے ہوئے بھی پورے باغ کا سنگھار ہے۔ خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ کا پیغام بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی وحدت قائم رکھو۔ ہمارا بھی عہد یہی ہے کہ ہماری وحدت قائم رہیگی اور ثقافتیں ہمیں تقسیم نہ کرسکیں گے۔

آخر میں میں خان رضوانی سیکرٹری سرائیکی اکیڈمی اور دوسرے دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنھوں نے مجھے آج کی تقریب میں شرکت کا موقع دیا۔ شکریہ !

سیاسی اور عوامی تقاریر

① دُنیا کا سب سے بڑا انقلابی

② اقوامِ متحدہ کے فرائض

③ "مارشل لاء کورٹ میں"

④ قومی تقاضے اور ٹیلی ویژن

⑤ نئی نسل سے قومی توقعات

⑥ محنت کشوں کی انجمن میں

⑦ نئی ذمہ داریاں اور نئے تقاضے

⑧ خواتین کے حقوق

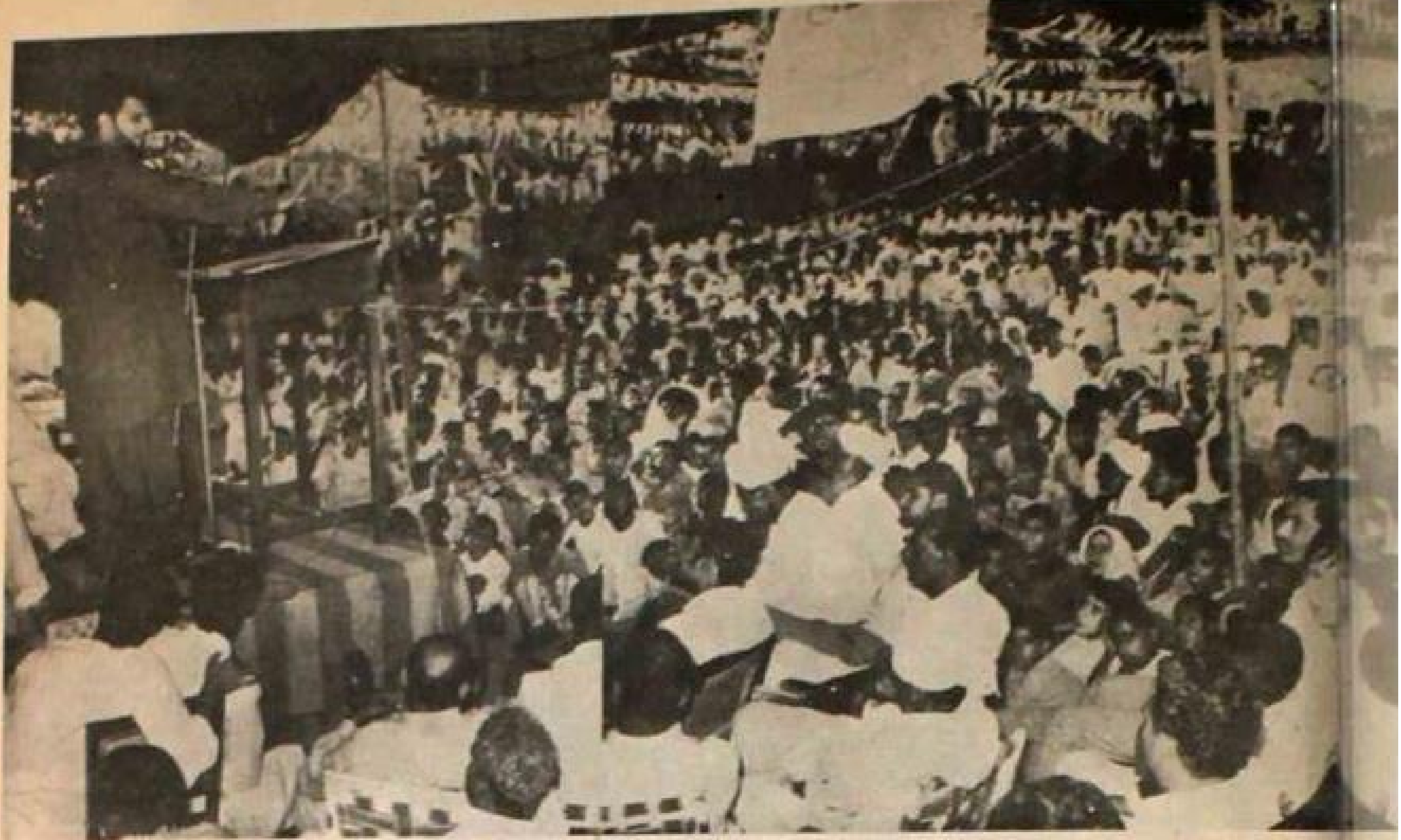

ضلع گجرات میں جوڑہ کے مقام پر پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک عظیم جلسہ عام سے خطاب

ٹاؤن ہال گوجرانوالہ میں پارٹی کے کارکنوں سے خطاب ۲ اپریل ۱۹۷۲ء

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے ط

انجمن ادبی رسائل کراچی کی س

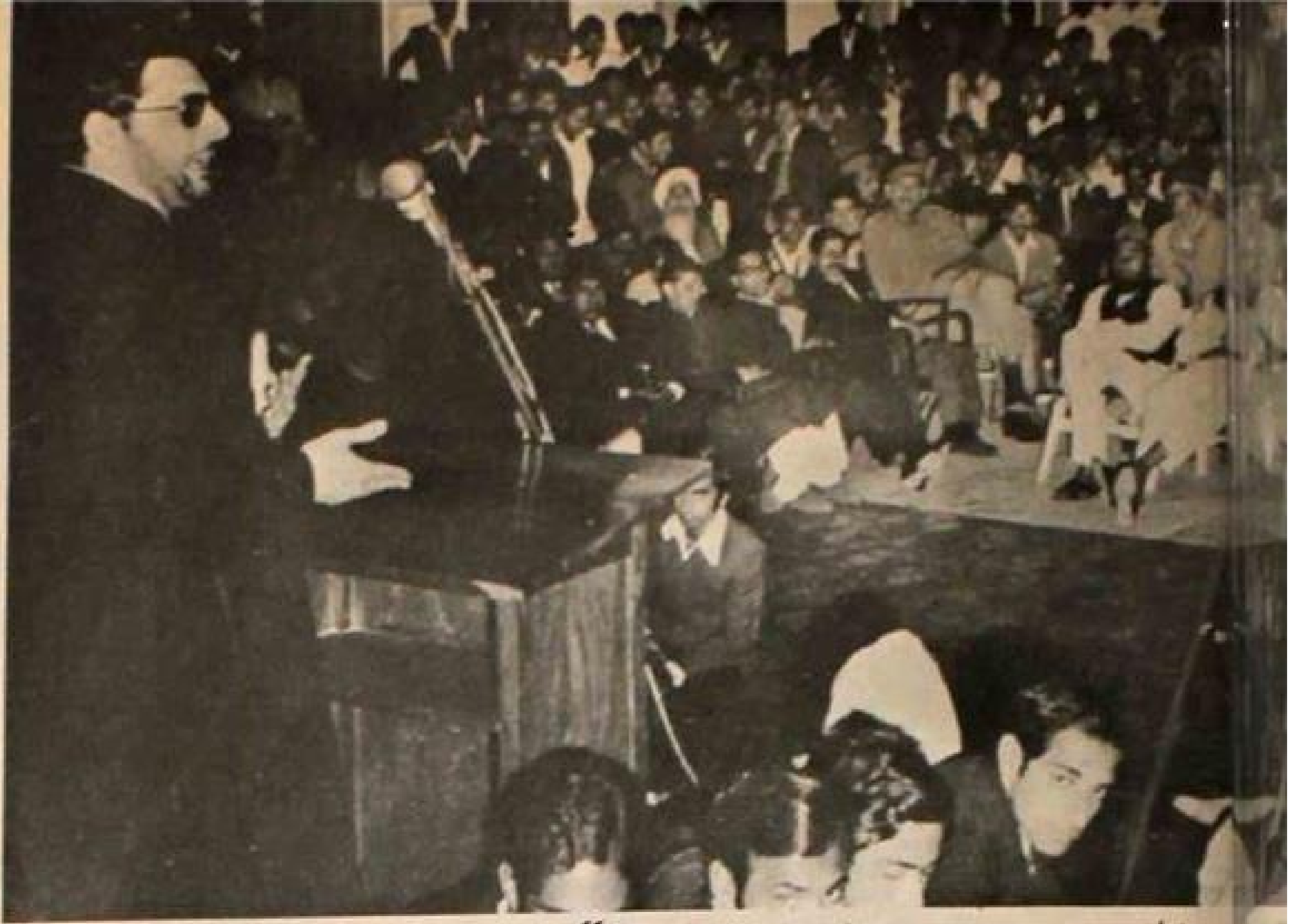

خطاب ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۴ء

کانفرنس سے خطاب ۱۲، اپریل ۱۹۷۲ء

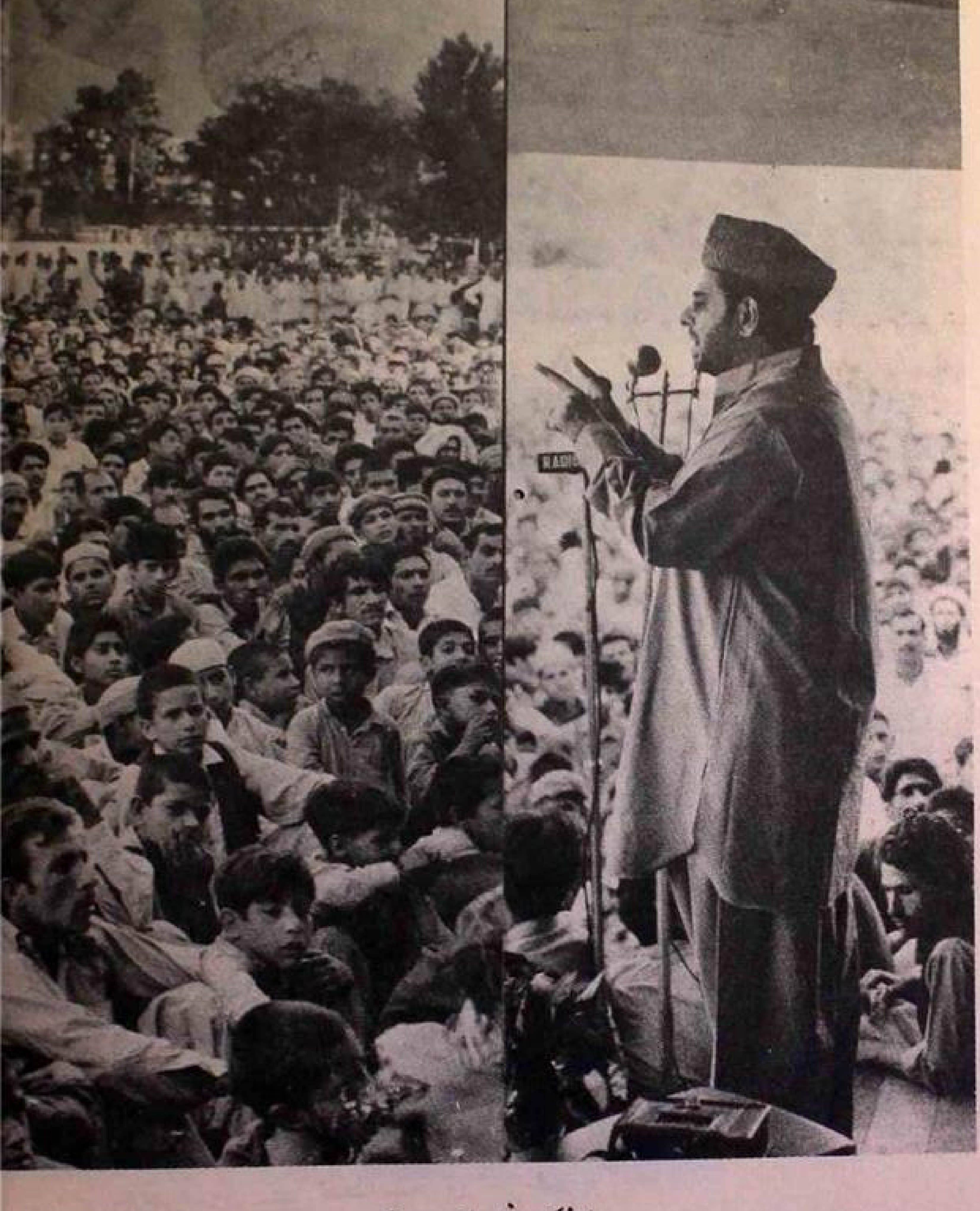

مولانا کوثر نیازی منگورہ (سوات) میں ایک عظ

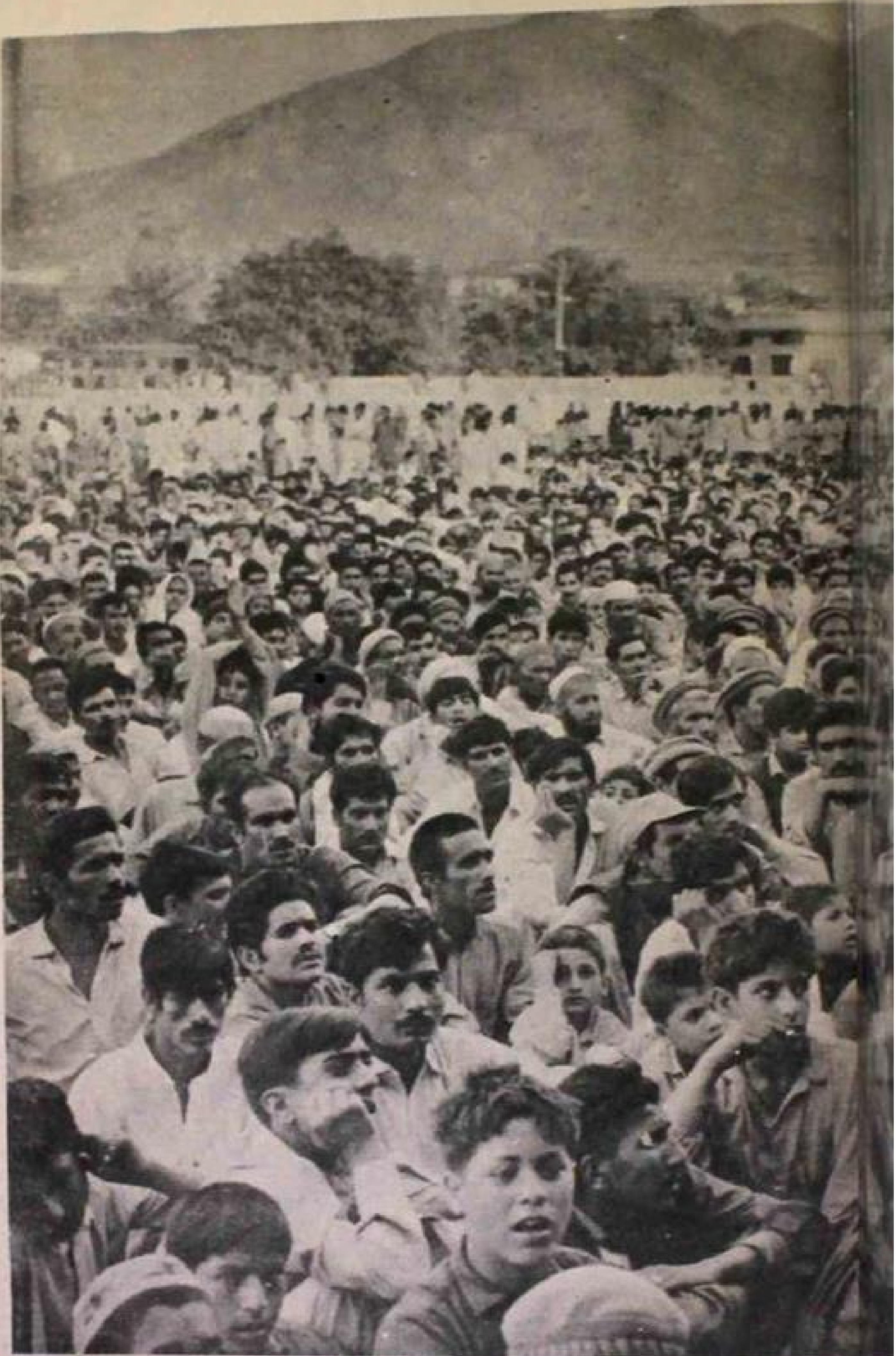

ستماع سے مخاطب ہیں ۱۱؍مئی ۱۹۷۳ء

ضلع سیالکوٹ کے ایک تق

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی فورٹ سنڈ

ہ محنے میں دیہاتیوں سے خطاب

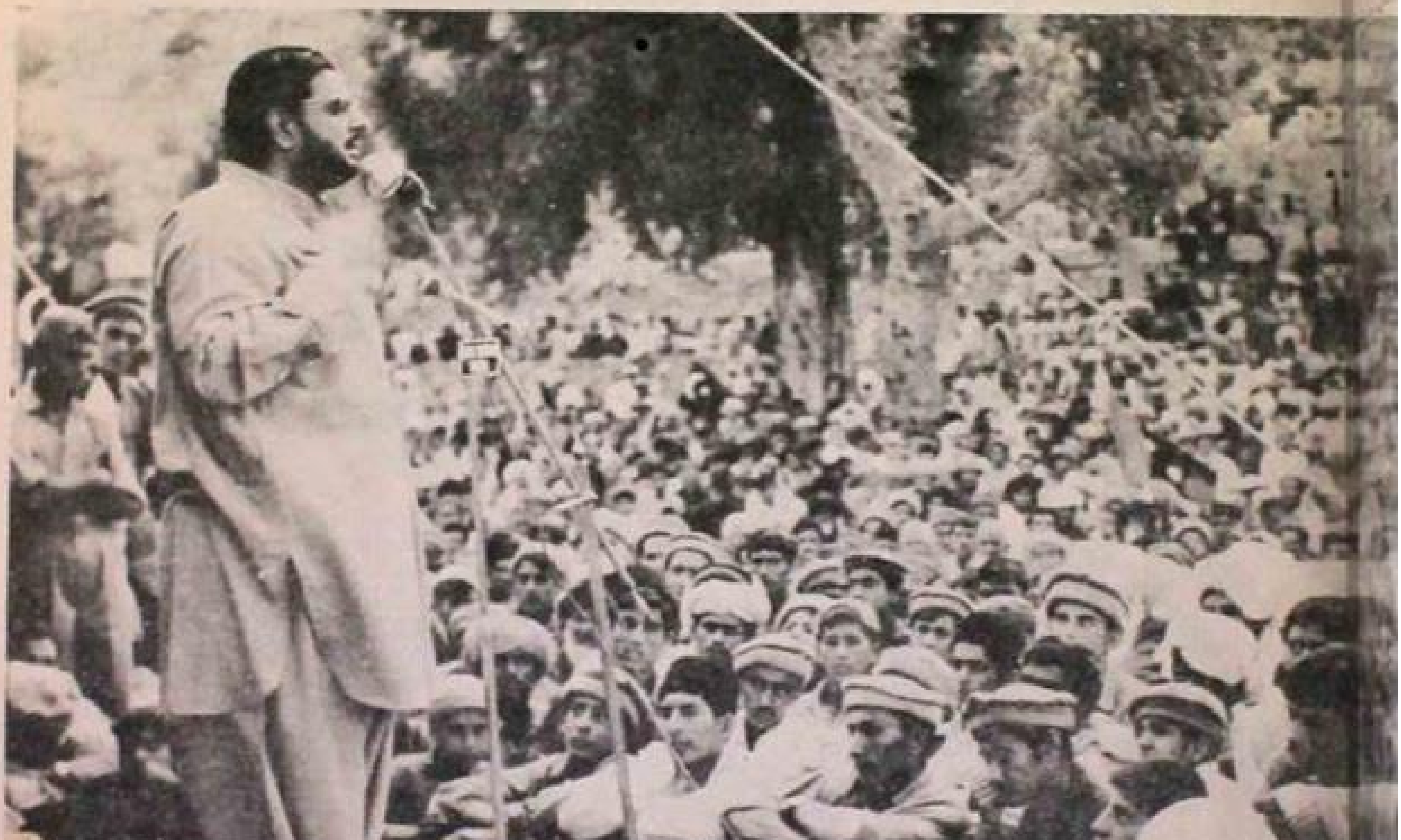

علا بلوچستان میں ایک جلسہ عام میں عوام سے مخاطب ہیں۔

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی مریدکے (ضلع شیخ

نارنگ منڈی (شیخوپورہ) م

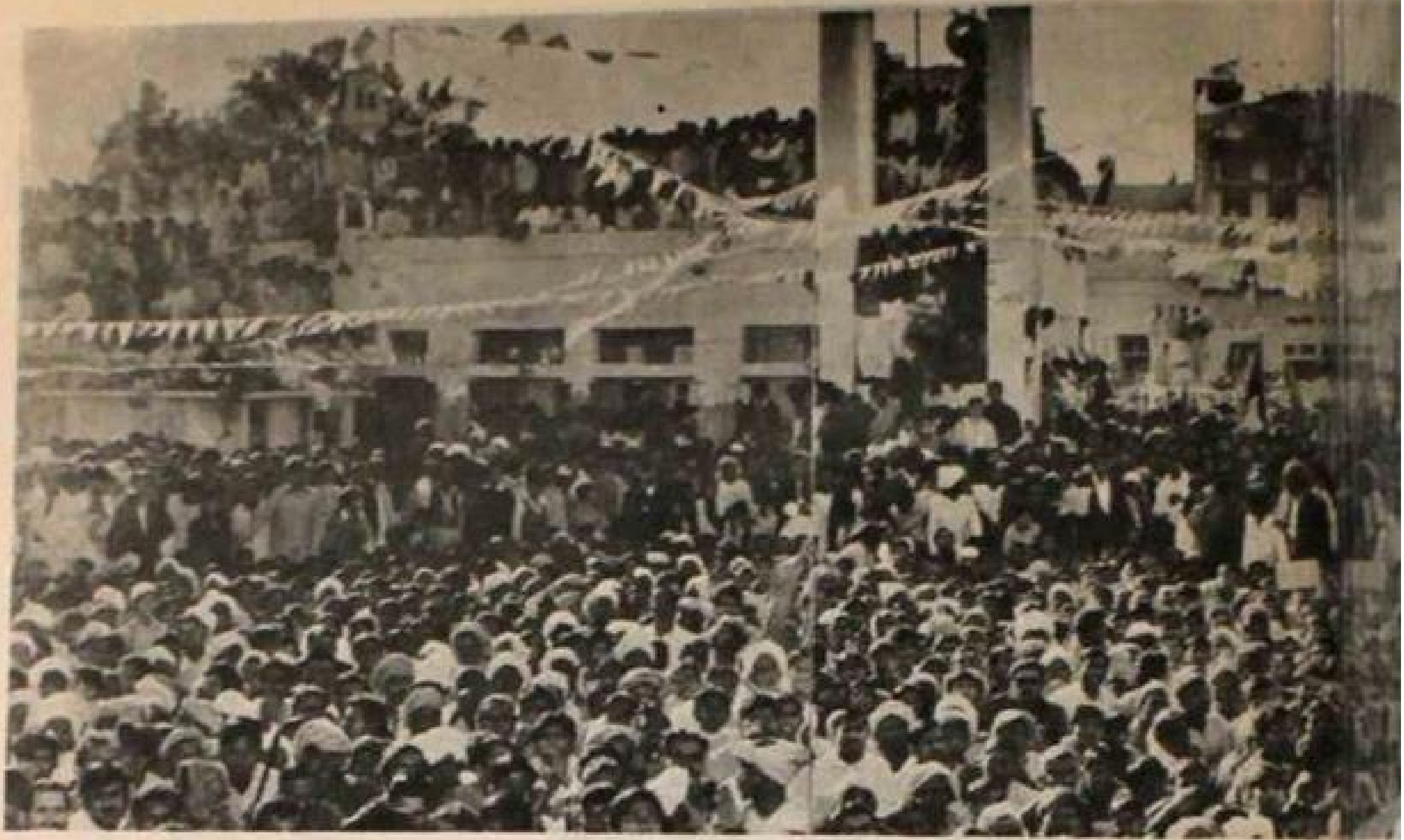

...بہت بڑے جلسۂ عام میں تقریر کر رہے ہیں۔ ۶ فروری ۱۹۷۴ء

...عوام سے خطاب ۷ فروری ۱۹۷۴ء

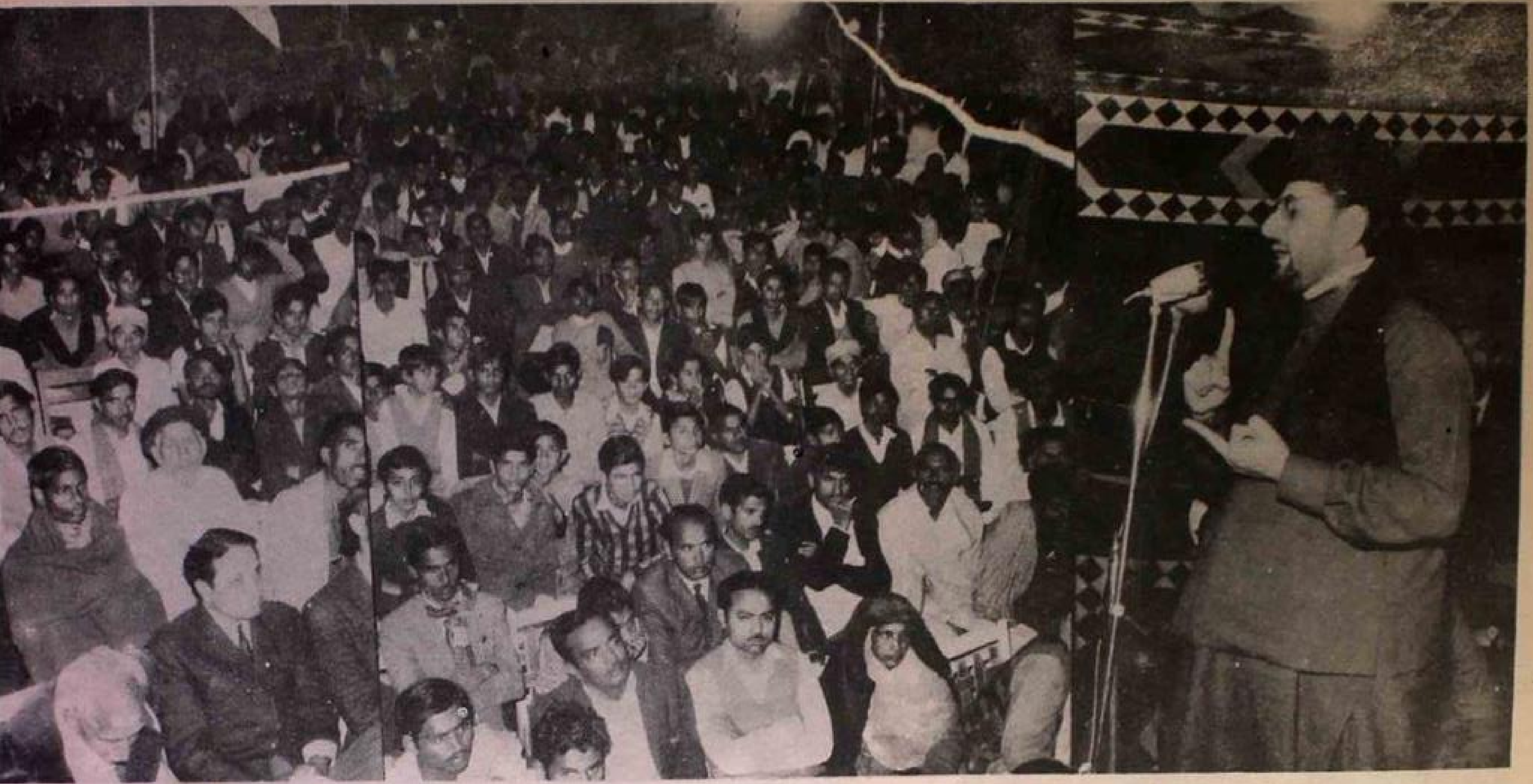

وحدت کالونی لاہور میں ایک عوامی جلسہ سے خطاب : ۱۱ دسمبر ۱۹۷۳ء

ضلع گجرات میں ایک جلسہ عام کا منظر

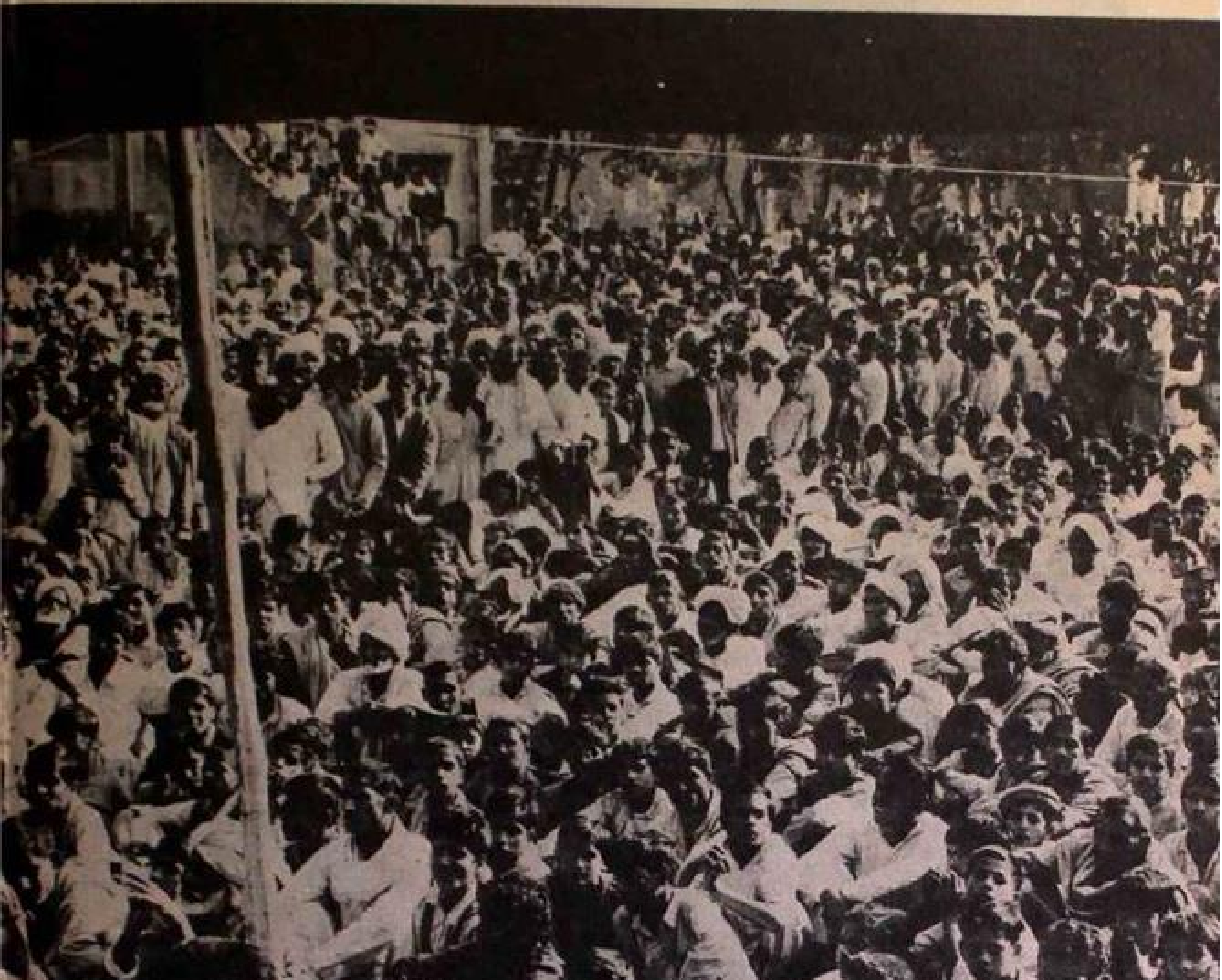

نارووال (ضلع سیالکوٹ) کے ایک جلسۂ عام

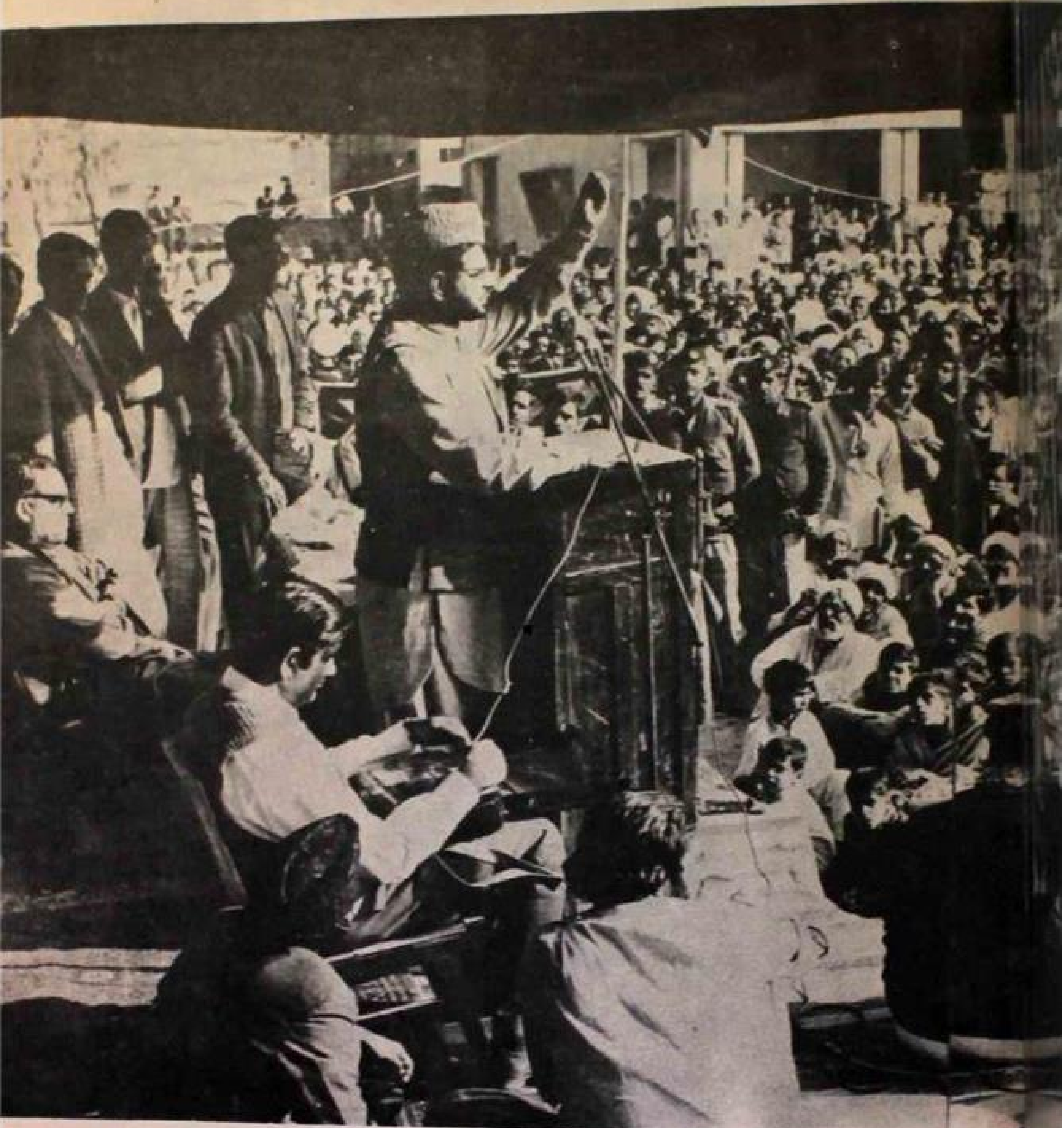

منظر - (۱۵ر فروری ۱۹۷۵ء)

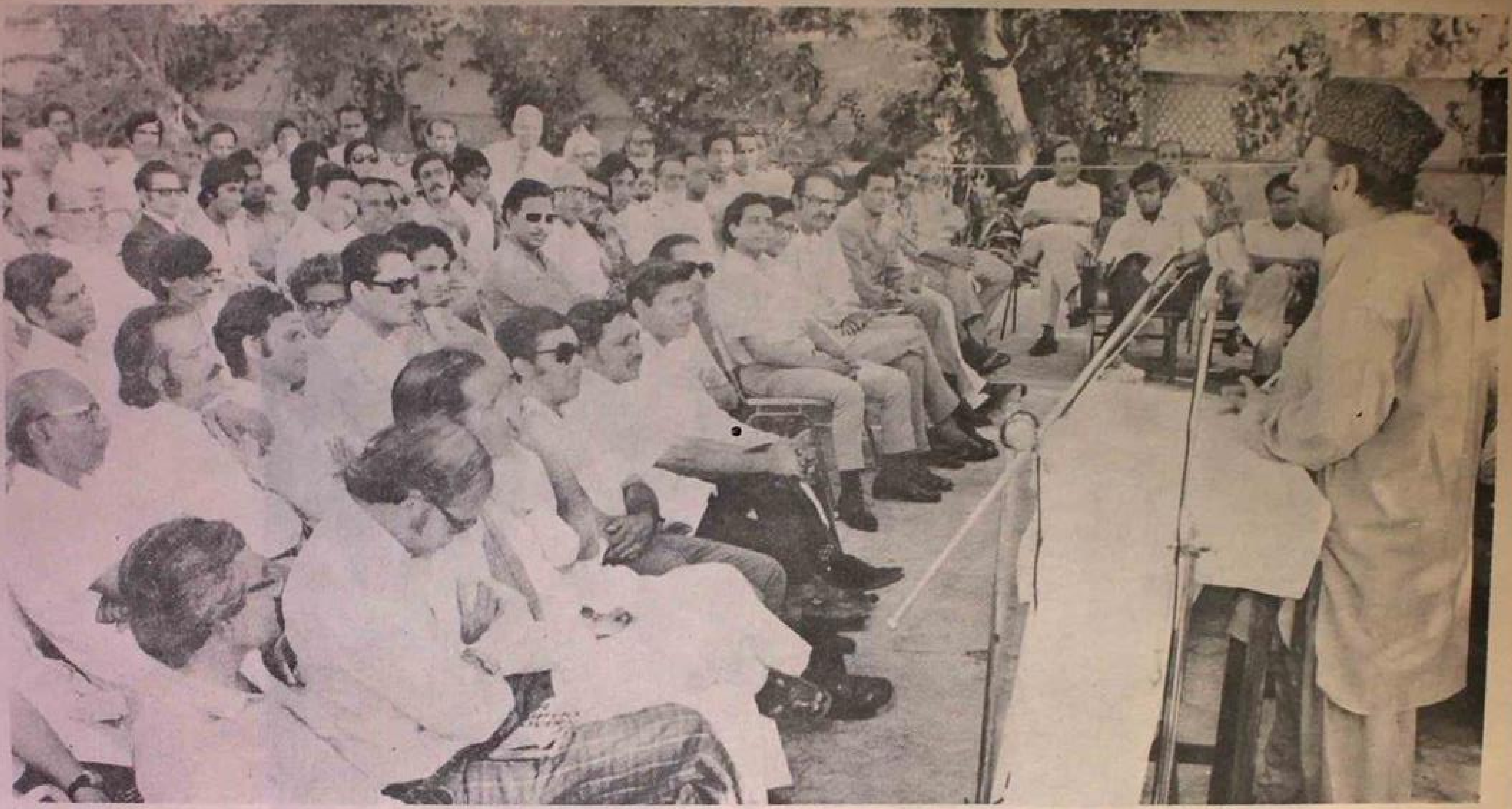

مولانا کوثر نیازی کراچی پریس کلب میں صحافیوں کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں تقریر کر رہے ہیں

سرائے عالمگیر میں ایک جلسہ عام سے خطاب ۱۰ستمبر۱۹۷۶ء

اچھرہ لاہور میں عوامی جلسہ کا منظر

دُنیا کا سب سے بڑا انقلابی

”حسن ابدال میں پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے وقت انھیں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت دی اور ان کو یہ بات سمجھائی کہ حضورؐ اس دنیا کے سب سے بڑے انقلابی تھے۔“

بھائیو۔ دوستو۔ بزرگو اور عزیزو!

جیسا کہ میرے دوست احمد وحید اختر نے آپ کو بتایا ہے میرا اصل پروگرام یہاں عید میلاد النبی کے جلوس میں شریک ہونا تھا۔ کیونکہ کئی سالوں سے حسن ابدال کے لوگ مجھے بلواتے تھے اور میں نہیں آسکتا تھا اور اس دفعہ انھوں نے ۱۲ ربیع الاول کی جگہ ۱۳ ربیع الاوّل کو جلوس رکھا تو میں نے ان کی دعوت قبول کی۔ لیکن جب مجھے وحید صاحب نے اور یہاں کے دوسرے کارکن ساتھیوں نے یہ کہا کہ وہ پارٹی کے کارکنوں کا اجلاس کرنا چاہتے ہیں اور میں اس میں شرکت کروں تو میں نے اسے خوشی سے قبول کیا س لیے کہ یہ نہیں ہو سکتا ——— کہ میں کسی شہر میں جاؤں اور وہاں اپنے ساتھیوں سے، اپنے کارکنوں سے نہ ملوں۔ اس لیے کہ حقیقت میں جو بھی عزّت ہمارے پاس ہے جو بھی کرسی ہمارے پاس ہے یہ خدا کی دی ہوئی ہے اور یہ اُن کارکنوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پہ پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیم میں بہت

جھگڑے ہیں، بہت سے اختلافات ہیں۔ میں یہاں کا رہنے والا نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اصلیت کیا ہے حقیقت کیا ہے کون سچائی پر ہے کون نہیں ہے۔ میں صرف اصولی بات جانتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جن کارکنوں نے قربانیاں دی ہیں، جنھوں نے اس پودے کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ جنھوں نے اُس زمانے میں کفر کے فتوے سہے ہیں جنھوں نے اُس زمانے میں مقابلہ کیا ہے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا۔ ان کا اس پارٹی کے اندر بنیادی مقام ہے۔ وہ لوگ اُن کے برابر نہیں ہو سکتے جو بعد میں آئے یا بعد میں آنا چاہتے ہیں

مجھے افسوس ہوتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ پارٹی کے اندر ہمارے دوست آپس میں لڑتے ہیں۔ اختلاف کرتے ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری منزل آ گئی ہے، شاید ان کا خیال تھا کہ حکومت ہماری منزل ہے۔ مگر حکومت ہماری منزل نہیں ہے۔ ان کرسیوں کے لیے ہم نے یہ ساری جدوجہد شروع نہیں کی تھی۔ یہ کرسیاں وسیلہ تھیں ذریعہ تھیں واسطہ تھیں منزل تک پہنچنے کا اور وہ منزل یہ تھی کہ ہم ملک میں اسلامی مساوات کا نظام قائم کریں۔ اسلامی سوشلزم کا نظام قائم کریں۔ ظالموں کو ختم کریں اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں۔ انصاف کا دور ہو ——

انصاف کا دَور دورہ ہو۔ یہ ہماری منزل تھی لیکن ابھی یہ منزل تو ہمیں حاصل نہیں ہوئی ابھی اس راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ ابھی لوگوں کو تکلیفیں ہیں۔ ابھی بہت سے دُکھ ہیں۔ ابھی لوگ یہ یقین نہیں رکھتے کہ وہ انصاف حاصل کر سکیں گے۔ اب بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس کی جیب میں پیسے ہیں وہی انصاف خرید سکتا ہے۔ غریب انصاف حاصل کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اب بھی بیواؤں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اب بھی یتیم پریشان حال ہیں۔ اب بھی مزارعین پر ظلم ہوتا ہے کوئی اگر مجھے خوشامد کے طور پر سپاس نامہ پڑھتے ہوئے کہتا ہے کہ فضا بدل گئی۔ ہوا بدل گئی۔ زمین بدل گئی۔ آسمان بدل گیا تو میں کہتا ہوں کہ تم غلط کہتے ہو۔ ابھی بہت تبدیلیاں آنی ہیں۔ ابھی تو ہاتھ بدلے ہیں ابھی ہمیں اصولوں کو تبدیل کرنا ہے۔

—— تو اتنے سارے کام پڑے ہیں اور ہم جھگڑ رہے ہیں ہم لڑ رہے ہیں عہدوں پر۔

کرسیوں پر۔ کون صدر رہے کون صدر نہ رہے۔ مگر یہ بہت افسوس کی بات ہے اس لیے کہ ابھی ہمیں بہت کام کرنا ہے۔ بہت جدوجہد کرنی ہے اور اگر ہماری صفوں میں اتحاد نہ رہا اگر ہم متحد نہ رہے تو پھر ہم اس منزل کو حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے لیڈر کی قیادت میں ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں متحد ہونا چاہیے۔ ان جھگڑوں کو ختم کرنا چاہیے۔ یہ جھگڑے اگر غرضوں پر مبنی نہیں ہیں تو جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ وہ جھگڑے ختم نہیں ہوتے جو غرضوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن اگر جھگڑے غرضوں پر مبنی نہ ہوں تو وہ آسانی سے ختم کیے جا سکتے ہیں۔ متحد ہو کر ہمیں کام کرنا چاہیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارا لیڈر رات دن کام کر رہا ہے' اس پر بڑے بوجھ ہیں' بڑے مسئلوں کا پہاڑ اس کے کندھوں پر ہے اور اس کے جو ساتھی ہیں اس کے جو کارکن ہیں اگر وہ آپس میں ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہوئے ہوں ایک دوسرے پر حملے کر رہے ہوں تو اُس کو ہم مضبوط نہیں کر سکتے۔ اُس کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتے اور اس کا دامن کھینچ کے ہم اس کو نیچے گرانے کی کوشش کریں گے بجائے اس کے کہ ہم اس کو آگے بڑھائیں یا اس کو یہ سہارا دیں کہ تم بے فکر ہو کر ان مسئلوں کو حل کرو۔ ہم ساتھ ہیں' ہم تمھارے پیچھے ہیں۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا' کوئی لڑائی نہیں ہے۔ آج کے دن' دوستو! ربیع الاول کے مقدس دن میں ۱۲ ربیع الاول کے فوراً بعد ۱۳ ربیع الاول کو جو پارٹی کے کارکن ہیں میں اُن سے کہتا ہوں کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ اُن میں اور پاکستان کی دوسری جماعتوں اور پاکستان کے دوسرے گروہوں میں کیا فرق ہے وہ بھی مسلمان ہیں۔ ہمیں وہ پہلے مسلمان نہیں کہتے تھے' لیکن اب تو کہتے ہیں ہم بھی مسلمان ہیں ——— وہ بھی کالی کملی والے کو مانتے ہیں ہم بھی اسی کی بخشش اور شفاعت کا آسرا رکھتے ہیں۔ وہ بھی خدائے واحد کو مانتے ہیں ہم بھی مانتے ہیں۔ سب کا قبلہ ایک ہے۔ سب کا کعبہ ایک ہے۔ سب کلمہ گو ہیں۔ اگر وہ سیاسی جماعت بناتے ہیں ان کا مقصد ووٹ حاصل کر کے حکومت بنانا ہے وہ بھی کوئی پروگرام رکھتے ہیں۔ وہ بھی منشور رکھتے ہیں۔ ہم اگر سیاسی جماعت بنائے ہیں ہمارا بھی منشور ہے' پروگرام ہے' ہم بھی لوگوں کو کہتے ہیں ہمیں ووٹ دو تو فرق کیا ہے۔ فرق

ایک ہے اور پارٹی کے ہر کارکن کو وہ فرق ذہن نشین کرنا چاہیے اور وہ فرق یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے کارکن انقلابی کارکن ہیں جب کہ دوسری جماعتیں انقلابی جماعتیں نہیں ہیں'۔۔۔۔۔۔
مگر انقلاب کہتے کس کو ہیں۔ انقلاب کے نعرے بہت لگائے جاتے ہیں۔ لیکن انقلاب کے بارے میں آپ جانتے ہیں یہ قلب سے نکلا ہے۔ یہ دل سے تعلق رکھتا ہے تبدیلی باہر تب آتی ہے جب پہلے دل میں تبدیلی آئے۔ اور دل میں تبدیلی نہ آئے تو باہر تبدیلی کیسے آسکتی ہے۔ اندر مُردہ سڑ رہا ہو۔ باہر چُونا گچ قبر ہو وہ تو کوئی منظر نہیں ہے رُوح اندر سڑی ہُوئی ہو' بوسیدہ ہو۔ اس سے بد بُو کے بھبکے اُٹھ رہے ہوں۔ دل کی دنیا تاریک ہو کالی ہو۔ دل میں ہوس نے گھر بنا رکھا ہو۔ دل میں دوسروں پر ظلم ڈھانے کی تمنا پرورش پا رہی ہو۔ دل میں بڑائی اور خلقِ خدا پہ تجبّر کرنے کے اور گھمنڈ کرنے کے ولولے مچل رہے ہوں۔ اور نعرہ لگایا جائے انقلاب زندہ باد۔ یہ انقلاب لانے کے طریقے نہیں ہو سکتے۔

انقلاب لانا ہے تو پہلے اپنے دل کو بدلنا ہو گا۔ پہلے اپنے آپ کو بدلنا ہو گا مانجھنا ہو گا مُصفا کرنا ہو گا۔ ٹھیک کرنا ہو گا۔ وہ کیسے ظلم ختم کرے گا جو خود ظالم ہے۔ وہ کیسے لوگوں کو پاکستان میں حقوق دے گا جو خود اپنے دائرہ کار میں لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے۔۔۔۔۔۔

وہ کیسے مساوات قائم کرے گا جو خود اپنے ملازموں کے جو جائز حق ہیں وہ بھی ان کو نہیں دیتا اور اپنے مزارعین کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں ہے وہ کیسے غریب کی بیٹی کے سر پر دوپٹہ دیگا کہ جو اپنے گھر کے قریب جو مکانات ہیں ان کی بیٹیوں کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہے۔۔۔۔۔۔

تو انقلاب پیدا کرنے کے لیے پہلے قلب کو تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ دل کی دنیا بدلنی پڑتی ہے دُنیا میں دو ہیں۔ ایک دُنیا تَن کی ہے ایک دنیا مَن کی ہے۔ تن کی دنیا میں انقلاب نہیں آسکتا جب تک کہ مَن کی دُنیا میں انقلاب نہ آئے۔'

اور اس کے لیے دوستو میں تم سے کہتا ہوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو ذہن میں بٹھا لینا چاہیے کہ جتنے لوگ دنیا میں انقلابی ہوئے ہیں وہ سب ہمارے لیے قابلِ احترام

ہیں۔ جس جس ملک میں انقلاب آیا ہے۔ جس لیڈر کی قیادت میں آیا ہے وہ ہمارا محترم ہے ہم اس کی عزت کرتے ہیں ہم اس کو زندہ باد کہیں گے۔ ہم اس سے سیکھیں گے ہم اس کے اصولوں کو سمجھیں گے۔ لیکن ایک بات سمجھ لینی چاہیے ان لوگوں کو جو مسلمان ہیں اور انقلاب لانا چاہتے ہیں کہ مسلمان جب انقلاب لانے کے لیے کوشش کرتا ہے، خواہش کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک ہی رہنما ہے۔ جو دنیا کا سب سے بڑا انقلابی رہنما ہے اور وہ محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اُن سے بڑا انقلابی آج تک کسی ماں نے پیدا نہیں کیا۔ آج تک آسمان کی آنکھ نے ان سے بڑا انقلابی نہیں دیکھا۔ آپ لوگوں کو دیکھیں۔ لیڈروں کو دیکھیں۔ جو تعلیم دیتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ مگر اس پیغمبرِ انقلاب کو دیکھیں جو تعلیم دی سب سے پہلے عملی نمونہ پیش کیا وہ خواہ عبادات کی بات ہو، خواہ کسی اور شعبے کی، کوئی شعبہ آپ دیکھ لیں۔ اگر انھوں نے کہا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھو، تو خود سات وقت کی نماز پڑھی آٹھ وقت کی نماز پڑھی۔ تہجد کی بھی۔ چاشت اور اشراق کی بھی۔ دوسروں کے لیے تہجد فرض نہیں مگر آپ کے لیے فرض ہے۔ اگر کہا کہ ایک مہینے کے روزے رکھو سال میں، تو خود کوئی مہینہ ایسا نہیں جس میں روزہ نہ رکھا ہو۔ کوئی ہفتہ ایسا نہیں جس میں روزہ نہ رکھا ہو۔ اگر کہا زکوٰۃ دو تو کبھی گھر میں اتنا نصاب ہی نہ ہُوا اتنا سامان ہی نہ ہُوا کہ اس پر زکوٰۃ عائد ہو سکے۔ سب کچھ خدا کی راہ میں لُٹا دیا۔ اگر کہا کہ دشمنوں کے ساتھ بھی مہربانی کرو، تو جنھوں نے قتل کی تدبیریں کیں جو خون کے پیاسے تھے ان کو بھی دُعائیں دیں اور مکّہ فتح ہُوا تو کہا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی میں پناہ دیتا ہُوں۔ تو جو اصول دیا اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اگر فرمایا کہ حکمران کو ذاتی فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہیے۔ کرسی کی وجہ سے کرسی کو ذریعہ بنا کر میرا ایک حق ہے ایک عام شہری کی حیثیت سے جس طرح آپ وہ حق حاصل کر سکتے ہیں میں بھی حاصل کر سکتا ہوں لیکن کوئی ایسا فائدہ اگر حاصل کروں جو اگر کرسی پر میں نہ ہوتا تو حاصل نہیں کر سکتا تھا تو وہ فائدہ میرے لیے حاصل کرنا حرام ہے اور ناجائز ہے۔

لیکن اگر فرمایا کہ کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے تو دیکھیے کہ لوگ دولت جمع کرتے ہیں اقتدار میں آنے کے بعد۔ مگر آپ نے کیا کیا؟ زکوٰۃ کا حکم دیا۔ لیکن کہا کہ زکوٰۃ سب کے لیے ہے۔ مگر فرمایا میرے خاندان والوں کو زکوٰۃ لینا منع ہے۔ وہ نہیں لے سکتے۔ آپ زکوٰۃ دوسروں کو دے سکتے ہیں مگر میرے خاندان کے لوگوں کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فائدہ اٹھالیا اور کہیں لوگ غریبوں کو دوسرے غریبوں کو چھوڑ دیں اور میرے ہی خاندان میں زکوٰۃ دینے لگ جائیں۔ اس لیے یہ پابندی لگا دی اور پھر کہا یہی نہیں تم میرے گھر والوں کو اور میرے خاندان والوں کو صدقہ بھی نہیں دے سکتے۔ حسینؓ بچے تھے، مالِ غنیمت میں کھجوریں آئی ہوئی تھیں۔ کہیں حسینؓ نے کھجور اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لی۔ حضورؐ نے انگلی ڈال کر وہ کھجور باہر نکال دی۔ حسینؓ یہ صدقے کی ہے۔ یہ مالِ غنیمت ہے۔ یہ خیرات ہے۔ یہ تمھارے لیے نہیں ہے۔ تم اس کے حق دار نہیں ہو۔ یہ تو غریبوں کے بچوں کے لیے ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ سرکارؐ نے زندگی گذاری فقر کی اور درویشی کی اور پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے اور یہ ساری باتیں لیکن کیوں؟ کیا کمی تھی۔ کیا اگر چاہتے تو جو انگلی چاند کو دو نیم کر سکتی تھی وہ اگر اشارہ کرتی تو کنکر موتی نہ بن جاتے۔ اور خود فرمایا کہ میرے پاس جبرائیل آیا اور اس نے آکر عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو یہ جو سامنے کی وادی ہے اس کو ہم سونے میں چاندی میں موتیوں میں ہیروں میں تبدیل کر دیں تمھارے لیے۔ مگر میں نے عرض کی باری تعالیٰ۔ نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ صبح مجھے ملے میں تیرا شکر ادا کروں۔ شام کو نہ ملے اور تیرے آگے فریاد کروں۔ تو یہ فقر اختیاری فقر تھا۔ ایک فقر وہ ہوتا ہے جو مجبوری کا ہوتا ہے۔ اگر اندھا کہے کہ میں غلط جگہ دیکھتا نہیں۔ تو اس کا کیا کمال ہے اس کی تو آنکھیں ہی نہیں۔ اگر لولا لنگڑا کہے کہ میں غلط رستہ پہ چلتا ہی نہیں تو اس کا کیا کمال ہے۔ اس کے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔ اگر وہ جس کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں کہتا ہے کہ میں کسی غریب پہ ہاتھ نہیں اٹھاتا تو اس میں کیا کمال ہے اس کے تو ہاتھ ہی نہیں ہیں۔ لیکن لُطف یہ ہے کہ زمین اور آسمان کے خزانے قدموں کے

نیچے ڈھیر ہوں انگلی کے اشارہ سے چاند دو ٹکڑے ہو سکتا ہو، عرش معلیٰ تک رسائی ہو۔ اور بحر و بر کی ساری رفعتیں آپؐ کی محتاج ہوں اور دو جہانوں کے شہنشاہ ہوں اور مسجد نبوی میں سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں اور پھر محمد مصطفےٰ کے گھر میں چولہا ٹھنڈا ہو اصل نفرت یہ ہے۔ مگر ایسا کیوں کیا۔ آپ اگر اچھی زندگی گزارتے دُنیوی لحاظ سے تو اس میں حرج تو نہ تھا! اسلام کے مطابق تھی۔ حلال کمائی سے اگر کوئی اچھی زندگی گزارتا ہے، صاف ستھری زندگی گزارتا ہے تو یہ تو اللہ کا انعام ہے اس میں حرج کیا ہے۔ مگر وہ پیغمبر انقلاب تھے۔ قائد انقلاب تھے۔ میں ان کی بات کر رہا ہوں وہ لیڈر تھے وہ قائد تھے اور کائنات میں جتنی طاقتیں انقلابی تھیں ان کی انھیں رہنمائی فرمانی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ میری امت میں بے شمار غریب ہیں کہ جن کے گھروں میں چولہا نہیں جلتا۔ جن کے تن بدن پر کپڑے نہیں ہیں تو میں نے بھی اگر ایسی زندگی گزاری جو اُمرا کی زندگی ہُوئی تو ان غریبوں کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ وہ یہ کہیں گے کہ ہمارا جو ہادی ہے ہمارا جو مُرشد ہے وہ بھی تو امیروں میں سے ہے وہ بھی امیر ہے۔ ہماری زندگی کے اندر بے کسی ہے، ہماری زندگی کے اندر یہ غم ہیں۔ مگر ان کی زندگی جو ہے وہ تو ہماری زندگی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ تو خود وہ زندگی گزاری جو کہ غریبوں کی زندگی تھی تاکہ اُمّت کے غریبوں کو یہ سہارا رہے کہ اگر انھوں نے فاقہ دیکھا ہے تو اُن کے آقا و مولا نے بھی فاقہ دیکھا ہے۔ آپ سیرت کا مُطالعہ کریں حضورؐ کی۔ آپ دیکھیں گے میں خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں، حرفِ عقیدت کی رُو سے نہیں کہتا حقیقت کی رُو سے کہتا ہوں کہ دُنیا کے اندر جب سے انسان پیدا ہُوا ہے اور جب تک کائنات قائم ہے، جب تک سُورج روشن ہے، جب تک ہوا چلتی ہے جب تک اس کائنات کے اندر گردش کا نظام قائم ہے جب تک اس کے اندر وہ قوانین قائم ہیں جو قدرت نے بنائے ہیں۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں انقلاب کے معاملے میں سرکار دو عالمؐ کا ہمسر ہو سکتا ہوں۔

پوری کائنات میں اگر کوئی پیغمبرِ انقلاب ہے، کوئی رہبرِ انقلاب ہے، کوئی مردِ انقلاب ہے

تو وہ محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تو پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنو! ساتھیو! انقلاب اگر برپا کرنا ہے تو ہمارے سامنے انقلاب کا نمونہ برپا کرنے کے لیے ہمارے آقا و مولا ہیں۔ ہمیں ان سے رہنمائی لینی ہے' ان سے روشنی لینی ہے ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہے ان کا لایا ہُوا مساواتِ محمدی کا نظام رائج کرنا ہے۔ آج جہاں جہاں روشنی ہے وہ سب اسی سُورج سے لی گئی ہے جہاں جہاں اچھائی ہے جس معاشرے میں ہے وہ سب یہیں سے لی گئی ہے آج زمانہ غلامی کو گالی دیتا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ ۱۴۰۰ سال پہلے غلامی کے خلاف جہاد کس نے کیا تھا۔ یہ کس کے بُوتوں کا فیض ہے کہ آج قومیں غلامی کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ تنہا سرکارؐ نے اپنے زمانے میں ۳۹ ہزار غُلاموں کو آزاد کیا ۱۴۰۰ سال پہلے آزاد کرایا اور ایسا نظام وضع کیا کہ غلامی کو بیخ و بنیاد سے اُکھیڑ دیا اس طرح اس نظام کو ختم کیا جو صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ جو معاشی نظام تھا اس زمانے کا کہ آج کوئی شخص جو ہے وہ غلام بننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آج قومیں غلامی کے خلاف اُٹھ کھڑی ہُوئی ہیں (سب تک میری آواز پہنچے گی۔ میں گلے سے نہیں بولتا میں دل سے بولتا ہوں)

یہ آپ کی تعلیم تھی کہ آج ماں باپ کا احترام ہے' آج جھوٹ کے خلاف نفرت' سچائی کی عظمت' غریبوں کا بھلا، ظالموں کا مقابلہ اور آج حق بات کہنے کی ادا ہے۔ آج یتیموں پہ شفقت ہے' بیواؤں کی دستگیری ہے۔ آج وہ نظام ہے جو مساوات پر مبنی ہے۔ آج جمہوریت ہے یہ ساری باتیں کہاں سے حاصل ہوئی ہیں زمانے کو۔ یہ سب پیغمبرِ انقلاب محمد مصطفیٰؐ کی بارگاہ سے حاصل ہُوئی ہیں۔

ہم جب دوسرے کسی ملک میں وہ چیزیں دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں یہ ان کی ہیں۔ یہ اُن کی نہیں یہ ہماری ہیں۔ ہمیں کسی سے چڑ نہیں' ہمیں کسی سے بَیر نہیں۔ اگر چین نے وہ باتیں اپنا لیں ہم نے نہیں اپنائیں تو ہمارا قصور ہے اگر کسی اور معاشرے میں وہ چیزیں ہیں ہمارے معاشرے میں نہیں ہیں تو ہم بھول گئے' ہماری تھیں۔ ہم نے بُھلا دیں زمانے نے لے لیں۔ وہ

آگے نکل گئے ہم پیچھے رہ گئے۔ آج ہمیں پھر سے یہ بات ذہن میں تازہ کرنی ہوگی کہ ہمیں انقلاب لانا ہے اس معاشرے کو بدلنا ہے۔ حکومت حاصل کرنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ ہاتھوں کی تبدیلی ہمارا مقصد نہیں تھا۔ ہم اصول بدلنا چاہتے تھے ہم نظام بدلنا چاہتے تھے۔ ہم سماج بدلنا چاہتے تھے۔ جب تک وہ سماج نہیں بدلتا وہ نظام نہیں بدلتا وہ اصول نہیں بدلتے۔ ہم منزل تک نہیں پہنچ سکتے ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ ہماری جدوجہد جاری ہے۔ ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ جان جائیگی مگر جدوجہد کا پرچم ہاتھ سے نہیں جائے گا۔

میں کیسے مان لوں کہ نظام بدل گیا۔ کیا میں نہیں دیکھتا کہ میرے دفتر میں، باہر، گھر میں ہجوم ہوتا ہے۔ کہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کو سفارشی چٹھی دوں کہ وہ اپنا جائز حق حاصل کر سکیں۔ جس معاشرے میں جائز حق حاصل کرنے کے لیے وزیر کی سفارش کی ضرورت پڑتی ہو، کون جھوٹا کہتا ہے کہ وہ نظام تبدیل ہو گیا اور وہ نظام جو ہے مساوات کے اصولوں پر مبنی ہے۔

جس نظام کے اندر غریب کا بچہ سکول میں داخلہ نہ لے سکے جب تک کہ وزیر کی سفارش نہ ہو اور ایم پی اے کی سفارش نہ ہو۔ میں کیسے مان لوں کہ نظام بدل گیا۔

جس نظام میں مجھ سمیت وزیروں اور ممبروں اور مال داروں کے گھروں کی کھڑکیوں پر ریشم کے پردے لگے ہوئے ہوں اور غریب کی بیٹی کا سر ننگا ہو میں کیسے مان لوں کہ وہ نظام بدل گیا۔

تو دوستو! اگر انقلاب لانا ہے تو نظام بدلنا ہوگا۔ آج غریب کا بیٹا اس لیے ترقی نہیں کر سکتا کہ وہ غریب کا بیٹا ہے اور امیر کا بیٹا اس لیے ترقی کرتا ہے کہ اس کو باپ کی دولت کا سہارا ملا ہوا ہے۔ نظام بدلے گا تو پھر سب کیلیے ترقی کے یکساں مواقع ہونگے جس کا ذہن ہے جس کا حق ہے اس کو ملے گا جس کا حق نہیں ہے اس کو نہیں ملے گا جو ظلم کرے گا وہ بااثر بھی ہوگا تو سزا پائے گا اور جو غریب ہے، مظلوم ہے، جس کی جیب میں پیسے بھی نہیں ہیں وہ انصاف حاصل کرنے سے اس لیے محروم نہیں رہے گا کہ وہ وکیل کو فیس نہیں دے سکتا۔ یہ آپ کو سارے کام کرنے ہیں اور اگر اس سارے کام کے آغاز ہی میں آپ لڑنے لگ گئے آپ جھگڑنے لگ گئے۔ آپ گردپوں

یں بٹ گئے تو پھر دوستو! کون منزل کو پہنچے گا۔ اپنے لیڈر کا کیا ساتھ دو گے۔ میں تو جب اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھتا ہوں تو مجھے وہ شعر یاد آتا ہے کہ ؎

مسافت دُور کی ہے اور ساتھی تھکتے جاتے ہیں
کہیں منزل پہ میرِ کارواں تنہا نہ رہ جائے

اس ملک میں جمہوری اور مساوات پر مبنی نظام قائم کیا ہے تو ہماری حکومت نے قائم کیا ہے۔ یہ سہرا ہمارے لیڈر کے سر ہے کہ اس نے مارشل لا کو ختم کیا ہمیشہ کے لیے انشاء اللہ مارشل لا ختم ہو گیا لیکن اب جمہوریت میں الیکشن ہوں گے۔ پھر آپ کو لوگوں کے سامنے آنا ہو گا۔ پھر لوگوں کے سامنے اپنا اعمال نامہ پیش کرنا ہو گا۔ تو خدمت کرو۔ خدمت کی بُنیاد پر تمھاری پارٹی آگے بڑھ سکتی ہے اور انقلاب کے لیے تیاری کرو مگر سب سے پہلے اپنے اندر بھی تبدیلی پیدا کرو۔ ارد گرد کے لوگ دیکھیں تو برملا کہیں کہ یہ آدمی ہے جو انقلاب لائیگا۔ اس لیے کہ اس کا اپنا عمل انقلاب کی صدا سے ہم آہنگ ہے تو میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لیتا۔ میں آپ سے صرف یہی کہوں گا کہ اس بات کو اپنے ذہن میں بٹھائیں کہ آپ میں اور دوسری جماعتوں میں دوسرے لوگوں میں گروہوں میں فرق یہی ہے کہ وہ سیاسی ہیں آپ انقلابی ہیں۔

اور انقلابی کارکنوں کی منزل کرسی نہیں ہوتی سیاسی کارکنوں کی منزل کرسی ہوتی ہے۔ انھیں ہاتھ بدلنے ہیں آپ کو اصول بدلنے ہیں۔ اور یہ منزل ابھی دُور ہے۔ اس منزل کی طرف چلنا ہے اور اس کے لیے نمونہ کون ہے؟ کس سے روشنی لینی ہے؟ کس سے ہدایت لینی ہے؟ کس کے فلسفے کو ماننا ہے؟ کس کی تعلیم کو سینے سے لگانا ہے؟ کس کے اصولوں کا سہارا حاصل کرنا ہے؟ کس کی یاد سے ہمت پکڑنی ہے وہ قائد انقلاب وہ پیغمبر انقلاب ہیں محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اقوامِ متحدہ کے فرائض

"پاکستان اقوامِ متحدہ کا رکن ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہر سال یہاں بھی یومِ اقوامِ متحدہ منایا جاتا ہے۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو کراچی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پاک، یو۔این ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام جو تقریب منعقد ہوئی، میں اس کا مہمانِ خصوصی تھا۔ ایک اپوزیشن لیڈر کی طرف سے اقوامِ متحدہ کے بارے میں ہر قسم کی بات ہر سطح سے کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی نزاکت نہیں لیکن کابینہ کے ایک رکن کے لیے اقوام متحدہ کی جائز کارکردگی کی تعریف اور اس کی ناکامیوں پر تنقید حد درجہ نازک اور کٹھن ہے۔

اس تقریر میں آب و آتش کو ہم کرنے کی یہ کوشش شاید کچھ زیادہ ناکام نہیں۔"

جنابِ صدر

خواتین وحضرات!

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ آج ہم ایسے موقع پر یومِ اقوامِ متحدہ منا رہے ہیں جبکہ لیلۃ القدر کی مبارک ساعتیں ہم پر سایہ افگن ہیں اور یہ بات آپ سب جانتے ہیں کہ لیلۃ القدر کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ سَلَامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ اس مبارک رات میں ان لمحوں میں صبح تک سلامتی ہی سلامتی ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں مجلسِ اقوامِ متحدہ کا بنیادی مقصد بھی سلامتی کا قیام ہے اس لحاظ سے اس مبارک رات میں یومِ اقوامِ متحدہ کا منایا جانا ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے۔

سلامتی کے لفظ سے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ان مقاصد میں اشتراک اور تعاون جو اقوامِ متحدہ کے سامنے ہیں بالکل ایک قدرتی اور فطری امر ہے اس لیے کہ جس دینِ متین کے ماننے والے ہم ہیں اس کا نام ہی اسلام ہے اور اس کا ایک معنی ایک

مفہوم ایک مطلب سلامتی ہے۔ پھر ہم اپنے آپ کو اہلِ ایمان کہتے ہیں اور ایمان کے بہت لغوی ماخذ میں سے ایک ماخذ امن بھی ہے۔ ایمان امن سے نکلا ہے جس معاشرے میں امن نہیں ہے وہ اہلِ ایمان کا معاشرہ نہیں ہے جس معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں وہ اہلِ اسلام کا معاشرہ نہیں ہے۔ اور جہاں سلامتی ہے جہاں امن ہے، وہ معاشرہ ہے جس کو حقیقی معنوں میں اہلِ ایمان کا اور اہلِ اسلام کا معاشرہ کہا جا سکتا ہے اور سلامتی اور امن ہماری نگاہوں میں اتنے وسیع ہیں کہ ہم رات دن صبح و شام دن کے اوقات میں خدا جانے کتنی ہی مرتبہ آپس میں ملتے ہوئے سلامتی کی دعا دیتے ہیں جب "السلام علیکم" کہتے ہیں تو اس کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ ہم اپنے مخاطب کی سلامتی چاہتے ہیں اور اس میں بھی ہم واحد کا صیغہ استعمال نہیں کرتے بلکہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہم پورے معاشرے کی سلامتی چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر پوری انسانیت کی سلامتی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس لیے ہم مسلمانانِ پاکستان کا یوم اقوام متحدہ منانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے یہ عین ان مقاصد کے مطابق ہے جن پر ہم پہلے سے یقین رکھتے ہیں اور جن کا نفاذ اور رائج کرنا ہمارا فریضۂ حیات ہے۔

جنابِ صدر! اہلِ علم کے اس اجتماع میں مجھے اس پس منظر پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس میں یہ مجلس قائم ہوئی۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ اس سے پہلے ایک اور مجلس بھی اس مقصد کے لیے قائم ہوئی تھی جس کا نام لیگ آف نیشنز تھا اور وہ پہلی جنگِ عظیم کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی۔ جب جنگ کی ہولناکیاں دنیا نے دیکھیں، تباہ کاریاں اور ہلاکت خیزیاں دیکھیں تو قوموں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا مشترک پلیٹ فارم قائم ہونا چاہیے جس کے دباؤ سے دنیا میں قیامِ امن ممکن ہو سکے۔

دوسری جنگِ عظیم نے ان تمام توقعات کا خاتمہ کر دیا جو اس لیگ آف نیشنز سے قائم ہوئی تھیں ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تھی جو تاریخ کی ہولناک ترین جنگوں

میں سے ایک گنی جاتی ہے اور اس جنگِ عظیم نے لیگ آف نیشنز کا خاتمہ کر دیا اس جنگ کے نتیجے میں یونائیٹڈ نیشنز کا ادارہ اٹھا اور اس نئے ادارے سے پھر دنیا نے یہ توقعات قائم کیں کہ شاید اب یہ قوموں کو از سرِ نو ایک پلیٹ فارم پر لا سکے، بقائے باہمی کا جذبہ پیدا کر سکے اور دنیا کو ہولناک تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رکھ سکے۔ مگر اس مجلسِ اقوامِ متحدہ کے قیام میں ایک بنیادی غلطی ایسی ہوئی جس کا خمیازہ ہمیں آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس مجلس کو بھگتنا پڑ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں پوری دنیا کو بھگتنا پڑ رہا ہے اور وہ بنیادی غلطی ایسی تھی جیسے شاعر نے کہا ہے کہ۔ ؎

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

بنیادی طور پر ایک خرابی کی صورت اس کے قیام میں مضمر تھی اور وہ یہ تھی کہ اس کے اندر جہاں یہ بات تسلیم کی گئی کہ تمام قومیں ہمسر ہیں، برابر ہیں ان کے حقوق مساوی ہیں، ان کو یکساں تحفظ دیا جائے گا وہاں پانچ طاقتوں کو بڑی طاقت تسلیم کر لیا گیا اور یہ پانچ طاقتیں وہ تھیں جو اس جنگ میں فاتح کی حیثیت رکھتی تھیں یا خود فاتح تھیں یا فاتحین کی حلیف تھیں اور ان پانچ طاقتوں کو فوقیت دے کر، بالادستی دے کر Veto Power دے کر اور ان کو ایسے حقوق دے کر جو دوسری قوموں کے پاس نہیں تھے اُس منشور کی اس پہلی شق پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا جس کے اندر تمام قوموں کو مساوی حقوق دیے گئے تھے اور جن میں تسلیم کیا گیا تھا کہ تمام قومیں ہمسر ہیں، مساوی ہیں، برابر ہیں اور لطف کی بات یہ ہے (چاہے آپ اسے لطف کی بات کہیں چاہے ستم ظریفی کی۔ مگر کبھی ستم ظریفیاں بھی لطف دیتی ہیں، جراحتیں بھی لطف دیتی ہیں خیر وہ ستم ظریفی کی بات یہ تھی) کہ ان پانچ طاقتوں میں چین کے اس حصے کو شامل کیا گیا جس کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں تھی، جس کی نمائندہ حیثیت نہیں تھی جسے اس کے عوام نے ٹھکرا دیا تھا اور اس چین کو نظر انداز کر دیا گیا، ماؤزے تنگ کے چین کو جو اصل طاقت تھی جو ایک کروڑ در کروڑ عوام کی اُبھرتی ہوئی طاقت تھی اُسے عوام کی نمائندگی کے حق ہی سے محروم کر دیا گیا۔ چین

کا داخلہ اقوامِ متحدہ میں بند کر دیا گیا اس پر دروازے بند کر دیے گیے اس کے بجائے ایک چھوٹے سے جزیرے کو جس کی حیثیت اس چین کے مقابلے میں ایک بڑی چٹان پر ایک چھوٹے سے مینڈک کی تھی اس کو اصل چین کا درجہ دے کر اقوامِ متحدہ کی گردن پر مسلط کر دیا گیا۔

اس صورتِ حال میں ایسی قائم ہونے والی ایک مجلس کی کوشش کے نتیجے میں جو نتائج ظاہر ہو سکتے تھے وہ غیر متوقع نہیں تھے جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اقوامِ متحدہ نے کچھ نہیں کیا جیسا کہ میں نے کہا اس کا مقصدِ وجود نہایت مستحکم ہے اور اس کا مقصد جہاں دنیا کو جنگ سے محفوظ رکھنا ہے وہاں تعلیم میں، ثقافت میں، علاج میں، پس ماندہ قوموں کی ترقی میں بہت سے اقدامات کرنا شامل ہیں۔ زندگی کے سارے شعبوں میں مختلف طرز کے ترقی کے اقدامات کرنا شامل ہے اور اس سلسلے میں یقیناً اقوامِ متحدہ نے اچھے کام کیے ہیں۔ آج اگر بنگلہ دیش سے بھارت سے پاکستانی جنگی قیدیوں کے پاکستان میں لائے جانے کا مسئلہ ہے تو اس میں اقوامِ متحدہ یقیناً اچھا کام کر رہی ہے جہاں تک مختلف علاقوں کے لوگوں کا جو جنگ کے بعد تباہ حال ہوئے ان کی آبادی کا تعلق ہے، ان کی امداد کا تعلق ہے، ان کو فنی سہولتیں بہم پہنچانے کا تعلق ہے، جہاں تک تعلیمِ بالغاں کا تعلق ہے، اس سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی کوششیں لائقِ تبریک ہیں لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ جہاں تک اس بڑے مقصد کا تعلق ہے جو اقوامِ متحدہ کے قیام کے منصوبے میں بنیادی مقصد کی حیثیت رکھتا ہے، امن کے قیام اور اس کے حصول کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی اس سلسلے میں وہ مصلحتوں کا شکار ہو گئی ہے۔ بڑی طاقتوں کی ڈپلومیسی کا شکار ہوئی ہے ان کے مفادات کا شکار ہوئی ہے ان کے مفادات کی چراگاہ بنی ہوئی ہے۔

بڑی طاقتوں کی باہمی آویزش اور ان کی باہمی مصلحت طرازیوں نے اس کے اس مقدس مقصد پر بہت کچھ گرد ڈال دی ہے جو دنیا نے اس سے وابستہ کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ بہت سے ملکوں نے اقوامِ متحدہ سے مایوس ہو کر اپنے معاملات باہر طے کرنا شروع کر دیے

اور آپ دیکھ لیجیے صومالیہ اور کینیا نے اپنے جھگڑے باہر طے کرنے کی کوشش کی اور اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ صومالیہ اور ایتھوپیا نے اپنے جھگڑے اقوام متحدہ سے بالا بالا طے کرنے کی کوشش کی جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ ویت نام کی جنگ میں اقوام متحدہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکی، اس سلسلے میں وہ انصاف طلب لوگوں پر انصاف کا کوئی دروازہ وا نہیں کر سکی، لیکن ویت نام کے دونوں فریقوں نے آخر کار مایوس ہو کر اس سے باہر اپنے معاملات طے کرنے کی کوشش کی اور آج نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ خاص طور پر چھوٹی قوموں کو اس ادارے سے مایوسی ہوتی جا رہی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک بڑی طاقتوں کی باہمی مصلحتیں اجازت نہیں دیتیں، جب تک ان کی آویزشیں جاری ہیں، جب تک اس ادارے میں ان کو برتری حاصل ہے اس وقت تک یہ ادارہ موثر رول ادا نہیں کر سکتا۔

جناب صدر! میں آج کی شب یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اقوام متحدہ آج پھر آزمائش کے دور سے گزر رہی ہے اور یہ آزمائش اتنی کڑی ہے اور اس کے لیے جاں بر ہونے کا ایسا موقع بھی فراہم کرتی ہے کہ اگر یہ ادارہ اس آزمائش سے کامیاب طور پر گزر گیا تو دنیا کے اندر اس کی ساکھ بحال ہونے میں بہت مدد ملے گی اور کمزور اقوام ایک دفعہ پھر اسے اپنا ملجا و ماوی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔

وہ آزمائش عرب اسرائیل جنگ نے فراہم کر دی ہے آپ کو یاد ہو گا کہ اقوام متحدہ اس سلسلے میں عرب اسرائیل جنگ کے ۱۹۶۷ء کے موقع پر ایک قرارداد پاس کر سکی ہے اس قرارداد کے دو حصّے ہیں قرارداد کے پہلے حصے میں یہ کہا گیا تھا کہ اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کر کے عربوں کو واپس دے دے۔ دوسرے جزو میں یہ کہا گیا تھا کہ ہر ملک دوسرے ملک کے ہر علاقہ، دوسرے علاقے کی سالمیت اور تحفظ کی ضمانت دے۔ اگرچہ یہ دوسرا جزو عربوں کے مفاد کے منافی تھا، عربوں کے مقاصد کے منافی تھا لیکن اس کے باوجود عربوں نے اسے تسلیم کیا

لیکن کئی سال گزر جانے کے باوجود اقوام متحدہ عربوں کے علاقے اسرائیل سے واگزاشت نہیں کروا سکی۔

اگر اقوام متحدہ بھی محض ایک مجلسِ وعظ ہے تو پھر ایسی مجالسِ وعظ تو ہر ملک میں قائم ہیں ان مجالسِ وعظ سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اگر اقوام متحدہ اپنی قرار داد کو عملی جامہ پہنانے کی قدرت نہیں رکھتا اگر اس میں ایک ملک سے بات منوانے کی صلاحیت نہیں ہے اگر وہ کوئی ایسا پریشر اپنے پاس نہیں رکھتی جو وہ غاصب قوم سے اس کا غصب کردہ علاقہ واپس لے سکے تو پھر ایسے ادارے کا انجام کچھ زیادہ تابناک نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں ذرا سا گریز کروں اور یہ کہوں کہ عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں جو علاقہ یہودیوں نے ہتھیا لیا اُس پر قبضہ کر لیا تھا اور آج چھ سات سال گزرنے کے باوجود اس کا ایک انچ بھی دینے کے لیے تیار نہیں اس کے مقابلے میں پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بھارت کے قبضے میں تھا اور جہاں اس کے لیے کریڈٹ بھارت کو بھی جاتا ہے کہ اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیا وہاں اس کے لیے قوم کو اپنے لائق لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے۔ جس نے اپنی شاندار ڈپلومیسی اور سیاست کی بنیاد پر گفت و شنید کی میز پر پانچ ہزار مربع میل علاقہ بھارت سے واگزار کرا لیا یقیناً آج یہ بات لوگوں کے نزدیک کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اس لیے کہ اس معاملے میں ہمارا معاشرہ اتنا صاف دل نہیں ہے کہ زندہ لوگوں کے کارناموں کی قدر کر سکے لیکن وقت آئے گا جب لوگوں کو اس کا اندازہ ہو گا جب عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں ہونے والی قربانیوں کو دیکھیں گے کہ اس طرح مسلسل ۲۳ سال تک قربانیاں دینے کے باوجود ہزاروں لوگوں کا خون بہہ جانے کے باوجود عرب اپنا علاقہ واپس نہیں لے سکے اور اس کے مقابلے میں ایک لیڈر نے صرف گفت و شنید سے اتنا بڑا علاقہ واپس لے لیا تھا تو پھر یقیناً وہ انصاف کریں گے اور مستقبل کا مؤرخ اس بات پر اس دور کے لیڈر کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جائے گا تاہم یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔

اقوام متحدہ آج پھر ایک نازک دور سے گزر رہی ہے اسے ایک آزمائش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سلسلے میں دنیا کی خاص طور پر کمزور قوموں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی ہیں، اور وہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ اقوام متحدہ اس بارے میں اپنے فریضہ منصبی کو کس طرح ادا کرتی ہے آج ضرورت ہے کہ عرب اسرائیل جنگ میں اقوام متحدہ عربوں کو ان کا حق دلائے عربوں کو ان کے علاقے واپس ملیں فلسطین کے وہ لوگ جنھیں بے گھر کیا گیا ہے جن کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا ہے ان کو ان کا علاقہ واپس دلایا جائے انھیں ان کی سرزمین میں آباد کیا جائے جو غاصب ہیں انھیں باہر نکالا جائے اور اس طرح اس مسئلے کو مستقل طور پر حل کر دیا جائے نہ یہ کہ محض لیپا پوتی ہو، محض وقتی طور پر آگ بجھانے کی کوشش کی جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ اس آگ میں ابھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں جو پھر شعلہ جوالہ بن کر مشرق وسطیٰ کے امن کو تباہ کر سکتی ہیں۔

آج یہ صورت حال ہے جس میں اقوام متحدہ کی اٹھائیسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ ہمیں اقوام متحدہ کے نیک مقاصد سے اتفاق ہے پاکستان ہمیشہ امن و امان میں یقین رکھتا رہا ہے اور ہمارے لیڈر نے اس عرب اسرائیل جنگ میں مختلف ملکوں کا دورہ کیا ہے اور اس ضمن میں اس نے ایسا فارمولا پیش کیا ہے جس سے یہ مسئلہ مستقل بنیادوں پر حل ہو سکتا تھا۔

ہم نے بھارت کے ساتھ اپنے معاملات کے تصفیے کے لیے ہمیشہ مذاکرات کی پیش کش کی ہے ہم نے شیخ مجیب الرحمٰن سے اپنے جھگڑوں کے تصفیے کے لیے گفتگو کی پیش کش کی اس لیے پاکستان کے بارے میں یہ کہنے کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ امن و امان میں یقین نہیں رکھتا یا یہ گفت و شنید اور مذاکرات میں یقین نہیں رکھتا۔ یقیناً یہ اقوام متحدہ کے منشور سے ہم آہنگ ہے اس کے مقاصد پر ایمان رکھتا ہے اور قیام امن کے لیے اس کو ہر قسم کی امداد دینے کے لیے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہے۔

مجھے اُمید کرنی چاہیے اور دعا بھی، میرا ایمان ہے کہ آج کی شب دعائیں مُستجاب ہوتی ہیں اس لیے ہمیں یہ دعا کرنی چاہیے کہ اقوام متحدہ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب

ہو اس کے اندر جو اُونچ نیچ ہے وہ ختم ہو۔ کمزور قومیں اس سے اپنے حقوق واپس لینے کے قابل ہو سکیں۔ یہ ادارہ اس قابل ہو سکے کہ یہ کمزور اقوام پر انصاف کے دروازے کھول سکے ورنہ دوستو مجھے کہنے دو کہ آج ہم سالگرہ منانے کے لیے جمع ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم اگلی مرتبہ جمع ہوں تو وہ دن سالگرہ کے بجائے برسی کا دن ہو۔

مارشل لا کورٹ میں

"۱۹۷۰ء کے وسط میں مارشل لاء کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا تو اس موقع پر ایک سپیشل فوجی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ عدالت نے جو چارج شیٹ مجھے دیا تھا اس کا جواب وکیل کی بجائے میں نے خود دیا۔

یہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور میرا سر اپنے رب کے سامنے یہ کہتے ہوئے شکر سے جھک جاتا ہے کہ اس نے مجھے آمریت کے بھیانک سائے میں بھی حق بات کہنے کی توفیق عطا کی۔"

مجھے اس معزز عدالت کے سامنے پیش ہونے سے پہلے جو چارج شیٹ دیا گیا ہے اس میں مجھ پر چھ الزامات عائد کیے گئے ہیں جن میں سے پہلے پانچ الزامات تقریباً ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ چھٹے الزام پر پہلے ہی بہت مواد فاضل عدالت کے سامنے آچکا ہے۔ میں اس پر مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ خبر میں نے سوسائٹی کی اصلاح اور بھلائی کے لیے چھاپی تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے صحافتی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا۔ دوسرے الزامات میں لائل پور اور سلانوالی کے جلسوں کی تقریروں کے سیاق و سباق سے کٹے ہوئے چند جملے شہاب کے دو اداریے اور ایک خبر شامل ہیں۔ ان سب میں نوابزادہ شیر علی خاں یا دوسرے وزیروں کے اقوال و افعال پر تنقید کی گئی ہے یا ان کے عزائم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سب پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی بجائے اس مخصوص پس منظر اور ماحول کو معزز عدالت کے سامنے اُجاگر کروں جو میری اس راست گفتاری کا اصل محرک ہے۔ میں فروری ۶۵ء میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہوا۔ مودودی صاحب کے تضادات اور ان کے قول و عمل میں بھیانک فاصلوں

نے مجھے دین کے نام پر اس جنگ زرگری سے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ مجھے جماعت کے بچھائے ہوئے کاروباری، سماجی، مذہبی، دام ہم رنگ زمین سے نجات ملی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ بقیہ زندگی اب مجھے غیر سیاسی انداز میں مذہب کی خدمت کرتے ہوئے گزارنی چاہیے چنانچہ میں اصلاح معاشرہ اور مذہبی تبلیغ کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ اس سفر میں ایسے بھی موڑ آئے کہ عروس سیاست نے بصد ناز و ادا مجھے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔ صدر ایوب نے ایک مرتبہ نہیں تین مرتبہ بلا کر مجھے کنونشن مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی، اہم ترین عہدوں کی پیش کش کی۔ میں نے معذرت کی تو اپنے وزیروں کے ذریعے بار بار مجھ پر زور ڈلوایا، مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کی توفیق سے میں ہر مرتبہ محفوظ رہا۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

میری علمی اور مذہبی سرگرمیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ حکومت نے مجھے ۶۶ء، ۶۷ء، ۶۸ء تین سال متواتر اپنے سرکاری حج وفد کا رکن نامزد کیا۔ حج وفد بھیجنے کا یہ سلسلہ آخر ختم ہو گیا اور وطن عزیز میں تنہا مجھے ہی یہ شرف حاصل ہوا کہ پہلے حج وفد سے لے کر آخر حج وفد تک میں برابر اس کا رکن رہا۔ ۶۸ء میں میری تحریری معذرت کے باوجود حکومت نے مجھے ستارۂ قائد اعظم دینے کا اعلان کیا۔ ۶۹ء میں چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف نے مجھے بادشاہی مسجد لاہور کی خطابت کا منصب پیش کیا، لیکن سرکاری ملازمت سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے میں نے یہ اعزاز قبول نہیں کیا۔ ستمبر ۶۵ء کے زمانۂ جہاد سے حکومت نے ریڈیو سے میری تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد ٹیلیویژن سے میرا درس قرآن جاری ہوا۔ تالیف و تصنیف درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کی ذمہ داریاں اس کے علاوہ تھیں۔ ۶۸ء میں حکومت مغربی پاکستان نے شیعہ سنی فرقہ وارانہ مسائل و تنازعات کا تصفیہ کرنے کیلئے ایک بورڈ تشکیل دیا جس میں پانچ شیعہ علما تھے اور پانچ علمائے اہل سنت اور ان میں ایک نام میرا بھی تھا۔ غرضیکہ اس انداز سے زندگی بسر ہو رہی تھی یہاں تک کہ مارشل لا نافذ ہو گیا۔

مارشل لا کے نفاذ سے کچھ عرصہ پیشتر ہی جناب ذوالفقار علی بھٹو قومی امنگوں کے ترجمان بن کر میدان میں آ چکے تھے۔ انھوں نے سرمایہ داری، سامراجیت اور استحصال کے خلاف آواز اٹھا کر ہر محبِ وطن کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ مخالفین کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے نے کچھ مدت تک تو مجھے بھٹو صاحب اور ان کے پروگرام کے بارے میں غلط فہمیوں میں مبتلا کیے رکھا لیکن بعد میں آزادانہ مطالعہ کے بعد میں جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس پکار پر لبیک نہ کہنا خالق و مخلوق دونوں سے غداری کے مترادف ہوگا۔ ادھر یہ احساسات تھے ادھر یہ پاس وضعداری تھا کہ جب میں نے صدر ایوب کے زمانۂ عروج میں سیاست میں شریک ہو کر ان کی مخالفت نہیں کی تو ان کے عہدِ زوال میں ان پر تنقید کر کے سستی شہرت کیوں حاصل کروں البتہ اتنا میں نے ضرور کیا کہ اس زمانہ میں فکری اور نظری محاذ پر میں نیشنلائزیشن اور تحدید ملکیت کے حق میں قرآنی دلائل پیش کرتا رہا اور سامراج دوستی اور سرمایہ داری کے خلاف میں نام نہاد مذہبی عناصر سے پنجہ آزما رہا یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو مارشل لا نے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی تو میرے یہ نظریات کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ غالباً ملک بھر میں پہلا جلسہ عام ۴ جنوری کو کمپنی باغ سرگودھا میں ہوا۔ یہ پیپلز پارٹی کا جلسہ عام تھا اور سیاست سے برسوں کی غیر حاضری کے بعد میں پہلی مرتبہ اس عوامی سٹیج سے بول رہا تھا۔ پانچ چھ سال کی پُرامن اور باعزت، باآرام غیر سیاسی زندگی گزارنے کے بعد دوبارہ اس خارزار میں قدم رکھنے کا فیصلہ میں نے اپنے ایمان کی روشنی میں کیا تھا۔ وطن عزیز میں قوم کو قائداعظم کے بعد پہلی مرتبہ بھٹو کی صورت میں ایک عوامی قیادت مل رہی تھی۔ دکھ درد کے مارے ہوئے عوام کو غربت و افلاس کی زنجیروں سے رہائی دلانے کے لیے ایک تحریک شروع ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جماعت اسلامی اور بعض دوسرے سامراج نواز حلقے مذہب کے نام پر حق کی اس آواز کو دبانے میں مشغول ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ آہستہ آہستہ مذہب سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ ان تمام نام نہاد مذہبی نمائندوں کو (جو حقیقت میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ایجنٹ اور گماشتے ہیں) دیکھ دیکھ کر مذہب کو ایک عوام دشمن طاقت سمجھنے لگے ہیں۔ اس موقع

پر اگر میں عوامی جد وجہد میں شریک ہو کر معاشی عدل و انصاف کے سلسلے میں خدا اور اس کے رسول کی اصل تعلیمات سامنے نہ لاتا، مذہب کے ان نادان دوستوں کا مقابلہ نہ کرتا تو مجھے ڈر تھا کہ قیامت کے دن میں اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا حق دار نہ بن سکوں گا۔

اسی زمانہ میں ایک سو تیرہ مولوی صاحبان نے اسلامی سوشلزم کے حامیوں پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہ واضح طور پر مارشل لا، کی خلاف ورزی تھی۔ اس کے ذریعے ایک طرف مصر، شام، عراق سوڈان، الجزائر، لیبیا اور یمن کے عرب ملکوں کے خلاف نفرت پھیلنے لگی۔ دوسری طرف پاکستان کے کروڑوں محنت کش عوام اور مزدور، کسان، صحافی اور دانشور دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔ میرے نزدیک یہ مسلمانوں کا روحانی قتل عام تھا جو جسمانی قتل سے کہیں بڑھ کر سنگین اور شدید تھا۔ یہ مولوی صاحبان کلمہ گو مسلمانوں کو کافر کہہ کر ان کی بیویوں کو ان کے نکاح سے خارج قرار دے رہے تھے۔ ان کے بچوں کو ان کی وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مر جانے پر مسلمانوں کی نماز جنازہ کا انھیں مستحق نہیں سمجھ رہے تھے مسلمانوں کے قبرستان میں ان کی تدفین کو ناجائز ٹھہرا رہے تھے۔ ایک مسلمان پر کفر کے فتوے سے یہی منطقی نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ حکومت کا فرض تھا کہ وہ ان فتوے بازوں کا پورا پورا محاسبہ کرتی مگر افسوس کہ جو پولیس ملک وقت اور خود مارشل لا، حکومت کی خیر خواہی کے لیے چند وزیروں پر ہونے والی تنقید کو مقدمہ بغاوت کا سرعنوان بنا دیتی ہے وہ اس سلسلے میں کوئی بھی کارروائی کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مگر کیا اسلام کے نام پر ہونے والے اس ظلم عظیم کی روک تھام کے لیے میں پولیس کی کارروائی کا انتظار کرتا رہتا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے قلم و زبان سے مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کے ساتھ مل کر اس فتوے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ عوامی جلسوں کو خطاب کرنے کے علاوہ ایک اور وسیلۂ اظہار بھی میرے پاس موجود تھا یہ ہفت روزہ "شہاب" تھا جو میں نے ۶۰ء میں جاری کیا تھا اور اس وقت سے نیم مذہبی، نیم سیاسی اور نیم علمی انداز سے شائع ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نام نہاد اسلام پسندوں نے صحافت کے وقار اور تقدس کو پامال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے اخبارات اور جرائد کے ذریعے سے کذب و افترا کے بے مثال

نمونے پیش کر کے اخلاق باختگی کے نئے ریکارڈ قائم کر دیے ہیں۔ مقبول عوامی شخصیتوں پر بے دریغ کیچڑ اچھالا جا رہا ہے۔ ان کے کارٹون بنائے جا رہے ہیں۔ انتظامیہ کے ارکان کو بلیک میل کرنے کے لیے کچھ افسروں کو سوشلسٹ قرار دے کر ان کی تطہیر کے مطالبے ہو رہے ہیں۔ علمائے حق پر تہمتیں تراشی جا رہی ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں صحافت کے محاذ پر بھی ان عوام دشمن عناصر کا مقابلہ کروں گا۔ میں نے "شہاب" کو ایک علمی جریدہ کی بجائے عوامی اخبار بنا دیا اور اس عوامی اخبار نے پے در پے صحافیانہ غنڈہ گردی پر وہ کاری ضربیں لگائیں کہ ان کی کھوپڑیاں پلپلی ہو گئیں اور یہ صحافت کے محاذ سے پسپا ہو کر "شہاب" اور میرے خلاف درپردہ سازشوں میں مشغول ہو گئے۔

"شہاب" کے اسی دورِ جدید میں مجھے نوابزادہ شیر علی خاں کی کارکردگی کو نسبتاً قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا مشاہدہ یہ تھا کہ وہ صریح جانب داری سے کام لے رہے ہیں اور اس جانب داری کو بے نقاب کرنا میرا صحافتی فریضہ ہے۔ اس سے پہلے میں اخبارات میں مختلف سیاسی رہنماؤں کے بیانات بھی پڑھ چکا تھا جن میں صدارتی کابینہ کے بعض ارکان کے نام لے کر ان پر جانبداری کے الزام لگائے جا چکے تھے۔ مثال کے طور پر کونسل مسلم لیگ پنجاب کے صدر سردار شوکت حیات اور بہت سے دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں نے نواب مظفر علی قزلباش کی جدید و قدیم سیاسی وابستگیوں پر کھلم کھلا تنقید کی اور انھیں صدر جنرل یحیٰے خاں کی غیر جانب دار حکومت کے لیے نااہل قرار دیا۔ یہاں میں مثال کے طور پر فاضل عدالت کے ملاحظہ کے لیے روزنامہ "حریت" کراچی مورخہ ۱۴ جولائی کی ایک خبر پیش کر رہا ہوں جس کا عنوان یہ ہے کہ

صدر مملکت اپنی موجودہ کابینہ توڑ کر اعلیٰ فوجی حکام پر مشتمل نئی کابینہ تشکیل دیں (یہ اخبار اس بیان کے ساتھ لف ہے۔)

خبر میں کہا گیا ہے کہ:

کوئٹہ ۱۳ جولائی (پی پی آئی) مغربی پاکستان مسلم لیگ کونسل کے سربراہ جناب یحییٰ بختیار نے صدرِ مملکت جنرل آغا یحیٰے خان پر زور دیا ہے کہ وہ اپنی صدارتی کابینہ کو توڑ دیں۔ کیونکہ کابینہ اپنی

غیر جانب داری برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئی ہے حالانکہ منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کے لیے اس کی شدید ضرورت ہے۔ انھوں نے کل رات اپنی قیام گاہ میں ایک استقبالیہ تقریب کے دوران ایک انٹرویو دیتے ہوئے صدرِ مملکت سے پُرزور الفاظ میں مطالبہ کیا کہ اگر ممکن ہو سکے تو وہ موجودہ کابینہ کو تبدیل کر کے ایک ایسی کابینہ تشکیل دیں جو فوج کے سینئر عہدیداروں پر مشتمل ہو۔ یحییٰ بختیار نے کہا کہ ہمیں مکمل اعتماد اور یقین ہے کہ سینئر فوجی حکام ہی ملک کی کسی سیاسی جماعت کی حمایت یا جانب داری کے بغیر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کرانے کے بارے میں مفید ہوں گے۔ ہمیں صدر یحییٰ کے خلوص اور غیر جانب داری پر کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے لیکن جہاں تک ملکی سیاست اور انتخابات میں موجودہ کابینہ کی غیر جانب داری کا سوال ہے اس پر مکمل طور سے عوام کا اعتماد ختم ہو چکا ہے۔

سرحد کے خان غلام محمد خاں لوند خوار اور دوسرے لیڈروں نے اپنے اخباری بیانات کے ذریعے سردار رشید کی جانب داری پر احتجاج کیا۔

اس طرح کی متعدد مثالوں کے پیشِ نظر میں سمجھتا تھا کہ کسی وزیر کی غلط کاریوں پر تنقید مارشل لا کے ضابطے کی زد میں نہیں آتی۔ غلط کار وزیر اپنی کارگزاریوں کی وجہ سے مارشل لا کے متعلق عوام کو غلط تاثر دینے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس طرح یہ گویا خود مارشل لا کے مخالف ہیں اور مارشل لا کے ان مخالفوں پر تنقید چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی بدخواہی نہیں بلکہ خیر خواہی ہے۔

نواب زادہ شیر علی خاں کی شخصیت کے بارے میں مجھے پہلا دھچکا اس وقت لگا جب ریڈرز ڈائجسٹ میں جین ڈکسن کی پیش گوئیوں والا وہ مضمون چھپا جس میں مضمون نگار کے بقول نوابزادہ صاحب نے قیامِ پاکستان کی پیش گوئی پر نہ صرف شک کا اظہار کیا بلکہ اسے ناپسند بھی فرمایا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ نواب زادہ صاحب اس کی تردید جاری فرمائیں گے مگر اس طرح کی کوئی تردید جاری نہیں ہوئی۔

دوسری بار ان کی شخصیت کے بارے میں افسوسناک تاثر میں نے اس وقت قبول کیا جب

جماعت اسلامی کے رسالہ اُردو ڈائجسٹ میں انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے چین اور چین کے نظام کے بارے میں سخت معاندانہ ریمارکس دیے۔

ادھر موصوف نے اپنی تقریروں اور اخباری بیانات میں بار بار نظریۂ پاکستان کی وہ مخصوص توجیہات پیش کیں جو جماعت اسلامی اور اس کے ہم سفروں کی ذہنی اپج کا نتیجہ تھیں۔ اس پر پورے ملک میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اور لاتعداد جلسہ ہائے عام میں نواب زادہ صاحب کو صدارتی کابینہ سے نکالنے کا مطالبہ کیا گیا۔ پُورے ملک میں مشہور ہو گیا کہ نواب زادہ شیر علی خان کو وزارت سے علیحدہ کیا جا رہا ہے اس پر جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ زندگی نے اپنے ۳۰ مارچ ۷۰ء کے شمارے میں "شیر علی کا مستقبل" کے عنوان سے یہ دھمکی دی کہ اگر نوابزادہ صاحب کو کابینہ سے علیحدہ کیا گیا تو اسلام پسند جماعتیں انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں گی۔ (زندگی کا یہ شمارہ فاضل عدالت کے ملاحظہ کے لیے لف ہے)

زندگی لکھتا ہے:

"راولپنڈی کے ایک انگریزی روزنامے کی اطلاع ہے کہ اس قسم کی افواہیں بڑے زور شور سے پھیلائی جا رہی ہیں کہ نواب زادہ شیر علی خاں اب چند دن کے مہمان ہیں اور منصب وزارت سے ان کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی اور ان کے ہم سفر یہ افواہ بڑے شدّو مد سے پھیلانے میں مصروف ہیں۔ نوابزادہ شیر علی خان سے ان عناصر کی ناراضگی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ نظریہ پاکستان کے پُرجوش مبلغ ہیں وہ اپنی صاف گوئی اور اصول پرستی کے سبب ایوب خان کے زمانے میں بھی زیرِعتاب رہے اور ہمیں اُمید ہے کہ اگر اب بھی انھیں وزارت اور اصول کے درمیان کسی چیز کا انتخاب کرنا پڑا تو وہ وزارت کے بجائے اصولوں کو ہی چُنیں گے خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے کیونکہ اس سے موجودہ حکومت کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیل جائیں گی اور مُلک بھر کے اسلام پسند حلقے یہ تأثر لیں گے کہ حکومت نے ضابطہ نمبر ۶۰ اور اسلام اور

نظریۂ پاکستان کی حفاظت کے لیے بعض دوسرے ضوابط محض عام لوگوں کو تسلی دینے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے جاری کیے ہیں ان پر عمل مقصود نہیں۔ ہمیں یقین ہے حکومت یہ فضا کسی صورت پیدا نہ ہونے دے گی اگر ایسا ہوا تو پھر اسلام پرست جماعتیں انتخابات کے بارے میں اپنے فیصلے کو تبدیل بھی کر سکتی ہیں۔"

یہ اقتباس دائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ نواب زادہ صاحب کی وابستگی کا جو ناقابل تردید ثبوت پیش کرتا ہے اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں فاضل عدالت خود ہی اس کے مضمرات پر غور کر سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال میرے سامنے آئی تو میں نے پبلک میں اس پر تنقید کرنے کے بجائے صدرِ مملکت جنرل یحییٰ خان کو اس سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ میں اپریل میں ان سے ملا اور نواب زادہ صاحب کی جانبدارانہ سرگرمیوں کو میں نے تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیا۔ میں صدرِ محترم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کامل توجہ سے میری معروضات کو سنا بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے اردو ڈائجسٹ کے انٹرویو پر خود بھی افسوس کا اظہار کیا۔ اتفاق سے میرے بعد نواب زادہ شیر علی خان کو صدرِ مملکت کی خدمت میں حاضر ہونا تھا۔ صدر صاحب نے مجھے خود بتایا کہ ابھی نوابزادہ صاحب آ رہے ہیں میں اس سلسلے میں ان سے ضروری بات کروں گا اور آئندہ وہ عوام کو شکایت کا موقع نہیں دینگے۔ نمازِ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ صدرِ محترم نے ازراہِ شفقت میرے لیے مصلّے کا انتظام کرا دیا۔ یہ ملاقات پریذیڈنٹ ہاؤس میں واقع ان کی قیام گاہ پر ہوئی۔ ہم باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے نماز ان کے ڈرائینگ روم میں ادا کی۔ اسی اثنا میں نواب زادہ صاحب آچکے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھا اس کے بعد صدرِ محترم نے مختلف اخبارات و جرائد کے حوالے سے ان کے ساتھ ان کی جانب داری پر جو گفتگو کی ہوگی (اور یہ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ کی تھی چنانچہ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ تک اپنی تقریریں اور بیانات میں محتاط رہے) تو نوابزادہ صاحب کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان کی شکایت کرنے والا مجھ گناہ گار کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس سے پہلے میرا یہی گناہ کیا کم تھا کہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوتے ہوئے میں کبھی ان کی بارگاہ ہمایونی میں حاضر نہیں ہوا۔ اب اس جسارت کے بعد تو میرا گناہ بغاوت کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اُنھوں نے مئی کے آخر اور جون کے شروع میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن حکام پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ کوثر نیازی پیپلز پارٹی کے جلسوں کو خطاب کرتا ہے اس کے باوجود اسے پروگرام دیے جا رہے ہیں۔ محکمہ نشریات کے افسران وزیر صاحب کا تحریری حکم چاہتے تھے جو وہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ بات نہ بنی تو دوسری باز پرس ان سے یہ ہوئی کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سب سے زیادہ پروگرام اسی کو کیوں دیے جاتے ہیں۔ اس پر پروگراموں کا ماہوار جائزہ لیا گیا تو یہ بات بھی صحیح ثابت نہ ہوئی۔ یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ جولائی میں مَیں نے پیپلز پارٹی میں باقاعدہ شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان دنوں ٹیلی ویژن کے لیے میرا درس قرآن ریکارڈ ہو چکا تھا۔ یہ ریکارڈ راولپنڈی اور کراچی اسٹیشنوں سے ٹیلی کاسٹ ہونا تھا کہ نوابزادہ صاحب نے میرے درس قرآن کی بندش کے احکام صادر فرما دیے۔ میرا جرم یہ نہ تھا کہ مَیں باقاعدہ سیاست میں کیوں شامل ہوا ہوں۔ یہ جرم تو ڈاکٹر جاوید اقبال بھی کر رہے ہیں اور کونسل لیگ میں ہونے کے باوجود ریڈیو سے نظریہ پاکستان کے موضوع پر ان کے لیکچر نشر ہو رہے تھے۔ یہ جرم مسٹر الطاف حسین قریشی سے بھی سرزد ہو چکا تھا مگر وہ جماعت اسلامی کے کارکن ہونے کے باوجود نوابزادہ صاحب کی خصوصی خواہش کے تحت ٹیلی ویژن پر جلوہ فرما تھے۔ اصل میں میرا قصور یہ تھا کہ میں نوابزادہ صاحب کی پسندیدہ اسلام پسند پارٹی کے بجائے پاکستان پیپلز پارٹی میں کیوں شامل ہوا ہوں۔ اس ذاتی تجزیے کے بعد تو مجھے نوابزادہ صاحب کے جانبدار ہونے میں کوئی شبہ ہی باقی نہ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد اگر میں ان کے کارناموں پر تنقید نہ کرتا تو یہ میرے جذبۂ فرض شناسی کے منافی ہوتا۔

جیسا کہ میں اس فاضل عدالت کے نوٹس میں لا چکا ہوں نوابزادہ شیر علی خاں پر تنقید کرنا کوئی جرم نہیں۔ وہ مارشل لا اتھارٹی نہیں ہیں اگر ایسا ہوتا تو ان کی برطرفی کا مطالبہ کرنے والوں پر اس سے پہلے ہی مقدمہ قائم ہو جاتا۔ حد یہ ہے کہ میں اس جرم میں زنجیریں پہنے ہوئے ہوں

اور ادھر وطن کی فضاؤں میں اب بھی یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ نوابزادہ صاحب کو برطرف کیا جائے۔

میں معزز عدالت کے ملاحظہ کے لیے روزنامہ حریت کراچی مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۰ء اس بیان کے ساتھ پیش کر رہا ہوں جس میں جماعت اہلِ سنت نے اپنے کراچی کے جلسہ عام میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ مطالبہ کیا ہے کہ "وزیر قومی امور کو ان کے موجودہ عہدہ سے سبکدوش کیا جائے، کیونکہ وہ جماعت اہلِ سنت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔"

شیر علی خاں پر تنقید کرنا مارشل لا کے تحت جرم ہوتا تو مقدمہ صرف مجھی پر قائم نہ ہوتا۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی فہرست تو بڑی طویل ہے۔

یہ رند ختم ہوں واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

میری انفرادیت یہ تھی کہ میں ملک اور قوم کے لیے چومکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ ایک طرف جماعت اسلامی اور دوسرے فتوے باز عناصر میرے خلاف گھبتیاں کھا رہے تھے تو دوسری طرف بعض نام نہاد اسلام پسند چیتھڑے صحافت کے میدان میں راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد حکام کو میری جھوٹی سچی شکایتیں پہنچا رہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ میں نے وطنِ عزیز میں غیر ملکی اثر و نفوذ کو بھی پوری شدت سے بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ یہ سفارتی حلقے بھی میرے مخالف ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تاروں اور مراسلوں، وفود اور قراردادوں نے نواب زادہ صاحب کی سرپرستی میں مارشل لا کی انتظامیہ کو بھی مجھ سے بدظن کر دیا۔ میں نے آج تک چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدرِ مملکت جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے خلاف اپنی تحریر و تقریر میں ایک لفظ نہیں کہا۔ خود میری فردِ جرم میں شامل لائل پور کی تقریر کے جملوں سے ثابت ہے کہ میں انھیں نیک نیت سمجھتا ہوں۔ لیکن میری گرفتاری پر حکومت نے جو پریس نوٹ جاری کیا اور پھر بعد میں جو چارج شیٹ مجھے عطا ہوا اس میں یہ پڑھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس میں ایک الزام مجھ پر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا بھی ہے اور اس کی تائید میں جو جملے میری تحریروں اور

تقریروں میں پیش کیے گئے ہیں وہ سب کے سب وہ ہیں جو نواب زادہ شیر علی اور دوسرے وزیروں کے متعلق ہیں گویا چارج شیٹ دینے والے افسروں کی طرف سے چاہا جارہا تھا کہ میں وزیروں کی بدعنوانیوں پر خاموش رہوں۔ وہ جھوٹ بولیں تو اسے جھوٹ نہ کہوں۔ سچائی کا لافانی نمونہ قرار دوں، وہ انتخابات کو ملتوی کرانے کے لیے بعض شر پسند عناصر کی ملی بھگت سے کھچڑی پکائیں تو اسے اپنے اخبار کے ذریعے صدر مملکت اور عوام کے نوٹس میں نہ لاؤں۔ میں فاضل عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے نواب زادہ صاحب اور دوسرے وزیروں کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا اور جو کچھ بھی کہا وہ افواہیں پھیلانے کے انداز میں نہ تھا۔ سینہ گزٹ کے طور پر نہ تھا جو کہا ہزاروں کے مجمع میں کہا جو لکھا قلم و قرطاس کے حوالے کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ صدر مملکت ان لوگوں کی حرکتوں سے باخبر رہیں، ان کا نوٹس لیں، ان کا تدارک کریں۔ بات غلط ہو تو حکومت اس کی تردید جاری کرے لیکن اب اس کو کیا کروں کہ یہی خدمت میرے پاؤں کی زنجیر بن چکی ہے۔ میں صدر مملکت کی شفقتوں سے بے حد گرانبار ہوں وہ بھی میرے جذبۂ حب الوطنی سے ذاتی طور پر واقف ہیں لیکن انھیں میرے بارے میں غلط رپورٹیں پہنچا کر جو تاثر دیا جاچکا ہے اس کے بعد میں ان کی خدمت میں یہ عرض کرنے کا موقع کہاں سے پیدا کروں کہ

سوداؔ کو جرمِ عشق میں کرتے ہیں آج قتل
پہچانتا ہے تو یہ گنہ گار کون ہے؟

قومی تقاضے اور ٹیلی ویژن

"۱۹۷۴ء میں سکیسر کے مقام پر ٹیلی ویژن بوسٹر سٹیشن کا افتتاح ہُوا۔ اس سلسلے میں لاہور کے ٹیلی ویژن سٹوڈیوز میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ میں نے اس موقع پر جو افتتاحی کلمات کہے تھے، یہ تقریر انھی پر مشتمل ہے۔ کسی تقریب کی مناسبت سے ابتدائیہ اور اختتامیہ کے طور پر جو رسمی باتیں کہی جاتی ہیں، انھیں اس تقریر سے حذف کر دیا گیا ہے۔"

ابلاغ عامہ کے وسائل میں آجکل ٹیلی ویژن کو جو عظیم اہمیت حاصل ہے اس سے کوئی ہوش مند شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ہر ملک میں ٹیلی ویژن کے تین بنیادی مقاصد ہوتے ہیں یعنی اطلاعات Information عمومی تعلیم General Education اور تفریح Entertainment

ظاہر ہے کہ پاکستان میں بھی اس کے بنیادی مقاصد میں یہی تین چیزیں آتی ہیں۔ تاہم ہمارے ملک کے خصوصی حالات کے پیش نظر ان نکات کی خصوصی توضیحات کی جا سکتی ہیں۔

مثلاً صرف خبر کے نشر کر دینے سے انفارمیشن کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ خبر کے ساتھ اس کے پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں اس سے پیدا ہونے والے مختلف قسم کے ردِ عمل اور اثرات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اگرچہ بعض نام نہاد قسم کے دانشور خبروں کی اس طرح کی با مقصد نشر و اشاعت کو پروپیگنڈہ کہہ کر اس کی قدر و قیمت کو کم کرنے کی کوششیں بھی کرتے ہیں تاہم دنیا کے تمام مہذّب ممالک میں اس قسم کی با مقصد خبر رسانی کو نہ صرف ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے۔

اپنے ملک کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر ہمیں اپنے تعلیمی پروگراموں کے مقصد، معیار اور پیش کش کے انداز کو ان کے مطابق رکھنا ہوگا۔ ابھی تک باقاعدہ تعلیمی پروگراموں کا سلسلہ ہمارے ہاں سے شروع نہیں ہوا۔ صرف کبھی کبھی تعلیمی نوعیت کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جلد ہی تعلیمی پروگراموں کے باقاعدہ سلسلے شروع ہو جائیں گے یہ سلسلے اپنی مدد آپ، زراعتی تعلیم، حفظانِ صحت اور رفاہِ عامہ کے کاموں سے متعلق ہوں گے ٹیلی ویژن سے نصابی تعلیم نہ تو ممکن ہے نہ مفید۔ البتہ ایسی تعلیم کے لیے جو انسان کی عمومی ذہنی نشو و نما کے لیے درکار ہے، ٹیلی ویژن ایک نہایت مفید وسیلۂ ابلاغ ثابت ہو سکتا ہے اور ہمیں ٹیلی ویژن کی اس حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

تیسرا مقصد یعنی تفریح بھی ایک نہایت اہم مقصد ہے اور بعض ممالک میں تو اس مقصد کو اوّلیت دی جاتی ہے۔ حقیقتاً اس مقصد کی اہمیت سے کوئی شخص انکار بھی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ٹیلی ویژن ہوتا ہی اس کام کے لیے ہے کہ جب دن بھر کام کرنے کے بعد لوگ اپنے گھروں میں ہوں تو ٹیلی ویژن سے انھیں روحانی اور ذہنی آسودگی حاصل ہو۔ تاہم تفریحی پروگراموں کا مطلب محض تفریح برائے تفریح نہیں ہونا چاہیے۔ عمدہ تفریح بھی وہی ہے جو انسان کو ذہنی فرحت مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ صحت مند خطوط پر اس کے ذہن کی تربیت بھی کر سکے۔ ہمیں اس چیز کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ آج سے پہلے ٹیلی ویژن سے جتنے تفریحی پروگرام ہوئے ہیں ان میں سے وہی پروگرام دیکھنے والوں میں مقبول بھی ہوئے اور ان کے ذہنوں میں محفوظ بھی رہے جو بامقصد قسم کی تفریح مہیا کرتے رہے۔ البتہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب سے پہلے بامقصد تفریحی پروگراموں کی تعداد بہت کم رہی ہے اور تعداد کی اس کمی کے ذمہ دار اس دور کے اربابِ سیاست و اقتدار تھے۔ اب ہمیں ٹیلی ویژن کے کارپردازوں سے توقع رکھنی چاہیے کہ ٹیلی ویژن کے بامقصد تفریحی پروگرام تعداد میں بھی زیادہ ہوں گے اور حسن و خوبی کے اعتبار سے بھی سابق پروگراموں سے بہت آگے ہوں گے۔

معلوماتی تعلیمی اور تفریحی پروگراموں کے سلسلہ میں ہمارے ٹیلی ویژن کے کارکن جو کوششیں کام میں لارہے ہیں ان کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ تاہم اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس ادارے کو اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے اور اس میں کام کرنے والے لوگ ٹیلی ویژن کی عوامی مقبولیت اور معاشرے پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات سے بخوبی آگاہ ہیں اور ہمیں ان کے جذبۂ حب الوطنی سے توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اس مؤثر ترین ذریعۂ ابلاغ کو نہایت بامقصد طریقوں سے کام میں لائیں گے۔

تاہم ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارا ملک آمریت کی وجہ سے نہ صرف سیاسی جارحیت کا شکار رہا ہے بلکہ ثقافتی جارحیت کا نشانہ بھی بنا ہوا ہے اور تاریخ کا ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی قوم سیاسی محاذ پر شکست کھا جاتی ہے تو ثقافتی محاذ پر فاتح کی حیثیت حاصل نہیں کرسکتی سیاسی اور فوجی شکست کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کلچر کے حصار میں بھی شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ان شگافوں کا پُر کرنا بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ قوم مادی شکست و ریخت کے بعد ذہنی شکست و ریخت سے بچ سکے۔ ذہنی شکست و ریخت سے بچانے کے لیے ذرائع ابلاغ خصوصاً ریڈیو اور ٹیلیو ژن ڈھال کا کام کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے اس نازک اور کٹھن دور میں جب وہ ہر طرح کی جارحیت کا شکار رہا ہے ہمارے نشریاتی اداروں کے باہمت کارکنوں نے اس کے خلاف سینہ سپر ہونے میں کسی قسم کی کمزوری یا تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا اور انھوں نے اس اعصابی جنگ کے خلاف جو اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے شروع کر رکھی ہے ڈھال بن کر قومی اقدار کی محافظت کی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد حالات بہت زیادہ کٹھن اور مشکل ہو گئے تھے تاہم ان اداروں میں کام کرنے والوں نے بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دیا ہے اور جب سے عوامی حکومت برسراقتدار آئی ہے ان لوگوں نے ملک کی تعمیر نو میں حکومت اور عوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کر کے اپنے اداروں کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر ان نشریاتی اداروں خصوصاً ٹیلی ویژن کے کارکنوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں

نے شبانہ روز محنت کر کے ایک خواب کو حقیقت کا رنگ دیا ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب لاہور میں پاکستان کا پہلا ٹیلی ویژن سٹیشن قائم کیا گیا تو ہمارے پاس اس کام کے لیے نہ تجربہ تھا نہ اطمینان بخش وسائل۔ ایک شکستہ سی عمارت عزم وعمل کی اس طویل داستان کی امین ہے۔ جو ٹیلی ویژن کے کارکنوں اور ہنرمندوں نے اپنے آرام اور اپنی نیند کو تج کر کے اپنے خونِ جگر سے تحریر کی۔ جس مشینری کے ساتھ یہ آزمائشی سٹیشن قائم کیا گیا تھا وہ نہ تو جدید دَور کے تقاضوں پر پوری اترتی تھی نہ ہی فنی ضرورتوں کی کفیل تھی مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں انسانی عزم، ہمت اور محنت وسائل کی کمی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس لیے ہمارے کارکنوں نے بھی اپنے محدود وسائل کی پروا کیے بغیر اس شکستہ گھروندے میں فن کے چراغ روشن کیے۔ مجھے یاد ہے کہ اس ابتدائی دور کے پروگرام بھی معیار اور کوالٹی کے اعتبار سے قابلِ قدر ہُوا کرتے تھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس آزمائشی مدت میں بھی بعض ایسے شاندار ڈرامے اور خاکے پیش کیے گئے ہیں جنھیں ٹیلی ویژن کا قابلِ فخر اثاثہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مگر اس دور کے تقاضے مختلف تھے اور آج کے تقاضے دوسرے ہیں۔ وہ رات کا وقت تھا۔ آمریت کی رات کا وقت۔ اور یہ دن کی روشنی ہے۔ انقلاب کے دن کی روشنی۔ عوام کی حکمرانی کی روشنی۔ قائدِ عوام کی قیادت کی روشنی۔ سب لوگ جانتے ہیں اندھیرے میں عیب چھُپ بھی جایا کرتے ہیں۔ مگر سورج کی تیز روشنی بڑی ظالم ہوا کرتی ہے۔ یہ تمام خدوخال کو نمایاں کر دیتی ہے اور اس میں کوئی عیب چھپانا ناممکن ہوتا ہے۔ مَیں جب کارکنوں کی ذمّہ داریوں کی نزاکت اور اہمیت کا خیال کرتا ہُوں تو بخدا میرے دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان گران نازک ذمہ داریوں کی آزمائش میں سُرخرو کرے۔ آج ہم اپنے عظیم رہنما کی قیادت میں ایک نیا پاکستان تعمیر کرنے کی تاریخی جنگ میں مصروف ہیں۔ ہمارے آج کے اعمال وافعال ہمارے مستقبل کی بنیادیں رکھ رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے کارکن خوش نصیب ہیں کہ قوم نے انھیں ثقافتی محاذ پر لڑنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ ثقافت محض رقص ونغمہ یا ڈرامے اور موسیقی تک محدود نہیں۔ یہ تو نظریات

کا پیکر ہوتی ہے اقتصادی اور سماجی رشتوں سے جنم لینے والی قدروں کا مرقع ہوتی ہے کسی معاشرے کی روحانی کیفیت کا اظہار ہوتی ہے اگر معاشرے کی رُوح گندی ہے تو اس کی ثقافت بھی غلیظ ہو گی۔ اگر معاشرے کی روح پاکیزہ ہے تو اس کی ثقافت میں بھی وہی پاکیزگی جھلکے گی۔ اور میرا ایمان ہے کہ عوام کی روح بے حد پاکیزہ ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہماری ثقافت کو اسی رُوح کی آئینہ داری کرنی چاہیے۔ ہمارے فنون میں عوام کی اسی خصوصیت کو اُجاگر ہونا چاہیے۔ کارکنوں کو یہ احساس کرنا چاہیے کہ ملک میں انقلابی اصلاحات کے نفاذ کے بعد سماجی رشتوں کی نوعیت تیزی سے بدل رہی ہے۔ زرعی اور صنعتی اصلاحات نے اقتصادی رشتوں کو بھی بدلنا شروع کر دیا ہے۔ انقلاب انہی رشتوں کو بدلنے کا نام ہے اور ہم نے انقلاب کی منزل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ ان نئے حقائق کی روشنی میں ہمیں اپنی نئی ثقافت بھی تخلیق کرنی ہے۔ ہمیں اپنی تہذیب کو انقلابی سانچے میں بھی ڈھالنا ہے اور ثقافت کا یہ انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمیں نہ صرف اپنی سوچ کو بدلنا ہو گا بلکہ ہمیں بانیٔ انقلاب جناب ذوالفقار علی بھٹو کے افکار سے خود کو مسلح بھی کرنا ہو گا اور ہمیں عوام کی اُمنگوں کو بھی سمجھنا ہو گا یہی وہ طریقہ ہے جس پر عمل کر کے ہم انقلابی عہد کے تقاضوں کو پُورا کر سکتے ہیں۔

آج ایک طرف نظریاتی لحاظ سے کارکنوں کی ذمّہ داریاں بے حد نازک ہیں اور دوسری طرف معاشرے کی طرف سے بھی انھیں نہایت کڑا فرض سپرد کیا گیا ہے۔ یہ مشرقی اقدار کا معاشرہ ہے۔ جہاں عزّت و عصمت کا مفہوم دوسرا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی عورتوں اور اپنے اہل خانہ کی پردہ داری کے لیے اُونچی اونچی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ وہ اپنے بچّوں، اپنی بہنوں، اپنی ماؤں اور اپنی بیٹیوں کے اخلاق کے تحفظ کے لیے نظروں پر پہرے بٹھاتے ہیں۔ لیکن انہی لوگوں نے ٹیلی ویژن والوں کو یہ اعزاز دیا ہے کہ وہ ان کے بیڈ روم میں داخل ہو سکیں۔ جب ایک ٹیلیویژن سیٹ کسی گھر میں چلتا ہے تو انھیں یہ احساس کرنا چاہیے کہ لاکھوں شریف گھرانوں نے ان کو اپنے کمروں کے اندر داخل ہونے کا موقع دیا ہے اور ان پر بھروسہ اور اعتماد کیا گیا ہے اس

لیے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اعتماد میں اضافہ کریں اور اسے مجروح نہ ہونے دیں۔

عوامی حکومت نے کارکنوں کے وسائل میں اضافہ کر دیا ہے۔ انھیں جدید ترین مشینری اور جدید ترین سہولتیں مہیا کی ہیں۔ ماضی کے مقابلے میں ان کا دائرہ اثر بڑھا دیا گیا ہے۔ اب وہ ہزاروں یا لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں عوام کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کو جو تفریح فراہم کریں وہ ہماری معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی اقدار کی نفی نہ کرتی ہو بلکہ ان کی نشو و نما میں مددگار ثابت ہو اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انقلاب کا جو پیغام ہمارے لیڈر نے ہمیں دیا ہے وہ ہر پاکستانی کے شعور کا حصہ بن جائے۔ ٹیلی ویژن والے دلوں کو ہی نہیں ذہنوں کو بھی متاثر کریں۔ انقلاب ذہن سے شروع ہو کر معاشرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور ذہنی انقلاب کی یہ ذمہ داری انہی کے سپرد کی گئی ہے جو محض تفریح نہیں دے رہے۔ یہ لوگ محض پروپیگنڈا نہیں کر رہے۔ صرف چند گھنٹوں کے پروگرام مرتب نہیں کر رہے بلکہ یہ تو تاریخ بنا رہے ہیں، مستقبل کی بنیادیں رکھ رہے ہیں۔ یہ تو انقلاب کے ابتدائی نغمے کی دُھن مرتب کر رہے ہیں۔ میری طرف سے ان سب کے لیے یہی مشورہ ہے کہ مقصدیت کو کبھی تفریح سے الگ نہ سمجھیں۔ ہم نے ۲۵ سال مقصدیت کو نظرانداز کر کے گزارے ہیں۔ ہمیں اس کی کافی سزا مل چکی ہے لیکن اب ہم نہ صرف منزل کا تعین کر چکے ہیں بلکہ راستے اور رہنما کا انتخاب بھی کر لیا ہے۔ اب یہ بے یقینی ختم ہو جانی چاہیے۔ اب ڈائرکشن لیس فیز Phase ختم ہونی چاہیے۔ اب ہمیں اپنے مستقبل کی درخشندگی کا پورا یقین ہے۔ اب ہماری محنتیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ آگے بڑھیے اور اعتماد کے ساتھ عوام کو پاکیزہ انقلابی اور مقصدی تفریح فراہم کرنے کا فرض انجام دیجیے۔ بانیٔ انقلاب کی نگاہیں ہر خدمت کرنے والے کو دیکھ رہی ہیں۔ ملک کے جس گوشے میں جو بھی فرد تعمیرِ وطن کی خدمت انجام دے رہا ہے، صدرِ مملکت کو اس کا نہ صرف علم ہے بلکہ وہ اس کا گہرے دل سے احساس بھی رکھتے ہیں۔ عوام ان کارکنوں کے نگران ہیں اور قائدِ عوام ان کے محتسب۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ عوام کی ثقافتی ضرورتوں کو پورا کریں گے اور بانیٔ انقلاب کے مددگار بلکہ دست و بازو ثابت ہوں گے۔

نئی نسل سے قومی توقّعات

"سی بی سرسید کالج راولپنڈی کا ایک مشہور کالج ہے۔ مارچ ۱۹۷۸ء میں کالج یونین کی حلفِ وفاداری کی تقریب منعقد ہوئی تو مجھے اس میں بطورِ مہمانِ خصوصی شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔

یہ خطبہ اسی موقع پر دیا گیا۔ مگر حسبِ معمول یہ بھی تحریری شکل میں موجود نہ تھا اور ٹیپ کی مدد سے حاصل کیا گیا۔

ٹیلی ویژن کیمرہ فلم بنا رہا تھا تو لڑکے اُچک اُچک کر کیمرہ مینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، شروع میں ٹیلی ویژن کے متعلق فقرے اسی سلسلے میں کہے گئے تھے۔"

جناب پرنسپل! عہدیدارانِ یونین! عزیز طلبا و معزز حاضرین!

میں سرسید کالج کی یونین کے عہدیداروں کا اور جناب پرنسپل آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس تقریب میں بلایا اور اس طرح جہاں اپنے معروف ادارے کے بارے میں جاننے کا موقع فراہم کیا وہاں عزیز طلبا سے باتیں کرنے کی یہ تقریب بھی بہم پہنچائی۔ یہ بات تو بہت رسمی ہے اور ہر شخص کہتا ہے۔ ہر مہمان بلانے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ہر منتظم مہمان کا شکریہ ادا کرتا ہے لیکن جب میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں تو حقیقت میں یہ کوئی رسمی بات نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ میں اس لیے آپ کا شکر گذار ہوں کہ یہ اجتماع نئی نسل کا اجتماع ہے۔ طلبا کا اجتماع ہے اور کسی بھی قوم کی بیشتر توقعات اپنی نئی نسل سے ہوتی ہیں۔ ویسے بھی پرانی نسل اب گور کنارے پہنچ چکی ہے۔ اس نے جو کچھ ہمارے دامن میں ڈالا وہ سب کے سامنے ہے۔ ٹھیک ہے کہ پاکستان بنانے میں نئی اور پرانی نسل دونوں کا یکساں Contribution تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی زمامِ کار گذشتہ برسوں میں نئی نسل کے ہاتھ میں نہیں رہی

بلکہ پرانی نسل کے ہاتھ میں رہی اور اس کے نتیجہ میں پاکستان اگر ٹوٹ گیا، پاکستان کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا کہ اس کا جغرافیہ تبدیل ہو گیا تو اس میں پرانی نسل کی ذمہ داری اتنی زیادہ ہے اور اتنی واضح ہے کہ نئی نسل کو شاید ہمیں اس کے لیے مطعون کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

(مجھے[1] احساس ہے نوجوانانِ عزیز! کہ آپ کے جلسوں میں ٹیلی ویژن بہت کم آتا ہے۔ میں مستقل ایک ہدایت جاری کروں گا کہ سرسید کالج کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ شوق جو ہے اس کو پورا کرنے کے لیے ہم اجلاس کے اختتام پر ٹی۔وی والوں کو اور آپ کو اس چار دیواری میں چھوڑ دیں گے، وہ برابر آپ کا فوٹو لیتے رہیں گے لیکن اس وقت ہم کام کی باتیں کرنا چاہتے ہیں اور سننا چاہتے ہیں۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نئی نسل سے کسی بھی قوم کی بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قوم کے مفکرین نے اُس قوم کو اس نئی نسل کو مخاطب کیا ہے اور مستقبل کی تمام آرزوئیں اسی سے وابستہ کی ہیں۔ ہمارے قومی مفکر علامہ اقبالؒ کے افکار کا آپ مطالعہ کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ جگہ جگہ انھوں نے نوجوان نسل کو پکارا ہے لیکن وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ نئی نسل تن آسانی کا شکار ہو گئی ہے تو پھر یوں ان کی زبان پر یہ گلہ ابھرتا ہے کہ

تیرے قالیں ہیں افرنگی تیرے صوفے ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اور جب وہ اپنی قوم کے افلاس کو دیکھتے ہیں غربت کو دیکھتے ہیں تو انھیں یہ خیال آتا ہے کہ میری قوم کی غربت اور افلاس کا مداوا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اگر میرے جوانوں کی خودی بیدار ہو اگر وہ دولتِ کردار سے مالا مال ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ؎

جواں اگر ہوں میری قوم کے جسور و غیور قلندری مری کچھ کم تونگری سے نہیں

---

[1] طلباء ٹی وی کیمروں کی طرف دیکھنے لگے تو اس موقع پر یہ کہا گیا۔

کہیں وہ یوں ایک آیڈیل نوجوان کا خاکہ نئی نسل کے سامنے پیش کرتے ہیں خوشحال خاں خٹک کے خیالات کو مستعار لے کر کہ ؎

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
نگاہ جس کی ہو بے داغ ضرب ہو کاری

کہیں وہ ماحول کو دیکھتے ہیں کہ ماحول ٹھیک نہیں ہے اور شاید نئی نسل بہک جائے تو وہ دُعا دیتے ہیں اپنے فرزند کو لیکن حقیقت میں فرزند ایک Symbol ہے وہ پوری نئی نسل کو دعا دیتے ہیں کہ ؎

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

کہیں وہ اپنی ملّی تاریخ کو دیکھتے ہیں (برخوردار اگر مشاعرہ کا شوق ہے تو آؤ نظم پڑھو ہم داد دیں۔ یہ داد اقبال کو جائے گی میں تو ان کے اشعار سے پڑھ رہا ہوں)

کہیں وہ اپنی ملّی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو اپنے سارے زوال اور تنزلی کی داستان کی وجہ اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ نئی نسل کا دل ٹوٹا ہوا ہے اس میں غلامی کی خو رچ بس گئی ہے اور اگر اس کو نئے سرے سے سبق دیا جائے دل افروزی کا، تو شاید ہمارے دکھ دُور ہو جائیں۔ تو وہ یوں کہتے ہیں کہ ؎

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارُو کوئی ڈھونڈ ان کی پریشاں نظری کا

اگر آپ ان کے افکار پڑھیں گے تو جگہ جگہ دیکھیں گے کہ تمام تر ان کی اُمیدوں کا انحصار نوجوان نسل پر ہے، وہ تنقید بھی کرتے ہیں۔ وہ جرّاح کی طرح نشتر بھی چلاتے ہیں، لیکن پھر شفقت سے مرہم بھی رکھتے ہیں اور جہاں وہ نئی نسل کے مفاسد کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں پیدا ہو چکے ہیں، وہاں اس کو عالی شان مستقبل، درخشاں مستقبل کی نوید بھی دیتے ہیں۔ تو مجھے خوشی ہے کہ میں اس نئی نسل سے مخاطب ہوں جو ہمارے مفکّر کی تمام تر مخاطبت کا مرکز رہی ہے اور پھر ایک لحاظ سے اور بھی مجھے خوشی ہے آپ کے ادارہ میں آتے ہوئے کہ اس کا نام اس عظیم ہستی پر ہے جسے سرسیّد احمد خاں مرحوم کہا جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہر بڑے آدمی کی طرح سرسیّد احمد کو بھی افراط و تفریط کا نشانہ بنایا گیا۔ تاریخ میں ہر بڑے آدمی کے بارے میں آپ دیکھیں گے کہ کچھ لوگ ایک انتہا پر اس کی قدر کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک انتہا پر اس کی مذمت کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ علی مرتضیٰؓ سے لے کر تاریخ حاضر تک چلتا ہے۔ آپ سیدنا علیؓ کو دیکھیں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو عقیدت میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ اُن کو نصیریہ کا گروہ خدا مانتا ہے۔ وہ تو سمجھتا ہے کہ انسانی رُوح میں ایک خدائے مجسم علی مرتضیٰؓ تھے اور دوسری طرف اسی دَور میں خوارج تھے جنھوں نے علی مرتضیٰؓ پر کفر کا فتویٰ لگایا وہ انھیں دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے رہے یہ ہر بڑی شخصیت کے ساتھ صورتِ حال پیش آتی رہی ہے اور سرسیّد احمد خان کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ سرسیّد احمد خان کے بارے میں ایک گروہ نے یہ کہا کہ یہ کافر ہے۔ اُن پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے اس لیے کہ یہ انگریزی پڑھا رہے ہیں، اس لیے کہ جدید علوم پڑھانے کے لیے درس گاہ کھول رہے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جنھوں نے سرسیّد احمد خان کو محسنینِ ملّت میں شمار کیا۔ تو یہ بات خالی از نزاع ہے، اس میں تو کوئی جھگڑا نہیں کہ سرسیّد احمد خان بڑے آدمی تھے۔ اس لیے کہ ہر بڑا آدمی اپنے دَور میں نزاعی شخصیت رہتا ہے۔ لیکن آج تک تاریخ کی اس گرد کے

بیٹھ جانے کے بعد کہ جو کچھ لوگوں نے اٹھائی تھی' اس بات کو مانتی ہے' دل و جان سے مانتی ہے کہ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کی صورت میں ملت پر ایک ایسا احسان کیا تھا کہ آنے والی نسلیں جس کا قرض ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتیں۔ ان کا نام ہماری تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میں جب تحریکِ پاکستان کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے سر سید احمد خان نے تقسیم کی اہمیت سمجھ لی تھی۔ انھیں یہ خیال تھا کہ ہندو غلبہ جس طرح سامنے آرہا ہے اس کے بعد مسلمانوں میں آزادی اور حریت کے لیے بیتابی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے' لیکن اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے ضرورت ہوگی کہ مردانِ کار سامنے آئیں۔ ضرورت ہوگی اس بات کی کہ ایسے لوگ سامنے آئیں جو جدید علوم جانتے ہوں اور ہندوؤں کا ہر فیلڈ میں مقابلہ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے علی گڑھ کا ادارہ قائم کیا اور پاکستان کی تحریک کو اگر دیکھا جائے تو حقیقت میں وہ علی گڑھ کالج کی Expansion ہے۔ علی گڑھ کالج کی توسیع ہے' پاکستان ایک بڑا علی گڑھ ہے۔ اس سے زیادہ پاکستان کی تحریک کو اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

تو یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ آپ کا ادارہ اس عظیم نام سے منسوب ہے۔ مگر جہاں یہ بات باعثِ افتخار ہے اور باعثِ مسرت ہے وہاں کچھ ذمہ داریاں بھی اس ادارہ پر عاید ہوتی ہیں اور اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر عائد ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ نئی نسل ناراض ہے اور آپ اس کا مظاہرہ کسی بھی وقت دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کا صدر اپنے خطبۂ استقبالیہ میں دو سو فقرے تعریف میں کہے اس حکومت کی تعریف میں یا کسی حکومت کی تعریف میں' آنے والی حکومت کی تعریف میں' جانے والی حکومت کی تعریف میں' حاضر حکومت کی تعریف میں' غائب حکومت کی تعریف میں' تو آپ دیکھیں گے کہ نوجوانوں پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوگا لیکن جب وہ یوں تنقید کرے گا کہ ان اداروں پر' ان محلات پر خرچ ہو رہا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ

ہمارے کالج کے لیے ہاسٹل نہیں ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مجمع تالیوں سے گونج اٹھے گا اور نوجوان بے ساختہ پکاریں گے کہ بالکل بجا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ کچھ لوگ اس علامت کو دیکھتے ہیں تو گھبرا جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی اچھے آثار نہیں ہیں۔ نوجوان باغی ہو رہے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے نوجوانوں کو باغی ہونا چاہیے اس سماج سے، اس معاشرے سے، اس نظام سے، اس سسٹم سے جس میں بے انصافی پائی جاتی ہے۔

اور یہ صرف پاکستان کے نوجوانوں ہی پر منحصر نہیں، پوری دنیا کے نوجوانوں کا موڈ یہی ہے پوری دنیا کے نوجوان ناراض ہیں، اپنے گرد و پیش سے اپنے ماحول سے، اپنے سسٹم سے، اپنے نظام سے، اپنے معاشرتی رسوم و رواج سے کہ جو کار فرما ہے۔ ان قدروں کے خلاف ہیں جو قائم ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ناانصافی اِن کے دامن میں آتی ہے۔ وہ کیوں ناراض ہیں وہ دیکھتے ہیں ایک طرف، ایک لڑکا ایک گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ اس کے ماں باپ وسائل رکھنے والے دولت مند ہیں، جاگیر رکھنے والے ہیں، اور ہر چند کہ اس کی صلاحیت اتنی نہیں مگر وہ زندگی کے میدان میں ترقی کرے گا۔ اس کے آگے دروازے کھلتے جائیں گے۔ انھیں کھولنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سم سم کہا جائے گا اور وہ کھلتے جائیں گے اور دوسری طرف اسی وقت ایک بچّہ پیدا ہوتا ہے مگر ایک کسان کے جھونپڑے میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس لیے کہ اس کے ماں باپ وسائل نہیں رکھتے ہر چند کہ وہ دماغی، ذہنی اور قلبی صلاحیتوں سے مالا مال ہے وہ زندگی کی دوڑ میں اس لیے پیچھے رہ جائے گا کہ اس کے پاس سہارا دینے والی بیساکھیاں نہیں۔ دولت کی بیساکھیاں نہیں ہیں۔ اثر و رسوخ کی نہیں ہیں اور سفارش کی نہیں ہیں۔ جب یہ منظر نوجوانوں کے سامنے آتا ہے تو وہ قدرتاً ناراض ہو جاتے ہیں، انھیں ناراض ہونا چاہیے۔ ایک حلقہ انھیں سمجھاتا ہے کہ تم غلط

کر رہے ہو، یہ اللہ کا نظام ہے، یہ تقدیر کا نظام ہے تمہیں اس پر صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے لیکن اب یہ بند نہیں باندھا جا سکتا۔ اس تغیر کی رو کے آگے کر جو عالمی سطح پر ابھری ہے اور پاکستان میں بھی ابھری ہے۔ اور میں آپ سے کہتا ہوں نوجوانانِ عزیز! اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے بڑے وثوق کے ساتھ اور یقین کے ساتھ کہ تقدیر کا یہ تصور جو آج تک دیا جاتا رہا ہے اور بعض لوگ دیتے رہے ہیں یہ سراسر اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ قرآن حکیم کھولتے ہی ہم اس حقیقت پر نگاہ کرتے ہیں۔

الحمد للہ رب العالمین۔ اور وہ رب جو جہانوں کا رب ہے وہ جہانوں کا پروردگار، ربوبیت اس کا کام، پرورش اس کا کام اور اس نے دینے کا ذمہ لیا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ہم تمہیں بھی رزق دیں گے، تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی دیں گے، ان کو بھی دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اگر رب یہ کہتا ہے کہ ہم رزق دیں گے اور وہ دیتا ہے تو پھر وہ رزق لوگوں تک کیوں نہیں پہنچتا۔ پھر کیا سبب ہے کہ ایک طرف کچھ لوگ فٹ پاتھوں پر سسک سسک کر جان دیتے ہیں اور دوسری طرف کچھ لوگوں کے کتے بھی یورپ میں علاج کراتے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ ایک طرف وزیروں اور امیروں کے گھروں میں تھانوں کے تھان ریشمی پردوں کی صورت میں لٹکے رہے ہیں اور دوسری طرف غریبوں کی بیٹیاں ہیں جن کے سر پر دو گز کا دوپٹہ بھی نہیں۔

پھر کیا سبب ہے کہ ایک تاجر کا بیٹا سرسید کالج میں اپنے لڑکے کو داخل کرا سکتا ہے۔ فیسیں دے سکتا ہے لیکن ایک غریب باپ نگاہِ حسرت سے دور سے اس بلڈنگ کو دیکھتا ہے لیکن اس میں اپنے بچوں کو داخل نہیں کرا سکتا اس لیے کہ اس کے پاس اتنی رقم نہیں، اتنا سرمایہ نہیں ہے تو پھر رب کا وہ وعدہ کہاں گیا۔ "میں رب العالمین ہوں" اور "میں تمہیں بھی رزق دیتا ہوں ان کو بھی دیتا ہوں" کیا ہم مان لیں کہ رب کا وعدہ صحیح نہ تھا؟ ٹھیک ہے کچھ

لوگ ممکن ہے ان Terms میں سوچتے ہوں اس لیے کہ آج کل یہ بھی فیشن ہے کہ اسلام کی کسی بھی بات پر کسی بھی معاملہ پر طنز و استہزا سے کام لیا جائے۔ بعض لوگ دانشوری اسی کو سمجھتے ہیں، شاید ترقی پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ جب اسلام کی بات ہو، خدا اور رسول کی بات ہو تو استہزا سے اور قدرے طنز سے کام لیا جائے اور آج بھی میں افسوس سے کہتا ہوں اور کسی نوجوان کو نشانہ بنا کر نہیں کہتا۔ حقیقتاً آپ سب میرے بیٹے ہیں لیکن میں دکھ سے کہتا ہوں کہ جب قرآن حکیم پڑھا جا رہا تھا تو میرا ایک بیٹا "اللہ" اس طرح کہہ رہا تھا جیسے مذاق اڑانا مقصود ہو۔ جیسے یہ بھی کوئی خندہ و استہزا کی چیز ہو۔ مگر نہیں آج ہم ایمان رکھتے ہیں اور یقیناً رکھتے ہیں اگر ہم یقین اور شعور کی دولت سے بہرہ ور ہیں اور ہماری رگوں میں مسلمان باپ کا خون رواں ہے تو ہم اسلام کی اقدار کو خندہ و استہزا کا متحمل نہیں بنا سکتے۔ ٹھیک ہے کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ رب نے وعدہ کیا تھا مگر پورا نہیں کیا۔ مگر میرے نزدیک مغرب سے سورج نکل سکتا ہے مشرق کی بجائے لیکن خدا کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

•

میرے نزدیک سمندروں میں آگ لگ سکتی ہے، میرے نزدیک ریت کے ذروں کو گنا جا سکتا ہے، آسمان کے تاروں کو گنا جا سکتا ہے، درختوں کے پتوں کو گنا جا سکتا ہے، میرے نزدیک شبنم جو ہے ٹھنڈک کی بجائے گرمی پہنچا سکتی ہے، چاند روشنی کی بجائے اندھیرا پھیلا سکتا ہے لیکن خدا کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔

پھر اگر اس نے وعدہ پورا کیا تو پھر کیا سبب ہے کہ ہمیں ناانصافیاں نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رب نے وعدہ پورا کیا۔ اس نے رزق اس کائنات میں اتنا بکھیر دیا جو سارے انسانوں کی ضرورت کے مطابق ہے لیکن کچھ لوگوں نے کچھ لوگوں کے حصے کا رزق بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ غاصب بن گئے۔ وہ ڈاکو بن گئے۔ رب نے وعدہ پورا کر دیا مگر کچھ ہاتھ بیچ میں اس

رزق کو اُچکنے والے بن گئے۔ آج اگر ان ہاتھوں کو بیچ میں سے کاٹ دیا جائے، توڑ دیا جائے تو یہ رب کی رضا کے عین مطابق ہے۔

اور آپ نے دیکھا ہے کہ جب رسولِ خدا فرماتے ہیں کہ ایک نیک انسان کی پہچان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ اسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے تو ایک مومن معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ مومن معاشرہ حقیقت میں خدائی معاشرہ ہے جو وعدے رب نے پورے کیے ہیں اپنے ذمے لیے ہیں۔ ان کا پورا کرنا اہلِ ایمان کے معاشرے پر فرض ہے اگر رب نے وعدہ کیا ہے کہ میں رزق دوں گا تو اہلِ ایمان کے معاشرے کا فرض ہے کہ رزق سب کو دیں۔ اگر کوئی معاشرہ وہ وعدہ پورا نہیں کرتا رب کا تو وہ ربانی معاشرہ نہیں ہے وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے اور اسی لیے فرمایا کہ ایک شخص جس کے ساتھ کا پڑوسی بھوکا رہتا ہے اور وہ خود سیر ہو کر کھا رہا ہے' وہ مومن نہیں، اگر پڑوسی کو آج ہمیں وسیع تر مفہوم میں دیکھنا ہو تو کیا پڑوسی صرف وہی ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہو۔ نہیں اس لحاظ سے اگر آپ حدیثِ نبوی کو دیکھیں گے تو گلبرگ کے علاقے میں کوئی پڑوسی کسی کا بھوکا آپ کو نہیں ملے گا۔ پھر تو وہ سب مومنین کاملین کا معاشرہ ہے وہاں سب مزے میں ہیں' سب مست ہیں۔ سب عیش کر رہے ہیں اس طرح اسلام آباد کی اکثریت کے بارے میں۔ میں سمجھتا ہوں وہ ساتھ جو دیہات میں ہیں ان کی بات دوسری ہے لیکن اسلام آباد میں بھوک نام کی کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ تو پھر کیا یہ سمجھا جائے کہ اسلام آباد مومنین کاملین پر مشتمل ہے کیوں کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں ہے۔

نہیں نوجوانو! پڑوسی کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے۔ قرآن حکیم پڑوسی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو تمہارا ساتھی ہے کسی ادارے میں، کسی درس گاہ میں، کسی کارخانے میں کسی فیکٹری میں وہ بھی تمہارا پڑوسی ہے اور پڑوسی جو دُور کا ہے وہ بھی اور پڑوسی جو قریب کا ہے وہ بھی۔ وہ بھی ہے جو مومن ہے' وہ بھی ہے جو کافر ہے' یہ سب پڑوسی ہیں اور آج دُنیا اس

طرح سمٹ آئی ہے کہ صرف یہی نہیں کہ راولپنڈی لاہور کا پڑوسی ہے اور راولپنڈی کراچی کا پڑوسی ہے بلکہ حقیقت میں آج پاکستان دنیائے اسلام کا پڑوسی ہے، آج پاکستان دُنیائے انسانیت کا پڑوسی ہے۔

تو اگر تعلیمی دینی معاشرے کی بات کرتے ہوئے آئیڈیل معاشرے کی بات کرتے ہو تو پُوری انسانیت میں دنیا میں جب وہ نظام قائم ہوگا جس میں کوئی تکلیف سے نہ ہوگا جس میں کوئی بھوکا نہ ہوگا تو پھر حقیقت میں پُوری انسانیت یہ کہنے کا فخر حاصل کر سکے گی کہ یہ ایمانِ کامل پر مبنی معاشرہ ہے۔ لیکن اگر پاکستان میں کہیں بھی لوگ بھوکے ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر پاکستان کے لوگوں کو یہ کہنے کا، یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں پہنچتا کہ پاکستان کا معاشرہ ایک مثالی اسلامی مُعاشرہ ہے۔ تو رب کا وعدہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم پُورا کریں اور لوگوں کے ساتھ انصاف کریں، لوگوں کے ساتھ عدل کریں اور یکساں ترقی کے مواقع سب کو دیں تب ہم ربّانی معاشرہ اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں گے تو ٹھیک ہے اگر نوجوان نسل باغی ہے اور اگر نوجوان نسل غصّے میں ہے اگر وہ اضطرابِ مسلسل میں ہے اور اگر وہ بے چین ہے اور سراپا بے چین ہے تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہے اسے بے چین ہونا چاہیے۔ اگر وہ یہ سارے مناظر اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھے اور پھر اس کے دل میں بے سکونی محسوس نہ ہو تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ وہ اصلی تقاضوں سے بیگانہ نئی نسل ہے نوجوان نسل کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جوانی کا خُون اس کی رگوں میں دوڑے۔ لیکن جوانانِ عزیز! جہاں میں یہ کہتا ہوں کہ آج اضطراب ہم میں ہے، آج بے چینی ہم میں ہے اور اقبال کی وہ دُعا پوری ہوگئی ہے جو کبھی اس نے مانگی تھی کہ ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

وہ دُعا پوری ہو چکی ہے آج تو بحر کی موجوں میں اضطراب ہی اضطراب ہے وہاں اب سوال یہ

ہے کہ موجوں کی تہہ سے نکلتا کیا ہے اور موجوں کی کشاکش سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ یہ موجوں کی کشاکش سفینے کو ساحل پر لگاتی ہے یا اس کو گرداب میں ڈبوتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اضطراب تخریب پر منتج ہوتا ہے یا تعمیر پر۔ اس لیے کہ سسٹم کو بدلنا، نظام کو بدلنا، معاشرے کو بدلنا یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں بہت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

لیکن یہاں دو چار نہیں اَن گنت سخت مقام آتے ہیں۔ شاعر نے (اس لیے کہ میرے دوست شعر کی بڑی داد دے رہے تھے میں سوچ رہا ہوں کہ ان کے تفننِ طبع کے لیے شعر بھی پڑھوں) ایک شاعر نے عملِ تخلیق کے بارے میں کہا کہ جب کوئی اچھا شعر کسی شاعر سے سرزد ہوتا ہے تو اس کے لیے کیا کچھ شاعر کو کرنا پڑتا ہے۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہُو ہوتا ہے

تب نظر آتی ہے اِک مصرعِ تر کی صورت،

اِک مصرعِ تر پیدا کرنے کے لیے سیروں جو خُون ہے تن کا وہ جلانا پڑتا ہے، خشک کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر سسٹم بدلنا ہو، اگر نظام بدلنا ہو۔ اگر پہلے جو قدریں قائم ہیں ان کو اکھیڑ کر نئی قدریں قائم کرنی ہوں تو پھر محض نعروں سے، محض مظاہروں سے، محض جلوسوں سے یہ کام نہیں ہو سکتا اس کے لیے پھر محنت کی ضرورت ہے، پتہ ماری کی ضرورت ہے، صلاحیت کی ضرورت ہے اور ایثار کی ضرورت ہے اور اس کے لیے انتظار کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ بیج جب کسان بوتا ہے تو وہ اگر یہ توقع کرے کہ آج میں بیج بو رہا ہوں اور آج ہی مجھے اس سے پھل حاصل ہو جائے گا تو اس کا تصوّر غلطی پر مبنی ہے۔ وہ بیج بوئے گا۔ اس کی نگہداشت کرے گا، اس کو پانی دے گا، اس کو دھوپ لگے گی اُسے چرند پرند سے بچالے گا اس کے

بعد کہیں مرحلہ آئے گا کہ وہ بیج زمین کا سینہ چیر کر ایک بار آور شجر کی صورت اختیار کرے اور وہ خود بھی اس کا پھل کھائے اور اس کی نسل بھی اس کا پھل کھا سکے اور آپ اور ہم اگر چاہتے ہیں کہ یہ نظام بدلے اور یقیناً بدلے تو اس کے لیے پھر ہمیں ایک فکر کی ضرورت ہے اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے۔ میرا اپنا ایک شعر ہے میں نے اسی معاشرے کو دیکھ کر کہا تھا' اسی نظام کو اس لیے کہ میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوا۔ میں بھی جانتا ہوں کہ غریب کے بیٹے کو کسی مقام پر پہنچنے کے لیے کتنی مشکلات سے کتنی جان جوکھوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ

نظامِ کہنہ کی قدروں کا خاتمہ سمجھو
ہمارے ہاتھ میں نیزے بھی ہیں قلم بھی ہیں

تو ایک طرف قلم کی ضرورت ہو گی' فکر کی ضرورت ہو گی' سوچ کی ضرورت ہو گی' صحیح نظریے کی ضرورت ہو گی اس لیے کہ علم وہی ہے جو قلم کے ذریعے سے منضبط ہوتا ہے وہ علم جو سینہ بہ سینہ چلتا ہے وہ علم نہیں ہے وہ علم جو دھوپ اور روشنی برداشت نہیں کر سکتا جو صدری نسخہ بن جاتا ہے طبیب کا' وہ علم نہیں ہے اس لیے قرآن حکیم نے کہا اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کہ وہ رب ہے جس نے انسان کو قلم سے علم سکھایا ہے۔ قلم سے تعلیم دی ہے اس لیے کہ حقیقی علم وہی ہے جو قرطاس و قلم کی دنیا آباد کر سکے حقیقی علم وہی ہے جو سامنے آ سکے' سب کی میراث بن سکے جس طرح ہوا سب کے لیے' جس طرح روشنی سب کے لیے اسی طرح وہ علم بھی سب کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ برہمن ازم کہے اور پاپائیت کہے کہ یہ علم فقط میرے ہی ادارے تک منحصر ہے' یہ باہر نہیں جا سکتا اور اگر باہر جاتا ہے ان کانوں میں سیسہ ڈال دو تاکہ علم کی یہ شعاعیں اس کے اندر رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ وہ علم نہیں۔ تو پہلے علم کی ضرورت ہے قلم کی ضرورت ہے' فکر کی ضرورت ہے' سوچ کی ضرورت ہے اور اگر اسی مرحلہ اوّل پر ہی ہم ٹھوکر کھا گئے میں تو پھر جہدِ مسلسل ہمیں کوئی کام نہیں دے سکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ نوجوان نسل کی اکثریت' میں اکثریت کا لفظ صحیح سمجھ

کر کہہ رہا ہوں۔ اس فکر کو جانتی ہے جو ہمارے دکھوں کا مداوا بن سکتا ہے۔ لوگ اس نسل کے مخالف ہیں معترض ہیں اس کے چست لباس پہ پھبتیاں چست کرتے ہیں اور اس کے بالوں کی وضع قطع کو معرض تنقید میں لاتے ہیں ظاہر کو انھوں نے اتنی اہمیت دے دی ہے کہ اس جذبہ کو وہ نظرانداز کر دیتے جو اس نسل کے دلوں میں موجزن ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ نئی نسل آج بھی ہزاروں ظاہرداریوں کے باوجود آج بھی کسی مرحلہ پر اگر اس کو آواز دی جائے ان نظریات کے لیے کہ جو اسلام کی متاع عزیز ہیں ان نظریات کے لیے کہ جو رسالت مآب نے ہمیں عطا کیے ہیں ان نظریات کے لیے جو قرآن سے ہمیں ملتے ہیں تو یہ نسل بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے آج بھی تیار ہے

فکر کے بارے میں تو نئی نسل کا معاملہ واضح ہے اکثریت کا معاملہ واضح ہے اور وہ جانتے ہیں۔ نئی نسل کے نمائندے جانتے ہیں کہ یہ وہ نظریہ ہے کہ ہماری سرزمین میں اس کا بوٹا لگ سکتا ہے۔ جو ہمارے خمیر میں ہے جو ہمارے ضمیر کے مطابق ہے جو ہماری روایات کی آرزو ہے، جو تاریخ کا تسلسل ہے جو جسم کے تقاضے بھی پورے کرتا ہے۔ کوئی سسٹم ایسا نہیں کہ جو بیک وقت اس Balance اس توازن کو لے کے چل سکتا ہے۔ اچھے سے اچھے سسٹم کو جو دنیا میں رائج ہیں آپ دیکھیں تو وہ زیادہ سے زیادہ حیوانی تقاضوں کو پورا کریں گے جسمانی تقاضوں کو پورا کریں گے لیکن کوئی سسٹم ایسا نہیں ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں تقاضوں کو بیک وقت پورا کر سکے۔ آپ کسی مذہب کا نام لیں مگر وہ مذہب سسٹم نہیں ہے۔ وہ مذہب ہے۔ وہ دھرم ہے، وہ پوجا پاٹ کی پرستش کی چند رسموں کا مجموعہ ہے لیکن سسٹم نہیں ہے مگر اسلام مذہب نہیں ہے، اسلام دین ہے اسلام نظام حیات ہے اور اسلام ایک سسٹم ہے

Progressive سسٹم جو کائنات کی ابدی قدروں کے ساتھ سفر کرتا ہوا انسانیت کے تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ انسان کے جسمی تقاضوں کو بھی اور انسان کے روحانی تقاضوں کو بھی۔ تو یہ نسل اس بات کو تو جانتی ہے مگر اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جہد مسلسل کی جائے۔ صلاحیت پیدا کی جائے

اگر وہ نظام لانا ہے تو مردانہ وار سامنا ہونا چاہیے۔ رجال کار تیار ہونے چاہئیں جو اس نظام کو چلائیں گے جو شعبہ ہائے زندگی میں تبدیلی لائیں گے، وہ ہاتھ پیدا کرنے ہوں گے کہ جن ہاتھوں سے یہ تبدیلی آئے گی۔ اور یہ تیاری کا مرحلہ اور یہ صلاحیت پیدا کرنے کا مرحلہ بہت طویل ہے، بہت کٹھن ہے، بہت مشکل ہے اور نوجوان نسل میں اگر کمی ہے تو اس مرحلے کے لیے تیار ہونے کے لیے جو ضرورتیں ہیں ان کو سمجھنا چاہیے، میں اندازہ رکھتا ہوں کہ ٹھیک ہے آج ہمارے کالجوں میں جیسے ہماری سوسائٹی میں ہوتا ہے۔ مختلف النوع نعرے سننے میں آتے ہیں اور خاص طور پر جب الیکشن ہونے والا ہوتا ہے اور بہت سے لوگ جو نوجوان ہیں وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں کوئی رائٹ ونگ کہلاتا ہے کوئی لیفٹ ونگ کہلاتا ہے۔ دایاں بازو اور بایاں بازو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ دائیں اور بائیں کا معاملہ اصل میں ضد کا معاملہ ہے۔ حقیقت میں جب آپ لفظوں کے چھلکے اُتار کر ان کے مغز تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ الفاظ مختلف ہیں مگر مفہوم دونوں کا قریب قریب ہے،۔ ایک لفظی دھوکا ہے، ایک لفظی نزاع ہے لیکن جو حقیقت میں سمجھتے ہیں کہ وہ Left ان معنوں میں ہے کہ وہ Progressive Islamic System کے مخالف ہے تو میں ان سے کہتا ہوں ان نوجوانوں کو کہ جو اس معاشرے کے مخالف ہیں اسے Change کرنا چاہتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو انقلابی بنا کے پیش کرتے ہیں اس انداز میں کہ Islamic Progressive System پر حملہ کریں تو میں ان سے کہتا ہوں نوجوانِ عزیز! اُلٹے بھی لٹک جاؤ گے تو درس گاہوں میں کبھی تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔

تمھیں اسلام کا احترام کرنا ہوگا، اسلام کے نظریات کا احترام کرنا ہوگا۔ اس سسٹم کو لے کر آگے چلنا ہوگا اگر قیادت کا شوق ہے، نوجوانوں کی قیادت کا شوق ہے۔ کسی ایسے شخص کو کسی ایسے نوجوان کو کسی ایسے گروہ کو کالجوں اور درس گاہوں کے اندر قیادت نہیں سنبھالنے دی جائے گی کہ جو اسلام کے پروگریسو سسٹم کو قائم نہ کرنا چاہے۔

اس کے ذریعے سے نئی نسل اپنی تمناؤں کا اظہار کر سکتی ہے اور پاکستان کی فلاح اور بہبود اسی میں منحصر ہے کہ پاکستان مسلم انقلابی رہنماؤں کی قیادت میں رہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے لیڈر نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ وہ ایک مسلم انقلابی رہنما ہے۔ وہ دائیں اور بائیں بازو کے چکر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ نوجوانوں کے لیے لیڈ ہے۔ آپ کو اس انداز میں چلنا ہوگا اسی انداز اور فکر کو اپنے ذہنوں میں بٹھانا ہوگا اور مجھے بہت مسرت ہے کہ آپ کے کالج میں جو نوجوان جیتے ہیں وہ اسلام سے محبت رکھتے ہیں اور جو ہارے ہیں وہ بھی اسلام کے مخالف نہیں ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ بعض اوقات ضد میں ایسے نعرے لگائے جاتے ہیں کہ لفظی جنگ چھڑ جاتی ہے۔

الفاظ کی بحثوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

جو غوطہ لگاتا ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ میں کسی طرح موتی نکال لے آؤں۔ اس کو سیپ سے جو اُوپر کا خول ہوتا ہے اس سے غرض نہیں ہوتی۔ لفظ کیا ہے اس پر نہ جاؤ یہ دیکھو کہ بولنے والا اس سے کیا مُراد لے رہا ہے اگر وہ مراد صحیح ہے تو یہ اعتبار کرو۔ میں مثال کے طور پر یہ کہتا ہوں اگر آپ کو اسلامی سوشلزم یا سوشلزم کے لفظ سے چڑ ہے آپ اسے پسند نہیں کرتے تو اگر کہنے والا یہ کہتا ہے کہ میری مُراد مساواتِ محمدی ہے تو آپ دل سے کہیں سبحان اللہ۔ اگر مساواتِ محمدی ہے تو ہمیں اس سے کیا اختلاف ہو سکتا ہے تو لفظی نزاع کالجوں میں نہیں ہونی چاہیے۔ درگاہوں میں نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کو ایک ٹیم بن کر آگے بڑھنا چاہیے۔ آگے چلنا چاہیے اور یہ ذہن میں رکھو کہ پاکستان اسلام کے ترقی پسند نظریہ حیات کے لیے بنا ہے اور پاکستان میں کوئی ایسا نظریہ نہیں چل سکتا، نہیں چلنے دیا جائیگا کہ جو اسلام کا مخالف ہے اور جو اسلام کی رُوحانی قدروں کے خلاف ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کافی وقت ہو گیا ہے اور آپ کا وقت میں زیادہ نہیں لینا چاہتا یا

دوسرے لفظوں میں آپ کو میں زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا۔

میں آخر میں جناب پرنسپل، آپ کا شکر گزار ہوں اور اپنے عزیز فیاض ملک کا بھی کہ انھوں نے اپنے مسائل بیان کرتے ہوئے کوئی نقد مطالبہ میرے سامنے پیش نہیں کیا۔ کوئی ایسا مطالبہ کہ جس کے بارے میں مجھے فوری طور پر یہیں کچھ کرنا ہے اس لیے کہ آپ نے جتنے مسائل بیان کیے ہیں وہ سب بڑے مسائل ہیں۔ ہال کا بنانا، ہوسٹل کا بنانا، بسوں کا مہیا ہونا وغیرہ وغیرہ قومی تحویل میں لیا جانا یہ ساری باتیں میں نے نوٹ کر لی ہیں بلکہ میں نے دل پر نوٹ کر لی ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ (تالیاں) کہ میں انھیں پورا کرنے میں آپ کے ساتھ دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر قسم کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں (تالیاں) اور مجھے فیاض ملک نے کہا آتے ہوئے کہ کوئی نہ کوئی گرانٹ ضرور ہونی چاہیے مگر کوئی مطالبہ انھوں نے نہیں کیا اور ویسے بھی اگر جو مانگنے والا ہے وہ فیاض ہو تو دینے والا فیاضی سے نہ دے سکے تو ایسی گرانٹ کی بات ہونی نہیں چاہیئے ___ میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنا بھرم بھی رکھا اور میرا بھی۔

محنت کشوں کی انجمن میں

"پان سگریٹ فروش یونین پاکستان کے محنت کشوں کی ایک مثالی تنظیم ہے۔ اس سے میرا رابطہ بہت پُرانا ہے۔ کم و بیش دس سال سے میں اس کی سالانہ کانفرنسوں میں شریک ہوتا ہوں۔ ان مزدوروں نے ازراہِ محبت مجھے اپنی برادری کا سرپرستِ اعلیٰ بنا رکھا ہے۔

ان کے ۱۹۸۴ء کے سالانہ کنونشن میں میں نے جو صدارتی تقریر کی اسے ٹیپ سے اتار کر لفظ بلفظ پیش کیا جا رہا ہے۔

خطاب کے شروع میں یُوسف کا لفظ مشہور محنت کش راہنما حاجی یُوسف کے لیے استعمال ہُوا ہے۔"

جناب حاجی یوسف صاحب۔ مہمانانِ گرامی اور عزیز ساتھیو!

آپ سب کو یہ بات معلوم ہے کہ یہ بھی اعترافِ شکر کی، اعترافِ نعمت کی، اور ادائے شکر کی ایک صورت ہے اگر میں یہ کہوں کہ قدرت نے مجھے الفاظ کی دولت دینے میں بخل نہیں برتا مگر کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ جذبات کا ساتھ دینے میں ناکام رہتے ہیں۔ آج آپ نے جس محبت سے میرا استقبال کیا، پھر جس طرح آپ نے نذرانہ محبت کے طور پر اپنی کسبِ حلال سے کی ہوئی کمائی کے پر دئے ہوئے ہار میرے گلے میں ڈالے، اس سے ممکن ہے کچھ نئے لوگوں کو جو میرا اور آپ کا تعلق نہیں جانتے یہ خیال گزرا ہو۔ کہ شاید یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ میں وزیر ہوں اور اقتدار کی کرسی میرے پاس ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ میرا آپ کا رشتہ کرسی کا رشتہ نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج زمانے کا طور یہی ہے۔ زمانے کا طریقہ یہی ہے کہ جو کرسی پر ہوتا ہے وہ لیڈر ہوتا ہے اور جو کرسی سے اترتا ہے دنیا جہاں کی خرابیاں اور برائیاں اس کے اندر نظر آنے لگتی ہیں۔ جو کل تک

اس کے پیچھے مورچھل لے کر کھڑے ہوتے اور اس کے آگے ہٹو بچو کی صدائیں بلند کرتے۔ اور اپنی پلکوں سے رستے کی گرد صاف کرتے تھے وہی اس کے خلاف فردِ جرم عائد کرنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ مگر یہ خانوادہ۔ محنت کشوں کا خانوادہ، یہ برادری محنت کشوں کی برادری۔ یہ رسم دنیا سے بالکل مختلف طریقے رکھتی ہے۔ ٹھیک ہے شاعر نے یوسف کے بھائیوں کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی

بیچ ہی دیویں جو یوسف سا برادر ہووے،

لیکن یہ برادری وہ ہے جس کے پاس یوسف ضرور ہے مگر یہ یوسف کے وہ بھائی نہیں ہیں جو اس یوسف کو بیچ دیں یہ اس کی آواز پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے ہیں

میرا آپ کا تعلق بہت پُرانا ہے اور مَیں نے اس وقت بھی جب لوگوں کو اس تعلق کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا اور جو سمجھتے تھے کہ دین کا ایک طالب علم سیاست کے کوچے کا ایک رہرو آخر اس برادری سے اس کا کیسے تعلق قائم ہو سکتا ہے جس کا وقت لکھنے پڑھنے میں بسر ہوتا ہے جو صحافت کی دنیا کا باشندہ ہے اس کا تعلق پان سگریٹ مشروب فروشوں سے کیا ہے اور کیوں ہے اور یوں طنز کرتے اور کہتے تھے کہ یہ تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ مَیں نے اس زمانے میں بھی کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ میرا اس برادری سے تعلق ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے اس لیے کہ یہ وہ برادری ہے جو پان بیچتی ہے مگر ایمان نہیں بیچتی۔

یہ وہ برادری ہے جو مشروبات کی صورت میں رنگین پانی ضرور فروخت کرتی ہے مگر انسانی خون کا کاروبار نہیں کرتی۔

یہ وہ برادری ہے جو پان کے اندر چونا ضرور لگاتی ہے لیکن انسانی ہڈیوں کا چونا اپنے محلات میں نہیں لگاتی۔

یہ وہ برادری ہے جو رزقِ حلال کماتی ہے اور صبح و شام تک اس کے فرزند جو اپنی دکان پر بیٹھ کر اپنے بچوں کے لیے قوتِ لایموت فراہم کرتے ہیں اتنی خوراک کہ جس سے بچوں کا رشتۂ جان و تن برقرار رہ سکے اور خدا کی قسم میرے نزدیک ان کے ایک پیسے کی قیمت قارون کے خزانے سے زیادہ ہے۔ ان کی جھونپڑیاں مجھے محلات سے عزیز ہیں۔ وہ چوکی جس پر پان فروش بیٹھتا ہے اپنی دکان لگانے کے دوران حاجی یوسف گرمیوں میں جب اپنی قمیض اُتار کر ایک بُنیان اور ایک چادر کے ساتھ اپنے تھڑے پر بیٹھتے ہیں۔ نیچے ایک چھوٹی سی گدّی لگا کر، خدا کی قسم مَیں وزارت کی کرسی سے اس گدّی کو زیادہ حسین سمجھتا ہوں۔

لوگ سمجھتے ہوں گے اور نئے دیکھنے والے کہتے ہوں گے کہ میرا اور ان کا تعلق آج کا ہے۔ شاید یہ اس لیے میرے ساتھ ہیں کہ مَیں وزیر ہوں مگر نہیں۔ یہ میری تکلیف کے ساتھی ہیں۔ یہ میری مشکل کے ساتھی ہیں۔ یہ میرے دُکھ درد کے ساتھی ہیں۔ جب فضا شعلے برساتی تھی۔ انہوں نے مجھ پر پھول برسائے جب زمانہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال رہا تھا انہوں نے اپنے خون سے میری آزادی کا محضر نامہ تیار کیا۔

جب لوگ اور علماء کہلانے والے لوگ مجھے کافر کہتے تھے انہوں نے میرے ایمان کی شہادت دی۔

جب باہر اس عمارت میں "شہاب" کو دفتر نہیں ملتا تھا انہوں نے اس عمارت میں پناہ دی یہ میرے مشکل کے ساتھی ہیں۔ یہ میرے آزمائے ہوئے ہیں اور مَیں اگر کہوں تو غلط نہیں کہوں گا کہ مَیں بھی ان کا آزمایا ہوا ہوں۔ کبھی مجھ میں اور ان میں فرق پیدا نہیں ہو سکتا مَیں مسندِ فقیری پر ہوں یا مسندِ وزیری پر۔ یہ میرے ہیں اور مَیں ان کا ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت میرے اور ان کے درمیان تفرقہ نہیں ڈال سکتی۔

لوگ اور بھی بہت ہیں۔ اخلاص کا دعویٰ کرنے والے۔ محبت کا دعویٰ کرنے والے اور پھولوں کے ہار گلے میں ڈالنے والے۔ مگر آپ میں سے جس کسی نے بھی مجھے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دیکھا ہو وہ شہادت دے گا کہ میں کبھی گلے میں ہار ڈالنے کے بعد مسلسل تقریر نہیں کرتا۔ گلے میں ہار ڈالتے ہی اس ہار کو میں اُتار دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ہار جو ڈالا جا رہا ہے اس کے اندر کس حد تک خلوص ہے مگر یہ ہار جو اس وقت میرے گلے میں ڈالے گئے ہیں میرا جی نہیں چاہتا کہ ان کو اُتار دوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جن لوگوں نے ہار ڈالے ہیں انہوں نے خلوص سے ڈالے ہیں۔ ان ہاروں میں ہر چند کہ یہ کاغذ کے ہار ہیں ہر چند کہ یہ تلے کے ہار ہیں۔ بے جان ہار ہیں۔ پھولوں میں پھر بھی زندگی ہوتی ہے۔ ان میں زندگی نہیں ہے۔ لیکن ان سے مجھے خلوص کی خوشبو آ رہی ہے۔ محبت کی خوشبو آ رہی ہے ایثار کی خوشبو آ رہی ہے۔ قربانی کی خوشبو آ رہی ہے۔

لوگ لیتے ہیں۔ آج کل لینے کا دور ہے۔ لوگ لیتے ہیں اور واقعی جسم کی ضرورت یہ ہے کہ وہ لیں۔ جسم مانگتا ہے۔ جسم لیتا ہے۔ مگر ایک چیز جسم کے ساتھ اور بھی ہے جس کا نام روح ہے۔ وہ لیتی نہیں ہے۔ پیٹ اور جسم لے کر غذا حاصل کرتا ہے اور انسان کی روح دے کر غذا حاصل کرتی ہے۔ لینے سے جسم بنتا ہے۔ دینے سے روح بنتی ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو دیتے ہیں تاکہ ان کی روح زندہ رہے۔ تاکہ وہ اُخروی سعادتوں سے مالامال ہوں تاکہ ان پر ان راہوں کے دروازے کھلیں جو راہیں اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے ان کو دکھائی ہیں تو ان محنت کشوں سے میرا ساتھ کیوں نہ ہو۔ ان سے میرا تعلق کیوں نہ ہو۔ یہ انوکھی ٹریڈ یونین ہے۔ یہ وہ ٹریڈ یونین ہے جس نے ٹریڈ یونین کے نئے افق لوگوں کے سامنے روشن کیے ہیں۔ ٹریڈ یونینیں ہیں۔ اچھی اچھی ٹریڈ یونینیں ہیں۔ ان کے شعلہ بار۔ شعلہ گفتار راہنما ہیں۔ سڑکوں پر مزدوروں کے پیشہ ور لیڈر ہیں۔ گولیاں چلوانے والے پیشہ ور لیڈر ہیں۔ اور درپردہ صنعت کاروں سے مل جانے والے لیڈر ہیں لیکن مجھے ایسی ٹریڈ یونین کی مثال نہیں ملتی جس نے اس طرح کا کوئی

ادارہ بنایا ہو۔ اس طرح کی کوئی تعمیر کھڑی کی ہو۔ اس طرح کا کوئی ہسپتال بنایا ہو۔ اس طرح کا کوئی دینی مدرسہ جاری کیا ہو۔ اس طرح کے عظیم منصوبے اس کے سامنے ہوں یہ ٹھوس کام اس بات کی علامت ہے کہ یہ ٹریڈ یونین دوسری ٹریڈ یونینوں سے مختلف نوعیت کا انداز رکھتی ہے اور یہی وہ ٹریڈ یونین ہے جو حقیقت میں آج پاکستان کو درکار ہے۔ آج وہ دور نہیں ہے کہ غیروں کی حکومت ہو۔ آج غلامی کا زمانہ نہیں ہے۔ آج ہم نے اپنے ووٹوں سے اپنی حکومت بنائی ہے۔ آج عوامی راج ہے۔ آج ذوالفقار علی بھٹو کا راج ہے۔

آج اس کے وجود کی صورت میں عوام کا راج ہے۔ اس لیے کوئی فرد شہنشاہ نہیں ہے۔ کوئی بادشاہ نہیں ہے۔ حقیقت میں اقتدار خدا کا ہے۔ اور خدا کی طرف سے دیا ہوا عوام کا ہے اور جو اس کو امانت سمجھے گا وہی کامیاب ہوگا اور ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے ساتھی اس کو امانت سمجھتے ہیں اور میں آپ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کو امانت سمجھتے رہیں۔

تو اگر یہ دور غلامی کا دور نہیں یہ آزادی کا دَور ہے۔ یہ عوام کا دَور ہے اگر یہ تعمیریں ہماری ہیں اگر یہ بینک جو آج قومی ملکیت میں لیے جا چکے ہیں یہ ہمارے ہیں۔ اگر آج دھواں اُگلتی ہوئی چمنیاں رکھنے والے کارخانے ہمارے ہیں اور یہ قومی ملکیت میں اکثر و بیشتر لیے جا چکے ہیں اگر انشورنس کمپنیاں ہماری ہیں یہ قومی ملکیت میں لی جا چکی ہیں اگر آج اس ملک کے اندر چلنے والی بسوں کے شیشے ہماری کمائی ہوئی محنت سے درآمد ہوتے ہیں ملک کے اندر، تو پھر یہ کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہے۔ ٹریڈ یونیزم یہ نہیں کہ ہم اپنے ہاتھوں سے ان کارخانوں کو جلائیں۔ ان بینکوں کو جلائیں۔ ان اداروں کو جلائیں۔ ان بسوں کے شیشوں کو توڑیں اور اس طرح ہم تخریب پر آمادہ ہوں اور یہ سمجھیں کہ اپنے ہی گھر کو آگ لگانے کے بعد کہ ہم نے کسی دوسرے ظالم کو آگ لگا دی ہے۔ یہ وہ یونین ہے آپ کی یونین جس نے دوسری یونینوں کے سامنے یہ نمونہ پیش کیا ہے اور یہ سبق دیا ہے کہ اے! آگ لگانے والو اے! تخریب کاری پر آمادہ لوگو خیال کرو۔

اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

یہ یونین ہے جس کے ساتھ ہمارا رشتہ ہے۔ میرا رشتہ ہے۔ میرا تعلق ہے۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ مجھے اس پر فخر رہے گا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ میرے ساتھ رہیں گے اور انشاء اللہ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔ لیکن یہ دینے والے لوگ اگر کچھ مانگتے ہیں تو اپنا حق مانگتے ہیں۔ یہ دوسروں کا حق چھیننا نہیں چاہتے۔ یہ اس دولت پر نگاہ حقارت بھی ڈالنے پر تیار نہیں ہیں کہ جو حرام کے راستوں سے کمائی جائے۔ یہ تو اپنا حق مانگتے ہیں۔ اور آخر کیوں نہ مانگیں۔ یہ پاکستان چند سرمایہ داروں کے لیے نہیں بنا۔ چند بڑے خاندانوں کے لیے نہیں بنا۔ چند جاگیرداروں اور وڈیروں کے لیے نہیں بنا۔ یہ ملک کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ ملک کسی کی راجدھانی نہیں ہے یہ کسی کی ذاتی سلطنت نہیں ہے۔ کسی کی میراث نہیں ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کا انصاف نہیں ہے۔ ان لوگوں سے کہو جو تقدیر کو غلط معنی پہناتے ہیں ان سے کہو یہ اس رب العالمین کی تقدیر نہیں ہے کہ ایک کوٹھی میں پیدا ہونے والا بچہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہو۔ اور زندگی میں ترقی کرتا جائے۔ اس لیے کہ باپ کی دولت کا وسیلہ اس کے ساتھ ہے۔ اور ایک جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ اپنی صلاحیتوں سمیت اس لیے دنیا کے اندر اپنا حق نہ پا سکے کہ اس کو باپ کا سہارا حاصل نہ تھا جو اس کو تقدیر سے موسوم کرتا ہے وہ خدا کے دین سے لاعلمی اور جہالت کا ثبوت دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں رب العالمین ہوں۔ میں جہانوں کا پروردگار ہوں؛ پھر یہ کیا ہے کہ فٹ پاتھوں پر لوگ بھوکے تڑپ رہے ہیں؛ پھر یہ کیا ہے کہ لوگ وہ بھی ہیں جو دودھ سے کلیاں کرتے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جن کو پانی بھی دستیاب نہیں ہے۔ پھر یہ کیا ہے

کہ ایک طرف کچھ لوگ یورپ جا کر اپنے کتوں کا علاج کرانے پر قادر ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے بچوں کو اگر دق کے جراثیم چاٹ جائیں تو وہ انہیں ہسپتال داخل نہیں کرا سکتے۔ کچھ وہ ہیں، وزیروں اور امیروں سمیت جن کے گھروں پر ریشم کے تھانوں کے تھان پردوں کی صورت میں لٹکے ہوئے ہیں اور کچھ وہ ہیں کہ جن کی بچیوں کے سروں پر دو گز کا دوپٹہ بھی نہیں ہے۔ اگر خدا رب العالمین ہے اور یقیناً ہے اگر اس نے کہا ہے' قاری صاحب تلاوت کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ انہوں نے ایک آیت کا ٹکڑا پڑھا کہ " نحن نرزقکم وایاھم" ہم تمہیں رزق دیں گے تمہاری اولاد کو بھی رزق دیں گے۔ ان کو بھی رزق دیں گے اگر اللہ کا یہ وعدہ ہے تو کیا اللہ کا وعدہ جھوٹا ہو سکتا ہے۔ نہیں، سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے مگر میرے رب کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کیا ہے؟ پھر یہ ظلم کیا ہے؟ یہ ماحول کیا ہے؟ رب کا وعدہ کیوں نہیں عملی جامہ پہن رہا۔ کیوں نہیں لوگوں کے سامنے وہ سادات آئی کیوں یہ لوگ اندھیرا دیکھتے ہیں۔ کیوں یہ تاریکیاں دیکھتے ہیں۔ کیوں یہ ظلم وستم دیکھتے ہیں۔ آؤ میں بتاتا ہوں۔ دوستو! رب نے وعدہ پورا کیا ہے اس نے جہانوں کا رزق کائنات میں بکھیر دیا ہے۔ اس نے سب کو رزق دیا مگر کچھ لوگ ایسے تھے جو اُچکے بن گئے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو ڈاکو بن گئے کچھ لوگ ایسے تھے جو دوسروں کا حق مارنے والے بن گئے۔ بیچ میں انہوں نے حائل ہو کر وہ رزق جو دوسروں کو جانا چاہیئے تھا وہ جھپٹ کر چھین کر اپنی تجوریوں میں بھر لیا۔ خدا کی قسم ان ہاتھوں کو توڑ کر ان تجوریوں سے لے کر غریبوں میں تقسیم کرنا یہ عین اسلام کی تعلیم ہے۔

اور اگر رب کہتا ہے میرا وعدہ' تو رب کہاں نظر آتا ہے میرے آقا نے فرمایا کہ اگر خدا کو دیکھنا ہو تو نیک بندوں کو دیکھو۔ نیک بندے کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ مومن کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ مومنین کے معاشرے کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ اور اگر اسلامی حکومت ہے تو وہ خدائی حکومت ہے۔ وہ خدا کے مشن کو پورا کرنے والی حکومت ہے۔ جب خدا یہ کہتا ہے

کہ رزق دینا میرے ذمے ہے تو گویا وہ حکومت جو اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے کی دعویدار ہے اس کا فرض ہے کہ ہر ایک کو رزق دے اگر وہ وعدہ پورا نہیں کرتی تو وہ خدا کی دی ہوئی قدروں پر قائم ہونے والی حکومت نہیں ہو سکتی۔

اس لیے اگر یہ مانگتے ہیں اپنا حق مانگتے ہیں تو کسی سے اس کا حق نہیں لیتے۔ یہ انصاف مانگتے ہیں۔ یہ عدل مانگتے ہیں۔ یہ ظلم کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ یہ ناانصافی کا خاتمہ چاہتے ہیں اور دیر سویر پسے ہوئے انسانوں کو ان کا حق دینا پڑے گا اور یہ حق کوئی نہیں دیتا بجز اسلام کے، کوئی نہیں دیتا بجز کالی کملی والے کے نظام کے۔ کوئی نہیں دیتا بجز قرآن کے۔ کوئی نہیں دیتا بجز قرآن لانے والے کے۔ اگر کہیں کوئی نہیں اچھائی نظر آتی ہے دنیا کے کسی ملک میں دنیا کے کسی نظام میں تو وہ سب تمہارا ہی دیا ہوا ہے۔ تم سے ہی لیا ہوا ہے۔ تمہاری ہی مستعار روشنی ہے آج پھر تم دوسروں کے ٹمٹماتے ہوئے دیوں سے روشنی حاصل کر رہے ہو۔ مگر بھول گئے ہو کہ ڈھلتے ہوئے نکلتے ہوئے آفتاب تمہاری آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

اور کوئی دے گا نہیں تو کیا دے گا؟۔ زیادہ سے زیادہ پیٹ کی بھوک مٹا دے گا مگر روح کی بھوک کون مٹائے گا اور انسان صرف پیٹ کا نام تو نہیں ہے۔ انسان کے سارے وجود کو پیٹ پر بنانے والو! اور پیٹ کی عینک لگا کر انسان کے سارے وجود کو دیکھنے والو! کائنات صرف پیٹ کا نام نہیں ہے۔ کائنات ضمیر بھی ہے۔ کائنات روح بھی ہے۔ کائنات قلب و دماغ کی اعلیٰ طاقتیں بھی ہیں۔ کائنات لطیف صفات احساسات اور جذبات کا نام بھی ہے پیٹ کو مطمئن کر دو گے لیکن یہ جذبات مطمئن نہیں ہوں گے۔ روح مطمئن نہیں ہو گی۔ آؤ ایسا نظام لائیں کہ جو روح کے تقاضے بھی پورے کرے۔ پیٹ کے تقاضے بھی پورے کرے اور وہی نظام جسے اسلام کہا گیا ہے اور جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ دنیا میں لے کر آئے ہیں۔ جسے اللہ نے بھیجا اور اس کے رسولؐ نے پیش کیا اور اگر قائد اعظمؒ نے کہا اسلامی سوشلزم اور ذوالفقار علی بھٹو نے

کہا اسلامی سوشلزم تو اس سے مراد یہی مساواتِ محمدیؐ ہے اس سے مراد وہی نظام ہے کہ جس میں پیٹ اور روح کے تقاضے بیک وقت پورے ہوتے ہیں۔ ہمیں روٹی عزیز ہے مگر عقیدے کی قیمت پر نہیں۔ ہمیں عقیدہ عزیز ہے۔ مگر ہم روٹی بھی چاہتے ہیں۔ ان علماء سے کہو جنہوں نے حقائق سے منہ موڑا۔ جنہوں نے لوگوں کے بلکتے ہوئے بچوں کی چیخیں سننے سے انکار کر دیا۔ ان سے کہو کہ کب تک تم لوگوں کو محض مواعظ حسنہ سے بہلاتے رہو گے کب تک تم انہیں تقدیر کا درس دیتے رہو گے۔ تقدیر پر شاکر ہونے کا درس دیتے رہو گے اور تقدیر کا خودساختہ مفہوم لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہو گے کیوں یہ نہیں سمجھتے ہو کہ

دو وقت کی روٹی بھی نہیں جن کو میسر،
کب تک وہ عقیدے کی غذا کھا کے جئیں گے!

یہ ایک حقیقت ہے۔ تلخ ہی سہی مگر عقیدے کا رشتہ تبھی برقرار رہے گا جب اس کے ساتھ تم ان کو غذا بھی دو گے۔ ان کی مادی ضروریات بھی پوری کرو گے۔ ورگرنہ آقا نے فرمایا ہے کہ "افلاس انسان کو کفر کے نزدیک پہنچا دیتا ہے۔" پھر نہ نماز میں لطف ہے کہ جو نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے وہ بھی سوچتا ہے کہ اس کے گھر میں فاقوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور میں یہاں کھڑا ہوں مگر صبح میرے بچے کیا کھائیں گے۔ وہ اسکول کی فیس کہاں سے لے کر جائیں گے۔ نہ خشوع رہتا ہے نہ خضوع رہتا ہے۔ عبادات میں بھی لطف تبھی ہے جب انسان کا قلب مطمئن ہو۔ جب اس کو سکون ہو۔ بنیادی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے اس کے بچوں کے مسائل حل ہو چکے ہوں۔ اس لیے اگر عقیدے کو مستحکم بنانا ہے تو روٹی کا مسئلہ حل کر دو۔ روٹی کے بغیر عقیدہ اور عقیدہ کے بغیر روٹی، نہ یہ درکار ہے نہ وہ درکار ہے۔ نہ ہم وہ عقیدہ چاہتے ہیں۔ جس میں روٹی کی ضرورت نہ ہو اور نہ ہم وہ روٹی چاہتے ہیں جس میں سے عقیدہ کو نکال دیا جائے۔ یہ ہے اسلامی سوشلزم

یہ اسلامی سوشلزم ہے جو ہماری حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ جو ذوالفقار علی بھٹو قائم

کرنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ یہ قائم ہو گا۔ وہ حکومت قائم ہو گی وہ نصب العین پورا ہو گا جس میں لوگوں کی تمام بنیادی ضروریات زندگی پوری ہوں گی۔ حکومت اس کا ذمہ لے گی، مگر ظاہر ہے یہ مسئلے چند دنوں کے نہ تھے۔ یہ مسئلے ۲۵ سال کے بھی نہ تھے۔ اس میں صدیوں کی اور مسافتیں حائل تھیں۔ ہم اس طرف بڑھ رہے ہیں۔ بتدریج بڑھ رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ہم وہ نظام لانے میں کامیاب ہوں گے۔ جس میں روحانی طاقتیں بھی جلا پائیں گی اور جس میں انسان کی مادی ضروریات بھی پوری ہوں گی۔ تو اگر پان فروش مانگتے ہیں اپنا حق اور مشروب فروش مانگتے ہیں اپنا حق تو کوئی غلط بات نہیں کرتے۔ ان کو ان کا حق دینا ہو گا۔ صنعت کاروں کو بھی۔ سرمایہ داروں کو بھی۔ آخر ان کی سگریٹوں کی قیمتیں بڑھتی چلی گئی ہیں۔ وہ قیمت آج نہیں ہے جو ۱۹۴۷ء میں تھی جو ۱۹۶۵ء میں جو ۱۹۶۰ء میں تھی مگر منافع کی شرح وہی ہے جو آج سے دس سال پہلے تھی جو آج سے پندرہ سال پہلے تھی۔ یہ منافع کی شرح بڑھانی ہو گی اور حکومت کے متعلقہ اہل کاروں کو بھی یقیناً آپ کے مسائل حل کرنے ہوں گے۔ میں آپ کا سفیر ہوں۔ آپ کی حکومت میں آپ کا سفیر ہوں۔ میں انشاء اللہ قائد عوام کے حضور یہ عرض کروں گا کہ آپ کے مسائل حل ہونے چاہئیں۔

اور جس طرح پہلے مسئلے حل ہوئے ہیں۔ آئندہ بھی اسی طرح حل ہوں گے۔ اس برادری سے اگر اس حکومت کا تعلق دیکھنا ہو تو یاد کرو کراچی میں جب کنونشن ہوا تھا قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ ممتاز علی بھٹو اور میں دونوں قومی اسمبلی کے اجلاس میں مشغول تھے، مگر جب ہم نے قائد عوام کو بتایا کہ ہمیں اس کنونشن میں جانا ہے ہر چند کہ قومی اسمبلی کی مصروفیات دامن گیر تھیں، مگر انہوں نے بطور خاص اجازت دی اور کہا اس کنونشن میں ضرور شریک ہو۔ خود جا کر محنت کشوں کو میرا سلام کہو۔

اگر یہ تعلق ہمارا ہے اور یقیناً ہے تو ہم اس تعلق کے تقاضے بھی جانتے ہیں۔ اس تعلق کے

جو مطالبے ہیں انہیں بھی سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صنعت کار اس بات کو سمجھیں گے۔ وقت کے تقاضے کو سمجھیں گے اور جس طرح آپ نے ان کے ساتھ تعاون کیا ہے اگر وہ آپ کے ساتھ تعاون کرتے رہے تو اسی طرح باہمی افہام و تفہیم کے ساتھ وہ مسئلے حل ہوں گے جو آپ کی برادری اور ان کے مابین ابھی تک نزاعی چلے آ رہے ہیں اور ابھی تک جن کا تصفیہ نہیں ہو سکا۔

مَیں اس بات کا احساس رکھتا ہوں کہ طبقاتی شعور بڑی چیز ہے۔ طبقاتی نفرت ہمارے ملک میں نہیں آنی چاہیئے۔ یہ لہر بڑی خطرناک ہے لیکن طبقاتی شعور ایک زندہ حقیقت ہے جو غریب کے گھر میں پیدا ہوا اس کا رشتہ غریبوں سے آخر رہے گا۔ وہ ان کا دکھ درد سمجھتا ہے۔ وہ ان کے طبقے کا آدمی ہے وہ اگر ان سے منہ موڑتا ہے تو حقیقت میں اپنے طبقے سے غدّاری کرتا ہے۔ اس لیے اگر مَیں یہ کہتا ہوں کہ طبقے موجود ہیں اور مَیں اگر طبقوں کو دیکھتا ہوں تو اس طرح دیکھتا ہوں کہ پاکستان میں بھی اگر طبقے ہیں تو صرف دو ہیں۔ ایک محنت کش اور ایک محنت کُش۔ ایک طبقہ محنت کشوں کا ہے ایک محنت کُشوں کا ہے۔ ایک وہ ہے جو محنت سے روزی حاصل کرتا ہے ایک وہ ہے جو محنت کو قتل کر کے اس سے اس کا حق چھیننے کی کوشش کرتا ہے میں محنت کشوں کے ساتھ ہوں۔ محنت کُشوں کے ساتھ نہیں۔

مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ دوستو اور بھائیو عزیزو اور بزرگو! کرسیاں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ یہ ساون کے بادل ہیں یہ بہار کا موسم ہے کہ اس کے بعد پت جھڑ بھی آتی ہے۔ یہ وہ دھوپ ہے جس کے بعد چھاؤں مقدر ہے۔ یہ وہ چھاؤں ہے جس کے بعد دھوپ مقدر ہے۔ یہ وہ جوانی ہے، جس کا تعاقب بڑھاپا کر رہا ہے۔ یہ وہ مسکراہٹ ہے جس کے پیچھے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ یہ وہ پھول ہیں جن کے مقدر میں مرجھانا لکھا جا چکا ہے۔ مگر یہ رشتہ رہے نہ رہے، کرسی رہے نہ رہے آپ اور میں ایک رہیں گے۔

اس لیے کہ مَیں اور آپ ایک ہیں۔ ایک طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ بھی محنت کش

ہیں اور میں بھی محنت کش ہوں۔ میں بھی قلم کا مزدور ہوں۔ میرا باپ کسان ہے، غریب ہے، اگر مجھ میں اُس باپ کا خون ہے اور یقیناً ہے تو میں آپ کے مطالبات کو لے کر چلوں گا۔ انہیں حل کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں کبھی زندگی میں آپ کے ساتھ غدّاری نہیں کروں گا۔"

نئی ذمّہ داریاں اور نئے تقاضے

"دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پاکستان کی مشہور دینی درس گاہ ہے۔ اس کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق ایم۔ این۔ اے کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل سے کون واقف نہیں۔

۱۹۶۶ء میں ازراہ شفقت انھوں نے مجھے اپنے دارالعلوم کا معائنہ کرنے اور طلبا سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یہ ان کی بزرگانہ شفقت تھی کہ میری تقریر سے پہلے دارالعلوم کی طرف سے ایک سپاسنامہ بھی پیش ہوا۔ اس تقریر میں عجز کی فضا اسی سپاسنامے کی مرہونِ منّت ہے۔ یہ تقریر اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد میں نے پہلی مرتبہ اس پُروقار علمی ماحول میں اپنے دینی افکار پیش کیے۔"

○

مجھے آج دارالعلوم میں آنے کا موقع ملا، یہ میری بڑی سعادت ہے اور آج میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ میں سالہا سال سے آپ کے دارالعلوم اور حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کی عظیم شخصیت سے متاثر ہوں اور وہ خدماتِ جلیلہ جو حضرت مولانا اور یہ ادارہ دینِ حق کی بجا لا رہا ہے شروع سے اس کا قدردان ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو زمانہ جا رہا ہے اور جس طرح حالات ہمیں گھیرے ہوئے ہیں اور دینِ حق کو فتنوں کا جو سامنا ہے ان میں ایسی بزرگ ہستیاں مغتنمات زمانہ میں سے ہیں اور کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جب یہ لوگ نہ رہے تو ہمارا کیا بنے گا۔ وہ جو شاعر نے کہا تھا، حضرت شیخ الحدیث کا وجودِ مسعود بھی میں انہی میں سمجھتا ہوں کہ

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

میرے بارہ میں جو ذرہ نوازی آپ لوگوں نے فرمائی۔ بغیر تصنع اور بناوٹ کے کہتا ہوں کہ میرے اندر ان خصوصیات کا سوواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی موجود نہیں۔ علماء ربانیین کا ادنیٰ

خادم ہوں اور انکی خاکِ قدم کو سرمۂ چشم بصیرت اور نجات کا باعث سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی متاع اور اندوختہ میرے پاس ہے تو یہی ہے۔ میں کچھ تقریر کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آپ اہلِ علم ہیں میں خود آپ سے سیکھنے آیا ہوں۔ بس ایک رشتہ کی بنا پر کہ میں ایک ادنیٰ خادم ہوں، کچھ باتیں جو میں نے جدید حلقوں میں بیٹھ کر اور شہری زندگی میں رہ کر محسوس کی ہیں عرض کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ حضرات آئندہ زندگی میں اسے ملحوظِ خاطر رکھیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آپ پر اللہ نے بڑا فضل وکرم کیا ہے۔ آپ اپنے مقام کا شعور کر لیں۔ اکثر علومِ دینیہ کے طالب علم احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالہ جرس کارواں رہے

ان کا خیال ہوتا ہے کہ دنیا نے ترقی کی شہرت، عزت اور دولت پائی اور ہم ان لوگوں سے فروتر ہیں بحیثیت جماعت اور ادارہ اور آپ کی اس نسبت دینی سے عرض کرتا ہوں کہ آپ کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ نے آپ پر اتنا بڑا کرم فرمایا کہ جو علوم اللہ اور رسولؐ، صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ اطہار اور ہمارے ائمہ سلف کی وراثت ہیں۔ ان کے حصول کا شرف خدا نے آپ کو عطا فرمایا اور آپ کو تخصیص کا درجہ دیا۔ یہ زمانہ جو گزر رہا ہے اس میں ترکِ دُنیا کی مذمت کی ضرورت نہیں کبھی ضرورت تھی جبکہ تقویٰ اور دین کا دَور دَورہ تھا اور لوگ چاہتے تھے کہ دُنیا کے علائق سے الگ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جائیں مگر اب مادیت اور مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ یہ ڈیڑھ بالشت پیٹ سارے جہان کا احاطہ کیے ہوئے ہے ماضی اور مستقبل کا سارا جائزہ پیٹ کے لیے لیا جا رہا ہے۔ روپیہ پیسہ اور عیش وعشرت لوگوں کا منتہائے مقصود بنا ہوا ہے۔ غرض سارے عالم میں فساد اس طلب دنیا کے لیے ہے اور یہی وہ رجحان تھا جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہر اُمت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کے لیے فتنہ دنیا ہے۔ دنیا تو ہر زمانہ میں پُر کشش رہی مگر جو رعنائی۔ زیبائی کشش اس کے اندر اس زمانہ میں پیدا ہوئی وہ پہلے نہیں تھی

پہلے زمانہ میں لوگوں کو ان سواریوں کا تصور نہیں تھا جو آج میسر ہیں۔ نہ یہ ماکولات و مشروبات تھے۔ اسی طرح لباس میں وہ تنوع اور رنگارنگی نہیں تھی جو آج کے مادہ پرست دور میں ہے۔ غرض یہ مال جس طرح آج باعثِ آزمائش ہے پہلے نہیں تھا۔ مال و دولت آج کا سب سے بڑا فتنہ ہے اور ترکِ دنیا اور رہبانیت کا خطرہ بہت کم ہے۔

آپ یہ خیال نہ کریں کہ دنیا عزت اور اقتدار کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ آپ کو اللہ نے دنیا طلبی سے محفوظ رکھا۔ قناعت کا جذبہ اور زندگی عطا فرمائی، اپنے اور رسولِ کریمؐ کے علوم کا وارث بنایا۔ اس سے بڑی عزت اور کیا ہو سکتی ہے۔ لوگوں کے پاس جو اقتدار ہے وہ زوال پذیر ہے اور پانی کے ببلہ کی مانند ہے۔ کل جو کرسی پر تھے آج ان کا نام لینا بھی جرم اور داخلِ دشنام ہو چکا ہے۔ ان کا حکم صرف جسموں پر چلتا ہے دلوں پر نہیں۔ آپ کا حکم اس زمانہ میں بھی جسموں پر نہیں بلکہ دلوں پر چلتا ہے۔ اصل دولت دولتِ آخرت ہے اور اس دولت کے مقابلے میں دنیا کی نسبت یہ ہے کہ جیسے کوئی بہتے ہوئے سمندر میں انگلی ڈال دے اور کچھ تری اس کی انگلی پر لگ جائے۔ آپ کی مثال تو بحرِ مواج کی مانند ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ اس شعور کو تازہ رکھ کر اس دار العلوم سے فارغ ہوں۔

"میں نے آج کے مختصر قیام کے دوران جو کچھ دار العلوم میں دیکھا جو سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا اور میں نے جو جائزہ لیا اس بنا پر کہتا ہوں کہ مستقبل قریب میں انشاء اللہ یہ دار العلوم پاکستان میں وہ حیثیت حاصل کرے گا جو برصغیر پاک و ہند میں دار العلوم دیوبند کو ہے۔"

اس لحاظ سے یہاں سے فارغ ہونے والوں کی ذمہ داری اور بھی نازک ہو گی۔ جب آپ یہاں سے نکلیں تو آپ کے علم کے ثمرات لوگوں پر منکشف ہونے چاہئیں جس کے لیے اہم اور پہلی بات

یہ ہے کہ زمانہ کی نزاکت کا خیال رکھیں۔ یہ زمانہ نازک مسائل کا ہے، یہ زمانہ الحاد اور دہریت میں مبتلا ہے۔ وہ نزاعی مسائل جو اصل کی حیثیت نہیں رکھتے قابلِ التفات نہیں۔ وسیع ماحول کو پیشِ نظر رکھیے۔ آج لوگوں کو خدا، رسالت، ایمان بالغیب اور آخرت جیسی باتیں سمجھانی ہیں۔ وہ مسائل جو جدید معاشی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں غربت، افلاس، بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے، لوگ متلاشی ہیں کہ کوئی ایسا مکمل اور صحیح نظام ان کے سامنے رکھ دیا جائے جس میں ان مسائل اور مشکلات کا حل ہو۔ وقت کے پیٹ سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں تصویر کشی، بنکنگ، انشورنس، ملکیت، قومی و انفرادی، عطیہ خون اور سرجری اور خدا جانے کیا کیا مسائل ہیں جن کے حل کے لیے ذہنی افق کو وسیع کرنا ہوگا۔

دار العلوم سے نکلنے کے بعد آپ کو ہر طرف سے ایسے فتنوں کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا جو بظاہر بڑی دلآویزی رکھتے ہیں۔ ان کے پاس خوبصورت اندازِ تبلیغ اور بلند بانگ دعاوی ہوں گے۔ یہ قسم قسم کی کتابوں اور رسائل سے آپ کو متاثر کرنا چاہیں گے ان کے اندازِ گفتگو، چال ڈھال غرض ہر چیز ابتلا اور آزمائش میں ڈالنے والی ہوگی مگر ان کی حیثیت اس چونہ گچ قبر کی ہوگی جس کے اندر کا مُردہ کافر ہو اور باہر سے اس کی آرائش و زیبائش کر دی گئی ہو۔ میں اپنے طویل تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تمام صلاح و فلاح صرف اور صرف سلف صالحین کے اتباع میں ہے۔ اسلام سائنس نہیں کہ اس میں طرح طرح کی اختراعات اور ایجادات کیے جائیں۔ سائنس کی دنیا میں تو ایسے دعوے قابلِ تعریف ہیں اور لوگ اس پر واہ واہ کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام میں اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ یہ چیز آج میں نے پہلی بار پیش کی۔ اسلاف سے بھی ایسا کام نہ ہو سکا تھا تو ایسا کہنے والا گمراہ ہے۔ اسلام اتنا قدیم اور پُرانا ہے جس طرح آدم علیہ السلام اور جس طرح یہ چاند، سُورج، یہ ہوا اور یہ دنیا پرانی ہے اور جس طرح پرانی ہونے کے باوجود آج بھی زندگی کا سرچشمہ ہیں اس طرح اسلام ہزاروں سال کے باوجود آج بھی ہزاروں جدتوں کا حامل ہے۔ اس کے بارہ میں کسی بلند بانگ دعوے والوں کی طرف ہرگز التفات نہ کیجیے۔ بلاشبہ کارِ تجدید و احیاءِ دین اسلام میں ہوتا رہا ہے اور ہر دَور میں مُجدّدین پیدا ہوتے رہے مگر ان کی حیثیت جدت طرازی کی ہرگز نہ تھی۔ مجدّدینِ امت نے پُرانی صدا قتوں

کو نئے اسلوب اور وقت کے انداز بیان میں ڈھال کر پیش کیا مگر جو شخص خود یہ دعویٰ کرے کہ یہ باتیں صدیوں کے بعد پہلی بار پیش کی جا رہی ہیں تو سمجھیے کہ یہ شخص ملت کی کشتی کو منجدھار کی طرف لے جا رہا ہے۔ گویا کہ اسے باہر نکال دے۔

اتحادِ اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے وہ تحزّب اور تفرق جس میں حق کو اپنے اندر محدود کر لیا جائے کہ اصل اسلام اگر ہے تو ہم ہی میں ہے اور اصل اسلام کا کام تو صرف ہم ہی کر رہے ہیں اور ساری صلاح و فلاح ہم ہی میں محدود ہے اور صالحینِ امت اور مجددینِ امت نے اگر جماعت اور تنظیم نہیں بنائی تو غلط ہے۔ تو ان لوگوں کا یہ تحزّب ملت اور دین کی بربادی کا باعث ہے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ پوری تاریخ میں مجدد نے کبھی اقتدار حاصل کرنے کے لیے تنظیم اور جماعت نہیں بنائی۔ یہ لوگ ان سب پر اعتراض کرتے ہیں کیا ایسا تو نہیں کہ وہ کام جو صالحینِ امت نے تیرہ صدیوں میں نہ کیا کہ انھوں نے دین کے نام پر کوئی جماعت وغیرہ نہ بنائی تو اس میں دین کی کوئی حکمت مضمر ہو تاکہ ان کا کام اصلاح کی بجائے فساد کا باعث نہ ہو اور اس دور کے بعض تجربوں سے ثابت ہوا کہ واقعی اس طرح کے کام اتحاد کی بجائے ملی انتشار اور اصلاح کی بجائے فساد کا باعث ہوئے اور مسائل سلجھنے کی بجائے اور الجھ گئے۔ ان فتنوں کے علاوہ انکارِ ختمِ نبوت کا فتنہ بھی پورے زور پر ہے۔ اس کے وسیع ذرائع اور لامحدود وسائل ہیں اور اس کی جڑیں بہت گہری ہو رہی ہیں۔ اس کی سرکوبی اور ازالہ اور مقابلہ کے لیے آج بھی آپ لوگوں کو علمی و نظری لحاظ سے مستعد ہونا ہے۔

اسی طرح دیگر زبانوں میں بھی اپنی ہمت اور محنت سے ادراک حاصل کیجیے جس میں اسلام کی تبلیغ کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ تقابلی مطالعہ کیجیے۔ نئے نظاموں کا نئے مسائل کا اور پھر اسلام سے ان کا حل تلاش کیجیے آپ حضرات کو بڑی محنت اور مشقت اٹھانی ہوگی اور وقت، ماحول، نفسیاتِ انسانی کو مدِنظر رکھ کر سوچنا ہوگا۔ نیا اسلوب پیش کرنا ہوگا اور قدیم حلقوں کے علاوہ جدید حلقوں میں بھی دینِ حق کا چرچا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ علمائے حق کا فریضہ ہمیشہ سے حکومتِ وقت کا محاسبہ

کرنے کا ہے۔ علمائے حق کبھی اقتدار اور دنیاوی وجاہت کے طالب نہیں رہے۔ سب سے پہلے یہ ثابت کیجیے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے لیکن اگر دین میں تحریف اور دجل وتلبیس سے کام لیا گیا تو ہم جانوں پر کھیل کر اس کی حفاظت کریں گے۔ یہ دور بلاشبہ سیاست کا ہے اور اسلام ہا جو رنگ دریاست اس زمانہ میں چل رہی ہے اس کا یقیناً دین سے کوئی تعلق نہیں۔

جس اقبال کا یہ مصرعہ پڑھا جاتا ہے کہ ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی اقبال نے مسلمانوں کو موجودہ لادینی سیاست سے کنارہ کش ہو کر دین کی خدمت کرنے کی بھی یہ کہہ کر دعوت دی تھی کہ پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو۔ اس سیاست نے ایسے جذبات پیدا کیے کہ سلنے اقتدار کی بھٹیاں بن کر رہ گئے۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ابلیس کا دعویٰ تھا مگر اس الیکشنی سیاست کی بنیاد ہی اس دعویٰ پر ہے۔ ہر فرد اور ہر جماعت اسی دعوے کو لے کر میدانِ سیاست میں اترتی ہے اور اس دعویٰ ابلیسی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ حکومتِ وقت کا احتساب ضرور کیجیے مگر اس احتساب میں خیر خواہی کا انداز ہونا چاہیے اپنے آپ کو اقتدار کا حریف نہ بنائیے حکمت اور اصلاح کے جذبے سے کلمۂ حق کہیے۔ بزرگانِ سلف کا یہی طریقہ رہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اقتدار سے دامن جھٹک کر انھوں نے جب بھی حق بات کہی ہے تو بڑے بڑوں کے دل دہل گئے ہیں۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ تبلیغ آپ کا فریضہ آپ کا مشن ہے۔ آپ ان عیسائی مشنریوں کو دیکھئے۔ جن کا جال دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے بے سروسامانی سے مشن کا آغاز کیا۔ اس کا پہلا مشنری جو ۱۷۹۳ء میں کلکتہ میں آیا ولیم کیری ایک موچی کا لڑکا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ چار دانگ عالم میں عیسائیت کا پرچار کیا جائے۔ وہ ہر گلی کوچہ گیا ہر گرجا میں چندے کے لیے ہاتھ پھیلائے کہ ہندوستان روانہ ہوسکے۔ اس تمام محنت کے بعد اسے کل ساڑھے تیرہ شلنگ چندہ ملا۔ حالانکہ اس وقت اس سفر کے لیے کم از کم ۵۰ پونڈ کی ضرورت تھی۔ اس نے جہاز والوں کی منت سماجت

کر کے انھیں راضی کر لیا اور کہا کہ میں تمھاری ہر طرح کی خدمت کروں گا۔ جوتے صاف کروں گا مگر مجھے ہندوستان لے چلو۔ چنانچہ اس نے یہاں آکر عیسائی مشن کا پودا لگایا جو آج ایک مضبوط درخت بن چکا ہے اور اس کے کانٹے برابر ملتِ مسلمہ کو تار تار کر رہے ہیں۔ اپنے حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کی مثال سامنے رکھیے جن حالات میں انھوں نے دارالعلوم کا آغاز کیا ہوگا میرا اندازہ ہے کہ اس وقت کچھ بھی ان کے پاس نہ ہوگا۔ نہایت بے سروسامانی میں ارادہ کیا ہوگا۔ مگر نیک نیتی، اخلاص اور جدوجہد زادِ راہ تھا تو آج اس عظیم ادارہ کی شکل میں دارالعلوم موجود ہے۔ لاکھوں رُوپے لگ گئے اور انشاء اللہ آئندہ کروڑوں خرچ ہوں گے۔ اگر آپ لوگ دین کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے نیک نیتی سے کام شروع کریں گے تو خدا کی مدد یقیناً ساتھ دے گی۔ وہ کبھی بھی اپنے بندوں کو زادِ راہ سے مایوس نہیں کریں گے۔ مولانا محمد علی جوہر نے کیا خوب کہا کہ "مشکلات اور بے سروسامانی سے نہ گھبراؤ۔ تم نے نہیں دیکھا کہ راستہ پر چلنے والے کو حدِ نظر سے آگے سڑک ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص حد سے آگے سڑک بند ہے مگر جب آدمی چلتا ہے تو محدود راستہ کھلتا نظر آتا ہے"۔ بڑھتے چلو خدا کا نام لے کر آگے بڑھتے چلو۔ مشکلیں ہمیشہ آسانیاں پیدا کرتی ہیں اور تاریکیوں کے پردے ہی سے آفتاب عالم تاب طلوع ہوا کرتا ہے۔

خواتین کے حقوق

"یہ تقریر میں نے ۲۵ مارچ ۷۴ء کو گورنمنٹ کالج برائے خواتین اسلام آباد میں یونین کی تقریب حلفِ وفاداری کے موقع پر کی تھی۔ ریڈیو ٹیپ سے تقریر ٹرانسکرائب ہوئی تو جہاں جہاں تالیاں بجی تھیں، رپورٹر نے جگہ جگہ "تالیاں" کا لفظ لکھ کر اس فضا کو بھی محفوظ کر لیا۔

تقریر کے شروع میں ایک دلچسپ واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ اس کالج نے پہلے بھی مجھے اپنی سالانہ تقریب میں مدعو کیا تھا، مگر کابینہ کے اجلاس کی وجہ سے میرے لیے صدارت ممکن نہ تھی، میں چودھری فضل الٰہی صاحب کو جو اس وقت قومی اسمبلی کے سپیکر تھے اور مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے رہے ہیں ساتھ لیتا گیا اور انھیں بتائے بغیر کرسیٔ صدارت پر بٹھا کر خود غائب ہو گیا۔"

جناب پرنسپل، اساتذہ کرام۔ عزیز طالبات۔ خواتین و حضرات!

جناب پرنسپل نے اپنے ابتدائی کلمات میں یہ فرمایا کہ میں دوسری بار یہاں آرہا ہوں مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ ڈیڑھویں بار ہے کہ میں یہاں آیا ہوں۔ (تالیاں)

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس دن Cabinet کا ایک اجلاس تھا اور مجھے اس میں شامل ہونا تھا آج پھر ایسے ہی ایک مصروفیت دامن گیر تھی، قومی اسمبلی کا اجلاس تھا اور مجھے پھر یہ خطرہ تھا کہ آج کی حاضری کہیں پھر ادھوری نہ رہ جائے۔ مَیں نے سوچا کسی اور دوست کو ساتھ لے چلیں اسے کرسی پر بٹھا دوں مگر پھر مجھے یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ملک کا صدر نہ بن جائے۔ (تالیاں)

تاہم مَیں آپ کی یونین کا اور جناب پرنسپل کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بارِ دگر یہاں آنے کا موقع دیا اور نئی نسل سے کچھ باتیں کرنے کی تقریب بہم پہنچائی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے تو لازماً تذبذب ہو گا کہ مَیں یہ کہوں کہ مَیں نئی نسل کے نصف بہتر سے بات

کر رہا ہوں اس لیے کہ نصف بہتر کی ترکیب سے مَیں ـــ اتفاق نہیں رکھتا۔ مَیں نہ نوجوانوں کو۔ لڑکوں کو۔ نصف کمتر سمجھتا ہوں نہ آپ کو نصف بہتر سمجھتا ہوں۔ نہ وہ نصف کمتر ہیں نہ آپ نصف بہتر ہیں۔ آپ دونوں نصف برابر ہیں۔ مَیں دونوں کو برابر سمجھتا ہوں۔ (تالیاں)

اور جب سنٹرل کالج فار مین For Men میں جاکر مَیں نے لڑکوں سے گفتگو کی تو مجھ پر یہ لازم ہوگیا کہ جب آپ کی طرف سے دعوت نامہ آئے تو مَیں آپ کے کالج میں بھی ضرور آؤں "تاکہ ترازو کا پلڑا برابر رہے اور کسی ایک طرف جھکنے نہ پائے۔ (تالیاں)

مَیں نے یہ کہا کہ آپ نصف برابر ہیں۔ یہ بات بڑی تفصیل طلب ہے۔ یہ اتنی سادہ اور اتنی آسان نہیں ہے اس کے اندر بہت وسعتیں ہیں بڑی گہرائیاں ہیں۔ آپ اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو صدیوں پہلے دنیا والوں نے عورت کا یہ مرتبہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسلام سے پہلے دو تہذیبوں کا ڈنکا بجتا تھا ایک یونانی تہذیب تھی۔ ایک رومن تہذیب تھی اور یہ ٹھیک ہے کہ ان کے بہت بڑے ایک مفکر نے، یونان کے مفکر نے جمہوریت کا جو خاکہ پیش کیا تھا خواہ وہ کتنا ہی خیالی کیوں نہ تھا اس کے اندر عورت اور مرد کو برابر کے حقوق دیئے تھے لیکن عملاً یونان کے اندر عورت کے بارے میں جو تصورات پائے جاتے تھے اگر آپ اس زمانے کی تحریروں کا مطالعہ کریں جن کا اب دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کس قدر متعصبانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ ایک ادیب نے یونانی ادیب نے عورت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت ڈس لے تو اس کا علاج ممکن نہیں۔" (تالیاں) اسی طرح ایک اور یونانی ادیب نے لکھا کہ "مرد کے لیے صرف دو مواقع خوشی کے ہوتے ہیں۔ ایک اس وقت جب اس کی شادی ہوتی ہے اور ایک اس وقت جب اس کی بیوی کا انتقال ہوتا ہے۔" یہ یونانی تہذیب کے تصورات تھے عورت کے بارے میں۔ اور رومن لا جو بہت مشہور ہے بلکہ عصر حاضر کا قانون حقیقت میں اسی سے ماخوذ ہے اور جس کی بڑی دھوم ہے بڑا چرچا ہے اس نے بھی عورت کو وراثت کا

حق نہیں دیا تھا۔ باپ کی جائیداد میں عورت کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ بات رومن لاء میں بھی طے تھی۔ اور رومیوں کے ہاں بھی عورت وہ قدر و منزلت نہیں پا سکی تھی۔ جو ایک مہذب سوسائٹی میں عورت کا حق ہے۔ پھر جتنے مذہب تھے خواہ وہ یہودیوں کا تھا خواہ عیسائیوں کا تھا خواہ ہندوؤں کا تھا۔ جتنے اس وقت کے مذہب تھے ان سب میں بھی عورت کے بارے میں عجیب و غریب نظریات پائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر آپ توریت کو پڑھیں جسے Old Testament "کتاب قدیم" کہتے ہیں یا آپ "کتاب جدید" پڑھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ جہاں ان کتابوں میں مرد اور عورت کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے انسان اور اس کی بیوی کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جنت سے وہ کیسے نکلے تو وہاں جو بات لکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب آدم سے سوال کیا اللہ تعالیٰ نے کہ تم نے پھل کیوں کھایا۔ تو اس نے کہا میں کیا کرتا یہ جو عورت تم نے میرے ساتھ لگائی ہوئی ہے اس نے مجھے کہا اور ورغلایا اور میں نے پھل کھا لیا، گویا ان مذاہب کے نزدیک غلطی ساری عورت کی تھی اور مرد کی نہ تھی اور جنت سے نکلوانے کی ذمہ داری عورت کی تھی۔ مرد غریب جو ہے اس کا کوئی ارادہ نہ تھا، لیکن عورت نے اس کو ورغلایا اور پھر جو عیسائیت ہے اور اس کی کتابیں اس میں عورت کے بارے میں جو تصوّرات ہیں وہ آپ پڑھ سکتے ہیں۔ ہم سب مذہبوں کا احترام کرتے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں عورت کو کہا گیا ہے کہ یہ شیطان کا دروازہ ہے۔ اس طرح کی باتیں رائج تھیں۔ ہندوؤں کے ہاں تو آپ جانتے ہیں کہ منّو مہاراج نے جو اُن کے سب سے بڑے قانون ساز تھے انہوں نے جو باتیں لکھی ہیں عورت کے بارے میں وہ آپ آج بھی اگر اس کے قوانین میں پڑھیں تو آپ حیران ہوں گے کہ عورت ان کے نزدیک ایک مویشی یا جانور کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی حیثیت نہ تھی۔ چانکیا نے جس نے منّو کے قوانین کی تشریح کی ہے اور اس کے جو زائد حصے ہیں انکو نکالا ہے اور ٹھیک ٹھاک کیا ہے۔ اس کا تصور یہ تھا کہ دریا سے اور بادشاہ سے اور

عورت سے انسان کو بچ کے رہنا چاہیئے کیونکہ یہ بہت زیادہ ضرر رساں چیز یں ہیں۔ بہت زیادہ نقصان پہنچانے والی۔ پھر ہندوؤں کے ہاں جن کے ساتھ ہم نے ایک عمر گزاری اور جو آج بھی ہمارے پڑوسی ہیں ان کا حال یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کتا اگر چھو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن عورت اگر چھو جائے تو اس سے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ یہ تصورات تھے مذہبوں کے یہ تصورات تھے ان تہذیبوں کے۔ جب اسلام نے یہ سبق دیا اور یہ پیغام دیا کہ عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔ اور جتنی عزت مرد کی ہے اتنی عزت عورت کی ہے ان دونوں کے درمیان اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ (تالیاں)

آپ جانتی ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب سوسائٹی میں بچیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا اور وہ اکثر آپ نے پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے۔ مسدس حالی میں مولانا حالی نے اس کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے بچی کے ضمن میں کیا ان کا طرزِ عمل تھا اس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے جو ایک صحابی نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں بیان کیا آپ کا یہ طریقہ تھا کہ کبھی کبھی آپ عصر کے بعد مجلس لگاتے تھے جس میں لوگ بیٹھتے تھے اور اپنے پچھلے زمانے کی باتیں سناتے تھے تو ایک شخص نے یہ بتایا کہ میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہے کہ میرے گھر میں بچہ ہونے والا تھا اور میں سفر پر چلا گیا بعد میں میرے ہاں بچی پیدا ہوئی تو بیوی نے اس خیال سے کہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے تو میں اسے قتل کر دوں گا۔ اس بچی کو اس نے ننھیال بھیج دیا اور وہاں پر وہ پلی بڑھی پروان چڑھی۔ اس نے پرورش پائی۔ مجھے غلط اطلاع دی گئی کہ بچہ فوت ہو گیا۔ ہوا تھا، فوت ہو گیا۔ لیکن جب میں واپس آیا اور اس زمانے میں آپ جانتے ہیں کہ رسل و رسائل کی کتنی دقت ہوا کرتی تھیں تو وہ بہت عرصے کے بعد جب وہ واپس آیا تو بچی دو ڈھائی سال کی ہو چکی تھی معصوم بچی۔ اس کی باتیں بڑی پیاری تھیں۔ توتلی زبان میں معصوم باتیں کرتی تھی تو مجھے اس کی باتیں بہت پسند آئیں۔ مجھے وہ پیاری لگی۔ تو جب میری بیوی نے یہ دیکھا کہ میں اس

پر التفات کرنے لگا ہوں اور توجہ کرنے لگا ہوں شفقت کے ساتھ تو اس نے ایک دن مجھے بتا دیا کہ یہ بچی حقیقت میں میری ہے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ سننا تھا کہ میرے اندر کا جو حیوان تھا وہ جاگ اُٹھا اور مَیں نے اس بچی کی انگلی پکڑی اور جنگل کی طرف لے گیا۔ مَیں نے وہاں گڑھا کھودا، جب مَیں گڑھا کھود رہا تھا تو مٹی اُڑ اُڑ کر میرے کپڑوں پر پڑ رہی تھی اور وہ معصوم بچی اپنے ہاتھوں سے میرے کپڑے جھاڑ رہی تھی اور کہتی تھی ابا جی آپ کے کپڑوں پر گرد پڑ رہی ہے آپ کے بال میلے ہو رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے ترس نہیں آیا اور مَیں نے اس بچی کو اٹھایا اس گڑھے میں ڈال دیا اس پر منوں مٹی ڈال دی اور جب میں روانہ ہوا تو یوں لگتا تھا جیسے ابا ابا کہتی ہوئی ایک آواز دور تک میرا تعاقب کر رہی ہے۔ وہ شخص یہ بیان کر رہا تھا اور آپ رو رہے تھے سرکار کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ انسان اتنا حیوان ہو چکا تھا۔ عرب جاہلیت کے دَور میں کہ وہ بچیوں کو اس طرح زندہ درگور کر دیتا تھا اور بچیوں کے ساتھ اس کا یہ سلوک تھا۔ یہ عرب جاہلیت کا سلوک تھا اسلام سے پہلے بچی کے ساتھ لیکن جب آپ تشریف لائے تو آپ نے یہ سبق دیا اور قرآن حکیم اس کا شاہد ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک جان سے پیدا ہوئے اور دونوں حقوق کے اعتبار سے برابر ہیں اور کوئی کسی دوسرے پر زیادتی نہیں کر سکتا۔ اسلام نے عورت کو وراثت کا حق دیا۔ اسلام نے یہ مرتبہ عطا کیا عورت کو۔ ماں کے بارے میں کہا کہ "عورت اگر ماں ہے تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔" بیٹی جس کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اسکے متعلق بتایا کہ "جو شخص تین بیٹیاں رکھتا ہو اور ان کی پرورش کرے اور ایک حدیث میں دو بیٹوں کے بھی الفاظ ہیں اور ان کو بیاہ دے ایسا شخص قیامت کے دن میرے ساتھ اس طرح ہو گا جیسے یہ دو انگلیاں ہوتی ہیں۔" اور ایک صحابی نے جب یہ سوال کیا کہ جس کی بہنیں ہوں اور ان کو وہ پالے اور ان کی پرورش کرے تو آپ نے اس کے بارے میں بھی یہی ارشاد فرمایا۔ پھر نیک بیوی کے بارے میں اچھی رفیقہ حیات کے بارے میں فرمایا کہ "وہ انسان کی زندگی کو دنیاوی زندگی

کو جنت میں تبدیل کر دیتا ہے۔" یہ عورت کے بارے میں تصور بدلا اسلام نے اور اس کو وہ مقام عطا کیا جو کسی تہذیب نے اور کسی مذہب نے عطا نہ کیا۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ آج پھر خواتین میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور خواتین ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا عورت کے بارے میں ان دو تصورات میں مبتلا ہے اور یہ دونوں تصورات حقیقت میں زیادتی پر مبنی ہیں افراط اور تفریط پر مبنی ہیں دونوں کے اندر توازن نہیں ہے دونوں کے اندر عورت کے صحیح مقام کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ایک نقطہ نظر وہ ہے جو جامد طبقے کا ہے اس کلاس کا ہے جو وقت سے بہت پیچھے ہے۔ اس طبقے کا ہے جو عورت کے بارے میں وہ تصورات رکھتا ہے جو حقیقت میں اسلامی تصورات نہیں ہیں، روائتی تصورات ہیں اور رسموں رواجوں پر مبنی ہیں اور اس کا تصور یہ ہے کہ عورت کو بند کر دیا جائے کال کوٹھڑی میں گھر کی چار دیواری میں وہ گھر سے باہر نہ نکلے اور اگر باہر نکلے تو اس پر گزوں تھان پڑے ہوئے ہوں کپڑے کے تاکہ جو لوگ اس کو دیکھنا نہ چاہیں وہ بھی دیکھیں کہ یہ کیا مخلوق ہے جو باہر نکلی ہے۔ (تالیاں)

اس کا کوئی حق نہ ہو، مرد چاہے اس کو مارے، مرد چاہے اس کو سزا دے، اس کو پیٹے لہولہان کر دے اس کی مرضی ہے۔ مرد جب زبان ہلائے طلاق طلاق، طلاق کہے وہ گھر سے باہر نکل جائے جب نکاح ہو رہا تھا مرد اور عورت کا معاہدہ ہو رہا تھا اس وقت دونوں کی رضامندی ضروری تھی لیکن جب علیحدگی کا سوال آیا مرد نے کہا جاؤ اس وقت اس عورت غریب کی رضامندی کا سوال نہیں یہ کیسا معاہدہ تھا۔ کہ جس معاہدے میں دو فریق ہوں۔ معاہدہ کرتے وقت یہ صورت ہو لیکن جب معاہدہ ٹوٹنے لگے تو مرد جو ہے وہ اتنی مہلت بھی نہ دے کہ ایک دو ماہ تین ماہ کا وقفہ ہو۔ جس میں ٹھنڈے دل سے معاہدے ٹوٹنے کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیا جا سکے وہ لفظ نکالے منہ سے اس کی زبان ہلے اور کسی کی قسمت برباد ہو جائے اور کسی کے بچے بھٹکنے کے لیے گلیوں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیے جائیں۔ یہ ان کا تصور ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی تعلیم بھی واجبی ہو۔ اوّل تو گھر ہی میں ہو پانچ چھ

ساات جماعتیں اور سکول میں اگر وہ پڑھ لے تو پھر کالج میں نہ جائے کیونکہ کالج میں کہتے ہیں لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔ یہ اس کلاس کا تصور ہے اور ان لوگوں کا تصور ہے یہ بھی زیادتی پر مبنی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ دوسری جو کلاس ہے جو دوسرے لوگ ہیں وہ ایک اور انتہا پر سوچتے ہیں انہوں نے عورت کو جائز مقام دینے کے نام پر اس کا استحصال کیا ہے اور حقیقت میں اس کا مرتبہ گرایا ہے اس کا مرتبہ بلند نہیں کیا اور یہ وہ کلاس ہے اگر آپ غور کریں دیکھیں تو ان کا کاروبار نہیں چلتا۔ اگر عورت کی کوئی عریاں تصویر وہ اپنے اشتہار کے لیے نہ دیں۔ کوئی دکان ان کے نزدیک نہیں چلتی۔ جب تک کوئی ماڈل گرل وہاں کھڑی نہ ہو۔ اور اگر کوئی ماڈل گرل نہیں رکھ سکتا تو شوکیسوں میں جب تک عریاں مجسمے نہ سجائے گئے ہوں عورت کے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری دکان نہیں چل سکتی۔ اس کے نزدیک میں آپ سے حقیقت کہہ رہا ہوں اور اس لیے یہ باتیں میں نسبتاً پوست کندہ کہہ رہا ہوں اور چھلکا اتار کر کہہ رہا ہوں کہ آپ پڑھی لکھی ہیں آپ سمجھ سکتی ہیں اور آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ کون لوگ عورت کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں ان کے نزدیک عورت آج بھی حقیقت میں ایک دل لگی کا سامان ہے ایک انگور کا خوشہ ہے شطرنج کی بساط ہے خربوزے کی پھانک ہے اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حیثیت نہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ گھر سے عورت کا تعلق کٹ جائے۔ بچوں سے اس کا تعلق کٹ جائے اور وہ بالکل اپنے فرائض کو چھوڑ کر ایک سوسائٹی گرل بن کر رہ جائے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یہ دونو تصور اسلام کیمطابق نہیں ہیں روائتی پردے کا تصور جاگیردارانہ سسٹم پر مبنی ہے اور حقیقت میں یہ تصور اس وقت کا ہے جب نواب حکومتیں کرتے تھے جب بادشاہ حکومتیں کرتے تھے مغل وائسرائے تھے صوبیدار تھے ان کے ہاں سے عورتیں اس طرح ڈولیوں سے نکلتی تھیں اور کہار ان کو اٹھاتے تھے اور پھر وہ بے چاری نکلتی تھیں ماں باپ کے گھر سے اور پھر جا کے ان کا جنازہ خاوند کے گھر سے نکلتا تھا اور وہ اِدھر اُدھر چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا کہانیوں کی کتاب میں آپ نے پڑھا ہوگا یہ اُس زمانے کی جاگیرداری کے زمانے کی ساری باتیں ہیں

ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کا فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور پھر ہمیں آج کے دور میں ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ ہمیں بہترین لیکچررز کی ضرورت ہے، پروفیسرز کی ضرورت ہے، ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں پڑھی لکھی خواتین کی ضرورت ہے۔ ہمیں نرسوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں میدان جنگ میں زخمیوں کی خدمت اور تیمار داری کرنے کے لیے ٹرینڈ سٹاف درکار ہے۔ آدھی آبادی کو، ہم کیسے قومی ترقی میں شامل ہونے سے روک سکتے ہیں۔ اگر قومی تعمیر کی دوڑ میں آدھی آبادی کو ہم روک دیں تو نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ نکلے گا کہ ہم جہالت میں ہم مصیبتوں میں مبتلا رہیں۔ ان قوموں کا مقابلہ نہ کرسکیں جو زندگی کی دوڑ میں بہت تیز دوڑ رہی ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی خواتین کو تعلیم دینی ہے انہیں علم کے زیور سے آراستہ کرنا ہے انہیں وہ تمام جدید علوم و فنون سکھانے ہیں جن کی ہماری قوم کو ضرورت ہے، ہمارے ملک کو ضرورت ہے یہ سب کچھ ہو مگر خواتین و حضرات! اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی جو تعلیمات ہیں اسکے جو نظریات ہیں ان کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنا ہے اور اپنی حیا کو اپنی شرم کو اپنی نسوانیت کو ہمیں محفوظ رکھنا ہے ملحوظ رکھنا ہے۔ اس کے تقاضوں کو ہمیں سمجھنا ہے اور کسی کو یہ اجازت نہیں دینی ہے کہ وہ انہیں ایکسپلائٹ کرسکے اور عورت کے ضمن میں کوئی ایسا رویہ اختیار کرسکے۔ جو توہین آمیز رویہ ہو یہ وہ توازن ہے جو اسلام خواتین کے ضمن میں ہمیں عطا کرتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ نئی نسل باوجود اس کے کہ بہت سی سرنگیں لگائی جا رہی ہیں اس کے اندر، ان باتوں سے باخبر ہے اس کی اکثریت ان باتوں کا شعور رکھتی ہے اور اس کے انداز میں اطوار میں وضع قطع میں اکثریت کے ان باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو ہمارے دین نے ہمیں عطا کی ہیں اور ہمارا دین جیسا کہ میں اکثر کہہ چکا ہوں کوئی جامد مذہب نہیں ہے اس نے اصول دیے ہیں اور ان کی تنقید ہر دور میں ہم اپنے تقاضوں کے مطابق اپنی ضروریات کیمطابق حدود میں رہتے ہوئے کرسکتے ہیں۔ آج ہمارا دین یہ چاہتا ہے کہ ہماری نسل خواہ وہ نوجوان لڑکوں پر مشتمل ہو۔ لڑکیوں پر مشتمل ہو علم حاصل کرے اپنے نظریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی تعلیمات

پر ایمان رکھتے ہوئے یقین رکھتے ہوئے اپنے آپ کو تیار کرے. مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے کیونکہ زمانہ بہت تیز رفتار ہے زمانہ بہت تیزی سے سفر کر رہا ہے اور وہ اس قوم کو اجازت نہیں دیتا ٹھہرنے کی جو قوم زندگی کی دوڑ میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کرے. مَیں یہی چاہتا ہوں کہ آپ سے یہ کہوں اور حقیقت ہے مَیں بہت خوش ہوں نوجوان طالبات سے لڑکیوں سے اس لیے کہ مجھے لڑکوں کے کالجوں کا ماحول بھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور لڑکیوں کا بھی. لڑکے ٹھیک ہے ممکن ہے یہ کہتے ہوں کہ ہمارے ہاں زندگی بہت زیادہ ہے اس لیے ہم زیادہ شور مچاتے ہیں اور زیادہ ہمارے ہاں ہوٹنگ ہوتی ہے۔ (تالیاں).

لیکن لڑکیاں. بچیاں بہت باشعور ہیں اور سمجھ دار ہیں. (تالیاں)

البتہ یہ ضرور ہے، اتنا وہ فرق ضرور روا رکھتی ہیں کہ جب پرنسپل تقریر کرے تو زیادہ تالیاں بجاتی ہیں۔ مہمان تقریر کرے تو کم۔ (تالیاں)

خطباتِ جمعہ

① بادشاہی مسجد لاہور میں عید کا خطبہ (عید اور ہم)

② خطبۂ جمعۃ الوداع (قرآن حکیم کا چیلنج)

③ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ۔

④ ووٹ کی شرعی حیثیت

بادشاہی مسجد لاہور میں عید کا خطبہ

"۱۹۷۲ء کی عید الفطر کے موقع پر میں نے لاہور کی بادشاہی مسجد میں خطبہ دیا یہ وقت وہ تھا جب اتحاد ملی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے طرح طرح کی بولیاں بولی جارہی تھیں۔ چار قومیتوں کا فتنہ تیزی سے پھیلایا جارہا تھا۔ رمضان کے پس منظر میں لاکھوں کے اس اجتماع عید میں اتحاد کا پیغام دیا گیا ہے۔"

عزیز بھائیو اور بزرگو! میں بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالقادر آزاد اور محکمہ اوقاف اور اپنے لاہور کے دوستوں کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس عظیم تقریب سعید پر یہاں آنے کی دعوت دی اور اس طرح مجھے اپنا چودہ پندرہ سال کا پرانا طریقہ جاری رکھنے کا موقع دیا۔ میں لاہور میں آپ کے لیے نیا نہیں ہوں۔ چودہ پندرہ سال سے میں لاہور میں ہی نماز عید پڑھاتا رہا ہوں۔ درمیان میں صرف ایک سال ایسا آیا جب میں جیل میں تھا۔ اور نماز عید کے اجتماع میں حاضر ہونے سے قاصر رہا۔ لیکن اس دفعہ میں سوچ رہا تھا کہ میرے دوست یہ نہ سمجھیں کہ وزیر ہونے کے بعد اب یہ معاملات مجھ سے چھوٹ گئے ہیں۔ ہم جس مقصد کو لے کر چلے ہیں وہ مساوات محمدیؐ کا مقصد ہے۔ اس کے اندر حقیقی نمونہ جو اس ملک میں قائم ہونا چاہیئے وہ یہی ہے جو اس مسجد میں نظر آتا ہے۔ جس طرح یہاں گورنر بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ وزرائے کرام بھی یہاں آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ اسی طرح امیر اور غریب، شاہ و گدا سب یہاں شانہ بشانہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونگے۔ مساوات کا یہ نمونہ جو مسجد میں نظر آتا ہے۔ اس مساوات کو مسجد

کے باہر بھی کام کرنا چاہیئے تاکہ بڑے اور چھوٹے کا تفرقہ ختم ہو جائے تاکہ لوگوں کے درمیان جو اونچ نیچ پیدا ہو گئی ہے وہ ختم ہو جائے تاکہ اور سب لوگ بھی اس مساوات محمدی کے نام سے فیض یاب ہوں جسے لیکر حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ دوستو اب کے آپ جانتے ہیں کہ نماز عید ایک ایسے ماحول میں ہو رہی ہے۔ جو پاکستان کے پچیس سال میں کبھی دیکھا نہیں گیا۔ اب کے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مہینہ جو تین ماہ بعد آنا تھا۔ وہ تین ماہ پہلے آگیا ہے۔ جیسے شوال محرم بن گیا ہے۔ جیسے اس عید کی خوشیوں میں شہیدوں کے خون کی سرخی رچ بس گئی ہے۔ اب کے ہم عید ایسے ماحول میں منا رہے ہیں جبکہ ہزاروں یتیموں اور بیواؤں کی آہیں اس فضا کے اندر ہمیں ایسے محسوس ہوتی ہیں جیسے سوگواری پھیلاتی چلی جا رہی ہیں۔ اب کے ایسے ماحول میں ہم عید منا رہے ہیں جبکہ ہمارے ایک لاکھ کے قریب قیدی بھائی دشمن کے ملک میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ عید پہلے کبھی نہیں آئی۔ اس عید کے اندر محرم کا رنگ موجود ہے۔ وہ چاند جس کسی نے دیکھا ہوگا جو اب کے طلوع ہوا ہے اس چاند کے اردگرد بہت سرخی تھی اور وہ سرخی حقیقت میں شہیدوں کے خون کی سرخی تھی۔ اس لیے اس عید کے موقع پر خاص طور پر ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ عید ہم سے کیا کہہ رہی ہے۔ وہ مبارک مہینہ رمضان کا جو ہم گزار کر آئے ہیں وہ ہم سے کیا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور وہ روزے جو اللہ نے ہمیں رکھنے کی توفیق عطا کی ہے ان کا کیا پیغام ہے کہ جس کے بعد آج ہم شکرانے کا دوگانہ بجا لائے۔ سب سے پہلے تو آپ یہ دیکھیں کہ دنیا کی دوسری قوموں میں خوشی کے دن آتے ہیں۔ دنیا کی دوسری قوموں میں بھی تقریبیں ہوتی ہیں دنیا کی دوسری قوموں میں بھی تہوار ہوتے ہیں لیکن ان تہواروں میں میلے ٹھیلے ہوتے ہیں۔ گانے بجانے ہوتے ہیں۔ ناچ رنگ ہوتا ہے۔ اس عید کے اندر وہ بات آپ کو نہیں ملے گی جو اسلام کی عید میں نظر آتی ہے۔ آپ آج کے دن کو دیکھیں۔ اس دن کے اندر گھنٹے، منٹ، سیکنڈ عام دنوں سے زیادہ نہیں۔ اس دن کے اندر وہ کون سی چیز ہے جو اس کو باقی دنوں سے ممیز کرتی ہے، نمایاں کرتی ہے ممتاز کرتی ہے۔ وہ صرف یہ چیز ہے کہ باقی دنوں میں پانچ نمازیں ہیں لیکن اس دن میں چھ نمازیں

ہیں۔ آج کے دن آپ چھ نمازیں ادا کر رہے ہیں جبکہ عام دنوں میں آپ صرف پانچ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ اس ایک نماز کے اضافے نے اس کو عید بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے خوشی اور مسرت کے اظہار کی بہترین صورت یہی ہے کہ اللہ کے روبرو ہم جس دن دو نفل زیادہ پڑھ لیتے ہیں۔ جس دن ایک نماز زیادہ پڑھ لیتے ہیں وہ ہمارے لیے عید بن جاتا ہے۔ اس سے آپ اس پیغام کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو رمضان المبارک نے ہم کو عطا کیا ہے۔ بلاشبہ رمضان المبارک کے روزوں کے علاوہ بھی بہت سی عبادتیں ہیں۔ نماز ہے، حج ہے، زکوٰۃ ہے، توحید کا عقیدہ ہے۔ لیکن روزہ کی صورت میں ایک ایسی عبادت ہم کرتے ہیں جس کے اندر باقی چار عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ اس عبادت میں نماز بھی شامل ہے۔ اس عبادت میں زکوٰۃ بھی شامل ہے۔ اس میں حج کی روح بھی شامل ہے۔ اس میں توحید کی خصوصیت بھی شامل ہے۔ آپ روزہ کے اندر تراویح کی نماز زائد پڑھتے ہیں۔ اس طرح نماز کا جزو بھی روزے کے اندر آجاتا ہے۔ زکوٰۃ کی روح یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ اور روزہ وہ سخاوت ہے جو سارے مہینے میں عام رہتی ہے۔ تمام دنوں میں عام رہتی ہے۔ لیکن روزے میں آپ کی سخاوت اس طرح برستی ہے جیسے بارش برستی ہے۔ پھر اس میں فطرانہ ہے کہ صدقہ فطر کے بغیر آدمی کی عید قبول نہیں ہوتی، روزے قبول نہیں ہوتے۔ اس طرح اس روزے کی عبادت کے اندر زکوٰۃ بھی شامل ہے۔

پھر حج کی روح یہ ہے کہ اس میں بہت سی پابندیاں ہیں۔ بہت سے حلال حرام بن جاتے ہیں۔ بہت سی جائز چیزیں ناجائز بن جاتی ہیں۔ اور روزے کے اندر بھی یہی کیفیت ہے کہ اس کے اندر بہت سی پابندیاں آدمی کو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ بہت سی حدود وغیرہ عائد کرنی پڑتی ہیں۔ وقتی طور پر بہت سے حلال حرام بن جاتے ہیں۔ پانی جیسی نعمت بھی انسان اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔ اس کے بعد توحید کو دیکھیے۔ توحید کے عقیدے کی جو روح روزے میں پائی جاتی ہے۔ وہ کسی عبادت میں نہیں پائی جاتی۔ ممکن ہے کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہو۔ لیکن وہ لوگوں کو دکھا رہا ہو۔ ممکن ہے ایک شخص زکوٰۃ دے رہا ہو لیکن وہ یہ چاہتا

ہو کہ اس طرح حاجی کہلائے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص حج کرنے جارہا ہو لیکن اس کے دل میں حاجی کہلانے کا شوق ہو۔ لیکن روزہ وہ عبادت ہے جس کا ریار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس کا دکھلاوے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک آدمی اگر بظاہر روزے سے ہو۔ اور اللہ کا خوف اور ڈر نہ ہو۔ گرمی کے موسم میں غسل خانے میں جاکر جہاں کوئی اس کو نہیں دیکھتا پانی پی سکتا ہے۔ لیکن کیا سبب ہے کہ روزہ دار ایک کمرے میں ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ اس کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے رکھے ہیں۔ پھل رکھا ہے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ اس کا ہاتھ نہیں بڑھتا۔ اور وہ کوئی چیز اٹھا کر منہ میں نہیں ڈالتا۔ یہ گویا توحید کی حقیقت ہے۔ جو اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے توحید کی روح ہے جو اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اس طرح روزہ تمام عبادتوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ روزے کے اندر توحید بھی ہے۔ روزے کے اندر نماز بھی ہے۔ روزے کے اندر حج بھی ہے۔ روزے کے اندر زکوٰۃ بھی ہے۔ یہ چاروں عبادتیں اس کے اندر شامل ہیں۔ تو یہ ہے روزہ جسے ایک مہینہ رکھنے کے بعد آج ہم اللہ کے سامنے حاضر ہوئے تاکہ ہم شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا سر اس کے سامنے سجدے میں رکھ دیں اور اپنے رب کا دوگانہ ادا کریں۔ دوستو اور بزرگو روزے کا یہی وہ پہلو ہے۔ اس عبادت کی یہی وہ روح ہے۔ اس عبادت کا یہی وہ فرض ہے کہ جس کی وجہ سے مسلمان خوشی کا اظہار کرتے ہیں مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پھر آج عید کے دن ہمیں ایک اور بات پر بھی غور کرنا ہے۔ ایک اور بات پر بھی نظر ڈالنی ہے کہ آج جب ہم عید منا رہے ہیں رمضان المبارک نے ہمیں پیغام کیا دیا ہے۔ روزے ہم سے کیا کہہ گئے ہیں۔ یہ عید ہم سے کیا تقاضا کرتی ہے۔ آج کی نماز عید کے اندر ہمیں وہ سبق یاد رکھنا ہے جو ماہ رمضان المبارک نے ہم کو عطا کیا ہے اور وہ سبق اتحاد اور اتفاق کا سبق ہے۔ رمضان میں مسلسل ہم نے یہ ٹریننگ لی کہ پوری ملت پوری قوم ایک رنگ میں رنگی گئی۔ ایک وقت میں موذن نے اذان دی۔ اور ہم نے روزہ کھولا۔ ایک وقت میں سحری ہوئی۔ اور ہم سحری کے لیے بیدار ہو گئے۔ ایک وقت میں موذن نے

صدا دی۔ ہمیں پکارا۔ اور ہم تراویح کے لیے چلے گئے۔ ایک وقت میں ہم نے روزہ رکھا۔ ایک وقت میں سحری ہوئی۔ ایک وقت میں افطاری ہوئی۔ اُس طرح پوری ملت ایک مہینے اتحاد اور اتفاق کے رنگ میں رنگی گئی۔ اور اس کے اندر وحدت پیدا ہوئی۔ کتنے افسوس کی بات ہوگی اگر ایک مہینہ مسلسل اتحاد اور اتفاق کی تربیت حاصل کرنے کے بعد ہم آج اتحاد کو چھوڑ دیں۔ ہم آج اتفاق کو چھوڑ دیں۔ اور آج پھر ہمارے درمیان دوری پیدا ہو جائے۔ بیگانگی پیدا ہو جائے۔ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے لگیں۔ ہم ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگیں۔ ہم اپنے رہنما کے بارے میں ہم اپنی حکومت کے بارے میں۔ ہم اپنی فوج کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں اور ہم افواہوں کے چکر میں آ جائیں۔ اور ایک دوسرے کا گوشت ہم پر حلال ہو جائے۔ ہم ایک دوسرے کا گوشت کھانے لگیں۔ اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے لگیں۔ اور اس طرح اتحاد اور اتفاق کا رشتہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس روزے کی عبادت نے یہ بتایا کہ ہم ایک قوم ہیں۔ ہم خواہ بلوچستان میں رہتے ہوں۔ خواہ سندھ میں رہتے ہوں، خواہ پنجاب میں رہتے ہوں، خواہ ہم سرحد میں رہتے ہوں۔ ہم سب ایک قوم ہیں۔ اس لیے کہ عقیدہ قوموں کی تشکیل کرتا ہے۔ فکر قوموں کی تعمیر کرتی ہے اور ایمان قوموں کی تکمیل کرتا ہے۔ قائد اعظم نے جب پاکستان کی جدوجہد کی تھی تو اس عقیدے کی بنیاد پر کی تھی۔ اسلام اور ایمان کی بنیاد پر کی تھی۔ اور یہ بتایا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے۔ اور جو اسلام کو نہیں مانتا وہ ایک علیحدہ قوم ہے۔ بدقسمتی سے آج جبکہ ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں جبکہ ہمارا جغرافیہ بدل چکا ہے۔ جبکہ آدھے سے زیادہ ملک ہمارے قبضے سے نکل چکا ہے۔ جبکہ ہمارا جسد ملت لہولہان ہو چکا ہے۔ جبکہ ایک بازو ہم سے کٹ چکا ہے۔ جبکہ ایک لاکھ کے قریب قیدی دشمن کی قید میں ہیں۔ آج پھر اس ملک کے اندر بعض لوگ یہ نعرہ اچھال رہے ہیں کہ ہم ایک قوم نہیں ہیں۔ بلکہ ہم چار قومیں ہیں۔ ہم پانچ قومیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے قوم کیسے بنتی ہے۔ قوم اگر زبان سے بنتی ہے تو ایک صوبہ بلوچستان کے اندر چھ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک کوئٹہ شہر کے اندر اردو بولنے والے ہیں۔ پنجابی بولنے والے ہیں۔ فارسی بولنے والے ہیں۔ سارے صوبہ بلوچستان کے اندر بلوچی بولنے والے

ہیں۔ پشتو بولنے والے پٹھان ہیں، بروہی بولنے والے ہیں۔ اور لاچی زبان بولنے والے ہیں۔ اگر زبان کی وجہ سے قوم بنتی ہے تو پھر تو چھ صوبوں میں اکیلا بلوچستان تقسیم ہو جائے گا۔ اور ایک صوبے کی وحدت چھ ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔ اگر محض رنگت سے قوم بنتی ہے تو بلال حبشی کا رنگ وہ نہ تھا جو عرب کے مسلمانوں کا تھا۔ عرب کے مسلمانوں کا رنگ، تو ویسا ہی تھا جیسا ابولہب کا تھا، جیسا ابو جہل کا تھا۔ لیکن رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے خاندان میں اگر ہے تو سلمان فارسی ہے۔ جو فارس کا رہنے والا ہے۔ لیکن جو میرے کلمہ پر ایمان لا چکا ہے۔ جو میرے عقیدے پر ایمان لا چکا ہے۔ میری قوم میں ابولہب نہیں ہے جو میرا چچا ہے میری قوم میں سے ابو جہل نہیں ہے جو قریش کا سردار ہے۔ تو قومیں رنگ سے نہیں بنتیں۔ قومیں زبان سے نہیں بنتیں۔ قومیں نسل سے نہیں بنتیں۔ بلکہ قوم عقیدے سے بنتی ہے۔ قوم فکر سے بنتی ہے۔ قوم ایمان سے بنتی ہے۔ اور قوم ہماری پاکستانی قوم لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پر ایمان لانے کے بعد بنتی ہے۔ اس لیے دوستو آج جبکہ روزوں کی عبادت کے بعد ہم یہاں جمع ہیں۔ اور روزوں نے ہم میں وحدت پیدا کی ہے۔ اتحاد کا رنگ ہم کو دکھایا ہے۔ ایک وقت میں سونے اور جاگنے کی تربیت دی ہے۔ ایک وقت میں کھانے اور ایک وقت میں کھانا بند کرنے کی تربیت دی ہے۔ ایک وقت میں تراویح کی نماز کیلیے دست بستہ ہونے کی دعوت دی ہے۔ اس اتحاد کو ہمیں سال کے باقی گیارہ مہینوں میں برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارے اتحاد کو جو چیز پارہ پارہ کر رہی ہے۔ وہ دشمن کی پھیلائی ہوئی افواہیں ہیں۔ آج بدقسمتی ہے کہ ہم ایک بات سنتے ہیں اور تحقیق نہیں کرتے کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ اور اس کو دوسرے بھائیوں تک پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ ایک بات سنے اور اسے بغیر تحقیق کے پھیلانا شروع کر دے۔ لیکن یہاں رات دن افواہوں کا بازار گرم ہے۔ یہاں فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں افواہوں کی۔ یہاں اپنے رہنماؤں کو بدنام کرنے کے لیے غیر ملکی اشارے پر افواہیں چلائی جاتی ہیں تاکہ ان کو اپنی قوم کی نظروں سے گرایا جائے تاکہ ان کا اعتماد

مجروح کیا جائے تاکہ اس قوم کا کوئی لیڈر باقی نہ رہنے دیا جائے جس کے اوپر اس قوم کو اعتماد ہو تاکہ یہ قوم ایسا جہاز بن جائے جس کا کوئی لنگر نہ ہو۔ ایک ایسی کشتی بن جائے جس کے بادبان نہ ہوں۔ آپ کو اتحاد اور اتفاق کے اندر رخنہ اندازی کرنے والی افواہوں کا سد باب کرنا ہے۔ دشمن کی چالوں سے باخبر ہونا ہے۔ اور آج کے دن آپ کو یہ بھی عہد کرنا ہے کہ اگرچہ ہمارا جغرافیہ بدل گیا ہے۔ ملک کا جغرافیہ بدل گیا ہے۔ لیکن ہماری تاریخ نہیں بدلی ہے۔ ہم وہی تاریخ رکھتے ہیں کہ جو ہمارے بزرگوں کی تاریخ تھی جو محمد بن قاسم کی تاریخ تھی۔ جو طارق ابن زیاد کی تاریخ تھی۔ ہم وہی تاریخ رکھتے ہیں کہ جو جنگ بدر اور احد میں دہرائی گئی۔ اور آج بھی ہم اس تاریخ کو دہرانے کا عزم رکھتے ہیں۔ آج بھی ہم ایک ایسی قوم بن سکتے ہیں کہ دنیا کی دوسری قوموں کے لیے صحیح نقش قدم چھوڑ سکیں۔ اس لیے آج کے دن اس عید کے دن جس میں سوگواری کا بھی پہلو ہے جس میں غم اور مسرت باہم گلے ملے ہوئے ہیں۔ جس کے اندر خوشی بھی ہے۔ جس کے اندر رنج بھی ہے۔ جس کے اندر ہمارے قیدیوں کی گرفتاری کا غم بھی شامل ہے۔ جس کے اندر ایک لاکھ سوگوار خاندانوں کی۔ ان کی بچیوں کی، ان کی بیویوں کی۔ ان کی بہنوں کی آہیں بھی شامل ہیں۔ اس عید کے دن ہمیں یہ عہد کرنا ہے کہ ہم پاکستان کی عظمت رفتہ کو واپس لائیں گے۔ ہم پاکستان کو مضبوط بنائیں گے، متحد بنائیں گے۔ پاکستان کو اسلامی مساوات کا گہوارہ بنائیں گے۔ یہاں سے ظلم و ستم کا خاتمہ کریں گے۔ یہاں سے غربت کا خاتمہ کرینگے۔ یہاں سے ہم جہالت کا خاتمہ کریں گے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے جس حکومت کو چنا ہے وہ اس مقصد کے لیے سرگرم کار ہے۔ مشکلیں بہت ہیں، مصیبتیں بہت ہیں، تکلیفیں بہت ہیں اور کاوشیں بہت ہیں۔ لیکن ان رکاوٹوں کو ایک ایک کرکے دور کیا جا رہا ہے۔ اور انشاء اللہ وہ وقت آئے گا جب پاکستان ایک مضبوط قلعہ بنے گا۔ یہاں مساوات محمدی کی بہار جلوہ فگن ہوگی۔ اور مشرقی پاکستان کے بھائی بھی دیکھیں گے کہ ان سے غلطی ہوئی۔ وہ بچھڑے ہوئے، بھولے ہوئے، بھٹکے ہوئے بھائی بھی محسوس کریں گے کہ ان سے دشمنوں نے دھوکہ کیا۔ وہ دن آئے گا جب بچھڑے ہوئے، بچھڑے ہوئے بھائی گلے مل جائیں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کب ہوگا۔ لیکن میں یقین رکھتا ہوں

ایسا ضرور ہو گا. بشرطیکہ ہم نے اپنے بھولے ہوئے، بھٹکے ہوئے، بچھڑے ہوئے بھائیوں سے نفرت نہ کی. ہم نے ان سے محبت کی، ہم نے انہیں گلے سے لگایا۔ اس لیے کہ مریض سے نفرت نہیں کی جاتی. اس سے ہمدردی کی جاتی ہے. اس کے مرض سے نفرت کی جاتی ہے۔ اس کی بیماری سے نفرت کی جاتی ہے. لیکن مریض سے نفرت نہیں کی جاتی. آج کے دن ہمیں یہ بھی عہد کرنا ہے کہ ہمیں پاکستان کو مضبوط بنانا ہے. پاکستان کو متحد رکھنا ہے. پاکستان کو ہمیں اسلامی مساوات کا گہوارا بنانا ہے. اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آج کے دن ہم نے یہ عہد کیا. آج کے دن ہم نے اتحاد کی لڑی اپنے ہاتھ میں تھامنے کا عہد کیا تو انشاء اللہ وہ وقت آئے گا کہ جب پاکستان دنیا کی عظیم ترین مملکتوں میں شامل ہو گا. اور دنیا کے بھولے بھٹکے لوگوں کو راستہ دکھائے گا میں دعا کرتا ہوں اور آپ بھی دعا کریں کہ اللہ تبارک تعالٰے ہمیں اس سبق پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

خطبۂ جمعۃ الوداع

"۱۹۶۶ء میں جامع مسجد شاہ عالم مارکیٹ لاہور کے دورِ خطابت کا
خطبۂ جمعۃ الوداع"

حضرات خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں رمضان المبارک کے مہینے میں روزہ رکھنے کی توفیق بخشی اور جمعۃ الوداع تک پہنچا دیا۔ ہماری دعا ہے کہ وہ خدائے برتر و بالا ہمیں اس بڑے افطار تک بھی پہنچا دے۔ جسے عرف عام میں عید الفطر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے اس بابرکت مہینے میں خدائی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی اپنی سی کوشش کی۔

اس ماہ میں ایک ایسی رات شامل ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم نازل فرمایا۔ ہم اسے لیلۃ القدر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ قدر والی رات کب آتی ہے۔ اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ علماء محققین کی رائے ہے کہ ستائیس رمضان کی رات لیلۃ القدر ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اس سلسلے میں ابہام اس لیے رکھا گیا ہے۔ تاکہ مسلمان رمضان کی تیسری دھائی میں ہر طاق رات کو شب قدر سمجھتے ہوئے خوب خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کریں۔ اگر

کسی ایک رات کے متعلق حکم آجاتا تو لوگ اسی رات میں عبادت کرتے۔ اور دوسری پر کما حقہ توجہ نہ ہو سکتی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں تلاش و جستجو کی وجہ سے زیادہ عرصے تک عبادت میں مشغول رکھنے کا ایک بہانہ مہیا کر دیا۔

خدائے مطلق کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ جب بھی کسی پیغمبر کو معجزات عطا کرنے لگتا ہے تو اس زمانے کے حالات کے مطابق معجزات بھیجتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا بڑا زور تھا۔ چنانچہ آپ کو عصائے موسیٰ عطا ہوا۔ جس سے انہوں نے بڑے بڑے نامور جادوگروں کو نیچا دکھایا۔ اور آخر انہیں خدائے واحد کا نام لیوا بنا کر چھوڑا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت میں طبابت کا بڑا شہرہ تھا۔ چنانچہ آپ کو ایسا معجزہ دیا گیا کہ تمام معروف طبیب ان کا لوہا مان گئے۔ ان کو یہ طاقت دی گئی تھی کہ وہ خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصاحت و بلاغت، منطق و حکمت اور علوم و فنون کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ آپ کو اپنے ماحول کے مطابق ایسا معجزہ عطا ہوا۔ جس نے مانے ہوئے فصیح و بلیغ شاعروں اور ادیبوں اور شہرہ آفاق علماء و فضلا کے منہ بند کر کے رکھ دیئے۔ ویسے تو آپ کے بے شمار معجزات ہیں۔ اور کتب حدیث و سیر کی کتابوں میں انکی تعداد تین ہزار لیکن عظیم ترین اور زندہ جاوید معجزہ قرآن حکیم جیسا جامع العلوم کلام ہے جو قیامت تک کے لیے ساری دنیا کو ایک کھلا چیلنج ہے۔ مگر کوئی اس کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم

ہندوستان میں جب آریہ سماجی تحریک زوروں پر تھی تو ان دنوں آریہ سماج تحریک کے بانی پنڈت دیانند نے ایک مسلمان عالم سے "معجزہ" پر ایک مناظرہ کیا۔ پنڈت جی نے کہا کہ معجزہ کبھی رونما نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غیر فطری امور تصور میں نہیں آ سکتے۔ پھر اپنے حریف مسلمان عالم دین کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر تم اس مجلس میں کوئی معجزہ دکھا دو تو میں مان جاؤں گا۔ عالم دین فوراً اٹھے اور قرآن مجید ہاتھ میں لے کر فرمایا۔

"یہ معجزہ ہے اور میں اسے اس وقت اہل مجلس کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا معجزہ اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے قیامت تک اتمام حجت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کے کفار کو چیلنج کیا۔ اور کہا کہ تم کتاب اللہ کی ایک سورت ہی کا جواب پیدا کر دکھاؤ۔ پھر خود ہی فرمایا کہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے۔

و ان کنتم فی ریب — اور اگر تم شک میں ہو اس کتاب کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسا ایک ٹکڑا ہی پیش کر دکھاؤ۔ اور (اس مقصد کے لیے) اللہ سے ورے اپنے تمام حمائتیوں کو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو۔ اور یقیناً ایسا نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔" (سورہ بقرہ)

اس چیلنج میں زورِ بیان انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ پہلے مقابلے کی دعوت دی کہ ایسا کر دکھاؤ۔ پھر غیرت پر یہ کہہ کر تازیانہ لگایا کہ تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ لفظ و معنی دونوں کے اعتبار سے کسی عظیم ترین عربی دان کو کبھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اس کی مثال لوگوں کے سامنے لے آئے۔ آج شام میں اعلیٰ پائے کے مسیحی عربی فضلاؒ موجود ہیں۔ "المنجد" جیسی لغت انہی کا ادبی و علمی کارنامہ ہے۔ لیکن آج سے لیکر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حیات تک نظر دوڑا لیجیئے۔ آپ کو ایک بھی مثال ایسی نہ ملے گی کہ کسی غیر مسلم عالم نے قرآن پاک کے اس چیلنج کا جواب دینے کی جرأت کی ہو۔

ایک بار حضورؐ کے زمانے میں عربی زبان کے ایک بہت بڑے فصیح و بلیغ شاعر لبید نے ایک نظم لکھی۔ جو بس آپ ہی اپنا جواب تھی۔ لوگوں نے کہا کہ اس شہ پارے کو خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکا دینا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کسی مسلمان نے ایک آیت قرآنی بھی اسکے ساتھ آویزاں کر دی۔ لبید نے جب یہ آیت کریمہ پڑھی تو کہنے لگا کہ میری نظم اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ کہتے ہی اس نے کلمہ پڑھا۔ اور ایمان لے آیا۔ مشہور معاندِ اسلام جارج سیل نے اپنے ترجمہ قرآن میں لکھا ہے کہ مسیح کا معجزہ احیائے موت مسلمانوں کے قرآن کی فصاحت و

بلاغت کے سامنے ہیچ ہے۔

قلم کی مثال دوسری کتب آسمانی کے پیروکاروں نے آج تک کبھی نہیں کہا کہ ان کی کتابوں میں درج الفاظ وہی ہیں جو اللہ تعالٰے نے نازل کیے۔ بلکہ ان کے اپنے قول کے مطابق وہ وحی کا مفہوم ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کا ایمان یہ ہے کہ قرآن حکیم کا لفظ لفظ اور شوشہ شوشہ منزل من اللہ ہے۔ اور معنوی اعتبار سے ہی نہیں لفظی اعتبار سے بھی یہ خدا کا کلام ہے۔ جس طرح قلم لکھنے والے کے ہاتھ میں اس کے مفہوم ہی کو نہیں۔ اس کے دل و دماغ میں آئے لفظ کو بھی صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا دست قدرت کا قلم بن کر الہامی الفاظ کو بھی ان کی حقیقی صورت میں بنی نوع انسان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ الفاظ بظاہر دہن رسالت سے ادا ہوتے تھے۔ مگر انہیں آپ کی زبان پر جاری کرنے والی خود پروردگار عالم کی ذات تھی۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

بائبل پر نظر ڈالیے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ فی الاصل عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی۔ پھر یونانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ رومی زبان میں منتقل ہوئی۔ لیکن جس زبان میں وہ بھیجی گئی تھی۔ اس کا ایک بھی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اقرار خود عیسائی بھی کرتے ہیں۔ اس کے استناد کا عالم یہ ہے کہ فقط توریت میں ۳۵ مقامات پر "آج تک" کے الفاظ درج ہیں جیسے :۔ "آج تک اس کی قبر فلاں مقام پر موجود ہے"۔

حالانکہ اس زمانے میں آج تک کے یہ الفاظ پڑھنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ آج اس مذکورہ قبر کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ اب ایک ایسی کتاب کے بارے میں کیسے مان لیا جائے کہ یہ وہی خدا کی نازل کردہ توریت ہے۔

ان ستم ظریفوں نے اپنی کتابوں میں اپنے ہی انبیاء کے خلاف وہ بہتان تراشے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کسی نبی کے متعلق لکھ دیا کہ وہ شراب نوشی کرتے تھے۔ تو کسی کو العیاذ باللہ اپنی

ہی بیٹیوں کے ساتھ ملوث ٹھہرایا۔ حد یہ ہے کہ توحید کا سبق دینے والی یہ ہستیاں کفر و شرک کے الزامات تک سے نہیں بچ سکیں۔ آج جب ہم قرآن حکیم میں پڑھتے ہیں۔

"وما کفر سلیمٰن سلیمان نے کفر نہیں کیا۔"

تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ یہ بھی کوئی بیان کرنے کی بات تھی کہ فلاں نبی نے کفر نہیں کیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کہا جائے کہ سورج نے اندھیرا نہیں پھیلایا، یا پھول نے بدبو نہیں پھیلائی۔ مگر جب ہم بائبل کو دیکھتے ہیں تو یہ عقدہ کھلتا ہے۔ اس میں ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر یہ تہمت جڑی کہ انہوں نے آخری وقت میں اپنی بیویوں کے کہنے سے شرک کیا تھا۔ اسی لیے قرآن مجید کو کہنا پڑا کہ:

"وما کفر سلیمٰن سلیمان نے کفر نہیں کیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر قرآن پاک نازل نہ ہوتا تو انبیاء کرام کی سیرتیں اسی طرح داغدار رہتیں اور ان کی تقدیس جھوٹ اور اتہامات کے دبیز پردوں میں دب کر رہ جاتی۔ اس قرآن کا اور قرآن لانے والے کا یہ احسان ایسا ہے کہ خود عیسائی اور یہودی بھی اس کے بارے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ قرآن کا احسان جملہ انبیاء کرام پر بھی ہے۔ اور ان تمام آسمانی کتابوں پر بھی جن میں کی ہوئی تحریفات کے پردے قرآن نے چاک کیے ہیں۔ اور اس طرح انسانیت کو حقائق کی اصل روشنی عطا فرمائی ہے۔

رہا قرآن تو اس کے متعلق خود منصف مزاج غیر مسلم اسکالر یہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے۔ ایک غیر مسلم فاضل نے کیا ہی عمدہ بات کہی ہے کہ:

"اگر قرآن کو بدلا جاتا تو سب سے پہلے تبت یدا ابی لھب و تب کی سورۃ تبدیل ہوتی۔ اور اس میں ابولہب کی بجائے ابوجہل کا نام داخل کر دیا جاتا۔ کیونکہ ابولہب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ اور اگر پاس قرابت سے اس کے بجائے ابوجہل کا نام لے لیا جاتا تو مضمون کے اعتبار سے سے اس میں کوئی خاص فرق

واقع نہ ہوتا۔

تدوین قرآن قرآن میں تحریف ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ جب خود اللہ تبارک وتعالےٰ نے یہ ذمہ لے لیا کہ:۔

ان علینا جمعہ وقرانہ ثم ان علینا بیانہ

"اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارا کام ہے۔ پھر اس کی تشریح و توضیح بھی ہماری ذمہ داری ہے۔"

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی کے زمانے میں قرآن جمع ہوا۔ اس لیے انہیں "جامع القرآن" کہا جاتا ہے۔ وہ "جامع النّاس علی القرآن" یا "جامع الناس علی مصحف واحد" ضرور ہیں۔ مگر جامع القرآن نہیں۔ جامع القرآن تو خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ جس نے وحی کی رہنمائی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں پورا قرآن لکھا دیا۔ چالیس سے زیادہ کاتبان وحی اس کام پر مامور رہے۔ جو آیات قرآنی کو پتھر، چمڑے اور اونٹ کے شانے کی ہڈی پر لکھتے تھے۔ کاغذ کا لکھا پانی سے دھل جاتا تھا۔ مگر یہ تحریریں زیادہ پائدار تھیں۔ ادھر یہ لکھا جاتا تھا۔ اور ادھر سینکڑوں صحابہ اسے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پورا قرآن دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سنایا۔ اور ظاہر ہے کسی ترتیب سے سنایا۔ سورتوں اور آیات کی یہی ترتیب صحابہ کو بھی معلوم تھی۔ حضورؐ کے زمانے میں قرآن الگ الگ سورتوں کی صورت میں تھا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جنگ یمامہ کے موقع پر متعدد حفاظ شہید ہو گئے تو مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس کے یاد رکھنے والے اسی طرح دنیا سے رخصت ہوتے رہے تو آئندہ نسلوں تک قرآن کیسے پہنچے گا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان الگ الگ سورتوں کو (جنہیں مصاحف کہا جاتا ہے) ایک تقطیع اور اندازہ میں لکھ کر مجلد کرا دیا۔ اور یہ نسخہ ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس رکھ دیا گیا۔

اہل عرب قرآن کو اپنے اپنے لب ولہجہ کے مطابق پڑھتے تھے۔ اور یہ فرق جغرافیائی عامل

کے سبب پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ مثلاً کوئی حتیٰ حین کہتا۔ تو کوئی عتیٰ عین وغیرہ۔ ایک بار ایک صحابی کسی جنگ سے واپس آئے تو بتایا کہ فلاں علاقے کے لہجے میں اگر تلاوت قرآن نہ کی جائے تو وہ جھگڑنے لگتے ہیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ام المومنین کے ہاں سے وہ نسخہ منگا کر قریشی لب ولہجہ میں (کہ اسی میں یہ نازل ہوا تھا،) اس کی کئی نقلیں تیار کرائیں۔ اور ایک ایک نقل ہر چھاؤنی اور بڑے مرکز میں بھجوا کر یہ حکم جاری کیا کہ تمام قبائل ان نسخوں کے مطابق آیات کا تلفظ کریں۔ اور ان کے علاوہ اپنے ہاں کے لب ولہجہ میں تیار شدہ تمام نسخے ضائع کر دیئے جائیں۔

یہ ہے حضرت عثمان کا کارنامہ جمع قرآن۔ وگرنہ جہاں تک تحریری اور زبانی صورت میں اس کی حفاظت کا تعلق تھا۔ اس کا حق تو عہد رسالت ہی میں پورا کر دیا گیا تھا۔

تلاوت و تفسیر اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جمع کرنیکا ہی ذمہ نہیں لیا۔ یہ بھی فرمایا کہ اسکا پڑھنا پڑھانا۔ اور اس کی تبلیغ بھی ہمارے ذمہ ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے اس عہد زوال میں بھی روئے زمین پر قرآن سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب موجود نہیں۔ کروڑوں بندگانِ خدا روزانہ پانچ وقت اپنی نمازوں میں اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ ابھی رمضان کے مبارک مہینے میں ایک ایک مسجد میں پورا قرآن سنایا گیا ہے۔ اس گئے گزرے دور میں بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفاظ قرآن موجود ہیں۔ حالانکہ آج قرآن یاد کرنے پر کوئی مادی ترقی موقوف نہیں۔ لیکن جس زمانے میں مسلمانوں کے ہاں قرآن کا علم اور حفظ اصل اہمیت رکھتا ہوگا۔ جب اس کی بنیاد پر حکومتیں چلتی ہوں گی تو اس زمانے میں حفظ قرآن کا کیا اہتمام ہوگا۔ آج اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

کوئی اس سے یہ نہ سمجھے کہ اس میں ہمارے حافظہ کی خوبی کا تعلق ہے۔ جس کسی کو اپنے حافظے پر ناز ہو وہ قرآن کے علاوہ کوئی سی اتنی ضخیم کتاب یاد کر کے دیکھ لے۔ اس پر حقیقت روشن ہو جائے گی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ غیر معمولی حفظ واہتمام قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ:۔

"ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔

تو یہ کمال ہمارے حافظہ کا نہیں۔ یہ خود اس کلام الٰہی کا اعجاز ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل ۔۔۔ نسیم صبح تیری مہربانی

تلاوت کے بعد قرآن کی تشریح و تفسیر میں بھی معجزاتی پہلو نمایاں ہیں۔ صحابہ کرام نے حضورؐ سے اس کی تفسیر سنی۔ حضورؐ کی پاک زندگی میں اس کی عملی تفسیر کا مشاہدہ کیا۔ پھر اسے نسلوں تک پہنچایا۔ سب سے پہلے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے کتابی صورت میں تفسیر قلم بند کی۔ ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین سے لیکر آج تک اتنے مفسر ہو گزرے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ تفسیر قرآن کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ ہر دور میں ایسے علماء حق پیدا ہوتے رہیں گے جو رائج الوقت زبان اور اسالیب کے مطابق قرآن سے پیش آمدہ مشکلات کا حل پیش کریں گے۔ اور قرآنی معارف کے بے پایاں سمندر سے موتی نکال نکال کر دنیا والوں پر نچھاور کرتے رہیں گے۔

قرآنی معاشرہ کی ضرورت حضرات! وقت نہیں ورنہ میں اعجاز قرآنی کے دوسرے گوشوں کی طرف اشارہ کرتا۔ اور اس کے حسن معنوی کا یہ پہلو پیش کرتا کہ کس طرح اس کی بنیادوں پر ایک نظام حکومت قائم ہوا۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دس سال ملے۔ ان میں سے بھی چھ سال جہاد و قتال میں کٹ گئے۔ اس عرصہ میں صحابہ کرام کو ستائیس بار جہاد کے لیے نکلنا پڑا۔ صرف چار سال سکون کے ملے۔ اور اتنے مختصر سے وقت میں جو نظام اور معاشرہ قائم ہوا۔ قیامت تک اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔

یہ بات تسلیم کہ ایسا کامل معاشرہ چشم فلک دوبارہ نہیں دیکھ سکے گی۔ کیونکہ اس کے بانی اور معلم خود رسول اللہؐ کی ذاتِ ستودہ صفات تھی۔ لیکن اگر ہم آج بھی اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کردیں تو ہمارے ملک میں اور پھر ہماری وجہ سے پوری دنیا میں ایک حقیقی خوشگوار انقلاب رونما ہوسکتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے پاکستان کو معرض وجود میں آئے سترہ

سال ہو چکے ہیں. مگر قرآن و دستور مجبور و مظلوم ہے. ہماری منڈیوں، کالجوں، اسمبلیوں اور گھروں میں اس کی حکومت نہیں. اسے ہم نے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر مسجد تک محدود کر دیا ہے. ملت مختلف ٹکڑوں اور گروہوں میں بٹ چکی ہے. مغربی سیاست نے ہمیں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کو دو متحارب دھڑوں میں بانٹ کر ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و عداوت بھر دی ہے. دینی عناصر آپس میں برسرپیکار ہیں. اور اس عالم انتشار نے ان کو کہیں کا نہیں چھوڑا.

کاش ہم سمجھ سکتے کہ اتفاق کی برکتیں کیا ہیں. اور انتشار کے نتائج کیا ہیں؟ ایک چھوٹی سی مثال لے لیجیے. سورج کے اندر اتنی گرمی موجود ہے کہ اس سے سمندروں کا پانی بھاپ بن سکتا ہے اور پہاڑ جل کر راکھ ہو سکتے ہیں. مگر اس کی شعاعیں لاکھوں میل کے دائرے میں منتشر ہیں. اس انتشار نے ان کی قوت کو ختم کر کے رکھ دیا ہے. بزنگ گلاس، آتشیں شیشہ صرف چند شعاعوں کو نقطۂ اتحاد پر لا سکتا ہے. نتیجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے رکھا ہوا کاغذ جل اٹھتا ہے. افسوس آج ہمارے سورج کی شعاعیں بھی حالت انتشار میں ہیں. اہل دین ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوتے. آج جمعۃ الوداع کا مبارک دن ہے. آیئے مل کر دعا کریں کہ اللہ ہمیں مل جل کر اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی توفیق دے تاکہ اہل حق کی متحدہ کوششوں سے قرآن کا معنوی اعجاز ایک دفعہ پھر دنیا کے سامنے متشکل ہو سکے.

حضرت ابوبکر صدیقؓ

"۱۹۶۵ء میں نوجوانوں کی ایک تنظیم کے زیرِاہتمام لاہور کی ایک جامع مسجد میں یومِ صدیقؓ منایا گیا تھا۔ میں نے اُس موقع پر یہ تقریر کی تھی جسے ہفت روزہ "شہاب" کے صفحات سے من وعن پیش کیا جا رہا ہے۔"

تعلیماتِ ہجرت

اسلام کے عظیم ترین فرزند حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمادی الثانی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا۔ اس مناسبت سے ان ایام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تذکرہ ضروری ہے۔ میں نے اس مقصد کے لیے واقعۂ ہجرت کو منتخب کیا ہے کیونکہ ہجرت کا یہ واقعہ جس میں حضرت ابوبکرؓ کی خدمات اور مقام روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں، عام طور پر تاریخ نویس اور مقررین اس پر ایک سرسری نظر ڈال کر جلدی سے گزر جاتے ہیں۔

ہجرت کا یہ واقعہ اسلام کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ہے جس کے بعد اسلام کو کامیابی و کامرانی کی منزل حاصل ہوئی۔ صحابہ کو جب آپؐ نے ہجرت کا حکم دیا تو مسلمان خاموشی کے ساتھ مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ مکّہ میں چند گنے چُنے مسلمان رہ گئے۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بھی آنحضرتؐ سے ہجرت کی اجازت طلب کی مگر آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا "ابھی نہیں ـــــ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں کوئی ساتھی عنایت فرمائے"۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سمجھ لیا کہ حضورؐ انھیں اپنی ہمرکابی کا شرف بخشنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں

نے دو اُونٹنیاں خریدیں اور انھیں خوب کھلا پلا کر سفر کے لیے تیار کرنے لگے۔

جب کفار نے دیکھا کہ آہستہ آہستہ سارے مسلمان جانے لگے ہیں اور سب چوری چھپے جا رہے ہیں (سوائے حضرت عمر فاروق رض کے، وہ جب مدینہ جانے لگے تو تیر کمان آویزاں کیے ہوئے حرم کعبہ میں آئے اور قریش کو مخاطب کر کے کہا میں جا رہا ہوں اگر تم میں سے کسی کی ہمت ہو تو مجھے روک لے) تو انھوں نے سوچا اب موقع ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت نبی اکرم ص کو شہید کر دیا جائے۔ آپ کو قتل کرنے کا پروگرام بنانے کے لیے دارالندوہ میں چودہ ممتاز قبائل کے سردار اکٹھے ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق اس مشاورت میں ابلیس بھی ایک نجدی سردار کے بھیس میں شامل ہوا۔ سرداروں نے مل کر مشورہ کیا اور پھر اس بات پر اتفاق ہوا کہ ہر قبیلے کے دو دو جوان مل کر آنحضرت ص کے گھر کا محاصرہ کریں اور وہ سب مل کر حضور ص کو قتل کر دیں تاکہ بنو عبد مناف قصاص طلب نہ کر سکیں کیونکہ ظاہر ہے وہ اکیلے اتنے قبائل کے خلاف کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔ مایوس ہو کر خون بہا پر راضی ہو جائیں گے اور اس طرح یہ روز روز کا چکر ختم ہو جائے گا۔

ادھر یہ منصوبے بنائے جا رہے تھے اور ادھر حضور ص کو بتلا دیا گیا تھا کہ کفار یہ منصوبے بنا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ص نے حضرت علی ع کو طلب کیا اور کہا کہ میرے بستر پر سو جاؤ اور لوگوں کو امانتیں لوٹا کر تم بھی مدینہ چلے آنا۔ یہاں یہ بات دھیان میں رکھیے کہ آنحضرت ص نے اپنے عزاد بھائی کو موت کے منہ میں ڈال کر تلواروں کے نرغے میں سلانے کا اہتمام صرف اس لیے کیا کہ کفار کی امانتیں واپس مل جائیں۔ امانت و دیانت کی ان اقدار کی حفاظت کا جو حق آنحضرت ص نے ادا کیا اس کی مثال نہیں ملتی کہ خون کے پیاسوں کو بھی امانت لوٹائی جا رہی ہے اور پھر خون کے پیاسوں کا بھی حال دیکھیے کہ وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ ان کی امانتیں صرف آنحضرت ص کے پاس ہی محفوظ رہ سکتی ہیں۔ کاش یہ لوگ یہ بھی سمجھ سکتے کہ جو شخص انسانوں کے معاملے میں امانت و دیانت کا حق ادا کرتا ہے وہ خدا کے معاملے میں کب بددیانتی کر سکتا ہے؟

اس کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور انھیں کہا کہ اب ہمیں ہجرت کرنا ہے۔ یہ سن کر خوشی سے حضرت ابوبکرؓ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ انھیں اس ہستی کی ہمرکابی کا شرف مل رہا تھا جس کی ہمرہی کا ایک ایک قدم ہزاروں سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

ان کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ نے ایک تھیلی میں کھانے پینے کا سامان رکھا جب اسے باندھنے کے لیے کچھ نہ ملا تو انھوں نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر تھیلی کو باندھ دیا۔ چنانچہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ذوالنطاقین (یعنی دو دوپٹے والی) کا خطاب دیا یہ حضرت اسماء وہی خاتون ہیں جن کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر نے حجاج بن یوسف کی فوج سے لڑتے ہوئے جان دی۔ شہادت سے قبل ابن زبیر جب اپنی والدہ (حضرت اسماء) سے مشورہ کرنے آئے کہ :-

"میں ہتھیار ڈال دوں یا حجاج سے لڑتا ہوا مردانہ وار جان دے دوں!"

تو حضرت اسماء نے جواب دیا۔

"بیٹا اگر تم حق پر ہو تو جان دے دو مگر ہتھیار نہ ڈالو۔"

جب شہادت کے بعد حجاج کے حکم پر ابنِ زبیر کی لاش سُولی پر لٹکا دی گئی تو وہ سُولی تک آئیں اور بڑے صبر و سکون سے فرمایا۔

"کیا شاندار سوار ہے کہ مرنے کے بعد بھی سواری سے نہیں اُترا۔"

غرض جب سامان سفر تیار ہو گیا تو یہ دنیا کے جلیل القدر مسافر چل پڑے۔ یہاں توکّل کا مطلب بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ خدا کی راہ میں خود اس کے حکم سے ہجرت ہو رہی ہے، لیکن اس ہجرت کے لیے دنیوی اسباب سے صرف نظر نہیں کیا گیا۔ غلام کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ غار کے آس پاس بکریاں چرائے اور شام کو دودھ دے کر جائے۔ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو یہ خدمت سپرد کی کہ دن بھر کفار جو منصوبے تیار کریں وہ رات کو آکر ان سے آگاہ کریں اور حضرت اسماءؓ کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ کھانا لے کر آئیں۔

اگر موسیٰؑ کی اُمت کے لیے من و سلویٰ اُتر سکتا تھا تو حضرت محمد مصطفیٰؐ کے لیے کیوں نہیں اُتر سکتا تھا جن کی اُمت میں شمولیت کے لیے حضرت موسیٰؑ نے بھی تمنا ظاہر کی تھی یہ ہم لوگوں کے لیے ایک مثال ہے کہ پہلے اسباب کرو پھر توکل کرو۔ کافر اور مومن میں فرق یہی ہے کہ کافر اسباب کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے کہ بس اب چیچک کا ٹیکہ لگوا لیا اور صفائی کا اہتمام کر لیا ہے اب مجھے کوئی خدشہ نہیں، لیکن مومن ٹیکہ لگوانے اور صفائی کا اہتمام کرنے کے بعد اللہ پر بھروسہ کرتا ہے کہ اب اپنی سعی کوشش کر چکا ہوں اللہ تعالیٰ ضرور میری حفاظت فرمائے گا۔

اس اہتمام کے بعد رات کی تاریکی میں دو مقدس مسافر چل پڑے اثنائے راہ میں یہ شرف بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حصے میں آیا کہ جب حضرت نبی کریمؐ کے پائے مبارک میں آبلے پڑ گئے تو آپ نے آنحضرتؐ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ اس سے قبل وہ کبھی دائیں ہو جاتے تھے اور کبھی بائیں۔ کبھی آگے اور کبھی پیچھے۔ حضورؐ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو عرض کیا:

"میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کہیں کوئی دشمن تو نہیں"۔

چلتے چلتے ثور تک پہنچے، یہ ایک پہاڑ ہے مکہ سے چار میل کے فاصلے پر اس کی چوٹی سے پہلے ایک ڈھلوان ہے جس کے آخر میں ایک غار ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غار کو اچھی طرح صاف کیا تاکہ حضورؐ کو کوئی تکلیف نہ ہو اس کوشش میں آپ کی انگلیاں بھی زخمی ہو گئیں اس کے بعد دونوں یعنی ایک نبی اور ایک صدیق غار کے اندر تشریف لے گئے۔

ادھر آنحضرتؐ کے بستر مبارک پر حضرت علی سو رہے ہیں۔ یہاں دونوں جلیل القدر صحابیوں کا مقابلہ مقصود نہیں۔ جو لوگ ان میں باہمی مقابلے کرتے ہیں ان کی نگاہوں میں اتنی گہرائی کہاں کہ وہ صحابی کی جاں نثاری اور فداکاری کی جانچ کر سکیں۔ ایک صحابی کی جاں نثاری وہ ہے جو آپ کی ہمرہی میں ظاہر ہوئی۔ دوسرے صحابی کی فداکاری یہ ہے کہ باہر موت کا پہرہ ہے مگر وہ ایسی میٹھی نیند سو رہے ہیں کہ اس کے بعد اور اس سے پہلے ایسی میٹھی نیند انھیں

کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکی۔

یہاں ان بدّوؤں کا اخلاق بھی ملاحظہ ہو وہ محاصرہ کیے ہوئے ہیں لیکن گھر میں گھس کر حملہ نہیں کرتے صبح کے منتظر ہیں کہ جب حضورؐ فجر کے وقت باہر تشریف لائیں گے تو ان پر حملہ کیا جائے۔ گھر میں گھس کر حملہ کرنا بدوی تہذیب کے اخلاق کے منافی تھا۔ اس کے برعکس اس تہذیبِ جدید نے یہ سکھایا کہ کسی کی تمیز نہ کرو ایٹم بم سے سب کو بھون کر رکھ دو۔

جب صبح ہوئی اور رسول اللہؐ کی بجائے مکان سے حضرت علی برآمد ہوئے تو کافر حیران و پریشان ہو گئے۔ نکلنے والا تو ان کے درمیان سے نکل گیا تھا کہ انھیں پتہ بھی نہ چلا۔ محاصرہ جاری تھا اور آنحضرتؐ نے سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے ایک مشت خاک اٹھائی اور کفّار کی طرف پھینک دی اور پھر ان کے درمیان سے اس طرح تشریف لے گئے کہ انھیں پتہ بھی نہ چلا کہ وہ جس کے لیے محاصرہ کر رہے ہیں وہی نکلا جا رہا ہے۔

کافروں نے جب حضرت علیؓ کو دیکھا تو ان سے رسول اللہؐ کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ کامیابی نہ ہوئی تو ان پر سختی بھی کی، پھر بھی معلوم نہ ہوا تو کفّار حضرت ابوبکرؓ کے گھر کی طرف چل پڑے کہ شاید آپ وہیں ہوں دیکھا تو ابوبکرؓ بھی غائب ہیں۔ ابوجہل نے حضرت اسماءؓ کو تھپڑ بھی مارا مگر ان سے سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اس شخص کے لیے ایک سو سرخ اونٹ کا انعام مقرر کیا گیا جو حضرت نبی کریمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پکڑ لائے یا ان کا سر لے آئے۔ اس وقت ایک سرخ اونٹ کا عرب میں وہی درجہ تھا جو آجکل موٹر کار کا ہے۔ اس دور میں بڑے بڑے ماہر سراغ رساں موجود تھے۔ جو اونٹ کے نقشِ پا دیکھ کر یہ بتا دیتے تھے کہ اونٹ کی رنگت کیا ہے، وہ مادہ ہے یا نر، اور اونٹنی ہے تو حاملہ ہے یا نہیں چنانچہ کفّار سراغ لگاتے ہوئے غار سے پچاس قدم کے فاصلے پر پہنچ گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کو فکر لاحق ہوئی۔ اپنے لیے نہیں انھیں، اپنی کوئی فکر نہ تھی جنھیں اپنی فکر ہوتی ہے وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے اور اس وادیٔ پُرخار میں

قدم نہیں رکھتے۔ انھیں فکر یہ ہوئی کہ کہیں کفار اس متاعِ کائنات کو نہ دیکھ لیں اور آپؐ پر کوئی آنچ نہ آجائے ـــــ یہاں نبی اور صدیق کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

"صدیق تم یہ نہ سمجھو کہ ہم دو ہیں ہم میں ایک تیسرا بھی ہے اور وہ خداوندِ قدوس ہے۔ تم غم مت کرو۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

قرآن اس کی شہادت دیتا ہے اور جن الفاظ میں شہادت دیتا ہے ان میں بجائے خود خطبے کے مضامین ہیں۔ اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقام بھی معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں انھیں "دو میں سے ایک" کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس سے نبی اور صدیق کے درمیان محبت اور تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح دو ہو کر بھی ایک تھے۔ گویا صدیق اکبرؓ نے اپنے آپ کو فنا فی الرسول کر دیا تھا۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ انھیں "صاحب" کہا اور وہ واحد صحابی ہیں جن کی صحابیت پر خود قرآن نے گواہی دی۔ قرآن کہتا ہے:

"جب اہلِ کفر نے اُسے نکالا اور وہ دو میں ایک تھا اور وہ دونوں غار میں تھے اور جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم مت کرو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید کی جو تمھیں نظر نہیں آسکتے۔"

یہ سکینت کس کے دل پر نازل ہوئی۔ کیا رسول کے قلب پر؟ وہ تو پہلے سے سکینت سے معمور تھا یہ سکینت ہی تو تھی جس کا نُور لاتحزن کے الفاظ سے پھُوٹ رہا تھا سکینت اس کے ساتھی کے قلب پر نازل کی گئی جسے اپنے آقا کی سلامتی کی فکر لاحق تھی اسے طمانیت خاطر کی نعمتِ لازوال دے کر حق الیقین اور عین الیقین کے مرتبے پر فائز کر دیا گیا۔ کائنات کی نورانی طاقتوں سے اس کی مدد فرمائی گئی اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی مثالی رفاقت اور صحابیت پر مہرِ تصدیق ثبت فرما دی گئی۔

کفار غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے تھے مگر مسند احمد کی روایت ہے کہ اللہ تعالےٰ

نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت یہ اہتمام فرمایا کہ مکڑی نے غار کے مُنہ پر جالا تن دیا۔ یہی تار عنکبوت دفاعی حصار بن گیا۔ کفار یہ سوچ کر واپس لوٹ گئے کہ اگر محمدؐ اور ابوبکرؓ اس میں چھپے ہوتے تو یہ جالا کیسے باقی رہ جاتا۔ ابوبکرؓ اپنے آقا کے ساتھ تین دن اور تین راتیں اسی غار میں رہے اور اس حال میں رہے کہ رسالت کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہا۔

سرِ وقتِ ذبح اپنا ان کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

یہی سعادت تھی جسے دیکھ کر امیرالمومنین عمر فاروقؓ کہا کرتے تھے کہ :

"میرے اور میرے سارے خاندان کے نیک اعمال ایک طرف اور غارِ ثور میں ابوبکرؓ کی ایک رات ایک طرف پھر بھی ان دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

دوستانِ عزیز۔ یہ ہے ابوبکر صدیقؓ کی خدمات کا ایک مختصر سا باب۔ اب تو اندازہ کر لو کہ جس کی ایک رات کا اجر یہ ہے اس کی پوری زندگی کا کیا اجر ہوگا۔ جو بچپن سے لے کر قبر کی منزل تک رسول اللہؐ کا ساتھی رہا۔ بدنصیب ہے وہ دل جو اس کے ادب و احترام سے خالی اور اس کی الفت و محبت سے محروم ہو۔ اقبال نے ابوبکر صدیقؓ کی شان میں کیا جامع شعر کہا ہے۔ ؎

ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

"ووٹ کی شرعی حیثیت"

"۱۹۶۲ء میں پاکستان مارشل لاء کے زیرِ نگیں تھا۔ سیاسی جماعتوں پہ پابندی تھی۔ قلم و زبان پر پہرے تھے۔ اس پس منظر میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات کا غلغلہ بلند ہوا۔ خدشہ تھا کہ کسی تنظیم کے نہ ہونے کی صورت میں پاکستان دوست عناصر الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ ایسے میں ووٹروں کی ذہنی تربیت کے لیے میں نے ووٹ کی شرعی حیثیت کے موضوع پر خطبۂ جمعہ دیا۔ جو بعد میں ہفت روزہ "شہاب" میں چھپا تو قارئین کے اصرار پر اسے کتابچے کی صورت دے دی گئی۔ چونکہ اس موضوع پر دینی حیثیت سے مربوط انداز میں شاید یہ پہلا اظہارِ خیال تھا، اس لیے اس کتابچے کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی اور الیکشن سے پہلے اس کے تقریباً ایک لاکھ نسخے فروخت ہوئے۔ سندھی اور پشتو میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہوا۔

معمولی سی لفظی ترمیم کے بعد یہ تقریر پیشِ خدمت ہے۔"

جمہوری ممالک میں باقاعدہ وقفوں کے بعد انتخابات کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ ان وقفوں کے دوران بھی ضمنی انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ انتخابات سے کافی عرصہ پہلے ہی امیدواروں کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں جیسے جیسے انتخابات قریب آتے چلے جاتے ہیں تیز تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کاروبارِ زندگی ہے ہی الیکشن۔ وہ اسی کو ذریعۂ عزت سمجھتے ہیں اور اسی سے ان کی چودھراہٹ قائم رہتی ہے۔ اس لیے وہ الیکشن لڑنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ انھیں خوب اندازہ ہوتا ہے کہ کب کام شروع کر دینا چاہیے ورنہ تاخیر ہو جانے سے کامیابی دشوار ہو جائے گی۔ دوسری طرف وہ لوگ جو صرف دینداری کے میدان میں رہتے ہیں اور ان کے دل میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو صرف اسی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سارے معاملے کو دنیوی ہنگامہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ مذہب سے اس چیز کا کوئی تعلق نہیں۔ الیکشن میں حصہ لینا اور کامیابی کے لیے دوڑ دھوپ کرنا سراسر ضیاعِ وقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انتخابات کی آمد آمد کے دوران بھی گوشہ نشین

رہتے ہیں اور اس ضمن میں اپنے فرض کی بجاآوری کی زحمت سے محفوظ رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے انھی دیندار بھائیوں کی اس غلط فہمی کو دُور کروں۔

اسلام ایک جامع نظامِ حیات

میرے خیال میں یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے ان دوستوں نے اسلام کو محض چند عبادات کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے حالانکہ اسلام ایسا دین ہے جو دنیا میں ہمیں پوری زندگی بسر کرنے کے جامع آداب اور طریقے سکھانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس میں ایک طرف اگر قیام و قعود اور رکوع و سجود کے طریقے بتائے گئے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ جب تم قاضی اور جج بن کر عدالت کی کرسی پر بیٹھو تو فیصلے کس طرح کرو۔ اس نے روزے کے آداب اور حج کے قاعدے بیان کیے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ جب تم تاجر بن کر کاروبار کرنے لگو تو تمھیں کن کن حدود و قیود کا پابند ہونا پڑے گا۔ اسلام اگر ایک طرف منبر و محراب کی باتیں کرتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی سکھاتا ہے کہ مسند و ایوان کے مطالبے اور تقاضے کیا ہیں اور انھیں کس طرح پورا کرنا چاہیے۔ غرض اسلام ایک جامع نظامِ حیات ہے اور اگر دنیا کے کسی کام کو اس کے سکھائے ہوئے اصولوں کے مطابق سرانجام دیا جائے تو وہ دنیا کا کام نہیں دین کا کام بن جاتا ہے۔ الیکشن کے مسئلہ پر بھی اسی اصول کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ اس پر جذباتیت سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہر چند کہ الیکشن کو نئے نئے حیلوں اور حربوں کے ذریعے موجودہ دَور میں ایک شیطانی کام بنا دیا گیا ہے، لیکن اگر اس میں شریعت حقّہ کے مطابق حصّہ لیا جائے تو یہی شیطانی فعل رحمانی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ووٹ کی اہمیت

ووٹ کیا چیز ہے اور اسے کیسے لوگوں کے حق میں استعمال

کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ہماری شریعت نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی تعلیم بیان کر دی ہے۔ افسوس کہ ہم مغربی طرزِ سیاست کی اندھا دھند پیروی کرنے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ ہم نے کبھی سیاست کے اس پہلو پر توجہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

ووٹ کے بارے میں ایک دنیا دار آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک تحفہ ہے جسے طشتری میں سجا کر کسی دوست کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یا ووٹ ایک ایسا مال ہے جسے اچھی قیمت ملنے پر فروخت نہ کرنا پرلے درجے کی بیوقوفی ہے۔ لیکن دین کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھیں تو ووٹ کی سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ یہ ملک و ملت کی طرف سے ایک بڑی بھاری امانت ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ملک و ملت کے اجتماعی فائدے کو چھوڑ کر محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے اس امانت کو استعمال میں لائے۔ اس صورت میں یہ ایک سنگین خیانت متصور ہو گی۔ ہمارے مزاج کی افتاد کچھ ایسی ہے کہ ہم چند روپے بھی کسی کے پاس بطور امانت رکھنا چاہیں تو اس کے لیے خوب دیکھ بھال کر نیک اور خدا ترس آدمی کو تلاش کرتے ہیں تاکہ وہ صحیح معنوں میں امین ثابت ہو۔ مگر جب ووٹ جیسی قومی امانت سپرد کرنے کا وقت آتا ہے تو اس کے لیے کسی تحقیق و تفتیش کو ضروری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا صاف صاف حکم ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔

ظاہر ہے کہ لفظ امانت کے بڑے وسیع مفہوم ہیں اور امانتیں صرف مادی اشیاء کی نہیں کردار کی۔ گفتار کی، سوچ کی، عمل کی اور اسی طرح دوسری صفات کی بھی ہوتی ہیں۔

شہادت اور وکالت

امانت کے بعد ووٹ کی حیثیت یہ ہے کہ یہ شہادت ہے۔ آپ جس کو ووٹ دے رہے ہیں گویا اس کے متعلق شہادت دے رہے ہیں کہ وہ اس بارِ امانت کو اٹھانے کا اہل ہے

اور اس قابل ہے کہ اسے نمائندہ بنایا جائے۔ اب اگر یہ شہادت سچی ہے تو آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق ہو گئے لیکن اگر خدانخواستہ غلط ہے یعنی آپ ایک بُرے اور نااہل آدمی کو ووٹ دے رہے ہیں تو یہ جھوٹی شہادت ہے اور جھوٹی شہادت کی سنگینی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے شرک کے ساتھ بریکٹ کیا ہے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ

اور قرآن حکیم کے حامل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کے سب سے بڑے مفسر بھی ہیں ارشاد فرمایا ہے کہ

"جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے"

ووٹ کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ یہ توکیل یعنی وکالت کا پروانہ ہے۔ آپ جسے اپنا ووٹ دیتے ہیں اسے اپنا وکیل بناتے ہیں یعنی وہ قومی ملکی یا مقامی معاملات میں آپ کا وکیل ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی مقدمے میں ہمیشہ اچھے سے اچھے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور زیادہ فیس کی بھی پروا نہیں کی جاتی۔ پس جب کیس پوری قوم سے متعلق ہو تو اس میں کسی نااہل آدمی کو وکیل بنانا پوری ملت سے دشمنی کرنا ہے۔ لہٰذا ووٹ دیتے وقت یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جس کو ووٹ دیا جا رہا ہے وہ اپنی رائے پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ "صُمٌّ بُکْمٌ" نہ ہو اور دوسروں کو قائل بھی کر سکتا ہو۔ اگر اس میں یہ صلاحیتیں موجود نہ ہوں تو پھر ایسے آدمی کو اپنی قوم کا وکیل بنانا چور کو چوکیدار بنانے کے مترادف ہے۔

چوتھی حیثیت

ووٹ کی چوتھی حیثیت یہ ہے کہ یہ ایک سفارش ہے۔ آپ ایک امیدوار کے حق میں اپنی رائے دے کر گویا یہ سفارش کرتے ہیں کہ اس شخص کو نمائندہ منتخب کر لیا جائے۔ اگر یہ سفارش

جائز اور نیک مقصد کے لیے ہے تو وہ امیدوار کامیاب ہونے کے بعد جتنے بھی اچھے کام کرے گا آپ بھی ان کی تکمیل میں برابر کے شریک ہوں گے۔ لیکن اگر وہ منتخب ہو کر غلط کام کرتا ہے غیر اسلامی قوانین بنانے میں حصہ دار بنتا ہے۔ اپنے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہو گی کیونکہ آپ نے اپنا ووٹ دے کر اسے نمائندہ منتخب کرنے کی سفارش کی تھی۔ قرآن حکیم کا اس ضمن میں بڑا واضح فیصلہ موجود ہے کہ

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا۔

جو کوئی سفارش کرتا ہے اچھی تو اس میں سے حصہ پاتا ہے اور جو کوئی سفارش کرتا ہے بُری تو اس میں اس کے لیے بھی بوجھ ہے۔

سیدنا حضرت امام حسینؓ کی مثال

ووٹ کی یہی اہمیت تھی جسے سیدنا حضرت امام حسینؓ نے میدانِ کربلا میں اپنے خون سے تحریر کیا ہے۔ ہر سال جب محرم کا مہینہ آتا ہے تو آپ زبان سے تو شہید کربلا کو بہت خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان کی قابلِ فخر شجاعت اور قربانی کی یاد بھی مناتے ہیں مگر کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ سیدنا امام حسینؓ کا اصل کارنامہ ہے کیا؟ کیا یہ کسی جائیداد کے بٹوارے کا قضیہ تھا یا تخت و تاج کے حصول کا معرکہ؟ آپ خود کہیں گے کہ نہیں ہرگز نہیں۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی المرتضےٰ، فاطمۃ الزہرا اور حسن مجتبےٰؓ کا تربیت یافتہ حسینؓ دنیاداروں کی اس پست سطح پر کبھی نہ اتر سکتا تھا۔ پھر یہ واقعہ کیونکر رونما ہوا؟ سو مختصراً بات یہ تھی کہ

حسینؓ اپنا ووٹ اور اپنی رائے ایک غلط کار آدمی کے حق میں نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں بیلٹ بکس تو نہ تھے کہ ان میں باقاعدہ پرچیاں ڈالی جاتیں لیکن بیعت کا طریقہ ضرور رائج تھا۔ خلیفہ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مطلب یہی

تھا کہ ہاتھ دینے والے کا ووٹ خلیفہ کے حق میں جا رہا ہے ؎

سر داد و نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؓ

حضرت امام حسینؓ کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ ایک نااہل آدمی کے لیے اپنا ووٹ استعمال کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دشتِ نینوا میں اپنے احباب و اعزہ کے ہمراہ بے دردی سے شہید کر دیے گئے اور امتِ محمدیہ کے لیے رہتی دنیا تک یہ سبق چھوڑ گئے کہ ؎

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

ہم سید الشہداؓ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں مگر یہ خراجِ عقیدت زبانی جمع خرچ تک محدود رہتا ہے۔ عملاً ہمارا حال یہ ہے کہ جب ہمیں اپنے محلوں اور شہروں میں ووٹ استعمال کرنے اور نااہل آدمی سے عدم تعاون کر کے ایک چھوٹے اور محدود دائرے میں سنتِ شبیریؓ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس عظیم الشان شہادت کے نتائج اور اسباق ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی یاد نہیں آتے۔

نمائندہ کیسا ہونا چاہیے

مسلمانوں کی نمائندگی اور سربراہی کے لیے کیسے لوگوں کو آگے آنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جسے اسلام نے تشنۂ جواب نہیں چھوڑا۔ قرآن و حدیث میں وہ صفات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں جو ہمارے اربابِ کار اور اہلِ اقتدار میں ہونی چاہییں۔ یہ ٹھیک ہے کہ زوال کے اس زمانے میں گنتی کے چند آدمی بھی مشکل سے اس کسوٹی پر پورے اتریں گے جو اسلام نے مقرر کی ہے۔ لیکن ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے ان صفات کی روشنی میں نسبتاً بہتر آدمیوں کا انتخاب چنداں مشکل نہیں۔

۱۔ اس ضمن میں قرآنِ حکیم نے جو سب سے پہلی بات بیان کی ہے اور جسے اصل الاصول کا درجہ حاصل ہے وہ یہ ہے کہ

"بڑائی بزرگی اور برتری کا معیار یہ نہیں کہ کون کتنا دولت مند ہے یا کس کی برادری کتنی بڑی ہے۔ اس کا حقیقی معیار یہ ہے کہ کون خدا سے ڈرنے والا ہے........ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم......"

۲۔ دوسری صفت وہی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی سربراہی کے لیے سامنے آنے والا واقعتاً اس منصب کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی زاہد و عابد اور درویش و پارسا ہو مگر منصب کا حق ادا کرنے کے لیے جو اہلیت ہونی چاہیے اس میں موجود نہ ہو۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی منصب پر فائز کیے جانے کی درخواست کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا تھا۔ "ابوذر! تمھیں یہ منصب نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تم کمزور آدمی ہو"۔

قرآنِ حکیم واضح طور پر حکم دیتا ہے کہ اپنی امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کرو۔ ووٹ بھی اس پہلو سے ایک امانت ہے کہ حدیثِ نبوی کی رُو سے جس آدمی سے مشورہ کیا جائے اس کا فرض ہے کہ وہ صحیح مشورہ دے۔ اگر وہ صحیح مشورہ نہیں دیتا تو امانت میں خیانت کرتا ہے۔ ووٹ ڈالنے، ڈلوانے کا یہی تو مطلب ہے کہ آپ سے حقیقی نمائندے کے بارے میں مشورہ کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ صحیح مشورہ نہیں دیتے تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

۳۔ تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحبِ علم ہو اسے معلوم ہو کہ ایک مسلمان فرد اور معاشرہ سے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے کیا مطالبات ہیں۔ وہ صاحبِ بصیرت بھی ہو اور صاحبِ فراست بھی۔

یہاں صاحبِ علم ہونے کا نکتہ بھی تشریح طلب ہے۔ زندگی کے جس شعبہ کے لیے کسی شخص کا انتخاب ہو رہا ہو اس شعبہ کے رُموز و اسرار کو مکمل طور پر جاننے والا انسان ہی اس شعبے

کا صاحب علم انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ چونکہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے نئے قانون سازی اور پہلے سے بنے ہوئے قوانین کی چھان بین اور ترمیم کا کام ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میدان میں صاحب علم وہی شخص کہلائے گا جو قانون سازی کے طور طریقوں کا ماہر ہو گا۔ اگر ایسا شخص علوم دین پر بھی دسترس رکھتا ہو تو یہ اس کی اضافی اہلیت ہو گی۔ لیکن اگر دین کی رسمی تعلیم اسے حاصل نہ ہو بلکہ وہ بالواسطہ طور پر اسلامی آئین حیات اور قوانین زندگی سے پوری طرح واقف ہو اور عالم دین نہ ہوتے ہوئے بھی دین کی روح کو سمجھتا ہو وہ مجلس قانون ساز کے لیے صاحبِ علم متصور ہو گا۔ اس قسم کے صاحبِ علم لوگوں کی ہمارے ہاں کبھی کمی نہیں رہی۔ خود قائدِ اعظم کی ذات والا صفات اس کی ایک درخشندہ مثال ہے۔ جنھوں نے ۱۹۱۰ء میں ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا رکن منتخب ہو کر مذکورہ کونسل میں سب سے پہلا غیر سرکاری بل بنام مسلم اوقاف بل پیش کر کے اسے قانون بنوایا تھا۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ ان کے اوپر ایک سردار اور بادشاہ مقرر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوتؑ کو ان کا بادشاہ بنا دیا۔ اب ادھر کیفیت یہ تھی کہ بنی اسرائیل اپنے بارہ قبیلوں میں سے بنو یہودا کو تو بادشاہت کا حق دار سمجھتے تھے اور بنو لاوا کو نبوت کا۔ حضرت طالوتؑ ان کے سب سے چھوٹے قبیلے بنو یامین سے تعلق رکھتے تھے۔ جب وہ بادشاہ مقرر ہوئے تو بنی اسرائیل اعتراض کرنے لگے کہ آخر طالوتؑ کو کس وجہ سے بادشاہ مقرر کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ وزادہ بسطة فی العلم والجسم ۔ وہ تم سے علمی اور جسمی دونوں پہلوؤں سے فضیلت رکھتا ہے اس لیے ہم نے اسے تمہارا بادشاہ بنا دیا۔ گویا سرداری اس کا حق ہے جو علمی حیثیت میں بھی ممتاز ہو اور جسمانی لحاظ سے بھی اس کی شخصیت باوقار، جاذبِ نظر اور پُر اثر ہو۔

۴۔ چوتھا وصف یہ بیان کیا کہ اس کا دل عہدے اور منصب کی حرص سے خالی ہو۔ لوگ

خود چاہتے ہوں کہ وہ آگے آئیں ۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> "اِنَّ اَخْوَنَکُمْ عِنْدِنَا مَنْ طَلَبَهُ ۔ ہمارے نزدیک تم میں سے وہ شخص بڑا خائن ہے جو خود اس کا طالب ہو۔" (ابوداؤد)

اس کے پیشِ نظر یہ نہ ہو کہ وہ عہدہ و منصب پر فائز ہو کر خوب فائدہ اٹھائے گا بلکہ اس کا نصب العین یہ ہو کہ وہ اسے خدمت قوم اور ادائے فریضہ کا ذریعہ بنائے گا اگر مثالی اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے تو اس میں تو امیدواروں کو خود امیدوار ہو کر اپنے حق میں پروپگنڈہ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی ۔ لوگ اہل آدمی کی دوڑ دھوپ کے بغیر ہی اسے منتخب کر لیا کریں گے ۔ لیکن چونکہ فی الوقت الیکشن کا سسٹم قائم ہی امیدواری کی بنیاد پر ہوتا ہے اس لیے نیک لوگوں کو اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ عوام ازخود انھیں منتخب کر کے نمائندگی کے لیے مجبور کر دیں گے ۔ اگر وہ کسی علاقے میں اثر بھی رکھتے ہیں اور انتخابات میں ان کی کامیابی کے مواقع بھی ہیں تو انھیں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے ہوئے خود ہی اس میدانِ کارزار میں اترنا ہو گا۔ غلط اور صحیح رجحانات کی اس کش مکش میں محض اس لیے تماشائی بنے رہنا کہ کہیں امیدواری کا الزام نہ لگ جائے ان کے مواقع کو بھی ختم کر دے گا اور کچھ عجب نہیں کہ کل قیامت کے دن ان سے پوچھ بھی لیا جائے کہ :

> جب اسلامی اور عوامی رجحانات و عزائم کا پرچم بلند کرنے کا موقع تھا تم اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے، لوگ تمھیں چاہتے بھی تھے تو تم کنارے پر کھڑے رہ کر طوفان کا تماشا کس لیے کرتے رہے ۔

اس لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ سربراہی کے لیے بڑھنے والا شخص حرص و آز سے پاک ہو ۔ منصب کو خدمت قوم کا وسیلہ بنانے کے لیے حاصل کرنے کی جد وجہد کر رہا ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حوصلہ مند، جری اور صاحب فراست بھی ہو وہ اپنا وقت اس

انتظار میں ضائع نہ کر دے کہ لوگ آخر خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اس عبوری دور میں امیدواری انتخابات کا سنگ بنیاد ہے اس لیے اسے اختیار کیے بغیر چارہ نہیں۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ برابر اپنا محاسبہ کرتا رہے تاکہ اس کے قلب و دماغ، حرص و ہوس کا گھونسلہ نہ بن جائیں۔ امیدواری کے موجودہ نظام میں بھی خدا کے فضل و کرم سے عوام بآسانی پہچان لیتے ہیں کہ کون ذاتی منفعت کے لیے ووٹ مانگ رہا ہے اور کون خدمت ملت و مذہب کے جذبے سے سرشار ہو کر ووٹ کا طالب ہے۔

برادری کے تعصّبات

یہ ہیں چار موٹی موٹی نشانیاں، علامتیں اور اوصاف جو ووٹ دیتے وقت مسلمانوں کو اپنے نمائندوں میں دیکھنی چاہییں۔ اور اگر ہم انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت اور صحیح نمائندوں کی اس پہچان کو اپنے سامنے رکھیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ الیکشن دنیا داری کا دھندا نہ رہے دین کا حصہ بن جائے، مگر افسوس ہم مصلحتوں اور غرضوں کے ایسے شکار ہو چکے ہیں کہ ہمیں دین کا وہ سب سے بڑا رشتہ یاد ہی نہیں رہا جس نے کبھی ہمارے باہم دگر متصادم عناصر کو ایک وحدت کی شکل عطا کی تھی۔ قرآن حکیم اس کو یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے۔

"وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔

اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو جب تم آپس میں دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم ہو گئے اس کی نعمت سے بھائی بھائی۔"

افسوس کہ اسلام جس مقصد کے لیے آیا تھا ہم نے اسے فراموش کر دیا۔ اور ایک

ملت کی بجائے ٹکڑوں اور فرقوں اور گروہوں اور برادریوں میں بٹ کر رہ گئے۔ یہ عصبیتیں ہم پر اتنی غالب آچکی ہیں کہ اب ہم تمام مسائل و معاملات کو انہی کی عینک لگا کر دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایک ارائیں غیر ارائیں کو ووٹ دینے سے کتراتا ہے خواہ وہ اہلیت اور صلاحیت کا جیتا جاگتا مجسمہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک کشمیری عام طور پر کشمیری ہی کو ووٹ دے گا خواہ وہ دوسرے امیدواروں کے مقابلے میں نالائق ہو۔ اور ایک پٹھان نمائندہ منتخب کرتے وقت پٹھان ہی کو ترجیح دے گا کیونکہ وہ اس کی برادری کا فرد ہے، حالانکہ اس طرح کی عصبیت کے بارے میں ہمارے آقا و مولا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس کا شکار اور پرستار ہم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ فرمایا:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّۃٍ لَیْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلٰی عَصَبِیَّۃٍ وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰی عَصَبِیَّۃٍ۔

وہ ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت کی طرف دعوت دی وہ ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت پر لڑائی کی وہ ہم میں سے نہیں جسے عصبیت کی حالت میں موت آئی۔"

ووٹ کی تجارت

ایک طرف ہمارے دل و دماغ پر برادریوں کی عصبیت کا قبضہ ہے، دوسری طرف ہماری قوم میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو باقاعدہ ووٹوں کی تجارت کرتے اور چند کھنکتے سکوں کے عوض اپنا ضمیر فروخت کرتے ہیں ہمارے خیال میں جو لوگ اس سلسلے میں بائع اور مشتری کا پارٹ ادا کرتے ہیں وہ ملک و قوم کے سب سے بڑے دشمن اور پرلے درجے کے غدار ہیں۔ یہ قوم کو آہستہ آہستہ بے حمیت، بزدل اور مفاد پرست بنانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے جو قوم چند روپوں کے عوض اپنی رائے بیچ دیتی ہو کل اگر بیرونی

دشمن اس پر حملہ کر دے تو اس کے اکثر آدمی لالچ میں ففتھ کالمینٹ اور جاسوس بننے پر آمادہ نہ ہو جائیں گے ؟ ضمیر کا گلا دبا دیا جائے اور روپے پیسے ہی کو معبود بنا لیا جائے تو اس صورت میں جو بھی ہو جائے کم ہے۔ ایسے لوگ اپنی خودی کو بھی موت کے گھاٹ اتارتے ہیں اور اپنے قومی کردار کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے

دِل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دِل یا شکم

ان چند سطور میں میں نے اپنا مافی الضمیر کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس پکار پر لبیک کہیں اور جب کبھی نمائندے چننے کا موقع آئے تو آپ کا فرض ہے کہ اس موقع پر ان لوگوں کو آگے لائیں جو خدا ترس، امین، صاحب علم اور بے غرض ہوں۔ اگر ایسے لوگ خود آگے نہ آ رہے ہوں تو عوام پر لازم ہے کہ انھیں کھڑا ہونے کے لیے مجبور کریں اور پھر ہر طرح ان کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

انتخابات کا موقع قومی زندگی میں ایک نہایت اہم موقع ہوتا ہے۔ اس موقع پر سوچ سمجھ سے کام لے کر اچھے نمائندوں کو منتخب کر لیا جائے تو قوم زندگی کے میدان میں آگے بڑھتی رہتی ہے اور جمہوری نظام کو قوت اور استحکام حاصل ہوتا رہتا ہے لیکن اگر اچھے نمائندے منتخب نہ کیے جائیں تو نہ صرف جمہوری اقدار کو ٹھیس پہنچتی ہے بلکہ بسا اوقات سال ہا سال تک قوم کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

پارلیمانی تقاریر

(۱) عوامی حکومت کے آئینی تصورات
(۲) امن کی راہ
(۳) مسلم بنگال اور پاکستان
(۴) ریڈیو کی اہمیت
(۵) پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس سے خطاب
(۶) بجٹ پر تقریر
(۷) کچھ ذرائع ابلاغ کے بارے میں
(۸) نیشنل پریس ٹرسٹ
(۹) "جن پہ تکیہ تھا —!"

عوامی حکومت کے آئینی تصورات

"آئین بن رہا تھا تو اسمبلی میں ہمیں بیک وقت چو مکھی لڑائی لڑنی پڑ رہی تھی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو اسلام کو فرقہ وارانہ عینک سے دیکھتے ہیں۔ لونڈیوں اور غلاموں کے قائل ہیں۔ غیر محدود ملکیت ان کا جزوِ ایمان ہے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو کئی قومیتوں کے حامی اور علاقائی زبانوں اور کلچر کے نام پر وحدتِ ملی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ۶ مارچ ۱۹۷۳ء کو قومی اسمبلی میں ان کے دلائل اور نئے آئین پر ان کے اعتراضات کا جواب دیا۔ یہ تقریر ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔"

○

جناب اسپیکر!

اس امر پر ارباب فکر و شعور سے بحث و تمحیص کہ کسی ملک کے لیے آئین کی کیا اہمیت ہوتی ہے، تحصیل حاصل کے سوا کچھ بھی نہیں کیونکہ سیاسی بصیرت رکھنے والے تو ایک طرف، عام پڑھے لکھے لوگ بھی جانتے ہیں کہ جس طرح ایک گھر کی باقاعدہ تعمیر کے لیے بڑی سوچ سمجھ کے ساتھ نقشہ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح اس بڑے گھر کی تعمیر کے لیے جسے ہم "وطن" کہتے ہیں اور جس میں ہماری آئندہ نسلوں کو صدیوں تک رہنا ہے، بڑے غور و فکر کے ساتھ آئین بنانے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ دستاویز ہے جس میں ایک طرف عوام کے حقوق اور فرائض متعین کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف ہیئت حاکمہ کے بنیادی فرائض اور ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اختیارات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ملک میں انتشار جنم لیتا ہے اور مطلق العنانی ظہور میں آتی ہے۔

آئین سازی اور ہم: بدقسمتی سے موجودہ عوامی حکومت کے قیام سے پہلے آئین کے سلسلے

ں ہمارا جو رویہ رہا وہ قطعاً صحت مندانہ اور سنجیدہ نہ تھا۔ ہمارا پڑوسی ملک بھارت ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا۔ لیکن اس نے ۱۹۴۹ء میں اپنے آئین کی تدوین کر لی اور ۱۹۵۰ء میں یہ آئین نافذ بھی ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی نئے آئین کے تحت انتخابات بھی کرا لیے گئے۔ لیکن ہمارا حال یہ رہا کہ ہم قرآن حکیم میں مذکور ہونے والی اس "بڑھیا" کی مانند جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سوت کاتتی تھی۔ کاتا ہوا سوت ادھیڑ دیتی تھی اور پھر کاتنے لگ جاتی تھی۔ ہم آئین بناتے تھے، اسے منسوخ کرتے تھے، پھر بناتے تھے اور پھر منسوخ کر دیتے تھے۔ آج بھی میں اس آئین ساز اسمبلی میں، آئین پر ہونیوالی تقریروں کے مباحث پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ صورت نظر آتی ہے کہ بعض وہ بنیادی مباحث بھی جو پاکستان کے قیام کے پہلے دن ہی طے ہو چکے تھے اور جن کے طے ہوئے بغیر پاکستان کا قیام ہی ممکن نہ تھا انہیں پھر بنیادی مسائل بنا کر معرضِ بحث میں لے آیا گیا ہے اور وہ باتیں آج محلِ نظر بنا دی گئی ہیں۔ جن پر ہمارے قومی وجود کا اور ہماری قومی انا کا دارومدار ہے۔

یہ بات ہم سب جانتے کہ پاکستان "دو قومی نظریے" کی بنیاد پر قائم ہوا ہے لیکن چونکہ ہمارے ہاں اب یہ فیشن سا ہو گیا ہے کہ باہر کا کوئی مصنف یا مفکر کوئی نظریہ پیش کر دے تو ہمارے لوگ اس پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ اس لیے ایک روسی مصنف کی تقلید میں اور اس مصنف سے پہلے بھی ایک مخصوص نظریۂ قومیت پیش کرنے والوں کی تقلید کرتے ہوئے اس معزز ایوان میں ہمارے کچھ دوست اس نظریے کے پرچارک بن کر سامنے آئے۔ میرے دوست جناب بزنجو کا کہنا یہ ہے کہ "ہمارے ملک میں چار قومیتیں ہیں اور ان سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔" اور اس ضمن میں انہوں نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں، جن کی طرف اگر میں اپنی تقریر کے آغاز ہی میں توجہ نہ دوں تو شاید، اپنے خیالات کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں۔ میں اس مرحلے پر صرف قرآن حکیم کے حوالے سے بات نہیں کروں گا۔ قرآن حکیم کے فرمودات کا تعلق براہِ راست ایمان اور یقین سے ہے وہاں عقلی استدلال پر انحصار نہیں، درآں حالیکہ ہمارے بزعم خود "جدید ذہن" رکھنے والے، اور "آزاد خیال"

کہلانے والے لوگ عقلی استدلال کی طرف دوڑتے ہیں۔

قومیتوں کا مسئلہ :

جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم نے صاف صاف کہا ہے کہ قومیت، عقیدے اور نظریے کی بنیاد پر بنتی ہے۔ نسل، رنگ اور وطن کی بنیاد پر نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن حکیم میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "اے اہل عرب!" اور یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "اے اہلِ عجم!" وہاں تو صرف ایک ایسے گروہ کو نام لے کر نسلی قومیت کے حوالے سے پکارا گیا ہے۔ جس کا نسلی افتخار اس کو لے ڈوبا۔ اور اس نسلی افتخار کی وجہ سے وہ راندۂ درگاہ ٹھہرا اور ملعون و معتوب ہوا اور آج تک ملعون و مقہور ہے۔ وہ گروہ "بنی اسرائیل" کا گروہ ہے اس گروہ سے قطع نظر، قرآن حکیم میں انسانوں کی کسی جماعت کو اس کے وطن کی نسبت سے خطاب نہیں کیا گیا۔ یہ تو ہوئی قرآن حکیم کی بات۔ میں کہتا ہوں کہ جب ہم جدید مفکرین کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی ایک دوسرے انداز میں قرآنِ حکیم کے ان نظریات کی اپنے لفظوں میں توثیق کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات کہ مسلمان جس علاقے میں بھی رہتا ہو وہ پہلے مسلمان ہے بعد میں کچھ اور۔ یہ بات کہ کسی ایک ملک میں قومیتوں کا تو کیا سوال، مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں میں رہنے والے مسلمان بھی، حقیقت میں ایک قوم ہیں، ایسی قوم ہیں جسے غیر مسلم مفکرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس مرحلے پر میں ٹائن بی کا وہ نظریہ اور اس کے دانشورانہ مطالعہ کا مُلخّص پیش کروں گا۔ جو اس نے مسلمان قوم کے بارے میں سپردِ قلم کیا ہے۔

"Study of History" جلد اوّل میں ٹائن بی نے صفحہ ۶۸ پر لکھا ہے کہ :-

> 'The society that has become the Islamic society of today first emerged in a zone of territory extending from the Asiatic hinterland of the sea of Marmora to the delta of the Ganges. This zone was narrow relativly to its length but for the most part it consisted of a single chain of countries—Anatolia. Azerbaijan. Khurasan. Afghanistan and Hindustan

and the narrow passages of the plains which cover the plains of northern India from the Punjab to Bengal''.

"یعنی آج جو اسلامی سوسائٹی بنی ہوئی ہے، اس خطے سے اُبھری ہے جو ایشیا کے اندرُونی حصے میں بحیرۂ ماحورا سے دریائے گنگا کے ڈیلٹا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ خطہ لمبائی کے مقابلے میں قدرے تنگ ہے اس کا بیشتر حصہ مختلف ملکوں کے ایک سلسلہ یعنی اناطولیہ، آذر بائیجان، خراسان، افغانستان اور ہندوستان اور پنجاب سے لے کر بنگال تک کے علاقے پر مشتمل ہے۔" یہ ایک غیر مسلم مفکر کا نقطۂ نظر ہے۔ وہ تمام سلسلۂ ممالک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو ایک قوم سمجھتا ہے اور اس کے ہر فرد کو "ایک اسلامی معاشرے" کا فرد سمجھتا ہے اور حقیقت میں "مسلمان قوم" کا مطلب ہے، ہی یہی کہ جو مسلمان ہے وہ وسیع تر "اسلامی معاشرے" کا فرد ہے اور جو شخص علاقائی نسلی اور لسانی تعصبات سے بلند ہو کر اسلامی معاشرے کا فرد نہ بنے۔ وہ مسلمان قوم سے عملی طور پر الگ ہے۔ اگر میں تفصیلات میں چلا جاؤں تو یہ بحث طویل ہو جائے گی۔

علاقائی زبانیں اور کلچر

لیکن جناب والا! آج کچھ لوگ زبان اور کلچر کی بنیادوں پر الگ الگ قومیتوں کے قائل ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ پاکستان میں ایک قومیت نہیں ہے بلکہ چار یا پانچ قومیتیں ہیں۔ اگر زبان کی بات کی جائے تو میں مانتا ہوں کہ ہماری علاقائی زبانیں بھی ہیں۔ اور ہمیں ان علاقائی زبانوں، ان کے ادب اور ان کی ثقافتی خوبیوں پر ناز ہے۔ ان کا ادبی ورثہ ہمارا ادبی ورثہ ہے۔ وہ بھی ہمارے ہی وطن عزیز کی زبانیں ہیں اور ہمارے دلوں میں ان زبانوں کے لیے محبت ہے۔ ان کے خلاف تعصب نہیں۔ بلکہ پچھلی حکومتوں نے ان زبانوں کے ساتھ جو تعصب رَوا رکھا، ہم اس کے مخالف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان علاقائی زبانوں کے بارے میں ایک نظر سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مختلف زبانیں بولنے اور لکھنے والے ان پاکستانی مفکرین اور مصنفین

نے جو نغمہ الاپا ہے اور جو پیغام دیا ہے وہ متحدہ مسلم قومیت کا پیغام ہے اور یہی روح ہے جو ان سارے مصنفین اور سارے صوفیاء اور سارے اکابرین کی تصنیفات میں اور ان کے پیغام میں جاری و ساری ہے۔ سرحد کا خوشحال خاں خٹک ہو یا پنجاب کا بلھے شاہ، سندھ کا قلندر شہباز ہو یا بلوچستان کا توکلی مست، کوئی بھی شاعر یا ادیب ہو، صوفی یا درویش، ان سب کے کلام میں، ان سب کی تخلیقات میں، ان سب کے افکار میں، ان سب کی گفتار میں آپ دیکھیں گے کہ ان کا پیغام کسی خاص علاقے کے لیے نہیں، وہ ایک تنگ دائرے میں محصور ہو کر نہیں سوچتے بلکہ تمام مسلمانوں کو ایک ہی قوم کا فرد تصور کر کے خطاب کرتے تھے۔ اگر محض زبان ہی قومیت کی بنیاد ہو تو بزنجو صاحب جانتے ہیں کہ ان کے اپنے صوبے میں صرف ایک زبان نہیں بولی جاتی۔ اس صوبے میں بلوچی بولی جاتی ہے۔ براہی بولی جاتی ہے۔ پنجابی بولی جاتی ہے اور پشتو بھی بولی جاتی ہے تو مختلف قومیتوں کا تصوّر پیش کرنے والوں کے اندازِ نظر سے اس کا مفہوم یہ ہوا کہ پاکستان میں چار قومیتیں نہیں ہیں بلکہ تنہا بلوچستان میں چار قومیتیں آباد ہیں۔ فکر کا یہ انداز قطعاً صحت مندانہ نہیں ہے اس لیے پاکستان کے لوگوں کے لیے اس طرح کے تصورات پیش کرنا ایک اچھا فعل نہیں۔ پھر ہمارے بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ قومیت کلچر کی بنیاد پر بنتی ہے اور ہمارے کلچر الگ الگ ہیں۔ مختلف صوبوں کے کلچر الگ الگ ہیں۔ مَیں مانتا ہوں کہ ہمارے مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان رسم و رواج، رہن سہن اور پسند ناپسند میں تھوڑا بہت ظاہری فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن بنیادی فرق کوئی نہیں۔ اصل چیز جس سے کلچر کی بنیاد پڑتی ہے اور اسے ارتقا حاصل ہوتا ہے وہ اس کا بنیادی نظریہ اور اس نظریے پر یقین ہے اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ بلکہ ایک مشہور مصنف ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے جس نے اپنی کتاب

"Notes Towards the Definition of Culture".

میں کلچر کے متعلق اس طرح کا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"The conception of culture and religion as

being, when each is taken in the right context, different aspects of the same thing is one which requires a good deal of explanation. But I should like to suggest first that it provides us with the means of combating two complimentary errors. The one more widely held is that culture can be preserved, extended and developed in the absence of religion''

یعنی "مذہب کے بغیر نہ تو کسی ثقافت کا وجود ہوتا ہے نہ اس کی توسیع کی جا سکتی ہے اور نہ اس کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔" تو ہر چند کہ ہمارے کلچر جدا جدا ہوں یعنی تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ ان میں فرق ہو لیکن ان کی بنیاد تو ایک ہی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی عقیدے پر قائم ہیں۔ وہ ایک ہی مذہبی روح کے مظہر ہیں، اور یہی وہ بات تھی جسے جد و جہد پاکستان کے وقت قائد اعظمؒ نے پیش کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ "اس برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں۔ ان دونوں کا تاریخی تصور جدا ہے، ان کی ثقافت جدا ہے اور ان کی پسند و ناپسند جدا ہے۔" اس زمانے میں جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہاں برصغیر میں دو کلچر اور دو ثقافتیں ہیں تو مختلف علاقوں کے رہنے والے مسلمانوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کی بات صحیح نہیں، صرف ہم مسلمانوں کا کلچر جداگانہ نہیں، مختلف علاقوں کے اپنے اپنے کلچر ہیں اور خود مسلمانوں کے بھی کئی کلچر ہیں۔ اُس وقت سب نے مل جُل کر اور بالکل متحد ہو کر قائد اعظمؒ کے جھنڈے کے نیچے اس جد و جہد آزادی میں حصہ لیا تھا اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے مسلمان حقیقت میں ایک ہی کلچر کو مانتے ہیں۔ ان کا تصورِ حیات ایک ہے اور وہ سب ایک ہی تاریخ کو تسلیم کرتے ہیں۔ افسوس کہ یہ نقطۂ نظر آہستہ آہستہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ خود قائد اعظمؒ مرحوم نے اپنی فراست مندانہ بصیرت سے اپنی زندگی ہی میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ کچھ ایسے عناصر پاکستان میں موجود ہیں، جو آگے چل کر مختلف قومیتوں کی بات کریں گے اور پاکستان میں رہنے والوں کو بنگالی پنجابی سندھی اور بلوچی وغیرہ کے تعصبات میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنی کئی تقریروں میں اس آئندہ ابھرنے والے احساس اور خیال پر بھرپور تنقید کی۔ یہ ان کی فراست مندی

اور مستقبل کو دیکھنے والی نگاہ تھی کہ انہوں نے اپنے بعد آنیوالے زمانے میں پیدا ہونے والے اس خطرے کو پہلے ہی بھانپ لیا کہ مستقبل میں اس کے منحوس سائے پاکستان پر پڑیں گے۔ اس ضمن میں قائد اعظمؒ کی فقط دو تقریروں کے مختصر اقتباسات آپ کے سامنے رکھوں گا۔ پہلی تقریر وہ ہے جو انہوں نے ۲۸ مارچ کو ڈھاکہ میں کی تھی۔ اس تقریر میں قائد اعظمؒ نے فرمایا :

> "Pakistan is the embodiment of the unity of the Muslim nation and so it must remain. That unity we as true Muslims must jealously guard and preserve. If we begin to think of ourselves as Bengalis, Punjabis and Sindhis first and Muslims and Pakistanis only incidentally, then Pakistan is bound to disintegrate. Do not think that this is a mere abstruse proposition: Our enemies are fully alive to its possibilities which I must warn you, they are al ready busy exploiting"

یعنی "پاکستان مسلمان قوم کے اتحاد کا مظہر ہے اور اسی انداز سے قائم رہے گا۔ سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں بڑی چوکسی کے ساتھ اس اتحاد کا تحفظ کرنا اور اسے قائم رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنے آپ کو بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ پہلے اور پھر اتفاقی طور پر "مسلم" اور پاکستانی سمجھنا شروع کر دیں تو پاکستان کا شیرازہ لازماً بکھر جائے گا۔ اس بات کو محض ایک خیالی مسئلہ نہ سمجھیں۔ ہمارے دشمن اس کے امکانات سے پوری طرح باخبر ہیں اور میں آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ان امکانات کو اُبھارنا شروع کر دیا ہے۔"

چشمِ بصیرت کی ضرورت :

اس کے بعد جناب والا ! قائد اعظم مرحوم نے ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے مقام پر تقریر کرتے ہوئے کہا اور میں نہیں جانتا کہ یہ بات کہنے کے لیے قائد اعظم کی نگاہِ فراست نے اس مقام کو کیوں منتخب کیا تھا آیا یہ محض اتفاق تھا یا اس کے اندر کوئی خاص بات تھی، جسے بلوچستان کی نمائندگی

کا دعویٰ کرنے والے مجھ سے بہتر جان سکتے ہیں۔ قائد اعظم مرحوم نے کہا:

> Baluchistan is the land of brave independent people and to you, therefore, national freedom, honour and strength should have a special meaning. These Whisperings of 'Mulki' and 'non-Mulki' are neither profitable for the land nor worthy of it. We are now all Pakistanis, not Baluchis, Pathans, Sindhis, Bengalis, Punjabis and so on and as Pakistanis we, must feel, behave and act and we should be proud to be known as Pakistanis and nothing else...... .."

قائد اعظم مرحوم نے واضح الفاظ میں یہ بات کہہ دی کہ "بلوچستان بہادروں کی سرزمین ہے۔ لیکن یہاں کچھ عرصہ سے جو اس طرح کی سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ کون "ملکی" ہے اور کون "غیر ملکی" ہے۔ اس طرز پر ہم کو نہیں سوچنا چاہیئے۔ ہم بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی کے چکر میں نہ پڑیں، بلکہ ہم یہ سمجھیں کہ ہم 'پاکستانی' ہیں صرف 'پاکستانی' ہیں اور اس کے سوا ہماری کوئی حیثیت نہیں۔" یہ وہ چیز تھی جسے قائد اعظم مرحوم نے پیش کیا۔ لیکن ان کے بعد ہم آہستہ آہستہ اس تصور کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کرتے چلے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار پاکستان کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے دیکھ لیا۔

"مشترک ہیں مگر سرحدیں قلب کی"

میں نہیں کہتا کہ جب کوئی دوست علاقائی قومیت کی بات کرتا ہے تو ہم اس کی تردید کرتے ہوئے جائز علاقائی حقوق کو پامال کرنے لگیں یا اس استحصال کو نظر انداز کر دیں جو پچھلے دور میں مختلف علاقوں کا ہوتا رہا ہے۔ یقیناً مختلف علاقوں اور مختلف صوبوں کو ان کے حقوق ملنے چاہئیں۔ یقیناً تمام زبانوں کو پھلنا پھولنا چاہیئے۔ یقیناً تمام زبانوں کے ادبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت ہونی چاہیئے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ قومیتوں کی تبلیغ اور صوبائی عصبیت کو ابھارنا خصوصاً اس وقت جب کہ ہم

ایک پاکستان کے لیئے ایک متحد، ہم خیال اور ہم عقیدہ پاکستان کے لیے آئین بنانے بیٹھے ہیں۔ یہ عصبیت ہماری وسیع تر قومیت کے لیے سم قاتل سے بدتر ہے۔ اس لیے میں اپنے تمام معزز ارکان اسمبلی سے درخواست کروں گا کہ جب وہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی میں بیٹھیں تو از راہِ کرم اس بنیاد کو فراموش نہ کریں۔ جس بنیاد پر پاکستان قائم ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم بنگالی ہیں، ہم پنجابی ہیں یہ ٹھیک ہے ہم سرحدی ہیں، یہ ٹھیک ہے ہم سندھی ہیں۔ ہم بلوچی ہیں۔ لیکن اس چیز سے بھی ہمیں صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیئے کہ:

اہلِ بنگال ہم اہلِ پنجاب ہم مشترک ہیں مگر سرحدیں قلب کی
ہم بلوچی بھی، سندھی بھی، افغان بھی، سب سے پہلے مگر ہیں مسلمان بھی

۱۹۵۶ء کے آئین سے موازنہ:

جناب والا! اس ایوان میں زیرِ بحث آنے والے اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرنے کے بعد اب میں بعض ان معاملات کا تذکرہ کروں گا۔ جن پر اعتراضات کیے گئے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان معترضین میں ہمارے بعض وہ فاضل علماء ہیں جو اسلام نواز اور اسلام دوست ہیں میں انہیں اسلام پسند تو نہیں کہنا چاہتا۔ علاوہ ازیں وہ دوست بھی ان میں شامل ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہمیں بہت زیادہ اسلامیت پیشِ نظر رکھنی چاہیئے۔ یہ وہ صاحبان ہیں جن کے مکتبۂ فکر کی طرف سے ۱۹۵۶ء کے مسودہ آئین کو ہمیشہ ایک مقدس صحیفہ کی صورت میں اہل وطن کے سامنے پیش کیا گیا بلکہ ایک زمانے میں ان کا ارشاد یہ تھا کہ کسی نئے آئین کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ "یہاں ۵۶ء کا ایک بہترین آئین ہمارے سامنے موجود ہے اس کو نافذ کر دینا چاہیئے۔ نئے آئین کے بکھیڑے میں ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔" میں ان دوستوں کو اگر وہ بھول گئے ہوں تو ان کا حافظہ تازہ کرنے کے لیے انہیں یاد دلاؤں گا کہ جس روز ۱۹۵۶ء کا یہ آئین بن کر نافذ ہوا تھا وہ ۲۳، مارچ ۱۹۵۶ء کا دن تھا۔ اس پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں

اس کی اپریل ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ "دستور کا خیر مقدم جس جوش وجذبے کے ساتھ نے کیا، اور یوم جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی تقریب جس دلی ذوق وشوق سے منائی، اس کا انہیں منانے کا حق پہنچتا تھا۔ یوم آزادی کی سرکاری تقریب کے مقابلے میں یہ تقریب صحیح معنوں میں عوامی تھی۔ اور اسی درجے اس کا معیار اور پیمانہ اونچا رہا۔ پاکستان کی ایک ایک مسجد میں اسلام اور پاکستان اور ملت کی سربلندی کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ دستور کے موضوع پر جامع مسجدوں میں خطبات دیے گئے۔ جلسوں میں اسلامی نظام پر تقریریں کی گئیں شکرانے کے نوافل پڑھے گئے۔ غریبوں کو کھانے کھلائے گئے اور مختلف اسالیب سے لوگوں نے اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا۔ یہ فی الواقع ایک حقیقی مسرت کا موقع تھا۔ ہماری سیاسی اور قومی تاریخ میں ایک بڑا دن ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کا تھا اور اب دوسرا بڑا دن ۲۳ رمارچ ۵۶ء کا دن قرار پایا۔"

یہ آئین ان دوستوں کے نزدیک اس حد تک اہم تھا اور اس حد تک اسلامی تھا کہ اس کے نافذ ہونے پر ان کے بقول سجدہ ہائے شکر ادا کیے گئے، نوافل پڑھے گئے، شیرینیاں بانٹی گئیں۔ لیکن جناب والا میں نے ۱۹۵۶ء کا آئین پڑھا ہے، بالاستیعاب پڑھا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اگر ۱۹۵۶ء کا آئین اسلامی تھا تو ۱۹۷۳ء کا یہ آئین جسے ہم آج پیش کر رہے ہیں اس میں وہ کونسی کمی رہ گئی ہے یا ۱۹۵۶ء کے آئین میں جسے ہر لحاظ سے جامع اور مکمل کہا جاتا ہے، وہ کون سا سُرخاب کا پَر تھا جو اس ۱۹۷۳ء کے آئین میں نہیں ہے جب میں اسلامی دفعات کو دیکھتا ہوں تو اسلامی دفعات کے لحاظ سے بھی یہ آئینی مسودہ جسے ہم نے پیش کیا ہے کہیں زیادہ جامع اور مانع ہے ۱۹۵۶ء کے آئین کی دفعات سے کہیں زیادہ بہتر دفعات اس آئین کے مسودہ میں شامل ہیں، جو آج ۱۹۷۳ء میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک خامی اس میں البتہ موجود ہے اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس تقصیر کے ہم مجرم ہیں اور اگر یہ جُرم ہے تو ہم اقراری مجرم ہیں، اور وہ تقصیر یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین قدرے اور طرز کا آئین تھا اور یہ ۱۹۷۳ء کا آئین ذرا مختلف طرز کا آئین ہے اور کچھ فرق ان میں ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے دوست اسلام کے نقطۂ نظر سے صدارتی نظام پر ریجھے

ہوئے تھے اور صدارتی نظام ان کو اسلام کے زیادہ قریب نظر آتا تھا اور پاکستان کے صدر کو صدارتی نظام میں زیادہ اختیارات حاصل تھے اور جب تک ذوالفقار علی بھٹو برسر اقتدار نہ تھے اور جب پاکستان پیپلز پارٹی برسر حکومت نہ تھی، اسوقت تک صدارتی نظام ہی اسلام کے عین مطابق تھا۔ لیکن پاکستان پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی اور صدارتی نظام قائم ہوا تو پھر انہوں نے کہا کہ پارلیمانی نظام اسلام کے زیادہ قریب ہے۔ اس میں اسلام کی زیادہ روح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرات جس طرف چاہتے ہیں اسلام کا منہ موڑ دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ زیادہ جمہوری ہے گویا اسلام نہ ہوا غریب موم کی ناک ہوئی۔ جس وقت چاہا، جدھر چاہا اس کو موڑ دیا

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار،
شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا!

جناب والا! جب میں ۱۹۵۶ء کے آئین کے مسودے کو دیکھتا ہوں تو ٹھیک ہے کہ اس میں قرارداد مقاصد شامل ہے۔ لیکن قرارداد مقاصد ہمارے اس آئین کے مسوّدے میں بھی شامل ہے۔ اگر میں اس میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں اسلامی قانون کے ضمن میں ایک کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اور اس کا انتظام کیا گیا تھا تو میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اس آئین میں ایک اسلامی کونسل قائم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے ۱۹۵۶ء کے آئین میں کمیشن قائم کرنے کے ضمن میں کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔ کوئی Qualification بیان نہیں کی گئی۔ کوئی صفت بیان نہیں کی گئی کہ کمیشن کا ممبر کون بن سکے گا۔ یہ سب کچھ صدر عالی قدر کی طبع نازک پر محمول کیا جانا لازم تھا کہ وہ جسے چاہیں کمیشن کا ممبر بنائیں جسے چاہیں کمیشن کا ممبر نہ بنائیں۔ لیکن اس آئین کے مسودے میں پہلی دفعہ Qualification مقرر کی گئی ہے اور ۸ ممبروں میں ۴ ممبروں کے لیے یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ چار ممبر کم از کم ۱۵ سال اسلام کی ریسرچ اور تدریس کا کام کر چکے ہوں۔ تب وہ اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبر بن سکتے ہیں اور اس مسودۂ دستور میں جناب! جو ایک "مقدس صحیفہ" تھا۔ اس میں پہلی دفعہ اسلام کے ساتھ ناروا اور یہ ظالمانہ مذاق روا رکھا گیا کہ اس کے اندر مسلّمہ مسلمان فرقوں

کو تحفظ دینے کا ذکر موجود ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ توحید پرست اور وحدتِ اسلامی پر اور ملت کی یک جہتی پر ایمان رکھنے والے لوگ اور اسے نظریے کے طور پر پیش کرنے والے لوگ ان فرقوں کے وجود کو مسلم اسلامی فرقے کی حیثیت میں اس آئین میں پیش ہوتا دیکھ کر کیوں چیں بہ جبیں نہ ہوئے تھے اور کیوں انہوں نے اپنے توثیقی دستخط ثبت کیے تھے اور اسے منظور کیا تھا کہ وہ فرقے حقیقت میں اسلام کے اندر تعصب پیدا کریں، اس کے اندر تفرقے اٹھائیں اور اس کے اندر انتشار بڑھائیں۔ اسلام کا مجھ سا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے کہا ہے:
ولاتکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ "اے اہلِ ایمان ان مشرکین میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اپنے آپ کو جنہوں نے فرقوں میں بانٹ دیا۔ ملت کو فرقہ فرقہ کر دیا اور اگر وہ گروہ میں بٹ گئے اور جنہوں نے الگ الگ جماعتیں بنالیں۔ الگ الگ ٹولیاں بنالیں۔ الگ الگ فرقے بنالیے۔ ان مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔"

•

گویا اسلام کے نزدیک "فرقہ بندی" شرک کے ہم معنی ہے۔ شرک کے مترادف ہے لیکن اس شرک اور اس فرقے کو اس آئین میں سندِ جواز عطا کی گئی اور تفرقہ کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا۔ پھر میں ایک اور اندھیرا اس آئین میں دیکھتا ہوں، جس سے یہ آئین پاک ہے اس فرقہ بندی سے بھی پاک ہے۔ کیوں کہ اس میں پہلی دفعہ تفرقہ بندی کے شرک کی جگہ "سکول آف تھاٹس" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں جس چیز کو فرقے کہا جاتا ہے حقیقت میں وہ "سکولز آف تھاٹ" ہیں۔ فرقے نہیں ہیں۔ الگ الگ امتیں نہیں ہیں اور کسی مذہب میں، کسی علم میں، کسی نظریے کے ادارے میں "سکولز آف تھاٹ" کا ہونا اس نظریے کو آگے بڑھانے اور اس کی نشر و اشاعت کرنے میں ہمیشہ ممد و معاون ہوتا ہے لیکن فرقہ بندی اس کے لیے ہمیشہ مہلک ہوتی ہے۔ یہ آئین اس سے پاک ہے۔ تیسرا اندھیر جس سے یہ آئین پاک ہے اور وہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں تھا، یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں "پرسنل لار اور پبلک لار" کی تجویز رکھی گئی تھی

یہ کہا گیا تھا کہ مختلف فرقوں کے جو پرسنل لاز ہیں، انہیں ان پر عمل کرنے کی اجازت ہے۔ میں نہیں جانتا کہ جو لوگ دین اور سیاست کے ایک ہونے کے علمبردار ہیں۔ جو لوگ دین کو ضابطہ حیات کہتے ہیں، وہ پرسنل لاز، اور پبلک لاز کی تفریق میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ دو غلا پن، یہ ڈوئلزم ان کو کیسے نظر آ گئی جو اسلام میں موجود نہیں۔ اگر یہ وہ مذہب ہوتا جو پاپائیت کا نتیجہ ہے، یہ وہ مذہب ہوتا جو عیسائیت کا نتیجہ ہے۔ جس میں قیصر اور خدا کے حصے الگ الگ ہیں تو پھر یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن وہ اسلام جس کے ہم اور آپ امین ہیں۔ اس کے ہوتے ہوئے، اس پر ایمان رکھتے ہوئے یہ پرسنل لاز اور اس کا اطلاق ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس آئین میں یہ چیز نہیں ہے اور یہ آئین اس تفریق و امتیاز سے پاک ہے۔ آئین ساز کمیٹی میں اس پر اچھی خاصی گفتگو ہوئی اور جب، ہم نے ان اصحاب کرام کی خدمت میں گزارش کی کہ یہ اسلام کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہے تو خدا کا شکر ہے اور میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ ہماری بات سمجھ میں آ گئی اور ۱۹۵۶ء کے مسودہ کا یہ آئینی نقص اس آئین کے مسودے سے ختم کر دیا گیا۔ اس کے باوجود جناب والا، ۱۹۵۶ء کا آئین سجدہ ہائے شکر کا مستحق تھا اور یہ جو ۱۹۷۳ء کا آئین ہے، یہ ایک ردی کاغذ کا پرزہ ہے، یہ ناکارہ ہے۔ یہ خلافِ اسلام ہے، یہ خلافِ جمہوریت ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ کہا گیا ہے کہ اسلامک کمیشن جو رپورٹ پیش کرے گا۔ آئین میں اس کی مدت پانچ سال ہے۔ پانچ سال میں وہ رپورٹ پیش کرے گا اور اس کے چھ مہینے کے اندر اس رپورٹ کو اس اسمبلی کے سامنے لایا جائے گا۔ اس آئین میں یہ کہا گیا ہے کہ سات سال کے اندر وہ رپورٹ پیش کی جائے گی، اور اس پر ہمارے دوستوں کو بہت شکوہ ہے، بہت گلہ ہے، بہت غصہ ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ ظالمانہ مذاق ہے اور قانون کو معرضِ تعویق میں ڈالنے کا ایک حربہ ہے۔ ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے اسلامی قانون کے نفاذ میں تاخیر پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن میرے دوست ناراض نہ ہوں، اگر میں ان سے گزارش کر دوں، کہ جناب والا! آپ بھولتے ہیں تو میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ اس زمانے میں اس سوال کے

جواب میں کہ آئین اور قانون کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے کتنی مدت درکار ہوگی؟ آپ نے جو مدت مقرر کی تھی، اس مدت سے کم مدت ہم نے تجویز کی ہے۔ آپ سے رہنمائی لیں، تب بھی ہم خطاوار اور آپ سے رہنمائی نہ لیں تب بھی خطاوار۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں، یہاں میرے پاس ایک کتاب "اسلامک لاء اینڈ کنسٹیٹیوشن" ہے، اس کے مرتب ہیں پروفیسر خورشید احمد، ایم اے، جماعت اسلامی پبلیکیشن کراچی۔ یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے دستوری مضامین کا مجموعہ ہے اس دستوری مضامین کے مجموعے میں ایک آئینی تجویز جو مولانا مودودی نے اس وقت کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے پیش کی تھی اس طرح ہے کہ :

> "All the existing laws of the land shall be brought in conformity with the Islamic Shariah within a prescribed period which shall not exceed ten years in any case"

اس کے اندر انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام موجودہ قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق بنانے کے لیے دس سال سے متجاوز مدت نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ تجویز پیش کریں کہ دس سال کے اندر اندر یہ کام سرانجام پائے تو آپ اسلام کے خادم اور اگر ہم سات سال کی تجویز پیش کریں۔ تو ہم اسلام کے ہادم۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ تفریق کیوں ہے ؟ پانچ سال کی اس مدت میں جو ۱۹۵۶ء کے آئین میں رکھی گئی یہ شرط نہ تھی کہ ہر سال کے اختتام پر مشاورتی کمیشن کی رپورٹ پیش کی جایا کرے گی لیکن ہمارے آئین میں یہ بات موجود ہے کہ ہر سال اس مشاورتی کونسل کی رپورٹ اس ہاؤس میں پیش کی جایا کرے گی ؛ تاکہ وہ اس کی کارکردگی کا جائزہ لے سکے۔

لونڈیوں اور غلاموں کا مسئلہ :

اس کے بعد میں ایک اور چیز کی طرف آتا ہوں جس کی بنا پر دوسری طرف سے کہا جاتا

ہے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین اسلامی تھا اور ۱۹۷۳ء کا آئین اسلامی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خرابی جس کا ذکر میرے فاضل دوست مولانا نعمت اللہ نے کیا ہے۔ ان حضرات کو کھٹکھٹانے کا باعث ہوئی ہو۔ جمعیت کے سبھی حضرات میرے بزرگ ہیں اور میں ان کا احترام کرتا ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ انہوں نے جن نظریات کا اظہار کیا ہے اگر وہ محض ان کے شخصی ہوتے تو میں ان کو نظرانداز کر دیتا اگر یہ نظریات ان کے انفرادی ہوتے اور بہت سے حضرات ان کی تائید کرنے والے نہ ہوتے اور خود اپوزیشن میں بیٹھنے والے علماء نے ان کا نوٹس نہ لیا ہوتا تو میں بھی ان کا نوٹس نہ لیتا۔ لیکن جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس تجویز کا نوٹس اس مرحلہ پر نہ لوں تو شاید یہ ایسی فروگذاشت ہو گی کہ آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔ کیونکہ اسلام کے نام پر ایک ایسی تجویز رکھی گئی ہے جو علم اور سائنس کے اس دور میں اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن سکتی ہے۔ ان بزرگوں نے کہا ہے کہ آئین کے اندر غلامی کا اور غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر نہیں کیا گیا اور انہی کی طرف سے کہا گیا ہے کہ غلام اور لونڈیاں ہونی چاہئیں۔ وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ جب بھی حزبِ اقتدار کی طرف سے بات ہو تو اس کی ضرور مخالفت ہونی چاہیئے لیکن جب حزبِ مخالف کی طرف سے اسلام کے نام پر کوئی غلط بات ہو تو الخاموشی نیم رضا کے تحت اس پر چُپ سادھ لی جائے۔ یہ کوئی صحیح نقطۂ نظر نہیں ہے۔ میں ان مجبوریوں کو جانتا ہوں جن کی اس میں تصریح نہیں کی گئی ہے کیونکہ ہمارے بزعم خویش بڑے بڑے مفکرین وہی نظریہ رکھتے ہیں جس کا بیان مولانا نعمت اللہ نے اپنی سادگی اور بہادرانہ طبیعت کی وجہ سے کر دیا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جب حضرت مولانا شاہ احمد صاحب نورانی صدیقی تقریر فرمائیں گے تو اپنے خطبے میں انشاء اللہ اس تجویز کی تائید ضرور کریں گے جو مولانا نعمت اللہ نے فرمائی تھی۔

جناب والا! اس تجویز میں یہ کہا گیا ہے کہ "غلامی ہونی چاہیئے۔ غلاموں اور لونڈیوں کی اجازت ہونی چاہیئے۔" میں اس علمی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا جو اس موضوع پر ناگزیر ہو جاتی ہے اور جس میں تمام تفصیلات لانی پڑتی ہیں، لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جس اسلام نے غلامی

کا سدِباب کیا۔ جس اسلام نے سب سے پہلے غلامی کا رواج ختم کیا اور روشن خیال دنیا کو بھی رفتہ رفتہ جس اسلام کے حریت پسندانہ نظام کی بدولت یہ جرأت اور ہمت ہوئی کہ وہ غلامی کو ختم کر دے۔ اُس اسلام کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ غلام اور لونڈیاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ مَیں مختصراً دو چار منٹ میں عرض کروں گا کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس وقت غلام بنانے کے لیے دو طریق کار رائج تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ مسلح اور منظم گروہ آزاد لوگوں کو پکڑتے تھے اور پکڑ کر ان کو اس طرح بیچتے اور خریدتے تھے جس طرح مویشی بیچے اور خریدے جاتے تھے دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جنگ کے نتیجہ میں جو لوگ پکڑے جاتے تھے انہیں لونڈی اور غلام بنا لیا جاتا تھا جہاں تک پہلے طریقے کا تعلق ہے۔ سرکارِ دو عالم رحمت اللعالمین امام المرسلین خاتمُ النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور صحیح بخاری میں حضورؐ کی یہ حدیث موجود ہے کہ "جو شخص کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنائے گا اور اس کی خرید و فروخت کرے گا، قیامت کے دن اس کے خلاف مدعی مَیں خود ہوں گا۔"

اور جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ جنگ سے جو لوگ پکڑے ہوئے آئیں ان کو غلام بنا لیا جائے یا ان کو لونڈیاں بنا لیا جائے یا ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ وہ ان سے تمتع کریں اور ان سے فائدہ اٹھائیں تو جناب والا! قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ فاما منّا بعد واما فداء[1] کہ "اگر ان کو جنگ کے بعد پکڑا جائے تو جنگی قیدیوں کو یا تو احسان کر کے رہا کر دیا جائے یا ان سے فدیہ لیا جائے۔"

---

[1] فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا ۔ (محمد ۴۷-۴)
مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں جنگی قیدیوں کی رہائی کے متعلق فرمائے ہوئے دو متبادل طریقوں میں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے طریقہ یعنی جنگ کے خاتمہ کے بعد احسان کے طور پر قیدیوں کو رہا کر دینے کا طریقہ زیادہ پسند فرماتے تھے اور حضورؐ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے بعد یہی طریقہ اختیار فرمایا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اگر کچھ وقت کے لیے ناگزیر ہو تو ہم جنگی مصلحتوں کے تحت ان کو قیدی بنا کر رکھیں کیوں کہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے کہ حتی تضع الحرب اوزارھا۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یعنی اس وقت تک ہم ان کو رکھ سکتے ہیں، جب تک جنگ کی کیفیت ختم نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ ہم آج کے دور میں کہیں کہ ان کو لونڈیاں بنا لیا جائے یا غلام بنا لیا جائے یا ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح تقسیم کیا جائے

جناب والا! اگر خدانخواستہ آج ہمارے جنگی قیدیوں کے ساتھ اور ان کے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کسی ملک میں روا رکھا جائے تو پھر ہم احتجاج کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ میں اپنے بزرگ دوستوں سے کہوں گا، کہ خدا کے لیے اسلام کی تعلیمات پیش کرتے وقت وہ نقطہ ہائے نظر نہ اپنائیں جن کی ہنسی اور مذاق اُڑے اور جن کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے ذہنوں پر ملّت اسلامیہ کی غلط تصویر اُبھرے۔

اس کے بعد جناب والا! میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے دوستوں کو اس مسوّدہ آئین میں جو بات زیادہ کھلتی ہے اور جس پر انہیں بہت زیادہ اعتراض ہے، وہ ہے "تحدید ملکیت" کا نظریہ۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ حکومت کیوں کسی کی جائیداد لے سکتی ہے۔ قومی اور ملکی مصلحتوں کی وجہ سے کیوں اس کے اندر ایسی دفعات رکھی گئی ہیں؟ مَیں جانتا ہوں کہ اپوزیشن اس بات پر متفق الرائے نہیں ہے۔ ایک قطب شمالی پہ ہے اور ایک قطب جنوبی پر لیکن

یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لیے،
کہ متفق ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

آپ کو مبارک ہو کہ جہاں تک صدر بھٹو صاحب کے خلاف اور پیپلز پارٹی کے خلاف ہونے کا تعلق ہے وہ سب متفق ہیں۔ جہاں تک ہمارے سوشلزم کا تعلق ہے پیپلز پارٹی کے اسلامی سوشلزم کا تعلق ہے، وہ کفر ہے۔ وہ الحاد ہے لیکن میر غوث بخش بزنجو اور خان عبدالولی خان کا سائنٹیفک سوشلزم بھی ان دوستوں کے لیے قابل قبول ہے بلکہ وہ ان کو اپنا لیڈر اور اپنا

قائد بنانے کے لیے تیار ہیں اور یہ معیار الگ الگ اور یہ پیمانے الگ الگ ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کس لیے ہیں لیکن بہرحال گلہ نہیں۔ ۔ ۔

اسلام، سوشلزم اور جمہوریت

جناب والا! میر غوث بخش بزنجو صاحب نے یہ کہا ہے اور اپنے ان دوستوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے کہا ہے کہ اسلام، سوشلزم اور جمہوریت، یہ تین الگ الگ نظام ہیں۔ لیکن پیپلز پارٹی نے ان تینوں نظاموں کو ایک ہی سانس میں اپنانے کا اعلان کیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مَیں ان سے کہوں گا اس کی دلیل آپ ہم سے نہ پوچھیں، اپنے ان دوستوں سے پوچھیں جو اسلامی جمہوریت کے قائل ہیں۔ اگر جمہوریت غیر اسلامی چیز ہے۔ وہ الگ نظام ہے اور مغربی جمہوری نظام مشرف بہ اسلام ہو سکتا ہے تو غریب سوشلزم نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے اسلامی سوشلزم کہہ دینے سے آدمی گنہگار ہو جائے لیکن میں ان سے اتنا ضرور کہے دیتا ہوں کہ سوشلزم Individualism کے مقابلے کی اصطلاح ہے اور سوشلزم اسلام میں ہے بلکہ اسلام کا حصہ ہے بقول مولانا حسرت موہانی: "اگر کوئی شخص سوشلسٹ ہو اور مسلمان نہ ہو تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص مسلمان ہو اور کہے کہ مَیں سوشلسٹ نہیں ہوں۔" سوشلزم ایک مسلمان کی اجتماعی عدالت اور اجتماعی انصاف کے تصور اور عقیدے میں شامل ہے۔ وہ کبھی اجتماعی انصاف سے روگردانی نہیں کر سکتا اس لیے ہمیں سوشلزم کے ماننے میں کوئی عار نہیں۔ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ سوشلزم یا اجتماعی انصاف جسے اسلامی اصطلاح میں "العدالت الاجتماعیہ" کہا جاتا ہے، اسلام کا حصہ ہے۔ اس لیے ہمیں اس سے شرمانے کی ضرورت نہیں، البتہ میر صاحب نے ان تینوں کو الگ الگ اور "سیپریٹ" چیزیں قرار دیا ہے تو پھر مَیں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے کسی وقت الگ سے ہی بتا دیں، تاکہ یہ چیزیں "پرسنل ایکسپلینیشن" نہ ہو جائے کہ جناب آپ ہمیشہ یہ کہتے ہیں اور ہم سے اپنی صاف گوئی کی داد پاتے ہیں کہ آپ سوشلسٹ ہیں اور

چونکہ آپ اسلام اور سوشلزم کو دو الگ الگ نظام سمجھتے ہیں۔ تو پھر کیا آپ یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ آپ سوشلسٹ ہیں اور اسلام کو نہیں مانتے؟ اگر یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ نہ چل سکیں تو یہ آپ کے وجود باوجود میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ لیکن بہر حال میں اس وقت اس بات کو زیادہ طول نہیں دیتا کہ کہیں آپ پھر "پرسنل ایکسپلینیشن" پر نہ آجائیں۔ بعد میں آپ سے یہ سوال پوچھ لوں گا تاہم میں یہ کہتا ہوں کہ تحدید ملکیت کے سلسلے میں، ہم نے کوئی جرم نہیں کیا اس سلسلے میں تو ابھی ہم نے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ ابھی تو حدیں مقرر ہوں گی اور ہونی بھی چاہئیں۔ کیونکہ جو معاشی نظام اس وقت اس ملک میں قائم ہے۔ حقیقت میں اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظام جس کے اندر ایک شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو اور دوسرا شخص دجلہ سے لے کر فرات تک زمین کا مالک ہو حقیقتاً ایسے نظام سے اسلام کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسے ختم ہونا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ سارے کام "سٹیپ بائی سٹیپ" یعنی مرحلہ بہ مرحلہ ہونے چاہئیں۔ کیونکہ سوسائٹی ایسی اصلاحات کو قبول نہیں کرتی جو یک لخت کر دی جاتی ہیں۔ ان کے لیے پہلے زمین تیار کرنی پڑتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ روٹی کپڑے مکان کے جو وعدے کیے گئے تھے وہ اس معاشی نظام کو بدل کر پورے ہوں گے۔ تبدیلی کا یہی طریق کار ہے کہ جو لوگ غیر محدود جائیدادوں کے مالک ہیں ان لوگوں سے جائیدادیں لے لی جائیں جو بھوکے اور ننگے ہیں انہیں دے دی جائیں یعنی ان لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ جو لوگ قوت لایموت اور روٹی کے نوالے کو ترستے ہیں لیکن اس کے لیے کچھ وقت لگے گا۔ ہم اتنا وقت نہیں مانگتے جتنا آپ نے مانگا تھا یا جتنا وقت آپ نے دیا تھا۔ لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ وقت دیجئے۔ یہ لوگ کہیں گے کہ ایک سال کے اندر کیوں نہیں ہو گیا؟ بہر حال اس ایک سال میں کچھ نہ کچھ اصلاحات تو ہوئیں بیج بوئے گئے ہیں۔ ان کے پودے اُگیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ یہ پودے بار آور ہوں گے۔ مگر اس میں کچھ وقت لگے گا۔ جناب والا! ان لوگوں کا حافظہ تازہ کرنے کے لیے میں آپ کی وساطت سے انہیں یاد دلاتا ہوں، کیونکہ یہ بھول رہے ہیں۔ کہ

اس معاشی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے Needy Citizen یعنی ضرورت مند شہری کو کپڑا، روٹی اور مکان دینے کے لیے خود انہوں نے فرمایا تھا کہ ایک مدت درکار ہے یہ مدت کتنی ہونی چاہیئے اس کا ذکر خود حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پیش کی ہوئی تجاویز کی روشنی میں کرتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> "It is completely within prescribed time limit not exceeding 10 years. All the necessary arrangements for taking over legal responsibilities to provide every needy citizen with the basic necessities of life—food, clothing, house, medical aid and educatton".
>
> (Islamic Law and Constitution—Page-154)

یعنی دس سال کی مدت، معینہ مدت ہو جس کے اندر ہر شخص کی یہ بنیادی ضروریات پوری ہو جانی چاہئیں۔ میں ان دوستوں کو یقین دلاتا ہوں، کہ دس سال کے عرصہ میں نہیں بلکہ اس سے کم مدت میں آپ دیکھیں گے، کہ پاکستان کا نقشہ بدل گیا ہے۔ پاکستان میں بنیادی ضروریاتِ زندگی ہر غریب اور ہر فرد ہر بشر کو حاصل ہو جائیں گی اور وہ وعدے جو ہم نے انتخابات میں کیے تھے وہ پورے ہوں گے۔

تحدیدِ ملکیت

جناب والا! مصر میں صدر ناصر کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے بنیادی مسائل کو قومی سطح پر حل کیا۔ حالانکہ اس غریب پر کفر اور الحاد تک کے الزام لگائے گئے۔ یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی "جامعہ الازہر" تمام دنیائے اسلام کے لیے روشنی کا مینار بنا ہوا ہے۔ صدر ناصر نے تحدیدِ ملکیت کی اور وہاں ہمارے روپے کے مطابق اسی ہزار روپے کی ملکیت سے زیادہ کی جائیداد کوئی شخص نہیں رکھ سکتا۔ اس وقت علمائے کرام یعنی مصر کے ترقی پسند علماء نے جو عدل اسلامی کے ماننے والے ہیں اس کی تائید میں ایک حدیث پیش کی تھی۔ جس کی تردید

کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ حدیث جصاص کی جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۲۲ پر لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ "جس نے دس ہزار درہم ترکہ میں چھوڑے وہ چوڑے پتھر بنائے جائیں گے اور اس کے ذریعہ اس کو سخت عذاب دیا جائے گا۔" اس پر ایک مصنّف نے احتجاج کیا تھا، کہ سیّدنا عثمان غنیؓ غیر محدود جائیداد کے مالک تھے اور وہ غنی بھی کہلاتے تھے۔ ان کی مثال کے ہوتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث مصدقہ ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے غنا کے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ بیشک وہ خلیفہ ہونے سے پہلے بہت غنی تھے۔ لیکن وہ اپنا مال اُمّت کی فلاح و بہبود کے لیے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں میں سے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خلافت کے بعد اپنی دولت کے بارے میں بیان دیا تھا کہ "میرے پاس سوائے دو اونٹوں کے اور کوئی اونٹ نہیں ہے۔ نہ ہی میرے پاس دودھ دینے والی بکری یا اونٹنی ہے۔ صرف دو اونٹ ہیں اور وہ بھی مَیں نے سفرِ حج کے لیے رکھے ہیں۔ حالانکہ خلافت سے پہلے تمام عرب میں میرے پاس سب سے زیادہ اونٹ اور بکریاں تھیں۔" اس سلسلے میں اپنے دوستوں کو یاد دلاتا ہوں اور اگر مفتی صاحب یہاں ہوتے تو تصدیق کرتے کہ مَیں اپنے پاس سے بات نہیں کرتا بلکہ بزرگ عالمِ دین جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظمِ دینیات ہیں جنہیں علمائے دیوبند سند مانتے ہیں یعنی مولانا تقی امینی کی بات کروں گا۔ جنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار "احکامِ شرعیہ میں حالاتِ زمانہ کی رعایت" کے صفحہ نمبر ۵۵ پر کیا ہے۔ "حکومت کو حق ہے کہ اسراف اور فضول خرچی سے لوگوں کو بچانے کے لیے آمدنیوں کی حد مقرر کر دے سرمایہ کو پھیلانے اور مالداروں کا مال حاصل کرنے کے لیے حسبِ صوابدید مختلف طریقے استعمال کرے۔ کھانا، کپڑا اور رہائش ایسی ضرورتیں ہیں، جو مشترک ہیں جن کے لیے حکومت ہر قسم کے قوانین نافذ کرنے کی مجاز ہے۔" اس بارے میں مولانا نے جن بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے یعنی امام حنبلؒ اور امام قیمؒ وغیرہ۔ تو مَیں اس کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں بنیادی ملکیت پر حد لگانے اور اس طرح غریبوں کے لیے قوت لایموت مہیا کرنے کے لیے ایک حد کے مقرر کرنے کا اختیار حکومت کو ہے اس پر اگر کوئی

ناک بھوں چڑھاتا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ میں اس ضمن میں زیادہ طویل بحث میں نہیں جانا چاہتا۔ آپ ہی بتایئے کہ مدینۂ منورہ میں عملاً مواخات قائم کیا گیا تھا یا نہیں؟ اور اس میں زبانی جمع خرچ تو نہیں کیا گیا تھا جیسے آج کل کے امیر اور جاگیردار کرتے ہیں۔ یہ مواخات اس وقت قائم کی گئی تھی۔ جب سرکارِ دو عالمؐ مدینۂ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے مال اور اپنی جائیداد سے اور اپنے گھروں حتیٰ کہ اہلِ خانہ سے بھی حصہ دیا تھا یا نہیں؟ جب تک معاشی طور پر تمام لوگوں کو اجتماعی معاشیات میں شریک نہیں کیا جاتا۔ اس وقت تک کوئی نظام حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اس ملک میں غریبوں کو بنیادی ضرورتوں کا حق نہیں دیں گے اور یہ چاہیں گے کہ آپ کے مال اور دولت پر حملے نہ ہوں یعنی آپ کے سنگ و خشت کے محلوں کی حفاظت بھی کریں، آپ کے کارخانوں کی حفاظت بھی غریب ہی کریں اور جواباً آپ ان کے لیے سنگ و خشت کے نہ سہی خس و خاشاک کی جھونپڑیوں کی تعمیر اور حفاظت کا ذمہ بھی نہ لیں تو ان سے آپ کی اپنی اور اپنے محلات کی محافظت کی توقع ایک فعل عبث ہے ان کو بھی جینے دیجئے۔ ان کے لیے زمین کے استعمال اور اس استعمال سے نانِ شبینہ حاصل کرنے کا موقع تو رہنے دیں ورنہ ان کے جو اعتراضات ہیں وہ اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وزیراعظم کے اختیارات

اب میں اس بات کی طرف آؤں گا کہ زیادہ اعتراض اس مسودہ آئین پر یہ کیا گیا ہے کہ اس میں وزیراعظم کو بہت زیادہ اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔

بہر حال میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی خاص بنائے اختلاف کیا ہے۔ کیا یہ بنا ہے کہ اختیارات صدر کو اس لیے نہ دیئے جائیں کہ ذوالفقار علی بھٹو صدر ہیں یا وزیراعظم کو اس لیے نہ دیئے جائیں کہ آئندہ وہ وزیراعظم ہو جائیں گے۔ یا صرف اتنا اعتراض ہے کہ اختیارات کسی کو ہونے ہی نہیں چاہئیں

عجیب بات یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر یہ حضرات اپنا سارا زور صدارتی نظام کے خلاف صرف کر رہے تھے اور بار بار مطالبہ کر رہے تھے کہ ملک میں پارلیمانی نظام ہونا چاہیئے جس میں سارے اختیارات وزیر اعظم کے پاس ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے کہیں سے یہ سن لیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی ملک میں ڈیگال کا نظام حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ جس میں اختیارات مشترکہ طور پر وزیر اعظم اور صدر کے پاس ہوتے ہیں تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ہم ڈیگال کا سسٹم نہیں چاہتے۔ ہمیں تو خالص پارلیمانی نظام درکار ہے۔ اس سے بھی گیا گزرا حال مذہبی جماعتوں کا ہے۔

ایک زمانے میں ۳۱ علمائے کرام نے اپنی مجلس قائم کی اور اس الزام کے جواب میں کہ علماء کوئی متفقہ دستور پیش نہیں کر سکتے۔ اسلامی دستور کا خاکہ پیش کیا۔ ہمارے اپنے زمانے میں بھی علمائے کرام اکٹھے ہوئے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس میں یگانہ روزگار علماء بھی شامل ہیں لیکن ان بزرگوں نے اس آئین پر جو اس وقت پیش کیا گیا ہے اور ان اختیارات پر جو اس آئین میں دیئے گئے ہیں اور ان اختیارات کی نوعیت پر غور نہیں کیا حالانکہ وہ آئیڈیل اسلامی دستور ہے۔ اس کی تیرھویں شق یہ ہے۔

> "The responsibility for the administration of the state shall primarily vest in the Head of the State, although he may delegate any part of his powers to any individual or party".

گویا "سرچشمۂ اختیارات یعنی ہیڈ آف دی سٹیٹ موقع محل کے اعتبار سے جس وقت چاہے اپنے وسیع اختیارات میں سے کچھ اختیارات انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے منتقل کر سکتا ہے۔"

اس شق سے صاف واضح ہے کہ ان بزرگوں کے ذہن میں صدارتی نظام سے بھی بڑھ کر امارتی نظام کا تصور کار فرما تھا۔ اس وقت ان کے نزدیک یہ نظریہ اسلام تھا۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو صدر بنے تو انہوں نے صدارتی نظام کو آمرانہ نظام کہہ کر مخالفت شروع کر دی۔ صدارتی نظام ان کے نزدیک غیر اسلامی ہو گیا۔ انہوں نے پارلیمانی نظام کے مطالبے شروع کر دیے۔

مغربی جمہوریت انہیں اسلامی جمہوریت نظر آنے لگی۔ حالانکہ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس میں محض کوئی ہجوم اسلام کی معینہ اقتدار کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ سچائی کے حق میں حسینؓ اور ان کے ۷۲ ساتھیوں کے ووٹ۔ یزید کے ہزاروں لاکھوں حامی ووٹوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اگر ایک طرف پورا ہاؤس جھوٹ کے جواز کے لیے قانون بنانے پر مصر ہو تو مخالفت کا ایک ووٹ اس کے مقابلے میں اسلام کے نزدیک کہیں زیادہ دقعت کا باعث ہوگا۔ جمہوریت کا یہ رائج الوقت تصوّر بھی ان کے نزدیک اسلامی بن گیا مگر اب جب کہ ہم پارلیمانی نظام کے حق میں ہیں جس میں وزیر اعظم ہوتا ہے تو یہ اس جمہوریت کو اسلام کے خلاف سمجھ رہے ہیں۔

وہ برطانوی پارلیمانی نظام جس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نظامِ جمہوریت کا سرچشمۂ اوّلین ہے۔ اس کے سربراہ کے اختیارات دیکھیے کیا اس کو Mere signing machine نہیں کہا جاتا۔ اگر کیبنٹ اس کو اس کی اپنی موت کا محضر نامہ بھی پیش کر دے تو اس کو دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ عام طور پر جو کہا جاتا ہے کہ The King can do no worng تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ منزہ عن الخطا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ غریب کے پاس اختیار ہی نہیں کہ خطا کرے۔ جیسا کہ فرشتے گناہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہی نہیں ہے جس سے گناہ کر سکیں۔ پارلیمانی نظام جسے ہم اپنے لیے قابلِ قبول سمجھتے ہیں، اس میں ممکن نہیں کہ آئینی سربراہ کے کچھ مطلق اختیارات بھی ہیں لیکن اسی پارلیمانی نظام کی رو سے وزیر اعظم کو جو زمانہ بھر کے اختیارات ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بار بار یہ کہنے لگیں کہ یہ صورت تو جمہوریت کے بہت خلاف ہے جناب مَیں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ لیکن مَیں اس ضمن میں ایک دو حوالے آپ کی اجازت سے ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم کو جو اختیارات ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں سر آئیور جیننگز نے اپنی کتاب "کیبنٹ گورنمنٹ" میں صفحہ ۱۸۰ پر کہا ہے۔

'The flexibility of the Cabinet System leads the Prime Minister to take upon himself a power not inferior to that of a

dictator provided always that the House of Commons will stand by him".

ترجمہ:۔ کیبنٹ سسٹم کی لچک کی بدولت وزیرِاعظم اپنے لیے ایسی قوت فراہم کر لیتا ہے جو کسی آمر سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ دارالعوام ہمیشہ اس کا ساتھ دے۔

جناب والا! اس ضمن میں انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ برطانوی آئین کی دفعات کے مطابق جب ہنگامی حالات ہوتے ہیں تو اس وقت وزیرِاعظم کو جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اس کے چشم و ابرو کے اشارے پر تمام ملک اور حکومت گردش کرتی ہے۔ صفحہ نمبر ۱۹۷ پر وہ کہتا ہے کہ:

"The Provisions of the British Constitution and the powers of the War Cabinet are just whatever Winston Churchil wants them to be at a given moment".

ترجمہ: برطانوی آئین کی دفعات اور جنگی کابینہ کے اختیارات کی شکل وہی ہوتی ہے جو ونسٹن چرچل ایک خاص موقع پر دینا چاہتا ہے۔

جناب والا! اس کے بعد میں آپ سے یہ کہوں گا کہ وزیرِاعظم کی حیثیت کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ برطانیہ کا پارلیمانی نظام ایسا ہے کہ اس میں پرائم منسٹر کی حیثیت وہ نہیں ہے جو ستاروں میں چاند کی ہوتی ہے بلکہ وہ ہے جو نظامِ شمسی میں سورج کی ہوتی ہے۔" اور جناب والا اس کے اندر یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اتنے اختیارات کا مالک کیوں کر ہوا۔ میں زیادہ حوالے اس لیے پیش نہیں کرتا کہ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ اس لیے اب آخری حوالہ پیش کرتا ہوں

"Given a solid party, backing and confidence amongst party leaders, the Prime Minister wields an authority that a Roman Emperor might envy or a modern dictator strive in vain to emulate".

ترجمہ: پارٹی کی مستحکم تائید اور پارٹی کے لیڈروں کے اعتماد سے وزیرِاعظم ایسے اختیارات کا حامل ہو جاتا ہے جس پر شاید کسی رومن شہنشاہ کو بھی رشک آ جاتا یا جس کے حصول کے لیے کوئی جدید طرز کا آمر خواہ مخواہ کوشاں رہتا ہے۔

یہ وہ برطانوی پارلیمانی نظام ہے جس کی تقدیس کی مثالیں دی جاتی رہی ہیں اور قسمیں کھائی جاتی رہی ہیں۔ میرے ان پیش کیے ہوئے حوالوں سے صاف واضح ہے کہ اس میں اصل اختیار وزیر اعظم کے پاس ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم اپنے دستور میں وزیر اعظم کو اختیارات کا مرکز مان رہے ہیں۔ تو یہ عین پارلیمانی روایات کے مطابق ہے۔ بدقسمتی سے اپوزیشن کے دوستوں کے سامنے ایک فرد کی ذات ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی ذات۔ جس نے ان کا کھانا پینا حرام کر رکھا ہے، وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنی سیاست کے اصول بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ میں اپنے دوستوں سے اپیل کروں گا کہ وہ ذاتیات سے بالاتر ہو جائیں۔ اصولوں کو سامنے رکھیں۔ اپنی قومی ضروریات، قومی امنگوں اور عوام کی نمائندگی کو اپنا مطمع نظر بنائیں۔ تبھی وہ اور ہم سب مسودۂ دستور سے انصاف کر سکیں گے

پاکستان قائم رہے گا:

آخری بات جناب والا یہ ہے کہ اس معزز ایوان میں بہت سے دوستوں نے بار بار کھڑے ہو کر پاکستان کے ٹوٹنے کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر ہماری یہ بات نہ مانی گئی تو پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ وہ شرط تسلیم نہ کی گئی تو ملک پارہ پارہ ہو جائے گا۔ یہاں میرے دوست حضرت مفتی محمود نے فرمایا کہ اب پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات ہو گئے ہیں کہ آیا یہ ملک بچ جائے گا؟ یہ شکوک کب سے پیدا ہو گئے ہیں؟ جناب والا! اس وقت سے جب سے حضرت مفتی صاحب سرحد کے وزیر اعلیٰ نہیں رہے۔ جب وہ وزیر اعلیٰ تھے تو ملک کے ٹوٹنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس وقت پاکستان محفوظ تھا۔ سالم تھا، اس وقت کوئی آفت نہیں تھی۔ لیکن جب سے جناب والا اپنے سنگھاسن سے نیچے اترے ہیں۔ اس وقت سے پاکستان کی سالمیت معرض خطر میں پڑ گئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مفتی محمود صاحب نہیں رہے تو اب پاکستان کا کیا بنے گا؟ یا یہ تصور کیوں ہے جناب والا! کہ چونکہ گورنروں کو برطرف کر دیا گیا ہے، چونکہ بلوچستان میں صدر راج نافذ کر دیا گیا ہے اس لیے پاکستان ٹوٹ جائے

گا۔ لیکن جناب والا! میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ جس جمہوریہ کی بار بار مثالیں دی جا رہی ہیں جو جمہوریہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کہتی ہے ہم اس جمہوریہ کی مثال لیتے ہیں میں کہتا ہوں کہ کیا میرے دوست جانتے ہیں کہ بھارت میں قیام آزادی سے لے کر آج تک ۲۶ مرتبہ صدارتی راج مختلف صوبوں میں نافذ ہوا ہے۔ کیا وہ اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں ۱۹۵۱ء میں صدر راج نافذ ہوا۔ پیپسو میں ۱۹۵۳ء میں۔ آندھرا میں نومبر ۵۴ء میں، کیرالا میں ۵۳ء میں پھر جولائی ۵۶ء میں پھر ستمبر ۶۴ء میں اور پھر مارچ ۶۵ء میں قائم ہوا۔ گوا۔ دمن اور دیو میں دسمبر ۶۶ء میں صدارتی راج قائم ہوا۔ راجستھان میں ۱۹۶۵ء اور پھر مارچ ۱۹۶۷ء میں نافذ ہوا۔ ہریانہ میں نومبر ۱۹۶۷ء میں۔ مغربی بنگال میں نومبر ۱۹۶۷ء، ۶۸ء پھر مارچ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں صدر راج نافذ ہوا۔ بہار میں ۱۹۶۸ء پھر جولائی ۱۹۶۹ء اور پھر ۱۹۷۲ء میں اتر پردیش میں ۱۹۶۸ء اور پھر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں۔ منی پور اسٹیٹ میں ۱۹۷۰ء میسور میں ۱۹۷۱ء میں۔ مشرقی پنجاب ۱۹۷۱ء میں، تری پورہ ۱۹۷۱ء میں اور اڑیسہ میں ۳ مارچ ۱۹۷۲ء کو یعنی آج سے صرف تین دن پہلے صدر راج نافذ ہوا۔

بار بار اور کئی جگہوں پر صدارتی راج قائم ہونے کے باوجود بھارت قائم ہے۔ وہ نہیں ٹوٹتا۔ لیکن اگر یہاں پاکستان میں ایک صوبے میں ایک مہینے کے لیے صدر راج قائم ہو گیا اور دو گورنر سبکدوش ہو گئے تو پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ جناب والا! میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ پاکستان کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ ٹھوکر لگے اور ٹوٹ جائے۔ یہ شیشے کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اس کے اندر چھ سات کروڑ جیالے انسان رہتے ہیں جو اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے لیکن پاکستان کو ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ جناب عالی! پاکستان کیوں ٹوٹے گا۔ میں آ رہا ہوں اس پوائنٹ پر کہ مشرقی پاکستان میں اس وقت جو حالات تھے اُن کا خود ولی خاں صاحب نے بڑا فاضلانہ تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کا عام آدمی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتا

تھا۔ لیکن اب تو وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے۔ اب تو سرحد، بلوچستان اور پنجاب میں کوئی فاصلہ نہیں ہے اور دلوں میں بھی فاصلہ نہیں ہے۔ جناب والا! میں آپ سے کہتا ہوں کہ پنجاب تو کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ پنجاب کسی کا حق غصب کرنا نہیں چاہتا۔ پنجاب نے ہمیشہ قربانیاں دی ہیں۔ پنجاب ہمیشہ قربانی دے گا۔ پنجاب سے آپ کیوں خائف ہیں کہ پنجاب ایک بڑا یونٹ ہے۔ وہ چھا جائے گا۔ وہ مار دے گا وہ گرا دے گا۔ یہ خطرہ پنجاب سے کیوں ہے؟ پنجاب کا اب بھی ان صوبوں سے گہرا تعلق ہے۔ تاریخی طور پر آپ دیکھیں گے کہ جب کسی دشمن نے حملہ کیا تو ادھر سندھ میں کیا یا ادھر سرحد میں کیا اور مار دھاڑ ہوئی تو پنجاب ہمیشہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے نکلا۔ ہم صاف طور پر دیکھتے ہیں کہ آج بھی اسلام کے عقیدے کے علاوہ ہمارے درمیان دوسرے قریبی تعلقات بھی ہیں شادی بیاہ کے ذریعے ہم چار صوبوں کے لوگ ایک دوسرے کے قرابت دار ہیں۔ یہاں میرے دوست حفیظ پیرزادہ بیٹھے ہیں۔ یہ بیاہے ہوئے ہیں پنجاب میں، وہاں سردار شوکت حیات بیٹھے ہیں۔ جن کے صاحبزادے کی شادی آپ جانتے ہیں کہاں ہوئی ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ بیٹھے ہیں جن کے صاحبزادے کی شادی سندھ میں ہوئی ہے۔ آپ دیکھیں گے اس طرح کی بے شمار مثالیں آپ کے سامنے ہیں ہم سماجی لحاظ سے رشتہ داریوں کے ذریعے اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کسی اعتبار سے بھی ہمیں دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ آج ہم لوگوں کے درمیان کوئی فاصلے نہیں۔ آج ہمارے "کامن مین" کے آپس میں ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ آج پشاور، سرحد اور دوسرے علاقوں کے تیس فیصد لوگ پنجاب میں رہتے ہیں۔ سندھ میں رہتے ہیں اور کراچی میں رہتے ہیں۔ ہم مضبوط رشتوں میں پروئے ہوئے ہیں۔ ہم ایک کنبہ ہیں اور ایک ہی معاشرہ ہیں۔ اس لیے اب وہ حالات نہیں ہیں جن کا حوالہ خان عبدالولی خان نے اپنی تقریر میں دیا ہے۔ اس لیے خدا کے واسطے پاکستان کے ٹوٹنے کی بات نہ کیجیے۔ پاکستان رہنے کے لیے بنا ہے۔ پاکستان ٹوٹنے کے لیے نہیں بنا۔ جو غلطیاں ماضی میں ہوئی ہیں۔ ان سے سبق حاصل کرنا ہے یہ نہ ہو کہ ذرا سی

بات آپ کی طبع نازک کے ناموافق ہوئی۔ کوئی چیز آپ کی پسند کے مطابق نہ ہوئی تو آپ نے فرمانا شروع کر دیا کہ پاکستان ٹوٹ رہا ہے۔ پاکستان نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ پاکستان افراد سے عبارت نہیں ہے۔ پاکستان ایک نظریے پر بنا ہے، ایک اصول پر بنا ہے۔ افراد کا کیا ہے وہ تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ پاکستان قائم رہے گا۔ اس کا وجود باقی رہے گا۔ جب تک سورج چمکتا ہے۔ جب تک ہوا چلتی ہے۔ جب تک دن رات کی گردش جاری ہے، تب تک پاکستان باقی رہے گا۔ ہمیں امید ہے انشاء اللہ کہ اس میں خرابی پیدا نہ ہو گی۔

اب مَیں آپ سے آخر میں گزارش کروں گا کہ ہمیں باہر سے خطرہ کم اور اندر سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپس میں اگر اپوزیشن اور حکومتی پارٹیاں مضبوط رہیں ان کا آپس میں تعاون رہے، تعلق رہے اور یہ نقطۂ نظر نہ ہو کہ یہ بات چیت چونکہ اربابِ اقتدار کی طرف سے پیش ہو رہی ہے اس کو ہم نہیں مانیں گے تو پھر یہ صورتِ حال انشاء اللہ کبھی پیدا نہ ہو گی کہ ہم کسی طرح بھی پاکستان کو نقصان پہنچائیں۔ مَیں اس مخلصانہ دعوت پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں کہ آیئے ہم سب مل جائیں۔ اکٹھے ہو کر پاکستان کو آئین دیں۔ گروہی مفادات سے بالاتر ہو کر، ذوالفقار علی بھٹو کی مخالفت سے بالاتر ہو کر اور یہ سوچے بغیر کہ پاکستان میں اگر ہماری حکومت نہ ہوئی تو ٹوٹ جائے گا۔ ان ذاتی ملحوظات سے بالاتر ہو کر، ہم پاکستان کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔

مِل جُل کے ارضِ پاک کو رشکِ ارم کریں
کچھ کام آپ کیجئے، کچھ کام ہم کریں۔

یہ دستور سب مِل جل کر بنائیں۔ آپس میں مل بیٹھیں، اتحاد اور اتفاق کی باتیں کریں۔ اسی سے ملک و قوم کو فائدہ ہو گا :۔

امن کی راہ

"جولائی ۱۹۷۲ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان معاہدۂ شملہ ہوا تو اس پر حزبِ اختلاف نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ بال کی کھال اتاری گئی۔ لفظوں کو خود ساختہ مفہوم کی پوشاک پہنائی گئی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے مسئلہ کی نزاکت کا احساس کیا اور معاہدہ کو قومی اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کر دیا۔ اپوزیشن کے رہنماؤں نے اس موقع پر جو تقریریں کیں ان میں ان تمام اعتراضات کو دُہرایا گیا تھا جو پہلے ہی سیاسی حلقوں میں زبان زدِ خاص و عام تھے۔

۱۲ر جولائی ۱۹۷۳ء کے اجلاس میں یہ تقریر انہی غلط فہمیوں اور کج بحثیوں کا پردہ چاک کرتی ہے۔"

جناب چیئرمین!

اس معزز ایوان میں جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ کسی ایک جماعت یا کسی ایک گروہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا بڑا گہرا تعلق پوری قوم اور پورے ملک کے مستقبل کے ساتھ ہے۔ مگر بعض اچھی اچھی تقاریر سُننے کے ساتھ ساتھ مجھے اس چیز کا شدید احساس بھی ہے کہ اس ایوان میں ہونے والی بعض تقاریر میں اس مسئلہ پر جس انداز سے بحث کی گئی ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض معزز ارکان اپنے آپ کو جماعتی سیاست کی سطح سے بلند نہیں کر سکے۔ ان مقررین میں سے بعض کو تو میں معذور سمجھتا ہوں کیونکہ مخالفت برائے مخالفت ان کا مشن ہے اور انھوں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین جس بات کو حق سمجھیں گے وہ اس کو باطل قرار دیں گے، جسے وہ دن کہیں گے اسے یہ رات کہیں گے اور جسے وہ رات کہیں گے اسے یہ روشنی ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ ان کا نقطۂ نظر ہے اس لیے ان سے شکوہ و شکایت فضول ہے۔ ان کا معاملہ اس مولوی کی طرح

ہے جو شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کے زمانے میں گزرا اور جس نے اعلان کر رکھا تھا کہ شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید جس بات کو سچ ثابت کریں گے میں اسے غلط ثابت کروں گا اور وہ جس بات کو جائز کہیں گے میں اسے ناجائز کہوں گا مگر ان حضرات کے علاوہ کچھ صاحبان اور بھی ایسے ہیں جو اپنی تقریروں میں Between the lines یعنی بین السطور ایسا انداز اختیار کرتے نظر آئے جس کی ان سے توقع نہ تھی۔ میرے دل میں مولانا مفتی محمود اور جناب غوث بخش بزنجو کا بے حد احترام ہے لیکن اگر میری بات کو گستاخی پر محمول نہ کیا جائے اور مجھے صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے تو میں عرض کروں گا کہ اس کے باوجود کہ انہوں نے معاہدہ شملہ کی واضح اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر تائید کی اور اس کے کسی شوشے یا مد پر بھی اعتراض نہیں کیا لیکن نہ جانے اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کیوں ضروری سمجھا کہ اس ایوان میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جائیں جن کا مقصد یہ ہو کہ اس معاہدے کا کریڈٹ پیپلز پارٹی اور اس کے چیئرمین کو نہ ملے حالانکہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے نہیں صدر پاکستان کی حیثیت سے معاہدہ کیا تھا اور یہ اچھی بات نہ تھی کہ اس میں سیاسی زاویہ نظر سے کسی کے کریڈٹ کو سامنے لایا جاتا۔ اس کے برعکس میں مولینا غلام غوث ہزاروی کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے کسی کی تحسین یا تنقید کی پروا کیے بغیر قلندرانہ انداز میں اس کی تائید کی اور وہ انداز اختیار نہ کیا جسے دودھ میں مینگنیاں ڈالنا کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی احساس ہے کہ اس ایوان میں بعض ایسی تقریریں بھی ہوئی ہیں جن کا موضوع زیر بحث سے کم ہی تعلق تھا۔ ان تقریروں میں اُنھوں نے دنیا جہان کے مسائل پر بحث کی اور اجلاس کے لیے صدارتی حکم کا مقصد اور اس خاص مسئلہ کو جس پر بحث کرنے کے لیے یہ اجلاس طلب کیا گیا تھا نظر انداز کر دیا گیا بلکہ پس پشت ڈال دیا گیا۔ یقیناً اگر میں چاہوں یا میرے ساتھیوں کی خواہش ہو تو ان کی ایک ایک بات کا جواب دیا جا سکتا ہے اور اس چیز پر بھی بحث ہو سکتی ہے کہ ملک کو دو ٹکڑے کرنے کا ذمہ دار کون ہے، یہ معاملہ یقیناً ایسا نہیں جسے اس ملک کے عوام نہ جانتے ہوں

یا جس کے لیے ہمارے پاس دلائل اور شواہد کی کمی ہو۔ اس طرف سے جو موقف اختیار کیا گیا ہے۔ اسے جھٹلانے کے لیے میں زیادہ تفصیل میں نہیں پڑوں گا کیونکہ اس ملک کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اس کے عوامل کی تحقیقات کرنے کے بعد اپنی رپورٹ مکمل کر چکے ہیں۔

ذمہ دار کون ؟

اس چیز کا فیصلہ تاریخ کرے گی کہ ملک میں ہونے والے افسوسناک حالات کا ذمہ دار کون تھا۔ کس نے ملک کو بچایا اور کس نے اسے دولخت کیا اور کون اب بھی اس بات کے درپے ہے کہ ملک کی موجودہ جغرافیائی وحدت بھی معرض خطر میں پڑ جائے۔ ان حقائق پر بحث بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر تین مارچ ۱۹۷۱ء کو ہونے والے اسمبلی سیشن کو ملتوی نہ کرایا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے ہم بتا سکتے ہیں کہ اگر اس اجلاس میں چھ نکات کی بنیاد پر آئین بن جاتا تو پھر دو پاکستان نہ ہوتے پانچ پاکستان بنتے۔ ہم نے پاکستان کو پانچ حصوں میں تقسیم ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔ لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے تمام ساتھی کہہ رہے ہیں کہ اجلاس ضرور ہونا چاہیے تو دوسری بار اجلاس طلب ہونے پر ہم نے اس میں شمولیت پر آمادگی کا اظہار کیا۔ پھر کیا سبب ہوا کہ عوامی لیگ کے لیڈر اور ارکانِ اسمبلی نے اس اجلاس میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ ان کے اس طرزِ عمل سے "بلی تھیلے سے باہر آ گئی" اور ان کے سینے کے اندر چھپے ہوئے عزائم آشکارا ہو گئے اور یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ وہ پاکستان سے علیحدگی تو بہر صورت اختیار کرتے لیکن پاکستان کے اس حصے کو بھی کمزور اور پارہ پارہ کر کے اور یہاں بھی کئی بنگلہ دیش بنانے کے بعد ایسا کرتے۔ قوم نے دیکھ لیا کہ ہمارا موقف کس قدر درست تھا اور ہم نے عوامی لیگ کے عزائم کی جو نشان دہی کی تھی وہ حقیقت سے کس قدر قریب تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب اس بحث میں پڑنا ایسا ہے کہ ؎

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

اب اس سانحہ پر بحث کرنا ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانا اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کا ہدف بنانا مناسب نہیں۔ بے بنیاد مفروضوں کی بنا پر کسی فرد یا جماعت کو ذمہ دار ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ ورنہ ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذمہ دار وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ مارشل لاء رہنا چاہیے، وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل نہیں ہونا چاہیے۔ عوام جانتے ہیں کہ اس کا مقصد کیا تھا لیکن یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ اپنا سارا وقت بحثوں میں برباد کرتے رہیں اور وہ مقصد جو گروہی اور جماعتی سیاست سے بالاتر ہے اور جس سے ملک و قوم کا مفاد وابستہ ہے اور جو آج اس ایوان میں زیر بحث ہے اس سے رُوگردانی کرتے رہیں۔ لہٰذا غیر ضروری باتوں میں اُلجھے بغیر میں معاہدہ شملہ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کے ضمن میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

جناب چیئرمین!

یہ معزز ایوان اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ معاہدہ شملہ کی تفصیلات سامنے آنے سے پہلے ہی اس ملک کا ایک مخصوص سیاسی عنصر تھا جسے پاکستان پیپلز پارٹی سے خدا واسطے کا بیر ہے، جسے ہماری ہر بات بُری لگتی ہے جس کے ارکان آج تک الیکشن کی فضا سے باہر نہیں آسکے بلکہ اگر میں بطور گریز یہ عرض کروں کہ اب بھی اس معزز ایوان میں ایسی تقریریں سننے میں آئی ہیں جیسے وہ الیکشن کے زمانہ کی تقریریں ہوں۔ جیسے کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ برسرِ اقتدار پارٹی کو بدنام کریں اور خود برسرِ اقتدار آکر سیاسی فائدے حاصل کریں تو ان باتوں سے کیا فائدہ ہوگا۔ الیکشن میں ابھی پانچ سال رہتے ہیں اس لیے ابھی سے الیکشن کی فضا قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

قومی تقاضے

اس وقت ہمیں ملک میں وحدتِ فکر و عمل، جذبۂ تعمیر و تعاون اور قومی یکجہتی کی فضا قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت اگر ہم دوسری باتوں میں اُلجھے رہے اور ہم نے شکست و

فتح کے ان پیمانوں کو اپنے ذہنوں سے محو نہ کیا جو الیکشن کے زمانے میں معیار نظر بنائے گئے تھے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی کہ وطن کا جو حصہ ہمارے پاس موجود ہے ہم اس کی سربلندی اور وقار میں کچھ اضافہ نہ کر سکیں گے۔ لیکن حال یہ ہے کہ جب معاہدہ شملہ سے پہلے مذاکرات کا اعلان ہوا تو کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ جو مذاکرات شروع ہو رہے ہیں وہ ملک کو فروخت کر دینے کی تمہید ہے لہٰذا مذاکرات نہیں ہونے چاہئیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذاکرات کیوں نہ ہوتے مذاکرات کب نہیں ہوئے اور دنیا کے کون سے حصے میں نہیں ہوئے۔ کیا خود بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے شملہ کے مقام پر بیٹھ کر مذاکرات نہیں کیے تھے۔ کیا قائد ملت لیاقت علی خاں نے بھارت سے مذاکرات نہیں کیے تھے۔ بڑے بڑے دشمن ملک بڑی بڑی باہم حریف طاقتیں بلکہ ایک دوسری کے ساتھ برسرِ جنگ قومیں بھی مذاکرات کرتی رہتی ہیں امریکہ اور روس کی باہمی مخالفت تمام دنیا پر عیاں ہے لیکن وہ بھی آپس میں مذاکرات کر رہے ہیں چین اور امریکہ کے درمیان جو مخالفت ہے اسے بھی تمام دنیا جانتی ہے، وہ بھی معاملات کو طے کرنے کے لیے آپس میں گفت و شنید کر رہے ہیں اگر ہم پرانی تلخیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہیں کہ بھارت سے ہماری لڑائی ہوئی تھی، اس لیے ہمارے اس کے ساتھ مذاکرات نہیں ہو سکتے تو یہ تو سوچ کا کوئی اچھا پیمانہ نہیں۔ اگر سوچ کا یہ پیمانہ تمام دنیا میں رائج ہوتا تو فرانس اور جرمنی کے درمیان کبھی تعلقات قائم نہ ہو سکتے۔ اسی طرح حال ہی میں جو تعلقات جرمنی اور روس کے درمیان قائم ہوئے ہیں وہ بھی قائم نہ ہو سکتے۔ لیکن ایک دوسرے کے ہاتھوں گہرے زخم کھانے کے بعد بھی دنیا کے مختلف ممالک کے درمیان جو تعلقات ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔ یہ دنیا حقائق کی ہے جذبات کی نہیں۔ یہاں تلخیوں کو سینوں سے لگائے رکھنے اور زخموں کو ناسور بنائے رکھنے سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر ہمارے ہاں بھی مذاکرات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تو یہ کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں جو دنیا کے اندر کبھی نہ ہوئی ہو۔ پاکستان کے سب سے بڑے اور مانے ہوئے رہنماؤں یعنی قائداعظم اور قائد ملت بھی اس طرح کے مذاکرات کر چکے ہیں۔ باہمی گفت و شنید کے

طریقے پر اس ملک میں پہلے بھی عمل ہوتا رہا ہے اس لیے اگر اب جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس طریق کار کو اختیار کیا ہے تو کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ جب سابق صدر ایوب خان برسر اقتدار آئے تھے تو انھوں نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد بھارت کو یہ پیشکش کی تھی کہ ہمارے درمیان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ No War Pact ہونا چاہیے لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تو ہماری طرف سے جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیش کش کو بھی بھارت نے مسترد کر دیا تھا لیکن آج وہ پُرامن مذاکرات کے لیے آمادہ ہے تو کیوں؟ اس میں اس کی حکمتِ عملی کا کون سا پہلو ہے؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھارت کے سامنے جو مقصد تھا' اسے وہ حاصل کر چکا ہے' اس لیے اب وہ پُرامن مذاکرات کر رہا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بھارت واقعی امن چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ برِصغیر کے اندر جس کشیدگی نے سالہا سال سے ڈیرے لگا رکھے ہیں اور دونوں ملکوں کے عوام کے ذہن جس طرح متاثر ہو رہے ہیں' اس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے دونوں ملک ایک دوسرے کے قریب آئیں ہم ازراہِ مروّت کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز بھارتی سیاست کا اخلاقی پہلو ہے۔

منتخب قیادت

لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ اگر آج بھارت ہمارے ساتھ پُرامن مذاکرات اور مصالحانہ گفت و شنید کا خواہشمند ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ہمارے درمیان جو معاملات اور مسائل نزاع کا باعث ہیں وہ طے ہو جائیں تو اس کے انداز نظر میں اس تبدیلی کا ایک بڑا سبب بھی ہے کہ پاکستان میں سالہا سال کے بعد ایک منتخب قیادت برسر اقتدار آئی ہے جس کے پیچھے اگر اس ملک کے عوام فردِ واحد کی طرح بن جائیں اور اپنی منتخب کی ہوئی قیادت کی ایک آواز پر مردانہ وار لبیک کہنے پر تیار ہو جائیں تو پھر اس قوم اور اس ملک سے جنگ لڑنا ایک کٹھن کام ہے

خواہ بظاہر وہ قوم کمزور دکھائی دے رہی ہو اور خواہ بظاہر اس کا ایک بازو بھی کٹ چکا ہو۔ کیونکہ ایسی جنگ میں اگر ابتدا کرنے والا کچھ زخم لگانے میں کامیاب بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ فوراً ہی اسے بہت سے زخم کھانے بھی پڑتے ہیں۔ ہماری موجودہ قیادت کو خدا کے فضل و کرم سے یہ قوت حاصل ہے کیونکہ یہ ایک منتخب اور عوام کا اعتماد رکھنے والی قیادت ہے یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھارت سمجھ رہا ہے کہ اس کے لیے اس وقت بہتر یہی ہے کہ ہم اس کے ساتھ اپنے نزاعی معاملات کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کریں۔

اسلام اور امن

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو اور محرک جو بھی ہو یہ بات بالکل روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ بھارت پُرامن مذاکرات کے لیے آمادہ ہو گیا ہے۔ ہماری طرف سے آمادہ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور جیسا کہ کل یا پرسوں اس ایوان میں کسی دوست نے کہا تھا اسلام کا مفہوم سلامتی ہے میں اس مفہوم میں کچھ اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ایمان امن سے نکلا ہے اس لیے مومن کبھی سلامتی اور امن کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص ہماری طرف صلح کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو ہم اس کا ہاتھ جھٹکنے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی اس کی طرف سے اپنا ہاتھ کھینچنے یا جواباً اس پر تاننے کے لیے تیار ہوں گے۔ میں مانتا ہوں کہ ان دونوں الفاظ یعنی اسلام اور ایمان کے ماخذ اور مادے اور بھی ہیں لیکن اگر آپ لغت کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو وہاں ان کے معانی میں سلامتی اور امن بھی ملیں گے۔ بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ ہمیں پُرامن مذاکرات میں تامل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کے اصولوں کے مطابق پڑوسی کے حقوق موجود اور مسلّم ہیں۔ اس لیے ہمارے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ ہم پڑوسیوں کے ساتھ مذاکرات نہ کریں۔ اور اپنے اور ان کے درمیان صلح کی فضا قائم نہ کریں۔ لہٰذا جس زاویے سے بھی دیکھا جائے یہ اعتراض کہ پُرامن مذاکرات نہیں ہونے چاہئیں

تھے، غلط ہے۔ علاوہ ازیں مذاکرات سے پہلے جن خدشات کا اظہار کیا جا رہا تھا ان کی بنیاد سیاسی اصولوں پر نہ تھی بلکہ سیاسی مخالفت پر تھی۔ اب مذاکرات کے نتیجے میں جو معاہدہ ہمارے سامنے آیا ہے اس کے مضمرات پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ معاہدے کے وقت ہم کون سی سیاسی سطح پر تھے، اس کا پس منظر کیا تھا اور وہ کیا حالات تھے جو اس معاہدے کے وقت اس برصغیر میں ہمارے سامنے تھے۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم نے ایسے وقت میں گفت و شنید کی جب ہمارا آدھا حصّہ ہم سے علیحدہ ہو چکا تھا اور مغربی پاکستان کا تقریباً تین تحصیلوں کا علاقہ دشمن کے قبضہ میں تھا اور جب ہمارے تقریباً ایک لاکھ جانباز فوجی بھائی دشمن کی قید میں ہیں۔ اور جب اس ملک میں پندرہ بیس لاکھ جنگ سے بے گھر ہونے والے لوگ سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کرنے میں دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان حالات اور پس منظر میں اگر گفت و شنید ہوئی اور اس میں گفت و شنید کا یہ معیار قبول کرا لیا گیا کہ کوئی ایسی بات معاہدہ میں شامل نہ ہو گی جو ہمیں منظور نہ ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی معاہدے کی بہت بڑی کامیابی ہے، ویسے اپنی تمناؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور اپنی خواہشات کی دنیا میں رہتے ہوئے یہ سوچنا کہ ہم جو کامیابیاں حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ سب کی سب حاصل ہوئیں یا نہیں۔ اس معاہدے کو جانچنے اور اندازہ کرنے کا اچھا پیمانہ نہیں اور نہ ہی اس طرح کے اندازِ فکر سے معاہدے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھیں کہ اس معاہدے سے پہلے جو اس طرح کے خدشات پھیلائے جا رہے تھے کہ شاید اس معاہدے سے پاکستان ایشیائی سلامتی کے منصوبے میں شامل ہو جائے گا یا برصغیر میں ایک کنفڈریشن قائم ہو جائیگی یا پاکستان کشمیر پر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائے گا یا بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع کا پیکٹ ہو جائے گا۔ یہ اور اس قسم کی جتنی اور بہت سی باتیں تھیں وہ سب غلط اور بے بنیاد ثابت ہوئیں اور لوگ سمجھ گئے کہ ان کی تہہ میں دشمنی کی نیت تھی اور ان کے غلط ثابت ہو جانے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس طرح کی افواہیں پھیلانے والے لوگ غلط کار ہیں جو قومی تاریخ کے ایسے نازک

موڑ پر بھی قوم کو دھوکا دینے اور اس دھوکے سے خود سیاسی فائدہ حاصل کرنے سے باز نہیں آتے۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اس مُعاہدے سے پہلے جو جو افواہیں پھیلائی گئی تھیں ان میں سے کوئی بھی سچ ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اس مُعاہدے نے ثابت کر دیا کہ پریذیڈنٹ بھٹو نے جو معاہدہ کیا ہے وہ باعزت امن Peace with honour کا سمجھوتہ ہے۔ انھوں نے عزّت اور وقار کے ساتھ اور برابری کی سطح پر کھڑے ہو کر ہندوستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہُوئے ہیں۔

کامیاب ڈپلومیسی

یہ خیال بھی رکھیے کہ اس معاہدے سے پہلے مسز اندرا گاندھی کیا بیان دے رہی تھیں۔ ان کا بیان آپ کے سامنے ہوگا۔ وہ کہہ رہی تھیں اور اپنے کیے پر بضد تھیں اور بھارت کا پریس ان کی اس بات کو بار بار اُچھال رہا تھا کہ مذاکرات میں یہ چیز شامل ہوگی کہ وہ بین الاقوامی لائن جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سرحد کا کام دیتی ہے، غیر منطقی ہے اسے منطقی بنانے کے لیے ہندوستان کو پاکستان کا کچھ اور حصّہ ملنا چاہیے تب امن قائم ہوگا۔ علاوہ ازیں بھارت کے کچھ رہنما ایسے بیانات بھی دے رہے تھے کہ پاکستان سے تاوانِ جنگ وصول کرنا چاہیے کیونکہ جنگ میں جارحیت پاکستان نے کی ہے۔ اس لیے اس پر ہمارا جتنا خرچ ہُوا ہے وہ تاوانِ جنگ کی صورت میں پاکستان کو ادا کرنا چاہیے۔ لیکن آپ نے صدر بھٹو کی کامیاب ڈپلومیسی ملاحظہ فرمائی کہ نہ تو ان مذاکرات میں پاکستان اور بھارت کی درمیانی سرحد کو غیر منطقی سے منطقی بنانے کا سوال پیدا ہُوا اور نہ تاوانِ جنگ کے مُطالبے کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا بلکہ اس چیز کی اجازت ہی نہ دی گئی کہ مذاکرات کے دوران یہ بات چھیڑے کیونکہ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آنے والا وقت ان باتوں کا مُتحمّل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ باتیں سرے سے ایجنڈے ہی میں شامل نہ ہوئیں۔

پھر اس معاہدے کے نتیجے میں آپ یہ بھی سُن رہے ہیں کہ پانچ ہزار مربع میل کا رقبہ پاکستان کو واگذار ہوگا۔ مجھے حیرت ہے کہ میرے ایک بزرگ دوست نے جن کا دیرینہ تعلقات کی بنا پر میرے دل میں کافی احترام ہے، اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جنگ کے دوران ہمیں جو علاقہ ملا تھا وہ زرخیز تھا اور ہم سے جو علاقہ ہندوستان نے لیا تھا وہ بنجر تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی وطن دوست خاص طور پر راؤ صاحب جیسے بزرگ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے وطن کے کسی حصے کو خواہ وہ بنجر ہو، خواہ سرسبز اس نظر سے دیکھے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن کا ہر ذرہ ستاروں سے بہتر ہے اور وطن کی ہر کیاری سرو وسمن کے باغوں سے زیادہ اچھی ہے۔ یہ کوئی معیار نہیں کہ جو حصہ ہمارے پاس آیا تھا وہ سرسبز تھا یا بنجر تھا۔ ملکی سرحدیں مُقدس ہوتی ہیں۔ وہاں گلاب اور چنبیلی کے پھول بھی کھل سکتے ہیں اور ریت بھی ہوتی ہے۔ مگر کیا وہ ریت مُقدس نہیں ہوتی؟ کیا اس کے تقدس کا سوال پیدا نہیں ہوتا؟ سوال یہ ہے کہ سرحد ہماری ہے ہمارے وطن کی ہے، ان سرحدوں کی پاسبانی اور ان کا واگذار کرانا ہمارا فرض ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیکانیر کا علاقہ بھارت کے قبضے میں ہے، اس کے مقابلے میں حُسینی والا کا علاقہ جو ہمارے قبضے میں ہے بہتر ہے۔ اگر اس کے پانی کو بند کر دیا جائے تو بھارت والوں کو چھٹی کا دُودھ یاد آ جائے گا، اور زندگی ان کے لیے دوبھر ہو جائے گی۔ میں کہتا ہوں راؤ صاحب آپ تو اسلام کے علمبردار ہیں۔ آپ جو کہتے ہیں واقعاتی اعتبار سے ٹھیک ہے لیکن کوئی مسلمان جس کے پیشِ نظر اپنے نبی کی سنّت ہو۔ وہ نبی جس نے اپنے خُون کے پیاسوں کو عبائیں دیں اور گالیوں کے عوض دُعائیں دیں۔ اس نبی کو ماننے والے اور پانی کو بند کر دیں، خواہ جن پر پانی بند کیا جائے وہ ہندومت سے تعلق رکھنے والے ہوں یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھنے والے، ان کو اس جُرم کی سزا دینے کے لیے کہ وہ دشمن کے علاقے میں رہتے ہیں، ان کا پانی بند کر دیا جائے استغفر اللہ، اگر کوئی اور اس طرح کی حرکتیں کرتا ہے تو کرے، ہمارے لیے تو حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسوہ حسنہ موجود ہے کہ جب کربلا کی طرف آنے والی اس فوج کی پیاس کا حال معلوم ہوا جو

آپ ہی کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی تو آپ نے اپنے اور بچّوں کے حصّے کا پانی اس تشنہ لب فوج کو پلا دیا اور خود پیاسا رہنا پسند کیا۔ اپوزیشن کے بعض مقررین کا یہ نقطۂ نظر ٹھیک نہیں کہ اس زمین کو جو ہمیں واگذار ہوئی ہے خود غرضی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لیے انسانیت کا احترام اعلیٰ اور ارفع چیز ہے۔ کوئی بھی انسان ہو، کسی مذہب کا ہو، کسی نسل کا ہو، کسی علاقہ کا ہو۔ ہمیں اس کو نسل و رنگ کی بنا پر نہ دیکھنا چاہیے بلکہ اس اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ وہ آدمی ہے اور آدمیت آدمی کے احترام کا دوسرا نام ہے۔

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

اِسلام اور احترامِ آدمیت

اسلام سے بڑھ کر احترامِ آدمیت کا علمبردار اور کوئی مذہب نہیں۔ اسلام نے رنگ، نسل، وطن اور اسی طرح کے دوسرے تعصّبات کو ختم کرنے اور انسانیت کا احترام بڑھانے کے لیے جیسی کوششیں کی ہیں ویسی کوششیں دنیا کے کسی دوسرے نظام نے نہیں کیں۔ آج کا نظام ہو یا کل کا نظام، دنیا میں جو لوگ جس نظام کے بھی علمبردار ہیں، وہ وحدتِ انسانی کے نظام کی طرف آئیں گے۔ اگر اللہ کی وحدانیت کا منطقی نتیجہ انسانوں کی وحدت ہے تو دنیا کا کوئی نظام اسلام کی تعلیمات سے فیض یاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے معاہدہ کیا ہے اور اس معاہدے کے ثمرہ کے طور پر پانچ ہزار مربع میل کا رقبہ واپس لیا ہے تو یہ بڑی خوش آئند بات ہے لیکن یہ صرف زمین کی بات نہیں، پندرہ بیس لاکھ کے قریب لوگ ایسے بے گھر ہو گئے تھے کہ ان کے لیے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ ان بے گھر لوگوں کا دُور سے نظارہ کرنا طوفانوں کی زد میں آئے ہوئے لوگوں کا ساحل سے تماشا کرنے کی طرح بڑی آسان بات ہے۔ پان کی گلوری مُنہ میں دبا کر رُومال کندھے پر ٹکا کر بڑے نستعلیق لہجے میں گفتگو کرنا بہت آسان ہے۔ یہ

کہنا بھی بہت آسان ہے کہ ہم ہر قربانی کے لیے تیار ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ دوستانِ عزیز خدا کے لیے ان لوگوں کے بچوں کا خیال کریں جن کے لیے سر چھپانے کو جھونپڑا تک نہیں، سر ڈھکنے کے لیے چادر بھی نہیں۔ ان کے بچوں کو بیٹوں کو دیکھیں جو بھیک مانگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے جسمانی اور اخلاقی تحفظ کے لیے جتنے وسائل بھی ہمارے پاس ہیں بروئے کار لا رہے ہیں۔ لیکن اس میں آپ نے کیا حصہ لیا۔ آپ نے کیا Contribute کیا صرف سنگدلانہ انداز میں یہ کہہ دینا کہ ہم قربانی کے لیے تیار ہیں۔ پندرہ بیس لاکھ انسانوں کے حالِ زار پر خندۂ استہزا محسوس ہوتا ہے۔

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی
تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ در پا را

درست مؤقف

یہاں بیٹھ کر ٹھنڈے ماحول میں باتیں کرنا بہت آسان ہے لیکن ان لوگوں کا اندازہ کرنا مشکل ہے، جنھیں تلخ حقائق کا سامنا ہے۔ انھیں دیکھیے کہ زمین کی واگذاری پر وہ کتنے خوش ہوئے ہیں۔ میرا ضلع سیالکوٹ سے بھی تعلق ہے اور اس ضلع کی نمائندگی بھی میں کر رہا ہوں۔ اس ضلع کی تحصیل شکر گڑھ کے لوگوں کا اندازہ لگائیں کہ وہ کتنی مشکل میں تھے۔ جب یہ فیصلہ انھوں نے سنا ہے تو کیسا سکھ کا سانس لیا ہے، کتنے مطمئن ہوئے ہیں یہ اس معاہدے کا ایک اہم پہلو ہے، اور دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے وعدوں کے مطابق، اپنی عوامی سیاست کے مطابق بلکہ اپنی افتادِ طبع اور غیرت مندانہ ضمیر کے تقاضوں کے مطابق کشمیر کے مسئلہ میں کوئی مصالحت نہیں کی اور کشمیر کے حق خود ارادیت کے ضمن میں اپنے موقف میں جو پاکستان کا دیرینہ موقف بھی ہے، ہندوستان کے بالمقابل بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن ہم اس معاملے کو یکطرفہ کامیابی ثابت کرنے کی کوشش کو پسند نہیں کرتے بلکہ پورے طور پر بجا سمجھتے ہیں کہ اس کا

کریڈٹ دونوں فریق کو پہنچتا ہے۔ تاہم معاملات کے بجا طور پر طے ہونے میں ابھی بہت سے مرحلے باقی ہیں۔ اس لیے ابھی اس کامیابی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہیں اور تاہم اس معاہدہ کو قبول نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ اس معاہدہ میں کشمیر کے متعلق جو طرزِ فکر اختیار کیا گیا ہے میری دانست میں پاکستان کے موقف میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ بھارت میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ بھارت نے یہ کبھی نہیں کہا کہ کشمیر کا کوئی جھگڑا ہے۔ اس کے سوچنے اور اظہار کرنے کے طریقے سے تو گویا یہ مسئلہ انتخابات کے ذریعے طے ہو چکا ہے۔ اس لیے اب اس مسئلے پر گفتگو نہیں ہو سکتی اور بات چیت کا دروازہ کھل نہیں سکتا، مگر آج اس کا موقف بدل رہا ہے۔ آج پہلی مرتبہ کشمیر کو متنازعہ فیہ علاقہ تسلیم کیا گیا ہے اور فریقین نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اسے دونوں ملکوں کے درمیان متنازعہ مسئلہ قرار دے دیا ہے جسے حل ہونا چاہیے۔

کشمیر کا تنازعہ

اب میں اس معاہدہ کے چوتھے پیراگراف کی دوسری کلاز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا جس میں پاکستان اور بھارت کے درمیان بین الاقوامی سرحد کا ذکر موجود ہے لیکن کشمیر کا ذکر نہیں۔ یہ کلاز اس طرح سے ہے :

> "Indian and Pakistani forces shall be withdrawn to their side of the international border."

کشمیر کا ذکر اس کلاز میں نہیں ہے اور اس لیے نہیں کہ کشمیر اور ہندوستان کے درمیان لائن آف کنٹرول کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری پیرا کے اندر اس چیز کی صراحت موجود ہے کہ یہ متنازعہ فیہ علاقہ ہے اور اس کا تصفیہ ہونا باقی ہے۔ اس سلسلے میں معاہدے کا اختتامی جملہ بھی بہت غور کے قابل ہے جس میں

کہا گیا ہے کہ :

"......the representatives of the two sides will meet to discuss further the modalities and arrangements for the establishment of durable peace and normalisation of relations, including the question of repatriation of prisoners of war and civilian internees, a final settlement of Jummu and Kashmir, and the resumption of diplomatic relations."

ان تصریحات سے واضح ہے کہ بھارت نے پہلی بار یہ تسلیم کیا ہے کہ کشمیر ایک متنازعہ فیہ علاقہ ہے اور کشمیر کا مسئلہ نزاعی مسئلہ ہے۔ یہ وہ بات ہے جو پاکستان ایک عرصے سے چاہتا تھا، لیکن اسے اس میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ پھر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ یہاں کشمیر کے بارے میں یہ تقریریں ہو رہی ہیں کہ ہم نے کشمیر کو کھو دیا ہے۔ تقریریں کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ کشمیر کا درد سب سے زیادہ ہمارے کشمیری راہنماؤں کو ہے۔ شیخ عبداللہ سے لے کر مولوی فاروق تک بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ معاہدہ بہت مناسب اور اچھا ہے اور کشمیر اور آزاد کشمیر کے عام شہری ہی نہیں سردار عبدالقیوم، سردار ابراہیم اور کے ایچ خورشید بھی تعریف کر رہے ہیں کہ اس میں کشمیری عوام کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔ کشمیر کے لوگ اس سے مطمئن ہیں اور آزاد کشمیر کے لوگ بھی مطمئن ہیں۔ مگر دوسرے لوگ ہیں کہ ان کے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہا ہے اور ان کے دل میں اہلِ کشمیر کا درد خود کشمیریوں سے زیادہ ہو رہا ہے اور وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ کشمیر کو بیچ دیا گیا ہے اور کشمیریوں سے زیادتی ہو رہی ہے اور کشمیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ ان کی طرف سے اس قسم کی بات بڑی عجیب ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس سمجھوتے کی وجہ سے اقوامِ متحدہ کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے دروازوں کی بات بھی عجیب ہے۔ مجھے ان کی باتوں سے ایسا لگ رہا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے دروازے نہ ہُوئے، خدانخواستہ عرشِ الٰہی کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہی اقوامِ متحدہ ہے جس نے آج تک کمزور اور مظلوم قوموں کا صرف تماشا دیکھا ہے جس نے آج تک ویٹ نام کے لوگوں

کی خونریزی بند کرانے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔ جس اقوامِ متحدہ نے آج تک دُنیا کے امن کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا، جس اقوامِ متحدہ کی پیش رو کے متعلق کہا گیا ہے اور جو اس پر صادق آتا ہے کہ ؎

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

ہمارے مسائل اور اقوامِ متحدہ

یہی اقوامِ متحدہ تھی جس کے در و دیوار کو قائدِ عوام کے ایک نعرۂ مستانہ نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہمیں ایسی اقوامِ متحدہ کی ضرورت نہیں لیکن یہ لوگ اسی اقوامِ متحدہ کا ذکر کرتے ہیں۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اسلام پسندی کے دعویدار کس طرح یہ دعویٰ کرسکیں گے کہ وہ توحید کا درس دے رہے ہیں۔ افسوس کہ انھوں نے اس ناکام ہونے والی اقوامِ متحدہ کی بات چھیڑ دی ہے، حالانکہ انھیں مولینا محمد علی جوہر کے الفاظ میں کہنا چاہیے تھا کہ اگر اقوامِ متحدہ ساتھ نہیں دے رہی تو نہ دے، اگر یہ غیر اللہ کے دروازے بند ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ خدا کا دروازہ تو بند نہیں ہُوا لیکن ان لوگوں نے تو اقوامِ متحدہ کو دربارِ الٰہی کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ پچیس سال سے اقوامِ متحدہ نے ہماری فریاد یا تو سنی ہی نہیں اور اگر سُنی ہے تو کوئی مداوا تلاش نہیں کیا۔ اس کے باوجود ان لوگوں کو شک ہو تو اور بات ہے ورنہ اس معاہدے نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ پھر ان حضرات نے اعتراض کیا ہے کہ اس سمجھوتے میں یہ لکھا گیا ہے کہ باہمی رضامندی اور پُرامن ذرائع سے امن و امان کے راستے تلاش کیے جائیں گے۔ تو میری عرض یہ ہے کہ کیا یہ بُری بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مسائل باہمی رضامندی اور پُرامن ذرائع سے حل ہوں یہ تو وہ چیز ہے جو یو این چارٹر کی دفعہ نمبر ۳۳ میں موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب بھی یو این او کے دو ممبر ملکوں کے درمیان

کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو گا تو وہ پُرامن مذاکرات کے ذریعے اس مسئلہ کا حل تلاش کریں گے۔ اور اگر اس طرح مسئلہ حل نہ ہو گا تو ثالث بٹھائیں گے جو ثالثی کرائے گا اور اس میں بھی باہمی رضامندی پر زور دیا جائے گا تاکہ مسئلہ کا حل نظر آ جائے۔ اس پر بھی کوئی حل دستیاب نہ ہو تو سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس معاہدے میں کونسی شق ہے جو یو این کے چارٹر کو غیر مؤثر کر دے گی اور یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ میں نہیں لے جایا جا سکے گا یا سیکورٹی کونسل کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ جو چیز اس معاہدے میں ہے ہی نہیں وہ آپ اس میں ڈالنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ یو این کا دروازہ بند نہیں ہُوا، اگر آپ یو این یا سیکورٹی کونسل کے پاس جائیں تو دیکھیں گے کہ دروازہ بند نہیں ہُوا۔

معاہدہ تاشقند اور معاہدہ شملہ

پھر یہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس معاہدہ میں کشمیر کے مسئلہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ صورت یہ ہے کہ اس معزز ایوان کے بہت سے ارکان نے اور بہت سے لیڈروں نے بھی جو عوام کی "مہربانی" سے اس معزز ایوان میں قدم رنجہ نہیں فرما سکے بار بار کہا ہے کہ معاہدہ شملہ تو اعلانِ تاشقند سے بھی بدتر ہے۔ اگرچہ میں بدگمانی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا علم مجھ سے بہتر ہے، ان کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے، وہ بڑے بڑے لیڈر ہیں، لیکن جب میں ان کی زبانی یہ بات سُن رہا تھا تو مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان حضرات نے آج تک معاہدۂ تاشقند کا مُطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں۔ ورنہ وہ اسے معاہدۂ تاشقند سے بدتر نہ کہتے۔ اپنے اس دعوے کے حق میں انھیں ثبوت پیش کرنے چاہئیں، دلائل سامنے لانے چاہئیں، کیونکہ پاکستان کے عوام دلائل کے بغیر محض اس بنا پر ان کی بات نہیں مان سکتے کہ یہ بات فلاں شخص یا فلاں افراد نے کہی ہے اس لیے ان کا فرمایا ہُوا مستند ہے۔ لوگ معاہدۂ تاشقند پر بھی غور کریں گے اور معاہدہ شملہ کو بھی دیکھیں گے۔ آئیے مُنیے میں آپ کو بتاتا ہوں

کہ معاہدہ تاشقند اور معاہدہ شملہ میں کیا فرق ہے۔ سب سے پہلے ازراہِ کرم ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے حالات کے فرق کو نگاہ میں رکھیے۔ جب آپ نے ۱۹۶۵ء میں جنگ لڑی تھی تو آپ بہت بہتر پوزیشن میں تھے۔ ہندوستان کا زیادہ علاقہ آپ کے پاس تھا۔ ہر چند کہ آپ کا کچھ علاقہ بھی بھارت کے قبضہ میں آگیا تھا۔ بھارت کے بہت زیادہ قیدی آپ کے پاس تھے اور یہی وجہ تھی کہ بھارت چیخ رہا تھا کہ جنگ بندی ہو۔ سیکورٹی کونسل میں فریاد کر رہا تھا کہ جنگ بند ہو اور فوراً ہو، اور بھارت اس لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا کہ اس وقت اس کی پوزیشن کمزور تھی۔ کشمیر میں بغاوت کے شعلے آتشِ چنار کی مانند بھڑک رہے تھے۔ کشمیر کے مسلمان عوام بھارت کی فوج کے ساتھ برسرِ پیکار تھے اور بھارت اس صورتِ حال اور اس کے نتائج سے پوری طرح آگاہ تھا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی پوزیشن تھی اور اب ۱۹۷۱ء کی پوزیشن ملاحظہ فرمائیے۔ لیکن میں اس دردناک داستان کو دہرانا نہیں چاہتا کیونکہ ہم سب اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے معاہدہ میں ہمیں زیادہ سے زیادہ اچھی شرائط حاصل کرنی چاہئیں تھیں۔ اپنے ملک کی بہتری کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنا چاہئیں تھے، جو ہم حاصل نہ کر سکے۔ اگر آپ اس موجودہ معاہدے پر غور کریں تو آپ کو کوئی غلط چیز نظر نہیں آئے گی۔ بلکہ اگر آپ اس کی تفصیلات پر غور کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں کشمیر کا ذکر موجود ہے۔ درحالیکہ معاہدہ تاشقند کے اندر ایک بنیادی مسئلہ کی حیثیت سے کشمیر کا ذکر تک موجود نہ تھا۔ صرف ایک جملے کے اندر کہا گیا تھا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے پس منظر میں جموں اور کشمیر کے معاملے پر بھی گفتگو ہوئی۔ مذاکرات شملہ میں ہمارے لیے اس سے پہلے ہونے والے مذاکرات کا پس منظر دردِ سر بنا ہوا تھا۔ لیکن بھارت کو معلوم تھا کہ ہم مسئلہ کشمیر پر گفتگو کریں گے۔ چنانچہ اس پس منظر میں بھارت کے ساتھ ہماری بات چیت ہوئی اور ان مذاکرات میں بھارت نے نہ صرف یہ کہ کشمیر کے مسئلے کا ذکر کرنا گوارا کیا بلکہ یہ بھی تسلیم کیا کہ اس مسئلہ کا تصفیہ ہونا باقی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تاشقند اور شملہ کے معاہدوں میں کافی فرق ہے۔ کیونکہ معاہدہ شملہ کے اندر جموں اور کشمیر کو متنازعہ فیہ علاقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ بیّن فرق ہے جو ہر

آنکھیں رکھنے والے انسان کو نظر آنا چاہیے اور اگر کسی کی عینک کے شیشے نظر کے مقابلے میں کمزور ہوں تو اسے ان شیشوں کے نمبر بدلوا لینے چاہئیں۔ اس کے بعد اسے نظر آئے گا کہ معاہدہ شملہ میں ہر چند کہ بھارت کے ساتھ فوری طور پر سفارتی اور تجارتی روابط استوار کرنے کا اعلان کیا گیا ہے، لیکن روابط کے قیام کے لیے اقدامات مرحلہ بہ مرحلہ Progressively ہوں گے اس معاہدے کے اندر یہ الفاظ موجود ہیں کہ جو کام بھی ہوگا وہ قدم بہ قدم یعنی Step by Step ہوگا۔ کیونکہ ہم ایک رشتے کو برقرار اور قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے رشتے کا احیا کرنا چاہیں تو اس سے پہلے بھارت کے گذشتہ اقدام کا مطالعہ کریں گے۔ ہم دیکھنا چاہیں گے کہ وہ کس جذبہ کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہے۔

اگر وہ واقعی خلوص اور صاف دلی کے ساتھ قدم اٹھا رہا ہے تو ہم بھی دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوں گے۔ غور فرمائیے کہ اس طریقِ کار میں فراست موجود ہے۔ تیسری بڑی بات جو معاہدہ شملہ اور معاہدہ تاشقند کو ایک دوسرے سے تمیز کرتی ہے وہ مذاکرات تاشقند کا پُراسرار ماحول ہے۔ یہ چیزیں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس وقت کے صدر نے اپنے وزیر خارجہ تک کو اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ معاہدہ جو بالا بالا ہوا تو اس کے جزئیات طے کرتے وقت وزیر خارجہ پاکستان شریک تھے اور نہ ہی معاہدے کی تکمیل کے وقت ذہنی اور قلبی طور پر شامل تھے۔

عوام سے مشورے

اس کے برعکس مذاکرات شملہ میں بیشتر گفت و شنید سرکاری افسروں اور مختلف سیاسی وفود نے کی۔ ہاں جب کبھی گفت و شنید کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہوتا یا اس میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تو فریقین کے وفود اپنے اپنے سربراہوں کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کی رہنمائی حاصل کرتے۔ اس کے علاوہ جب بھی دونوں سربراہوں نے آپس میں گفت و شنید کی

تو ان کے مشیر بھی شامل رہے اور معاہدے کو کسی قسم کی پُراسرار چیز بننے سے بچانے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کی گئیں۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں کہ شملہ روانہ ہونے سے پہلے صدر بھٹو نے ملک کے عوام کو اعتماد میں لیا۔ انھوں نے ملک کے علمائے دین سے مشورہ کیا۔ مزدور رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کی۔ وکلا کے ساتھ گفتگو کی، دانشوروں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ گفت و شنید کی۔ ان تمام لوگوں کو اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کیا اور خود بھی ان سب کی باتیں سنیں اور نہ صرف سنیں بلکہ ان کو مناسب وقعت اور اہمیت بھی دی۔ اور جب معاہدہ ہو گیا اس وقت بھی اعلان کیا کہ یہ حرفِ آخر نہیں، بلکہ اس وقت تک آخری اور حتمی نہ ہو گا جب تک کہ پاکستان کی قومی اسمبلی اس کی توثیق نہ کرے گی۔ اگر اسمبلی اس معاہدے کو قبول نہیں کرے گی تو یہ معاہدہ قائم نہیں رہے گا، اس لیے میں یہ گزارش کروں گا کہ اگر انسانی عناد اور مخالفت میں ہم بہت آگے نہ نکل گئے ہوں تو معاہدہ تاشقند کے اتنے پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس فیصلہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہو گی کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد جو فیصلہ کیا گیا اس میں پاکستان کی عزت، پاکستان کی عظمت اور پاکستان کے وقار پر کوئی حرف نہیں آنے دیا گیا۔ اگر ان حقائق کے بعد بھی کچھ لوگ اسے معاہدۂ تاشقند سے بدتر کہنے یا ثابت کرنے کی کوشش کریں تو کرتے رہیں۔ اگر کوئی شخص دو اور دو چار نہ کہے اور پانچ کہنے پر مصر ہو تو ہم اسے روک نہیں سکتے، یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ہر شخص کو ہر بات کہنے کا حق ہے لیکن حقائق کی دنیا میں من گھڑت باتوں سے سچ کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ لوگ احمق اور سادہ نہیں ہیں اور عوامی جدوجہد کی وجہ سے وہ اتنا شعور حاصل کر چکے ہیں کہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کا باہمی فرق ان پر آشکارا ہو۔

جنگی قیدی

اس کے بعد میں آپ کی اجازت سے یہ عرض کروں گا کہ یہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں

کو کیوں رہا کرا کے نہیں آئے۔ میرے جن دوستوں نے یہ بات کہی ہے مجھے ان کا بڑا احترام ہے۔ خود مفتی صاحب قبلہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ جنگی قیدیوں کو رہا کرا کے کیوں نہیں آئے ہیں۔ میں قبلہ مفتی صاحب اور دوستوں سے گزارش کروں گا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے پاس وہ کونسی جادو کی چھڑی تھی جسے استعمال کر کے وہ ان جنگی قیدیوں کو رہا کروا کے لے آتے۔ بنگلہ دیش کے متعلق شملہ میں کسی طرح کی بات کرنے پر تو پہلے ہی پابندی لگا دی گئی تھی، اور یہ اعلان بھی کر دیا گیا تھا کہ بھارت کی سرزمین پر بنگلہ دیش کے متعلق کوئی بات نہ ہو گی بلکہ ہم بھائی بھائی خود مل کر اس مسئلہ کو حل کریں گے۔ کیونکہ بنگلہ دیش جو حقیقتاً مشرقی پاکستان ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام مسافت اور بُعد کے باوجود جو آتش و خون کے سمندروں کے حائل ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں ایک ہیں، وہ آج بھی عقیدۃً مسلمان ہیں اور خدا اور رسولؐ کی محبت نے ان کو ایسے رشتوں میں پرو رکھا ہے کہ اس دُوری کے باوجود دنیا کی کوئی طاقت انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ اگر ہمارے روابط منقطع ہیں تو ایک وقت وہ بھی آئے گا جب یہ غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی اور ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی یہ سمجھیں گے کہ وہ کس طرح دام ہم رنگ زمیں کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جو بنگلہ دیش کے مسئلہ کو اسرائیل کے مسئلہ سے مشابہت دیتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ عربوں نے بھی اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا اور ایسا کہنے کے باوجود اسلام پسندی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اس طرح وہ کلمہ گو مسلمانوں اور اسرائیل کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے بڑا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ہمیں اس طرح کے اظہارِ خیال سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ ہم بنگالی مسلمانوں کے ساتھ محبت، مودّت اور اخوت کے رشتوں میں منسلک ہیں۔ کیا ہم ان کو وہ درجہ دیں جو عربوں نے اسرائیل کو دے رکھا ہے؟

بہرحال بنگلہ دیش کی بات جذبات سے تعلق رکھتی تھی اس لیے بھٹو صاحب نے ان جذبات کا احترام کیا اور اس موضوع پر بھارت کی سرزمین میں کوئی بات نہ کی۔ اگر وہ وہاں بنگلہ دیش کی بات کرتے تو بلاتاخیر جنگی قیدیوں کو واپس لا سکتے تھے۔ لیکن ایک طرف تو ہمارے ملکی رہنما ان کے

ہاتھ بھی باندھ رہے تھے اور دوسری طرف اب اس بات پر اصرار بھی کر رہے ہیں کہ یہ کام مزدور کرکے آتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح تو یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب شیخ مجیب اور بھٹو صاحب کے درمیان بات چیت ہو گی اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے بھائی آپس میں ملیں گے تو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔

مُعاہدہ شملہ اور مسائل کا حل

موجودہ معاہدے نے اس حل کے لیے راستہ پیدا کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ جب ہم چھینے ہوئے علاقے واپس لے لیں گے تو پھر بھارت کے لیے ہمارے جنگی قیدیوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے کوئی جواز نہیں ہو گا۔ کیونکہ جب کوئی ملک جنگ میں ہاتھ آیا ہوا علاقہ واپس کرتا ہے تو پھر جنگی قیدیوں کو نہ چھوڑنے پر عالمی رائے عامہ اس کے متعلق کہہ سکتی ہے کہ چونکہ جنگ کے ختم ہونے کا اعلان ہو چکا ہے اور اب جنگ کی فضا ختم ہو گئی ہے تو پھر آپ نے جنگی قیدیوں کو کیوں اب تک قید رکھا ہوا ہے جب جنگ ختم ہو گئی ہے تو جنگی قیدیوں کو بھی واپس بھیج دینا چاہیے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی طاقت اب ہمارے ان بھائیوں کو جو بھارت کی حراست میں ہیں ہم سے دور نہیں رکھ سکتی اور وہ دن دُور نہیں جب وہ ہمارے درمیان آ موجود ہوں گے۔ میں جنگی قیدیوں کے لواحقین کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں جنھوں نے صبر اور حوصلے سے کام لے کر پاکستان کی عظمت اور وقار کو بلند رکھنے کے لیے حکومتِ پاکستان کے ساتھ پُورا پورا تعاون کیا ہے۔ اُمید ہے کہ وقت آنے پر یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور ہوسِ اقتدار کے مارے ہوئے لوگ جو جنگی قیدیوں کے مسئلے کو محاذ آرائی کا موضوع بنانا چاہتے ہیں اس میدان میں بھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بلکہ انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑیگا۔

جناب والا!

میں نہیں چاہتا کہ یہاں ان دلائل کا تجزیہ کروں جو اس معزز ایوان میں میرے بعض

فاضل دوستوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں۔ میں ان کے اندازِ گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ کیونکہ ان کے دلائل میں منطق کی جلوہ آرائیاں تھیں لیکن "پائے استدلالیاں چوبیں بود" کے مصداق انھیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے تھا کہ منطق ہمیشہ مضبوط نہیں ہوتی اور اس میں کمزوریاں بھی ہوسکتی ہیں چنانچہ وہ اپنے ارشاد فرمائے ہوئے جملوں پر داد تو پاسکتے ہیں لیکن ان جملوں سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ پرسوں ایک دوست نے ایک بڑی دلچسپ بات کرتے ہوئے ایک بہت بڑا نکتہ پیدا کیا اور بڑی داد بھی لی اور اگر وہ اسمبلی ہال میں نہ ہوتے کسی پبلک جلسہ میں تقریر کرتے تو اور تو اور میں خود بھی ان کی شان میں نعرۂ تکبیر بلند کرتا۔ لیکن یہ معزز ایوان تو سنجیدہ باتوں کی جگہ ہے یہاں جذبات سے ماورا ہو کر قومی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر یہاں کہا گیا ہے کہ ہزار سال تک لڑنے والے پانچ سو سال تک تو لڑے ہوتے۔ اگر مولینا مجھ سے مشورہ کرتے تو میں ان سے گذارش کرتا کہ تنقید ہی کرنی ہے تو آسان طریقہ یہ تھا کہ آپ کہتے کہ ہزار سال بھی زندہ رہا ہے کوئی جو بھٹو صاحب ہزار سال تک لڑنے کی بات کرتے ہیں۔ ہزار تو بجائے خود رہا، پانچ سو سال بلکہ سو سال تک بھی زندہ رہنا محالات میں سے ہے۔ تاہم بات وہی ہے کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" ؟ ایک بات استعاراتی رنگ میں کی جاتی ہے اور آپ اس سے لفظی معنی اخذ کرتے ہیں۔ اگر اہلِ زبان ہونے کے دعوے دار بھی زبان کے ساتھ یہ سلوک روا رکھیں کہ بال کی کھال اتارنے میں لگے رہیں تو ہم لوگوں کو صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے۔ منطق تو کوئی ایسی چیز نہیں جسے دلیل کے طور پر لوگ قبول کریں۔ ایک شخص کہتا ہے کہ جب تک میری دو ٹانگیں سلامت ہیں میں لاہور سے راولپنڈی پیدل ہی چل کر آیا کروں گا' تو پھر اگر اس شخص کی ایک ٹانگ ضائع ہو جائے تو کیا اس سے یہ کہا جائے گا کہ اچھا اب گجرات تک پیدل چل کر دکھاؤ۔ یا اگر کوئی کہے کہ میں دونوں ہاتھوں سے پانچ گھنٹے تک تالی بجا سکتا ہوں تو کیا جس بدقسمت آدمی کا ایک ہاتھ ناکارہ ہو' اسے ڈھائی گھنٹے تک بجانے کا حکم دیا جائے ؟

جناب چیئرمین ! اگر آپ اجازت دیں گے تو میں ان منطقی مغالطوں کے متعلق

بات چیت کروں گا جو ہمارے اپوزیشن کے بعض محترم ارکان نے اس معزز ایوان کو اور اس ایوان کے توسط سے پوری قوم کو دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ۲۱ اگست کو جہاں اور بہت سے موضوعات پر بحث ہوگی وہاں ان مغالطوں کے متعلق بھی اپوزیشن کے بعض ارکان سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔

اس وقت میں اس معزز ایوان کا مزید وقت نہیں لوں گا لیکن آخر میں اتنی عرض ضرور کروں گا کہ آج چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے کا وقت نہیں۔ اس معزز ایوان میں ایک طرح کی رسم سی پڑ گئی ہے کہ معزز ارکان ہر بات کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے ہیں مگر ہمارا ملک ایک نازک دَور سے گزر رہا ہے۔ ہمیں جذباتیت سے گریز کرنا چاہیے اور حقائق کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ آج ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں جن سے لوگوں کے حوصلے پست ہوں۔ یہ کہنا کہ کل یہ لوگ ایک ہزار سال لڑنے کی باتیں کرتے تھے اور آج امن کی گفت و شنید کر رہے ہیں۔ ہمارے مقصد کے لیے مفید نہیں جس وقت ہم جارحیت کے خلاف ایک طویل جدوجہد کے عزم کا اعلان کر رہے تھے اس وقت بھی ہم امن کے خواہاں تھے اور آج بھی امن ہی چاہتے ہیں اور مستقبل میں بھی امن ہی کی جستجو میں رہیں گے۔ اس لیے جب بھی امن کی پیش کش ہوگی ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن جہاں ہم نے دیکھا کہ ہماری اس خواہش کا احترام نہیں ہو رہا، اگر ہم نے محسوس کیا کہ پاکستان کی عزت اور وقار کو ملحوظ نہیں رکھا جا رہا ہے تو یقین جانیے کہ جہاں ہم امن کی خواہش کرتے ہیں، وہاں اپنے وطنِ عزیز پاکستان کے لیے ذوالفقار علی بھٹو، ان کے ساتھی، ان کا پورا ملک اور ان کی قوم بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ کاش اس ایوان کے معزز ارکان یہ سمجھ سکیں کہ آج کا وقت اس بات کے لیے مناسب نہیں کہ انتقام انتقام کے نعرے لگا کر قوم کو ایک طے شدہ راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جائے۔

قومی ذمّہ داریاں

جنابِ والا!

جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے، ہر مسلمان کی زندگی ہے، ہر مسلمان کا ایمان ہے، ہر مسلمان کا شعار ہے۔ لیکن اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جہاد محض قتال کا نام نہیں ہے، جہاد محض لڑائی کا نام نہیں ہے بلکہ جہاد جدوجہد کا نام ہے، محنت کا نام ہے، مشقت کا نام ہے، جہاد اللہ تعالیٰ کے نام کو سربلند رکھنے کی کوشش کا نام ہے، جہاد ملک کی خدمت کا نام ہے، غریب اور مظلوم کو سربلند کرنے کا نام ہے، اس لیے ہم جہاد سے کبھی دریغ نہ کریں گے، ہرگز گریز نہ کریں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جہاد کریں، محنت کریں، مشقت کریں، جذباتیت سے بلند ہوں۔ اپنے اندر وحدت پیدا کریں۔ جو ملک ہمیں ملا ہے اور جس حال میں ملا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اور مزید اندیشے تھے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسے ایک بنائیں اور مستحکم کریں تاکہ ایک مستحکم پاکستان مشرقی پاکستان کے لیے بھی شعاعِ اُمید ثابت ہو۔ ہم جیسے مشکلات میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے یہ بحثیں کہ پاکستان کے بنانے میں کن کا حصہ تھا اور کن کا نہ تھا مفید نہیں۔ اس لیے میں اس قسم کی بحث میں نہیں پڑوں گا۔ میں تو صرف یہی کہوں گا کہ خدارا احتیاط کیجیے کہیں کوئی اور فتنہ کھڑا نہ ہو جائے۔ میں ان لوگوں کی خدمت میں جنھوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اور جو اب پاکستان کی بقا کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں یہ گزارش کروں گا کہ اس نازک وقت میں ان پر بھاری ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اگر ان کو اس کا احساس ہے تو پھر اس مرحلے پر قومی زندگی کے اس اہم مرحلے پر قومی وحدت اور یگانگت پر آنچ نہ آنے دیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم سب مل جائیں اور آج ہی اختلافات سے بالا ہو کر یہ دیکھیں اور سوچیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اس ملک کے لیے ایک Ray of hope ہیں، وہ آخری شعاعِ اُمید ہے۔ اگر ہم ان کی قیادت کو بھی ناکام بنا دیں، اگر ان کی راہ میں بھی

کانٹے بچھادیں، اگر ان کے لیے بھی روڑے اٹکائیں اور ان تمام باتوں کی تہہ میں محض گروہی اور جماعتی سیاست کارفرما ہو تو پھر مجھے خطرہ ہے کہ پاکستان کا مستقبل شاید تابناک نہ ہو سکے۔

اس لیے میں پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں سے، جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے بزرگوں سے بڑے زور سے کہوں گا کہ متحد ہو جائیے اور قائد نے جو امانت آپ کے سپرد کی تھی اور وہ امانت اب جس حال میں بھی ہے اور جتنی بھی ہے اس کی حفاظت کیجیے۔ اسے اپنے سینے سے لگائیے اور اپنے حسنِ عمل سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے جائیے۔ ہمیں ہر وقت یہ سوچنا اور غور کرنا چاہیے کہ ؎

اک مصوّر نے جو سونپی تھی امانت کی طرح
کیا یہ لازم ہے وہ تصویر مٹا دی جائے

مسلم بنگال اور پاکستان

"بنگلہ دیش کو منظور کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ مسئلہ عوامی حکومت کے قیام کے بعد پچھلے سالوں میں جتنا جذباتی اور نازک رہا ہے اسے کون نہیں جانتا۔ جب ۹ جولائی ۱۹۷۳ء کو اس مسئلہ پر غور کرنے کیلیے قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو فضا ہوش سے زیادہ جوش سے معمور تھی۔ اکثریتی پارٹی نے اس موقع پر جو قرارداد پیش کی اس کی وضاحت اور تائید میں مَیں نے یہ تقریر کی تھی۔ میرے پیشِ نظر یہ تھا کہ ہم جذباتیت کے بجائے ٹھنڈے دل سے اس مسئلے پر غور کریں۔"

○

جناب اسپیکر!

آج اس ایوان میں جو مسئلہ زیر بحث ہے بلاشبہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے جذباتیت کو اس طرح اپنا شعار بنا لیا ہے کہ وہ ٹھوس حقائق کو بھی جذباتی انداز سے لیتے ہیں۔ اور ان کو بھی ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

بنگلہ دیش کا مسئلہ ہماری خارجہ پالیسی کے دائرہ میں شامل ہو چکا ہے۔ اور یہ بات سیاست کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ خارجہ پالیسی جذبات سے طے نہیں ہوتی بلکہ یہ ان مسائل سے تعلق رکھتی ہے جو کسی قوم کی ضروریات، اس کی مصلحتوں اور ان حقیقتوں سے حل ہوتے ہیں جو انھیں درپیش ہیں۔ یحییٰ حکومت نے اپنی آمرانہ اور غلط روش کے ذریعے مسلم بنگال کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اور جس کے نتیجہ میں ہم تباہیوں سے دوچار ہوئے وہ ایک بڑی حماقت تھی۔ لیکن اب مزید حماقت یہ ہوگی کہ ہم حماقت پر حماقت کرتے

چلے جائیں۔ اور مسلم بنگال سے کوئی رابطہ استوار کرنے کے راستے میں مزید رکاوٹیں کھڑی کریں۔ اور وہ نفرت جس کے بیج پچھلے برسوں میں بنگالی مسلمانوں کے دماغوں اور دلوں میں بوئے گئے اس کی فصل ہم کاٹتے چلے جائیں۔ اور اس طرح ہم نفرت کے جہنم کو بھڑکاتے رہیں اور صورت حال کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں۔

اکثریت کا مطالبہ

صورت یہ نہیں ہے کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لیا تھا یا اسے بزور شمشیر فتح کر لیا تھا۔ بلکہ صورت یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے مسلمانوں نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی۔ اور اس کے حق میں رائے دی تھی۔ بعد میں صحیح یا غلط بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے تحت یا کسی بھڑکاوے یا دھوکے میں آ کر اسے آپ جو چاہیں کہہ لیجیے مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اپنے لیے ایک علیحدہ سٹیٹ کا مطالبہ کیا۔ اور بنگلہ دیش کے حق میں انھوں نے رائے دی۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو اکثریت میں ہیں ان پر ہم اپنے فیصلے ٹھونسیں جو ان کے مقابلے میں اقلیت ہیں۔ جمہوریت کو اگر ہم تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ کبھی کوئی اقلیت کسی اکثریت پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دلیل دی جائے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ یا بنگلہ دیش کے لوگ تو پاکستان سے علیحدگی نہیں چاہتے ہیں۔ یہ بھی ایک دل بہلاوے کی بات ہے۔ اور اپنے دل کو غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی بات ہے۔ یہ غیر ضروری جذباتیت پر احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات ہے۔ اس لیے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے اور بنگلہ دیش کے لوگوں نے یہ خواہش مختلف ذرائع سے واضح کر دی ہے کہ وہ اب ہمارے ساتھ مل کر نہیں رہنا چاہتے۔

سب سے پہلے میں اس الیکشن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا جو شیخ مجیب الرحمٰن

نے برسر اقتدار آنے کے بعد کرائے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ بنگلہ دیش کے مسئلہ پر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ وہ پاکستان سے ایک علیحدہ سٹیٹ کے سوال پر ہوئے۔ اور ان میں وہ ایک عظیم ترین اکثریت کے ساتھ جیت گیا۔ وہ مارجن ذہن میں ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کسی بھی برسرِ اقتدار پارٹی کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دھاندلی کی ہوگی۔ اس نے غلط اور جعلی ووٹ ڈلوائے ہوں گے اور اس طرح اس نے اپنا اثر استعمال کیا ہوگا تب بھی جتنا Percentage آپ اس مارجن کو دینا چاہیں دیں۔ اس کے باوجود وہ ایک عظیم ترین اکثریت جو عوامی لیگ کو اس الیکشن میں حاصل ہوئی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ بنگالی مسلمان بہر حال اب ہمارے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس کے بعد جناب عالی! آپ یہ دیکھیں کہ مولانا بھاشانی جیسے لیڈر جو مجیب کے خلاف اور سیاسی طور پر ان کے رقیب ہیں۔ اور جن کے بارے میں پاکستان کے ترقی پسند حلقے اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ان کی بھی خواہش اور ان کی رائے واضح ہو چکی ہے۔ مولانا بھاشانی جنھوں نے سب سے پہلے "السلام علیکم" کے الفاظ کہے تھے۔ آج پھر یہ بیان دے رہے ہیں بلکہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پاکستان کو بنگلہ دیش کی حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے اس سے ان کے ہاتھ مضبوط ہوں گے اور پاکستان کے حامی عناصر کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

بہاریوں کی واپسی

اس کے بعد یہ بات توجہ طلب ہے کہ خود اپوزیشن اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں لوگوں کے ذہن اس طرح بدل چکے ہیں اور وہاں کی فضا یکسر اس طرح تبدیل ہو چکی ہے کہ اب وہاں پاکستان دوست یا پاکستانی عناصر کا زندہ رہنا یا زندگی کے دن گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔ اور ایک مطالبہ جو اکثر ان حضرات کی طرف سے ہوا وہ یہ ہے کہ بہاریوں کو واپس پاکستان میں آنے دیا جائے۔ یہاں ان کو بسایا جائے۔ یہ

مطالبہ یہاں اکثر کس لیے ہوتا ہے ؟ اس لیے ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک بہاری اب مشرقی پاکستان میں نہیں رہ سکتے۔ اب وہاں کی فضا ان کو قبول کرنے کو تیار نہیں، اب وہاں کی زمین ان کے لیے بدل چکی ہے۔ اور اب اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ وہاں پاکستان کے ساتھ ان گزشتہ برسوں کی سیاست کے نتیجہ میں ان کے ذہنوں پر وہ تاثرات طاری ہو چکے ہیں جس کے نتیجہ میں وہاں ایک خلیج حائل ہو چکی ہے اور بنگلہ دیش کا ایک علیحدہ وجود اب حقیقت بن چکا ہے۔ پھر نیپال کے راستے جتنے قافلے یہاں آ رہے ہیں اور آتے رہتے ہیں ان کے بیانات پر بھی نظر رکھیں آپ کو معلوم ہو گا کہ بنگالی کس حد تک پاکستان دوست عناصر پر اور پاکستانی ذہن رکھنے والے لوگوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں یا ان افراد کے خلاف تلخ جذبات رکھتے ہیں۔ اس لیے ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا کہ بنگالی ہمارے ساتھ ہیں اور وہ ہم سے علیحدہ نہیں ہوئے بلکہ ان کو زبردستی ہم سے علیحدہ کیا گیا ہے بالکل ایک ایسی منطق ہے جس پر کوئی حقیقت پسند آدمی ایمان نہیں لا سکتا۔

تاریخی شواہد

اگر ایک ملک سے اس کا کوئی حصہ بزور شمشیر یا برضا و رغبت علیحدگی اختیار کرے تو کیا ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد وہ ملک اس کو تسلیم کرے۔ تاریخ میں کیا ایسے شواہد نہیں ہیں کہ جب ایک ملک سے اس کا ایک حصہ علیحدہ ہوا تو اس ملک نے اس کو تسلیم کر لیا ہو۔ ابھی میرے فاضل دوست خورشید حسن میر صاحب نے شام اور مصر کی مثالیں دی تھیں کہ کس طرح شام اور مصر نے عرب ری پبلک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ لیکن بعد میں وہ علیحدہ ہو گئے۔ اس کے باوجود ان کے تعلقات میں فرق نہیں آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تسلیم کیا۔ آپ یہ دیکھیں کہ پہلی عالمی جنگ سے قبل عراق، شام، تیونس،

الجزائر، مصر، سعودی عرب سب سلطنت ترکیہ کے حصے تھے۔ جو ایک ہی خلافت کی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں یہ سب ملک بیرونی طاقتوں کی مدد سے آہستہ آہستہ خلافت ترکیہ سے علیحدہ ہوتے چلے گئے۔ لیکن کیا اتاترک نے ان ممالک کے علیحدہ وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تو پھر ہم کب تک جذبات کے انداز کو اپنائے رکھیں گے۔ اور حقائق سے غفلت برتیں گے۔ اس کے بعد سب جانتے ہیں کہ ۱۹۵۵ء تک سوڈان مصر کی سلطنت کا حصہ تھا، لیکن جب یہ علیحدہ ہو گیا۔ اور اپنی علیحدہ مملکت بنالی تو صدر ناصر نے اس کو تسلیم کیا۔ وہ جذبات میں آکر یہ نہیں کہتے کہ ہم سوڈان کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم کٹ مریں گے۔ گردنیں کٹوادیں گے، نہیں بلکہ اس نے حقیقت کو تسلیم کیا۔ کیونکہ یہ مسئلے جذبات سے حل نہیں ہوا کرتے۔ اس کے بعد آپ افریقہ کی ریاستیں دیکھیں جو کسی نہ کسی یورپی ملک کے زیر اثر تھیں، اس کی سلطنت تھیں، اس کی غلامی میں تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ تمام افریقی ریاستیں آزادی حاصل کرتی گئیں۔ اور علیحدہ ملک بنتی چلی گئیں۔ اور تمام یورپی ممالک نے جن کے اقتدار میں یہ ریاستیں تھیں۔ ان کا علیحدہ وجود تسلیم کیا۔ یہ ایسی انہونی بات نہیں۔ یہ کوئی ایسی عدیم النظیر چیز نہیں کہ جب ملک کا کوئی حصہ اس سے علیحدہ ہو جائے تو بعد میں اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔

تسلیم نہ کریں تو؟

جناب والا! یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کریں تو نتیجہ کیا ہو گا۔ کیا اس کی حقیقت تبدیل ہو جائے گی؟ کیا اس کا علیحدہ وجود ختم ہو جائے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ایک سو ممالک بنگلہ دیش کو تسلیم کر چکے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ بعض بین الاقوامی اداروں کا ممبر بن چکا ہے۔ پھر بھی ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے تو اس میں نقصان کس کا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ تھوڑا بہت وقتی طور پر ایک خاص محدود وقت تک اس کا

بھی نقصان ہو۔ اگر آپ دور رس انداز سے سوچیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ آخر کار ہمارا نقصان ہو گا۔ اگر ہم وہاں نہیں جائیں گے اور ہمارے تعلقات بحال نہیں ہوں گے۔ اگر ہمارا کوئی سفارتی رشتہ قائم نہیں ہو گا تو ہم پاکستان دوست عناصر کو جس کا وہاں قتل عام ہو رہا ہے نہ بچا سکیں گے۔ ہم ان کو پناہ نہیں دے سکیں گے۔ ہم ان کو مظالم کے پنجے سے نہیں چھڑا سکیں گے۔ اور نہ ہی کوئی دباؤ ڈال سکیں گے۔

اس کے بعد جناب والا! ہمارا چین کے ساتھ تعلقات کا معاملہ ہے وہ ہمارا دوست ہے۔ اور اس نے اس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے انکار کر رکھا ہے جب تک ہم اس کو تسلیم نہ کریں وہ بھی ہمارے تسلیم نہ کرنے کی صورت میں بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرے گا۔ اس کا بھی وہاں کوئی سفارت خانہ نہیں ہو گا۔ اور نہ ہی اس کے وہاں روابط استوار ہونگے۔ اگر چین بنگلہ دیش کے ساتھ اپنے تعلقات استوار نہیں کرے گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ بڑی طاقتیں جن کے اثرات پاکستان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں یا بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان کا اثر و رسوخ وہاں پر بڑھ جائے گا چین وہاں جاکر ان اثرات کو ختم کر سکتا ہے۔ اور اس طرح بنگلہ دیش کے مستقبل کی راہیں بھی روشن اور درخشاں ہو سکتی ہیں۔

جناب والا! میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارے نہ تسلیم کرنے کی وجہ سے بہت سے دوست ملک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش مسلمان ممالک کے زیر اثر نہیں ہے۔ مسلمان ملک اپنے اثرات وہاں پھیلانے کا کوئی موقع حاصل نہیں کر رہے۔ اگر مسلمان ممالک کے روابط وہاں پیدا ہوتے تو وہ زیادہ اثر ڈال سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کر کے ہم ان روابط کو زیادہ مستحکم کر سکیں گے جو اس حصہ اور اس حصہ میں پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ اور پیدا کیے جانے چاہئیں۔

اقتصادی پہلو: ہمیں اقتصادی نقصان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ

۲۵ سال مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اس انداز میں کام کرتے رہے ہیں کہ دونوں کی اقتصادی ترقی ایک دوسرے پر منحصر رہی ہے۔ اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ ہماری بہت سی مصنوعات اور ہماری بہت سی چیزوں کی مارکیٹ مشرقی پاکستان میں ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اب بنگلہ دیش بھی آزاد ہے۔ اور بہت سی چیزیں تیسرے ذرائع سے آج بھی وہ پاکستان سے حاصل کر رہا ہے۔ مثلاً کپڑا اور دوسری چیزیں وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم خوش ہو لیتے ہیں کہ مشرقی پاکستان اقتصادی گرداب میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن اس سے ہمیں فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے فائدہ دوسری طاقتوں کو پہنچے گا جو ان کی مشکلات کو Exploit کریں گے۔ جو بنگلہ دیش کو ہم سے دور کریں گی۔ اور اس نظریہ سے بھی دور کریں گی جو ہم مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس ہے۔ اس قرضے پر بھی نگاہ رکھیں جو تیرہ چودہ ارب روپیہ ہے۔ اور جس کا کروڑوں روپیہ سالانہ سود دینا پڑتا ہے۔ کیا ہم یہ سود دیتے رہے گے۔ اور اس طرح زیر بار ہوتے چلے جائیں گے۔ کیا ہمیں اپنے غریب عوام کے معاشی مسائل کو حل نہیں کرنا ہے۔ اور یہ لوگ (حزب اختلاف) محض نعرے لگاتے رہیں تاکہ عوامی حکومت مشکلات میں پھنسی رہے۔ اور یہ ان کے قرضے ادا کرتی رہے۔ اور اس پر اسس کا بار پڑے اور ساتھ ہی ساتھ شور کریں کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ گرانی بڑھ گئی ہے مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ جب ہم ان مشکلات کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کا تدارک کرنا چاہتے ہیں تاکہ پاکستان کے غریب عوام کے کندھوں پر سے بوجھ اتارا جائے جو پہلی حکومت نے غلط طور پر ان کے اوپر ڈال رکھا تھا۔ تو پھر یہ ہمارے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

نظریۂ پاکستان

جناب والا! یہ کہا جاتا ہے کہ اگر بنگلہ دیش تسلیم کر لیا گیا تو نظریہ پاکستان ختم ہو جائیگا لیکن جناب والا۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے پاکستان کا جو نظریہ پیش کیا تھا

کیا اس میں مشرقی پاکستان کا نام تھا، مسلم بنگال کا نام تھا۔ اگر نہیں تھا تب بھی وہ پاکستان کا ایک حصہ تھا۔ اس میں اگر کشمیر کا نام تھا۔ اور اگر کشمیر نہیں ملا تھا تو اس کے باوجود نظریہ پاکستان زندہ رہ سکتا ہے۔ تو وہ حصہ جو علامہ اقبال کے نظریہ پاکستان میں شامل نہیں تھا۔ بنیادی طور پر اگر ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نظریہ پاکستان قائم نہیں۔

جناب والا کون نہیں جانتا کہ نظریۂ پاکستان محض حدود کا نام نہیں، محض ایک جغرافیائی نام نہیں ہے۔ محض عمارتوں اور سنگ و خشت کا نام نہیں۔ نظریہ پاکستان ایک سچائی ہے، نظریۂ پاکستان ایک اصول ہے، یہ ایک عقیدہ ہے۔ اور عقیدہ کبھی جغرافیائی حدود میں تغیر و تبدل سے ختم نہیں ہوا کرتا، کبھی سچائی ختم نہیں ہوا کرتی۔ کبھی اصول ختم نہیں ہوا کرتے۔ اس لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے مسلم بنگال کو تسلیم کر لیا۔ اگر ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو نظریہ پاکستان ختم ہو جائے گا۔ وہ حقیقت میں لوگوں کے ذہن کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ناموزوں تشبیہ

جناب والا! بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ لوگ جو رات دن اسلام اسلام پکارتے ہیں۔ جو رات دن مذہب کا نام لیتے ہیں۔ اور اس ملک کے اندر برسر اقتدار آنے کے خواب دیکھتے ہیں، مذہب کی تجارت کرتے ہیں اور مذہب کے زینے سے دنیاوی خوشحالی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش تسلیم کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عرب اسرائیل کو تسلیم کر لیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کیسے کر سکتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے کلمہ گو مسلمانوں کو یہودیوں سے تشبیہ دیتے ہوئے بھی کچھ خدا کا خوف نہیں کیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کتنا ہی گیا گزرا مسلمان کیوں نہ ہو۔ کتنا ہی گنہگار

کیوں نہ ہو لیکن وہ ہمارے حقائق اور ہمارے ایمان کی رو سے ہزار درجے یہودیوں سے بہتر ہے۔ اور پھر اگر بنگالی مسلمانوں سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اور وہ بڑے سے بڑے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کو یہودی کہنا۔ ان کو اسرائیل سے تشبیہہ دینا جناب والا سنگدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ آخر بنگلہ دیش بنے گا تو پھر بھی وہ ایک مسلمان ملک ہو گا۔ اسے ہم اسرائیل سے کس طرح تشبیہہ دے سکتے ہیں، یہودی ریاست سے کیسے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ یہ عوام کے مذہبی جذبات کا استحصال کرنے کے مترادف ہے اور لوگوں کے ذہنوں کے اندر غلط شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مہم ہے۔

معقول قرارداد

جناب والا! آخر ایسا کیوں ہے؟ ان سارے حقائق کے ہوتے ہوئے قومی اسمبلی آج یہ منظور نہیں کر رہی ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے۔ ہم اس لیے یہاں نہیں بیٹھے ہیں۔ اور آج ہم یہ بحث نہیں کر رہے کہ ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے اٹھیں گے بلکہ ہم اپنے لیڈر کو، اس لیڈر کو جسے اس ملک کے ۸۰ فیصد عوام نے اپنا قائد چنا ہے۔ اس لیڈر کو جس کے ہاتھ وقت کی نبضوں پر ہیں۔ اس لیڈر کو جس سے زیادہ عوام کی خواہشات اور امنگوں کو اور کوئی نہیں جانتا۔ جو عوام کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دیتا چلا آیا ہے اس کو ہم یہ اختیار دیں کہ وہ جب چاہیں۔ جب بھی مناسب وقت پائیں، جب ملک اور قوم کی مصلحت ہو، قوم کے فائدے میں ہو۔ جب وہ دیکھے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینا ملک کے فائدے اور مفاد میں ہے۔ اگر یہ شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر سکتا ہے۔ اس قدر سنجیدہ، اس قدر معقول، اس قدر انفرادیت پسندانہ، اور اس قدر مبنی بر حقیقت قرارداد کی مخالفت میری سمجھ میں نہیں آتی بجز اس کے کہ میں یہ کہوں کہ ان لوگوں کا کام ہی یہ ہے کہ ہمارے راستے میں رکاوٹ ڈالیں اور برسر اقتدار پارٹی کی ٹانگ کھینچیں۔ عوام کے فیصلے کے

آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کریں اور عوام کے ووٹوں کی بھاری اکثریت جو فیصلہ دے چکی ہے اس کے خلاف مہم چلائیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ آج وہ لوگ بھی بنگلہ دیش کے مخالفوں میں شامل ہو گئے ہیں جنھوں نے کل اپنی سیاست کا آغاز ہی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے نعرے سے کیا تھا۔ اس وقت ان کا خیال یہ تھا کہ شاید ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطالبہ نہیں مانیں گے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ہم ان حقائق پر غور کرنے لگے ہیں جب انھوں نے دیکھا کہ شاید اب ہمارے مطالبات اور شرائط تسلیم ہو جائیں اور بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے تو یکلخت بدل گئے ہیں۔ اتنی ڈھٹائی سے بدل گئے ہیں کہ سیاست کی تاریخ میں اس کا جواب نہیں ملتا۔ اب وہ کہنے لگے ہیں کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینا ملک و قوم اور اسلام ہر چیز کے منافی ہے۔ جناب والا میں یہ عرض کروں گا کہ کسی لحاظ سے دینی لحاظ سے، سیاسی لحاظ سے، بین الاقوامی لحاظ سے، تاریخی لحاظ سے ان لوگوں کے دلائل میں کوئی وزن نہیں۔ میں قومی اسمبلی کے معزز اراکین سے عرض کروں گا کہ وہ شرحِ صدر کے ساتھ اس قرارداد کو منظور کریں۔ ان لوگوں کی باتوں پر نہ جائیں جو آج بہکے ہوئے ہیں یا بہکائے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں کا کام یہ بھی ہے کہ ہم Lead دیں۔ اگر کچھ غلط فہمی بھی ہو تو ہمارے مسلسل عمل سے کل ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ انھیں نظر آ جائے گا کہ جو فیصلہ ہم کر رہے ہیں اور جو فیصلہ صدر ذوالفقار علی بھٹو کر رہے ہیں وہ ملک کے مفاد میں تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اس قرارداد کی پُرزور تائید کرتا ہوں۔

ریڈیو کی اہمیت

"۳۱ جنوری ۱۹۷۳ء کو قومی اسمبلی میں پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن
کا بل پیش کیا گیا۔ اس موقع پر کی گئی تقریر۔"

میرا ارادہ نہ تھا کہ میں کچھ زیادہ تفصیل بات کروں لیکن آج کی اس بحث میں بہت سے دوستوں نے ایسے مسائل اٹھائے ہیں کہ اس بل کو زیرِ غور لاتے ہوئے مجھے ان کے متعلق ضرور کہنا پڑے گا۔

سب سے پہلے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ معزز اراکین ریڈیو کی اہمیت سے پورے طور پر باخبر ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ ریڈیو اس دور میں جہاں خیالات پہنچانے کا ذریعہ ہے، جہاں تفریح، پروپیگنڈے اور تعلیم کا ذریعہ ہے وہاں وہ Motivation یعنی نئے خیالات اور نظریات کی ترغیب اور تبلیغ کا ذریعہ بھی ہے اور اس کے ذریعے معاشرے کے اندر کافی تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ یہ امر بھی خوشی کا باعث ہے کہ یہ معزز ارکان اس چیز سے بھی باخبر ہیں کہ دوسرے ملکوں کے برعکس پاکستان کی سابقہ حکومتوں نے ریڈیو پاکستان کو ترقی دینے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ جب ہم اپنے پڑوسی ملکوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ بھی اس میدان میں ہم سے کہیں آگے جا چکے ہیں۔ ہندوستان کی بات تو چھوڑ دیں کہ اس نے سری نگر سے لے کر راج کوٹ تک ہماری سرحدوں کے ساتھ ساتھ Transmitters

کے جال بچھا دیے ہیں اور کئی کئی Channels سے ان کی نشریات براڈ کاسٹ ہوتی ہیں۔ افغانستان میں بھی پچھلے سال ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر لگایا جا چکا ہے جس کے ذریعہ اس کی نشریات بہت دُور دُور تک سُنی جا سکتی ہیں۔ ایران میں بھی کئی ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر کام کر رہے ہیں۔ لیکن ہم نے پاکستان ریڈیو کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں کی بلکہ اگر ہم نے اس پر توجہ دی بھی اور ہماری سابقہ حکومتوں نے اسے نوازا بھی تو ان کی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں ہمیں یہ روزِ بد جس کی طرف میرے ایک دوست نے اشارہ کیا ہے، دیکھنا پڑا کہ ریڈیو پاکستان کی ساکھ پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ اس پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا۔ کیونکہ جنگ کے زمانے میں ان کو باخبر نہیں رکھا گیا اس میں ریڈیو پاکستان کے کارکنوں کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ پالیسی بنانے والوں کا قصور تھا جن کی غلط پالیسی کے نتیجے میں ریڈیو پاکستان کے اعتبار میں کمی آگئی اور اس کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ ورنہ اسی ریڈیو نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ خدمات سرانجام دیں اور اس وقت اس کے کارکنوں نے اس طرح کام کیا جس طرح کہ مجاہدین محاذِ جنگ پر کام کرتے ہیں لیکن نہ صرف یہ کہ اس ادارے کو کوئی صلہ نہ ملا بلکہ اس کو نقصان پہنچا اور اس کے کارکنوں کا معاوضہ بھی کم کر دیا گیا اور ان کے حقوق کا بھی خیال نہ رکھا گیا۔ ان لوگوں کو ایسا سمجھا گیا جیسے اس معاشرے، اس سوسائٹی میں ان کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ جب موجودہ عوامی حکومت برسراقتدار آئی تو جہاں اس نے زندگی کے بہت سے دوسرے گوشوں کی طرف توجہ کی وہاں اس نے ریڈیو پاکستان کو بھی ایک طاقت ور ذریعۂ ابلاغ بنانے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایک سال کے اندر اندر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے ذرائع اور وسائل آپ کے سامنے ہیں۔ ہماری مشکلات آپ کے سامنے ہیں اور ملک ہمیں جیسی حالت میں ملا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کا وہ شعر اس حکومت پر صادق آتا ہے جس کے سامنے مسائل کا ایک جنگل ہے کہ:

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

تو اس صورتِ حال میں اگر ریڈیو پاکستان کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ توجہ انہی چند دنوں کی بات ہے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں اس کے لیے منصوبہ بندی کر لی گئی ہے اور جو جو منصوبہ بندیاں ہوئی ہیں ان میں سے بعض منصوبوں پر کام بھی شروع ہو چکا ہے بعض پر آگے چل کر ہو گا۔ ایوان کو اطلاع دیتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے (اگرچہ بعض دوست تو صوبائی تعصب کو ایکسپلائٹ کر رہے ہیں) کہ اس پاکستان کو ایک وحدت بنانے کے لیے ایک اکائی میں تبدیل کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہم صوبوں میں ریڈیو ٹرانسمیٹروں کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنائیں گے۔ چنانچہ ریڈیو پاکستان پشاور کا ٹرانسمیٹر جو پہلے محض دس کلو واٹ کا تھا۔ اس حکومت نے اس کے متعلق پہلی دفعہ یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کو تیس گنا طاقت ور بنا کر تین سو کلو واٹ کا ٹرانسمیٹر لگایا جائے اور اسی طرح کوئٹہ میں جہاں دس کلو واٹ کا ٹرانسمیٹر کام کر رہا ہے وہاں ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک نیا طاقت ور ٹرانسمیٹر لگایا جائے جو ایک سو پچاس (۱۵۰) کلو واٹ طاقت کا ہو اور اس طرح سے ان ریڈیو اسٹیشنوں پر دو چینل کام کرنے لگیں گے، ان کاموں میں ہمیں بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ ہمیں بہت سی ضروریات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، زراعتی پروگرام دینے پڑتے ہیں۔ دیہاتی اور شہری آبادی کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ دو چینل ہو جانے کی صورت میں ان پروگراموں میں جدت اور تنوّع پیدا ہو سکے گا اسی طرح فیڈرل پروگرام یعنی قومی نوعیت کے پروگراموں کے لیے ہم نے ایک ہزار کلو واٹ کا ایک ٹرانسمیٹر نصب کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس ٹرانسمیٹر سے پورے ملک کے اندر قومی نوعیت کے پروگرام پیش کیے جائیں گے۔ میرے دوست نے یہ شکایات بجا طور پر پیش کی ہیں اور میں خود اس میں شریک ہوں کہ باہر کے ملکوں میں ریڈیو پاکستان سنائی نہیں دیتا۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں ورثہ میں ملا ہے اس سلسلہ میں ہم نے فیصلہ کیا ہے اور اس پر کام شروع ہو چکا ہے۔ یہ Project چھ مہینے میں کام شروع کر دے گا دو شارٹ ویو ٹرانسمیٹر لگانے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے۔ پہلے پچاس (۵۰) کلو واٹ طاقت کے شارٹ ویو پر ہمارا ایک ٹرانسمیٹر کام کر رہا ہے جو غیر ممالک کے استعمال کے

لیے اور غیر ممالک کی نشریات کے لیے ہے۔ اب اڑھائی سو کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر کام شروع کرے گا۔ اس طرح سے ہماری نشریات غیر ممالک میں سنی جاسکیں گی اور یورپ افریقہ اور ایشیائی ممالک میں اپنی آواز ہم اچھی طرح پہنچا سکیں گے۔

• جنابِ والا!

ہمارے پیش نظر یہ پروگرام ہے کہ صوبوں کی مجموعی ترقی کو پیشِ نظر رکھ کر ہمارے ریڈیو اسٹیشن مختلف پسماندہ علاقوں کے لیے کام کریں۔ کیونکہ ہمیں ریڈیو اسٹیشنوں کے ذریعے ان علاقوں میں رہنے والوں میں تعلیم کو بڑھانے، ان کی تربیت کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے لیے عوامی طاقت کو حرکت میں لانا ہے۔ اس حکومت کو بہت سے کام سرانجام دینے ہیں اور انشاءاللہ جو مدت عوام کی طرف سے اسے ملی ہے۔ اس کے ختم ہونے سے بہت پہلے مجوزہ نئے ریڈیو اسٹیشن قائم ہو جائیں گے مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد کامیاب ہوں گے۔ خیرپور، لاڑکانہ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہو رہے ہیں اور بہاول پور کے علاقوں میں موبائیل ٹرانسمیٹر لگانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس طرح سے ہم ملک بھر میں ریڈیو اسٹیشنوں کا جال بچھا دیں گے اور ٹرانسمیٹر مضبوط نہ ہونے کی شکایت جسے یہاں بار بار دہرایا گیا ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

جنابِ والا!

اب میں پروگراموں کی طرف اپنی توجہ مبذول کروں گا۔ جہاں تک اس شکایت کا تعلق ہے کہ علاقائی زبانوں کے پروگرام نہیں دیے جاتے، میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ یہ شکایت محض صوبائی تعصب پر مبنی ہے۔ بالکل سُنی سنائی بات ہے۔ صرف افواہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید میاں قصوری صاحب کو اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ریڈیو بہت کم سُننے کا اتفاق ہوتا ہے اس لیے وہ معذور ہیں۔ لیکن ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ موجودہ حکومت نے علاقائی زبانوں کے بارے میں کوئی تعصب نہیں برتا۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم اپنے دل میں کوئی تعصب نہیں رکھتے۔ ہم فراخ دل لوگ ہیں۔ ہم پاکستان کی تمام زبانوں کو اپنی زبانیں سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک ہر

زبان خدا کی عطا کردہ زبان ہے۔ ہم انشاءاللہ ہر علاقائی زبان کو ترویج دیں گے ترقی دیں گے۔ اس کی ثقافت اور ورثہ کی حفاظت کریں گے۔ اس لیے کہ یہ سب ہمارا سرمایہ ہے۔ اس کے ساتھ اجنبیت اور بیگانگی کا سلوک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب آپ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ پہلی دفعہ کراچی میں دوسرے چینل سے موجودہ حکومت کے عہد میں سندھی پروگرام شروع کیا گیا ہے اس حکومت، کے زمانے میں حیدرآباد میں چینل نمبر ایک سے ساٹھ فیصد سندھی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس حکومت نے پہلی دفعہ کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن سے بلوچی اور پشتو زبان کا وقت بڑھایا ہے۔ پہلی دفعہ اس حکومت نے پنجابی زبان کو پنجاب کے ریڈیو سے اتنا وقت دلایا ہے جتنا کہ سندھ میں سندھی زبان کو دیا جا رہا ہے۔ پہلی دفعہ خبروں کے بلیٹن دو کی بجائے تین کیے گئے۔ آج پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی میں تین تین بلیٹن دیہاتیوں کے لیے روزانہ خبروں میں نشر ہو رہے ہیں اور اس کے باوجود اگر کوئی گلہ باقی رہ جاتا ہے تو وہ اس صورت میں دور ہو سکے گا جب ہم اپنا کوئی دوسرا چینل بنائیں گے۔ اب ایک چینل پر سارا بوجھ ہے دوسرا چینل آ جائے گا، تیسرا چینل آئے گا تو ہم یقیناً عوام کی زیادہ سے زیادہ اُمنگوں کو پورا کر سکیں گے جنھیں اب تک ہم پورا نہیں کر سکے پھر اس ریڈیو کے ذریعے پہلی دفعہ دیہی علاقوں کو بھی پروگراموں میں شریک کیا گیا ہے۔ اگر آپ میں سے کچھ دوستوں نے وہ پروگرام سُنا ہے جو "چوپال" کے نام سے نشر کیا جاتا ہے یا جو ہم "عوامی سیمینار" کے نام سے نشر کرتے ہیں، تو وہ ہماری اس کوشش سے باخبر ہوں گے۔ یہ ہفتہ وار پروگرام ہیں جن میں ریڈیو کے کارکن دیہات میں پہنچتے ہیں وہاں دیہاتی لوگوں کو موقع دیتے ہیں کہ وہ مسائل بیان کریں اور وہاں مختلف محکموں کے لوگ بھی موجود رہتے ہیں اور ان کی شکایات کا جواب دیتے ہیں اس طرح ریڈیو پاکستان نے حکومت کے ساتھ اور ملک کے شہری علاقوں کے ساتھ دیہی عوام کا رابطہ قائم کر دیا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کے پروگراموں کے ضمن میں ایک انقلابی قدم ہم نے اٹھایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آج تک بچوں اور عورتوں کے پروگراموں میں وہ خواتین یا بچے شریک ہوتے تھے جو چاندی یا سونے کا چمچہ مُنہ میں لے کر پیدا ہوتے تھے، یہ پروگرام اپر کلاس کے لوگوں کے بچوں

اور عورتوں کے تفریحی سامان تھے اس میں غریبوں کے بچے نہیں جا سکتے تھے اس میں وہ عورت نہیں جا سکتی تھی جو اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھ کر اپنے خاوند کے لیے روٹیاں پکاتی ہے، جو اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتی ہے، جو اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتی ہے۔ یہاں میرے ایک دوست نے جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں اور میں ان کے پیشے کا احترام کرتا ہوں۔ ایک بات کے ضمن میں حوالہ دیتے ہوئے صاحب بہادروں کی زبان میں "تانگہ والاز" "کھوکھا والاز" کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ان کھوکھا والوں، تانگہ والوں کے بچوں کو پروگرام میں لایا ہوں اور میرے نزدیک یہ کھوکھے والے، تانگے والے ان لوگوں سے زیادہ قابلِ قدر ہیں جو حرام کی کمائی کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کسبِ حلال کرتے ہیں اور خون پسینہ ایک کر کے حلال کی روزی کما کر اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اس Remark کی طرف توجہ دینا پڑی۔ اگر میں اس Remark کی طرف توجہ نہ دیتا تو یقیناً میں اپنی پارٹی کے ساتھ انصاف نہ کرتا، اس ایوان کے ساتھ انصاف نہ کرتا۔ میں شرمندہ ہوں غریبوں کے سامنے ان کھوکھے والوں، تانگے والوں کے سامنے جن کے لیے ایک معزز ممبر نے اس شانِ بے نیازی اور شانِ خسروانہ کے ساتھ یہ زبان استعمال کی ہے تاہم میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پہلی دفعہ غریبوں کے بچے اور غریب عورتیں اس پروگرام میں شریک ہو رہے ہیں اور یہ ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ اس اصول پر سختی سے عمل کیا جائے۔

جہاں تک ریڈیو کی خبروں کا تعلق ہے۔ جناب والا۔ چونکہ یہ پروگرام بھی اس ایوان میں بحث کے دوران زیرِ تنقید آیا ہے۔ اس لیے میں اپنے دوستوں سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تنقید کرتے ہوئے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ ٹھیک ہے۔ ہر شخص Idealism کا حامل ہے۔ ہر شخص IDEAL چیز کا طلب گار ہے لیکن Step by Step چلا جاتا ہے۔ ترقی کی راہ پر قافلہ قدم بہ قدم چلتا ہے۔ یوں ایک چیز آسانی سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ میں کل کی بات نہیں جانتا لیکن آج خبروں کے میدان میں ریڈیو پاکستان کی کارکردگی کا یہ عالم ہے اور مجھے اس کے

لیے اپنے ریڈیو کے کارکنوں پر فخر ہے کہ صدر نکسن نے آٹھ بجے صبح ویت نام کے بارے میں عالمی اہمیت کی خبر کا اعلان کیا، تقریر کی اور ریڈیو پاکستان نے اسی دن نو بجے صبح ایک ہی گھنٹے کے بعد اپنے سارے پروگرام روک کر ایک مخصوص پروگرام پیش کیا۔ جس کے اندر یہ خبر بھی اہلِ وطن کو دی گئی۔ صدرِ پاکستان کا پیغام بھی اس موقعہ پر نشر کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس خبر پر اس پروگرام میں تبصرہ بھی نشر ہُوا اور Commentary بھی ہُوئی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اتنی نمایاں کارکردگی ہے جس کے لیے ریڈیو پاکستان کے کارکن بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جناب والا!

یہاں بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ اس ریڈیو سے اپوزیشن کو موقع نہیں دیا جاتا میرے بعض "آزاد" دوست یہ کہہ کر اپوزیشن کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بصد شوق حاصل کریں لیکن وہ حقائق سے نظر نہ چرائیں۔ وہ محسوس کریں کہ پچیس سال میں آج تک سوائے الیکشن کے کبھی اپوزیشن لیڈروں کو یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ اربابِ اقتدار کے اُوپر تنقید ریڈیو کے ذریعے سے کریں۔ کبھی یہ موقع نہیں دیا گیا کہ اپنے سیاسی موقف ریڈیو سے پیش کریں لیکن ہمارے دَور میں دس دن کے اندر نیشنل Hook up پر جو قومی اہمیت کا پروگرام ہے اور پورے ملک میں نشر ہوتا ہے اس نیشنل Hook up کے پروگرام میں دس دن میں پانچ گھنٹے سیاسی لیڈروں کو دیے جا چکے ہیں۔ کیا یہ اس ملک کی تاریخِ نشریات کا ایک سنہری باب نہیں؟ ایک سیاسی لیڈر کو نہیں بلکہ جتنے بھی سیاسی لیڈر آئے ہیں ان پر سے وقت کی پابندی ہٹا دی گئی ہے۔ پندرہ منٹ کا جب اعلان ہُوا تو میں نے کراچی سے اپنے محکمے کو ہدایات دیں کہ پندرہ منٹ کی کوئی قید نہیں ہے اپوزیشن کے لیڈر جتنا وقت لینا چاہتے ہیں دو۔ اور اسی سے نوّے منٹ تک اپوزیشن کے لیڈروں نے ریڈیو پاکستان کا وقت لیا۔ اس کے باوجود بھی گلہ ہے۔

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

کیا اس بات کو بھی نہیں سراہا جائے گا کہ پچیس سال میں پہلی مرتبہ ایسا ہُوا۔ حالانکہ دوسری

جتنی حکومتیں گزری ہیں ان کا حال بھی آپ کے سامنے ہے۔

جمعیت علمائے اسلام کے بعض بزرگوں نے موسیقی کے پروگراموں پر بھی تنقید کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ گانے سرے سے بند کر دیے جائیں۔ ان بزرگوں کا میرے دل میں احترام ہے لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ کاش ایسا موقع آتا۔ کاش اس معاشرے کو آپ نے بدل دیا ہوتا۔ میں آپ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں مجموعی بات کر رہا ہوں۔ کاش دینی جماعتوں نے اپنا فرض ادا کیا ہوتا۔ سیاسی اور سماجی کارکنوں نے اپنا فرض ادا کیا ہوتا۔ یہ معاشرہ اتنا بدل دیا ہوتا کہ اس کے اندر یہ طلب اور تڑپ ہوتی کہ ایک فلمی گانے پر جتنا وقت لگ رہا ہے ہم اس کے بجائے کوئی دوسری چیز سنیں گے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ لوگ دوسرے پروگرام ختم کر کے صرف گانا سننا چاہتے ہیں۔ آپ کا مطالبہ بجا۔ لیکن اگر آپ گانوں کے خلاف ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں خلاف نہیں ہوں۔ میں تو بہر حال اچھے گانے کو پسند کرتا ہوں چاہے آپ اس سے ناراض ہی ہوں کیونکہ میرا مسلک چشتیہ ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غور فرمایئے کہ اگر ریڈیو پاکستان سے گانے بند کر دیے جائیں اور آپ اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں تو کیا آپ مجھے ضمانت دے سکتے ہیں کہ آپ کے اس ملک کے گھر گھر میں ریڈیو" سیلون " سے گانے نہیں سنے جائیں گے۔ کیا آپ کو معلوم ہے۔ ابھی بعض دوست کہہ رہے تھے کہ جب ریڈیو پاکستان نشریات کا آغاز کرتا ہے تو سوئیاں گھومتی ہیں، کبھی کسی ملک کے اسٹیشن پر اور کبھی کسی ملک کے اسٹیشن پر۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سوئیاں کون گھماتا ہے۔ ریڈیو پاکستان تو نہیں گھماتا۔ اگر ہمارا ذہن اتنا بدل چکا ہے اور ایسا بگڑ چکا ہے کہ ہم کوئی ایجوکیشنل چیز نہیں سن سکتے۔ کوئی ٹھوس پروگرام نہیں سن سکتے۔ اور اس وقت جب مثال کے طور پر کوئی تقریر مولانا عبدالحکیم صاحب کی شروع ہوتی ہے تو سوئچ آن کر کے سیلون یا انڈیا لگا لیتے ہیں۔ تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہمارا معاشرہ بگڑ چکا ہے۔ بہر حال یہ جملہ معترضہ تھا۔ گانا بند ہو بھی کیوں؟ اچھا گانا تو ذوقِ سلیم کی غذا ہے اس لیے ہم نے گانا بند کرنے کی بجائے

یہ کوشش کی کہ ہم اس کے اندر تبدیلیاں لائیں۔ چنانچہ ہم نے موسیقی کو دورِ نو کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے آپ تو گیت کو ہمیشہ اندھیروں کا نقیب سمجھتے ہیں لیکن ہم نے روشنی کے گیت بھی لکھوائے ہیں اور نشر کیے ہیں۔ یہ تجربہ ہے جو مستقبل قریب میں ضرور کامیاب ہوگا۔

جنابِ والا!

پروگراموں کے سلسلے میں دینی پروگراموں کی بھی بات ہوئی ہے میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ اس سلسلے میں ریڈیو پاکستان نے جو انقلابی اقدامات کیے ہیں وہ کیا کیا ہیں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حج کے موقع پر سات پروگرام براہِ راست دیارِ حبیب سے اس ملک میں نشر کیے گئے ہیں اور سات روز تک پاکستان کا چپہ چپہ لبیک اللّٰھم لبیک کی صداؤں سے گونجتا رہا۔ اس کے باوجود اگر کچھ لوگ دینی پروگرام کی شکایت کرتے ہیں تو میرے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں۔

جنابِ والا!

حکومتِ پاکستان کا ریڈیو کے سلسلے میں ان پروگراموں، منصوبہ بندیوں اور تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اہم ترین کارنامہ وہ ہے جو بل کی صورت میں ایوان کے سامنے پیش ہے۔ یہ کارنامہ پاکستان ریڈیو کو پاکستان ریڈیو کارپوریشن میں تبدیل کرنے کا ہے۔ بہت سے دوستوں نے اسے بہت ہی محدود نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شاید ان کا خیال ہے کہ ریڈیو کارپوریشن بنانے کا مطلب کوئی آزادی یا غلامی کا سا مطلب ہے۔ میرے ایک فاضل دوست نے یہ کہا ہے کہ ریڈیو کو حکومت سے آزاد کرانے کی جو کوشش کی گئی تھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ حکومت جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوئی اس کے بارے میں یہ تصور قائم کیا جا رہا ہے کہ اس نے کسی کو غلام بنا رکھا ہے اگر ایسا ہے تو پھر سارے محکموں کو اس سے آزاد کرا لینا چاہیے تاکہ اس کی غلامی سے سب نکل جائیں۔ ان دوستوں کو معلوم

ہونا چاہیے کہ یہ غلامی اور آزادی کا تصور ریڈیو کارپوریشن کے منصوبے میں کارفرما نہیں تھا۔ جو باتیں پیشِ نظر تھیں وہ دو تھیں۔ ایک تو یہ کہ ریڈیو پاکستان کے ملازمین کی تنخواہوں کا معیار بہت فروتر تھا۔ جیسا کہ میرے دوست افضل رندھاوا صاحب نے کہا ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد یہ تفاوت بڑا ظالمانہ نظر آتا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے Scales بھی از سرِ نو ترتیب دیے جائیں۔ اگر سرکاری محکمہ رکھتے ہوئے ترتیب دیے جاتے تو دوسرے سرکاری محکموں نے کیا قصور کیا ہے۔ اس لیے یہ ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ اس سرکاری محکمے کی حیثیت بدل دی جائے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ سرکاری محکموں میں بڑی سست رفتاری سے کام ہوتا ہے مجھے اس کا اعتراف ہے اور میں جانتا ہوں، اور مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ سُرخ فیتہ آج بھی سرکاری محکموں میں موجود ہے۔ آج بھی فائل بڑی مشکل سے ایک میز سے دوسری میز پر جاتی ہے۔ اگر ریڈیو پاکستان کو بھی سرکاری محکمہ رکھا جاتا تو وہ منصوبہ جو حکومتِ پاکستان ریڈیو کے فروغ کے لیے پیشِ نظر رکھتی ہے کم از کم بطریقِ احسن پورا نہ ہوتا اس کے لیے کارپوریشن درکار تھی۔ تاکہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن دو ایسے شعبے ہیں جن کے لیے نئے نئے Talent کی ضرورت ہے۔ نئے نئے صاحبِ صلاحیت لوگوں کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ Talent کہاں سے لائیں۔ سرکاری محکمے میں تو کئی کئی سالوں کے بعد Seniority اور Juniority کے مسائل پیدا ہوں گے۔ اچھے لوگ جو صلاحیت رکھتے ہیں اس طرف توجہ نہیں کریں گے۔ لہٰذا ہم نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اس کو کارپوریشن بنا دیا جائے تاکہ لوگوں کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع باآسانی مل سکیں۔ اس ضمن میں یہ کہتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتا ہوں کہ یہ منصوبہ ممتاز حسن کمیٹی کا منصوبہ نہیں تھا۔ حقیقت میں یہ منصوبہ ۶۲-۱۹۶۱ میں اس وقت کاغذوں پر منتقل ہوا جب موجودہ صدر اور عوامی لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو اس وقت وزیرِ اطلاعات تھے۔ انھوں نے پاکستان ریڈیو کارپوریشن بنانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ لیکن جب وہ وزیرِ اطلاعات نہیں رہے تو یہ منصوبہ بھی کھٹائی میں

پڑ گیا۔ آج پھر اس حکومت کو جس کی قیادت صدر بھٹو کر رہے ہیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ رہا ہے۔

جنابِ والا! بھارت آج تک ریڈیو کو کارپوریشن کا درجہ دینے کا متحمل نہیں ہو سکا۔ جن سنگھ نے لوک سبھا کے باہر مظاہرے کیے۔ اپوزیشن نے تقریریں کیں۔ لیکن آج تک حکومت نے ریڈیو کارپوریشن نہیں بنایا۔ یہ فخر ہمیں حاصل ہے ہم نے اپنے دور میں اس اہم قومی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔

جنابِ والا!

میں اس موقع پر یہ بھی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ ریڈیو کے کارپوریشن بننے کا یہ مقصد نہیں کہ حکومت کسی کو نامزد نہ کرے۔ کسی کو مقرر نہ کرے یا Director متعین نہ کرے۔ اگر یہ تصور کسی دوست نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے تو وہ ایک یوٹوپیا کا تصور ہے۔ وہ تصور عملی اور حقیقی نہیں۔ آپ نے بی۔بی۔سی کی نشریات ضرور سنی ہوں گی لیکن ان کی تاریخ قواعد و ضوابط اور Working پر نظر نہیں کی۔ میں آپ کی معلومات کے لیے عرض کرتا ہوں کہ بی۔بی۔سی کے ڈائریکٹر جنرل اور چیئرمین کا تقرر وہاں کی حکومت کرتی ہے۔ وہ حکومت جس کی جمہوریت کے گُن گاتے ہوئے ہم نہیں تھکتے۔ اس لیے حکومتِ پاکستان اگر کوئی نامزدگی کرتی ہے تو اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے۔

جنابِ والا!

یہاں جذبات کی تسکین کے لیے کوئی چلتی ہوئی بات کہہ دینا جو عام نعروں کی حیثیت رکھتی ہے یا اس کو دُہرا دینا بڑا آسان ہے۔ لیکن میں میاں صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے ذہن میں ریڈیو کی آزادی کا جو تصوّر رکھتے ہیں مجھے ایشیا یا افریقہ کے کسی ملک میں وہ آزادی دکھا دیں جو آپ پاکستان ریڈیو کے لیے مانگ رہے ہیں۔ فرانس جس کی جمہوریت مسلّمہ ہے اس کا ٹی وی اور ریڈیو جوائنٹ کارپوریشن ہے اور اسے براہِ راست وزیرِ اعظم Prime Minister کے

وفتر سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ایسے ممالک جن کے سوشلزم کی تعریف میاں صاحب بھی کرتے ہیں ان کے ذرائع ابلاغ براہِ راست State کے کنٹرول میں ہیں۔ اگر یہ سب حقائق ہیں اور یقیناً ہیں تو ریڈیو پاکستان کے متعلق وہ ایسا مطالبہ کیوں کرتے ہیں جو عملی اور حقیقی نہیں جو کسی بھی ملک میں زیرِ عمل نہیں۔

جنابِ والا!

یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فوری طور پر ریڈیو کارپوریشن کے کارکنوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ میں عرض کروں گا کہ فوری طور پر اس کارپوریشن کے ملازمین کو جو فائدہ پہنچے گا وہ یہ ہے کہ تمام سٹاف کی تنخواہوں میں دس فیصد اضافہ کر دیا جائے گا اور فنی کارکنوں کی تنخواہوں میں تیس فیصد اضافہ ہوگا۔ آگے چل کر جو مالی فوائد ہو سکتے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ میں اس Floor پر یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ ہمارا اصل مقصد ریڈیو، ٹی وی جوائنٹ کارپوریشن قائم کرنا ہے۔ جس کی طرف ہمارے ایک فاضل دوست نے توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے ابھی کہا ہے کہ ریڈیو والے بڑی محنت کرتے ہیں لیکن ٹی۔ وی اور ریڈیو کے معاوضوں میں بڑا تفاوت ہے انھوں نے کہا ہے کہ حکومت کو احساس کرنا چاہیے کہ شعر و ادب کی تخلیق کتنا مشکل کام ہے وہ یہ کہہ رہے تھے اور میں ڈاکٹر مبشر کو جو میرے پاس بیٹھے ہیں یہ شعر سنا رہا تھا۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے

تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

اس کے متعلق مختصراً عرض یہ ہے کہ پاکستان میں جو ٹیلی ویژن کارپوریشن قائم ہے۔ اس کے اندر غیر ملکیوں کا سرمایہ بھی لگا ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب سے وہ قائم ہوئی ہے وہ کارپوریشن کی حیثیت سے کام کر رہی ہے دراں حالیکہ ریڈیو شروع سے ایک سرکاری محکمہ تھا اور بہت پھیلا ہوا محکمہ تھا۔ اب انتظامی لحاظ سے اسے اس سطح پر لانے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ جوں جوں ہم نے انتظامی نوعیت کی ان دقتوں پر قابو پا لیا ویسے ہی ہم اس کی نئے انداز سے تشکیل

کرنے کے قابل ہوتے چلے جائیں گے۔ میرا ذاتی اندازہ یہ ہے کہ دو سال میں ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم ان دقتوں پر قابو پا لیں گے مجھے یقین ہے اور میں حکومت کی جانب سے آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم ریڈیو اور ٹی۔ وی کی مشترکہ کارپوریشن قائم کر کے دم لیں گے ؟

پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس سے خطاب

۱۴ر نومبر ۱۹۷۳ء

سب سے پہلے میں آپ سب کو مشاورتی کمیٹی کے پہلے اجلاس میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ اپنی نوعیت کا نہ صرف یہ پہلا اجلاس ہے بلکہ حقیقتاً ریڈیو پاکستان کی پہلی مرکزی مشاورتی کمیٹی بھی ہے۔ اس سے پہلے علاقائی سطح پر مشاورتی کمیٹیاں قائم ہوتی رہی ہیں لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ ایک مرکزی مشاورتی کمیٹی بھی قائم ہوئی۔ اس میں ہم نے پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل اصحاب کو بھی نمائندگی دی ہے اور عوام کے منتخب نمائندے بھی اس میں شریک ہیں اس کے ساتھ تمام صوبوں کو اس میں نمائندہ حیثیت سے شریک کیا گیا ہے۔ اس کی تشکیل میں ہم نے اقلیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور مجھے خوشی ہے کہ ان کے نمائندے بھی شریک اجلاس ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کے تعاون، مشوروں اور رہنمائی سے پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں بہتر سے بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکے گی۔

جہاں تک ریڈیو کی اہمیت اور ہمارے ملک کی تعمیرِ نو میں اس کے حصے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس مختصر مگر منتخب اجتماع میں اس پر اظہارِ خیال کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ

آپ سب جانتے ہیں کہ ریڈیو ایک ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جو ہر قسم کے فاصلوں اور آمد و رفت کے وسائل کے فقدان کے باوجود ہمارے عوام کے لیے تفریح و تعلیم کا ذریعہ ہے۔ میں نے "واحد" کا لفظ اس لیے کہا ہے کہ ابھی تک ہم ٹی وی کو اتنی وسعت نہیں دے سکے کہ اس کا "نٹ ورک" پورے ملک میں قائم ہو سکے اور یہ قائم ہو بھی جائے تو لوگوں کا معیارِ زندگی ابھی اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس صورت میں ریڈیو کی جو اہمیت واضح ہوتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور اسی لیے آپ حضرات کی ذمہ داریاں اس قدر اہم ہیں اور مجھے توقع ہے کہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں آپ بہتر نتائج پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

آپ حضرات کو علم ہے کہ موجودہ عوامی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ریڈیو پاکستان کے کارکن اور عوام و خواص سب ہی پچھلے کئی سالوں سے اس بات کا مطالبہ کرتے چلے آ رہے تھے کہ ریڈیو پاکستان کو ایک کارپوریشن کی شکل دی جائے اس مطالبے کے پیشِ نظر جہاں اور بہت سے اسباب و عوامل کارفرما تھے وہاں دو باتیں خاص طور پر پیشِ نظر تھیں۔ ایک یہ کہ بڑی حد تک ریڈیو کے کاموں میں سُرخ فیتے کی لعنت جس سے ابھی تک کوشش کے باوجود ہم پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ ریڈیو پاکستان کی کارکردگی سے ختم ہو جائے۔ اگر وہ سرکاری محکمہ شمار ہوتا تو فائل کو ایک میز سے دوسری میز تک پہنچانے میں جتنے دنوں کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے وہ شاید آپ بھی جانتے ہیں اور آپ سے زیادہ میں خود اسے جانتا ہوں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ریڈیو کے ملازمین کی شرح معاوضہ میں بھی اضافہ ہو جائے اور یہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور رات دن اپنی صلاحیتوں کو اس کام میں جھونک رکھا ہے اور جو آزمائش کی مشکل سے مشکل گھڑیوں میں بھی بڑی سے بڑی کسوٹی پر پورے اترے ہیں۔ ان لوگوں کی تنخواہوں کے معیار کو بھی ہم بہتر بنا سکیں۔ پچھلی حکومتوں کے دَور میں جس طرح اور بہت سے عوامی اور جائز مطالبات نظرانداز ہوتے رہتے۔ اسی طرح یہ مطالبہ بھی کولڈ سٹوریج میں پڑا رہا۔ اس سے سرد مہری برتی گئی لوگ وعدے

کرتے رہے لیکن انھوں نے اسے پُورا نہیں کیا مجھے یہ خوشی ہے کہ یہ اعزاز اس عوامی حکومت کو حاصل ہے کہ اس نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں اس دیرینہ مطالبہ کو پُورا کیا اور ریڈیو پاکستان ایک خود مختار کارپوریشن کی حیثیت میں تبدیل ہو گیا۔ ہم نے جہاں اس کے باقاعدہ ملازمین کی تنخواہوں کے معیار کو بڑھایا وہاں اس کے سٹاف آرٹسٹوں کو باقاعدہ ملازموں کی مراعات دی گئیں۔ دوبارہ نشر ہونے والے موسیقی اور ڈرامے کے پروگراموں پر رائلٹی دی گئی اور اس طرح فنکاروں کو استحصال سے نجات دی گئی۔ یقیناً یہ ان کا حق تھا کہ انھوں نے اپنے دماغ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے بل بوتے پر جو فن پارے تخلیق کیے ہیں جب تک وہ دکھائے یا سنائے یا پیش کیے جائیں، یہ فن کار ان سے حاصل ہونے والی آمدنی میں حصّہ دار ہیں۔

کارپوریشن کے قیام کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے ضمن میں دوسرا کام جس پر ہم نے خاص طور پر توجہ دی یہ تھا کہ اب تک ریڈیو صرف امیروں ہی کے ڈرائینگ روموں کی زینت تھا۔ ریشمی غلافوں میں لپٹا ہُوا ایک بڑا اور خوب صُورت سا ریڈیو سیٹ ڈرائینگ روم کی زینت بنا ہوا ہے غریب آدمی اس تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ غریب آدمی کا بچہ تصوّر نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کبھی ریڈیو کے بچّوں کے پروگراموں میں شریک ہو سکے گا۔ اس کے لیے بھی سفارش کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اس کے لیے بھی بڑے آدمیوں کا بیٹا ہونا ضروری تھا۔ ہم نے یہ کوشش کی کہ عوام کو اس کی کارکردگی میں شریک کیا جائے گیا۔ ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ ریڈیو ان کا ہے۔ یہ کسی خاص طبقے کا نہیں ہے۔ کسی خاص گروہ کی میراث نہیں ہے اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔

اس احساس کے پیشِ نظر ہم نے تمام ریڈیو سٹیشنوں کو بار بار ہدایات دیں اور پھر ان کا جائزہ بھی لیا کہ عوام کو اس کے مختلف پروگراموں میں شریک کیا جائے جب تک بچّوں کے پروگراموں میں ایک تانگے بان اور ایک ریڑھی لگانے والے کا بچہ بے روک ٹوک شریک نہیں ہوتا اس وقت تک میں نہیں کہہ سکتا کہ ریڈیو عوامی ریڈیو

ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب بڑی حد تک برف پگھلی ہے لیکن ابھی ہمیں اس سلسلہ میں اور کوششیں کرنا ہیں۔ اب آپ کو دیکھنا ہوگا کہ اس ملک کا ہر باشندہ ریڈیو کو اپنا ادارہ سمجھے اور اگر کسی ایک بھی شہری کے دل و دماغ میں ریڈیو سے اپنائیت کے احساس میں ذرا سی بھی کمی رہ گئی تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم کامیاب نہیں ہیں۔ کارپوریشن کے افسران کامیاب نہیں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے کارکن اور فنکار کامیاب نہیں ہیں۔

یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ریڈیو پاکستان سے مزدوروں اور محنت کشوں کے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے ہیں ہمارے نزدیک اس ملک کی ثقافت اس ملک کے کارخانوں اور کھلیانوں میں ہے چنانچہ ریڈیو کی ٹیموں کو ہم نے ہفتہ وار اور کہیں کہیں ہفتہ میں دو دو مرتبہ دیہاتوں میں بھیجا۔ "چوپال" اور دوسرے عنوانات کے تحت ہم نے کسانوں' دیہاتوں اور دیہی آبادی میں رہنے والے لوگوں کے مسائل پر مذاکرے نشر کیے۔ ان کی جیتی جاگتی زندگی کی جھلکیاں نشر کیں اور اس طرح ریڈیو کی تاریخ میں پہلی دفعہ دیہات میں کام کرنے والے مزدوروں اور غریب کسانوں کو ریڈیو پاکستان میں نمائندگی دی گئی۔

علاوہ ازیں ہم نے یہ بھی کوشش کی کہ موسیقی صرف عیش و تفریح کا ذریعہ نہ رہے بلکہ وہ ایک عوامی اجتماعی موسیقی کا روپ دھارے اور اس کے اندر کوئی پیغام بھی ہو۔ ایسی موسیقی جس میں لچرپن، ابتذال اور فحاشی نہ ہو اور جو انسان کے اعلیٰ خدمات کو اپیل کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ فن کے معیار پر بھی پوری اترتی ہو۔ ان لوگوں کے ذہنوں کو مطمئن کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں جنھیں انتہاپسندی کا عارضہ ہے اور جن کے نزدیک سازسے نکلنے والی ہر آواز شیطان کی آواز ہے۔ ایسے لوگوں کا کوئی علاج میرے پاس نہیں ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ریڈیو میں سے موسیقی ختم ہو جائے اور ہمہ وقت ایسے پروگرام نشر ہوں جن کے اندر تبلیغ اور تلقین ہوتی ہے اور جن کے اندر وعظ و نصیحت ہو اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کا ریڈیو اپنے اندر جو اپیل اور کشش رکھتا ہے وہ قطعاً کھو بیٹھے گا آپ انسانی جذبات کی توہین نہیں

کر سکتے اور نہ ہی ان کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اگر آپ یہی رویّہ اختیار کریں گے تو لوگ پھر دوسرے ملکوں کے ریڈیو سنیں گے۔ ہم ان لوگوں کی انتہا پسندی کی تسکین نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان لوگوں کی انتہا پسندی کی تسکین کر سکتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ریڈیو سے ہمہ وقت صرف موسیقی ہی نشر ہو اور کوئی دوسرا پروگرام نشر نہ ہو۔ ہماری کوشش تو یہ رہی ہے کہ ایسی موسیقی پیش کی جائے جس کے اندر تفریح بھی ہو، جس سے لوگ اپنے غموں کو بھی بھول سکیں اور جس کے سننے سے ان کے اندر تعمیری رجحانات ابھریں اور دوسرے ملکوں کی موسیقی سے تمیز بھی ہو اور اس کے اندر انفرادیت بھی جھلکے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے کچھ ابتدائی قدم اٹھائے ہیں۔ اس ضمن میں دو لانگ پلے ریکارڈ "روشنی کے گیت" کے عنوان سے آپ کو اس وقت پیش کیے گئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ انھیں سنیں گے اور اس تجربے کو پسند کریں گے اور اس کی بہتری کے لیے مزید مشورے بھی دیں گے۔

ہم نے ایک اور کوشش یہ بھی کی ہے کہ اجتماعی آوازیں جس میں پانچ پانچ سو افراد تک کی آوازیں شامل ہیں، اجتماعی عوامی موسیقی نشر کریں۔ ان پروگراموں کا آغاز ہو چکا ہے اور ان میں اضافہ بھی ہوتا رہے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ موسیقی کے میدان میں بھی ہم آپ کے تعاون سے آہستہ آہستہ کافی اچھے اقدامات کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

ریڈیو کو عوامی رُخ دینے کے ضمن میں ہم نے ہر اس مسئلے کو ریڈیو کا مسئلہ بنایا کہ جس سے عوام متعلق ہوں۔ جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے قوم جس طرح بیتاب تھی، ریڈیو اس سے بے تعلق نہیں رہا۔ جہاں اس نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑا اور اس کے لیے زمین ہموار کی وہاں اس نے اپنے جنگی قیدیوں تک نامہ و پیام کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے روزانہ ۴۵ منٹ کے پروگرام بھی نشر کیے۔ جن میں ان کے اعزا و اقربا کے پیغام ہوتے تھے۔ ہمیں جنگی قیدیوں کے جو خطوط

ملتے رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس پروگرام سے بے حد خوش تھے اور اس طرح انھیں نیم ملاقات کا سلسلہ حاصل ہوتا تھا اور بڑی حد تک ان کے زخموں پر مرہم رکھا جاتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے اعزا و اقربا کی آواز سُن کر اپنے اندر ایک نیا حوصلہ اور ایک نیا ولولہ پاتے تھے۔ اب ان کی واپسی شروع ہوئی ہے تو ان کے نام روزانہ ریڈیو سے نشر کیے جا رہے ہیں ہیں تاکہ ان کے اعزا جان سکیں اور انھیں فوری طور پر خبر ہو سکے کہ ان کے عزیز اور رشتہ دار اب اس قید سے چھوٹ کر وطنِ عزیز کو واپس لوٹ آئے ہیں۔

اس طرح جب سیلاب آیا تو سیلاب کی تازہ ترین خبروں سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے اور آمد و رفت کے ذرائع سے روشناس کرانے کے لیے روزانہ پانچ پانچ بلیٹن ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہے تاکہ لوگوں کو ابلاغ کی کوئی کمی محسوس نہ ہو اور انھیں تازہ ترین صورت حال کی اطلاع رہے۔ اسی طرح سیلاب زدگان کی امداد کے نیک اور اعلیٰ جذبات کو گفتگو اور ڈراموں کے رُوپ میں ریڈیو پاکستان سے نشر کیا اور اپنے بھائیوں کی امداد کرنے کے سلسلے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عوامی رُخ دینے کے ضمن میں ریڈیو کے لیے یہ اہم ترین مرحلہ تھا اور حکومت کے مقاصد میں بھی اسے اساسی مقصد کی حیثیت حاصل تھی۔ دیہات میں ریڈیو کی ٹیمیں بھیجنا جہاں مستقل پروگراموں میں شامل ہے وہاں اب ایک نیا تجربہ بھی کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم دس مقامات پر پاکستان میں ویلیج براڈکاسٹ قائم کر رہے ہیں۔ یہ چھوٹی سطح پر ویلیج براڈکاسٹنگ سٹیشن ہو گا اور اس کا دائرہ کار سات میل سے دس میل تک محیط ہے۔ اس میں دیہاتی عوام اپنے مسائل زیرِ بحث لائیں گے، ان کا حل ڈھونڈیں گے۔ نئی دنیا سے روشناس ہوں گے۔ نئے تجربوں سے واقفیت حاصل کریں گے اور اس طرح اس قابل ہو سکیں گے کہ وہ اپنے آپ کو بہتر بنیادوں پر استوار کر سکیں اور اپنی دیہی زندگی کے مسائل حل کر سکیں۔ مجھے بڑی حد تک اُمید ہے کہ یہ تجربہ کامیاب رہے گا۔ اس سلسلے میں ہمارے ماہرینِ فن آسٹریلیا کا دورہ کر چکے ہیں جہاں کی امداد سے ہم یہ اسٹیشن قائم کر رہے ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ چھ ماہ کے

اندر اندر یہ اسٹیشن قائم ہو سکیں گے۔ اور ان کے بعد ہم کوشش کریں گے۔ کہ ان اسٹیشنوں سے زیادہ سے زیادہ دیہی آبادی کو نشریات کے دائرہ کے اندر لایا جائے۔

ریڈیو پاکستان نے ان دو سالوں میں ایک اور اچھا اقدام عالمی سروس کے اجرا کی صورت میں کیا ہے۔ یہ شکایت عام تھی کہ بیرونِ ملک رہنے والے پاکستانیوں کو پاکستان کے حالات سے آشنا کرنے کے لیے کوئی مناسب انتظام نہیں۔ اسی طرح غیر ملکی سامعین بھی پاکستان کے احوال و کوائف، مسائل اور موقف سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس سال ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو عالمی سروس کا اجرا کیا گیا۔ ان نشریات کے سلسلے میں چند معمولی نقائص کبھی کبھی سننے میں ضرور آئے ہیں جن پر قابو پانے کے لیے ہم پوری کوشش کر رہے ہیں اس کے لیے ہم بیرونی دُنیا سے بھی ماہر انجینئرز کی خدمات حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ بحیثیت مجموعی روزانہ سوا گیارہ گھنٹے کی یہ نشریات ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس طرح کی ایک اور سروس حج سروس کے نام سے شروع کی گئی جو سال میں دو ماہ تک جاری رہتی ہے۔ پچھلے سال یہ شروع ہوئی اور ارضِ مقدس میں جو مسافر دیارِ حبیب میں ہیں ان کو اس سروس کے ذریعے پاکستان کی خبروں سے مطلع کرنے اور معلومات میں اضافے کے لیے مناسب پروگرام نشر ہوتے رہے ہیں۔ اس سال بھی یہ سروس شروع ہے اور حج آفس کو جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ پاکستانی حجاج اس سروس سے بڑی حد تک مطمئن ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ بھی پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ میدانِ عرفات میں دیا جانے والا خطبہ براہِ راست عرفات سے یہاں سنایا گیا اور اس کے لیے ریڈیو پاکستان کے کارکن مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی پروگرام حج کے موقع پر براہ راست وہاں سے ریلے کیے گئے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے بھی پروگرام ریلے کیے گئے اور اس طرح لوگوں کے دلوں کو سرور حاصل ہوا۔ ان کے ایمانوں میں اضافہ ہوا اور انھوں نے ریڈیو پاکستان کے ذریعے سے

یہاں بیٹھ کر دیارِ حبیب کی باتیں سنیں۔ امسال بھی ان پروگراموں پر عمل ہوگا اور یقیناً یہ نشریات اہمیت کے اعتبار سے تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔

ایک اور بات جس کا تذکرہ کرنا میں ضروری سمجھوں گا وہ علاقائی زبانوں کی نشریات ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں کچھ گنے چنے لوگ قومی زبان اور علاقائی زبانوں کو باہم دگر حریف بنانے کی فکر میں ہیں۔ علاقائی زبانیں قومی زبان کی حریف نہیں نہ قومی زبان علاقائی زبانوں کی حریف ہے۔ ہم تمام علاقائی زبانوں کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر بے پناہ سرمایہ اور بے پناہ ثقافتی ورثہ ہے ان کا ادب اتنا وقیع ہے کہ اسے دنیا کے کسی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ زبانیں اتنی ترقی یافتہ ہیں کہ ہمیں ان پر فخر ہے۔ مگر پچھلے زمانے میں علاقائی زبانوں، ثقافتوں اور ان کے ادبی و شعری سرمایوں کو نظرانداز کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کو لسانی مسائل پر ہنگامے کھڑے کرنے کا موقع ملا۔ یہ حکومت جہاں تک قومی زبان کو اس کا قرار واقعی مقام دینے کے لیے ہمہ تن مصروف ہے وہاں وہ اس کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے فروغ کو بھی اہمیت دیتی ہے اور ان دونوں کو ایک ساتھ لے چلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس احساس کے پیشِ نظر علاقائی زبانوں کی نشریات کو بڑھایا گیا۔ ان دو سالوں میں ہماری قومی نشریات میں جہاں ساڑھے تینتیس (۳۳½) گھنٹے روزانہ کا اضافہ ہوا وہاں علاقائی زبانوں میں روزانہ بیس گھنٹے ۳۵ منٹ کا اضافہ ہوا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم مختلف علاقوں کی زبان اور ثقافت کو فروغ دینے میں کوئی کوتاہی نہیں برت رہے۔

اب آخر میں یہ بھی چاہوں گا کہ قبل اس کے کہ آپ ایجنڈے پر غور کریں، اپنے مشوروں سے ریڈیو پاکستان کے کارکنوں کو نوازیں اور اس ترقیاتی پروگرام کی بھی داد دیں کہ جو موجودہ عوامی حکومت کے سامنے ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ پچھلے برسوں میں ہمارے حکمرانوں نے ریڈیو پاکستان کے استحکام پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بالخصوص جبکہ دوسرے ممالک ہماری سرحدوں

کے ساتھ ساتھ ریڈیو کا جال بچھانے میں مصروف تھے اس وقت ہم نے ریڈیو کو بالکل نظر انداز کیا۔ اسے کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ کوئٹہ میں جس کی سرحدیں اتنی اہم ہیں صرف دس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر نصب رہا جو یقیناً کسی طرح بھی موثر ثابت نہ ہو سکا۔ مجھے خوشی ہے کہ اب اسے ڈیڑھ سو کلوواٹ میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ گویا پندرہ گنا زیادہ طاقت ور نیا ٹرانسمیٹر نصب کیا جارہا ہے جس کا افتتاح انشاء اللہ اگلے مہینے دسمبر میں ہوگا۔

اسی طرح پشاور میں بھی دس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر تھا اب اسے بھی زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کا پروگرام زیر عمل لایا جا چکا ہے اور خدا نے چاہا تو اس کا افتتاح بھی اگلے سال کے اندر ہوگا۔

مجھے احساس ہے کہ کراچی ریڈیو اسٹیشن بھی اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی خدمات پاکستان کی نشریات کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اگلے سال کے پروگراموں میں کراچی ریڈیو کی تعمیر و ترقی کا منصوبہ بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اس وقت جو ترقیاتی پروگرام ریڈیو پاکستان کی تعمیر و استحکام اور ترویج حکومت کے پیش نظر ہے اس کی تکمیل کے بعد ریڈیو جو اس وقت فقط ۳۳ فیصد علاقہ اور ۸۰ فیصد آبادی کور کر رہا ہے حکومت کے منظور کردہ تعمیری و ترقیاتی کریش پروگرام کے نتیجہ میں ۶۰ فیصد علاقہ اور ۹۳ فی صد آبادی کو میڈیم ویو کے ذریعہ سے کور کرنے لگے گا۔ مجھے امید ہے کہ اس کریش ترقیاتی پروگرام کے نفاذ کے بعد ریڈیو پاکستان اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں زیادہ کامیابی حاصل کرے گا اور وہ اقدامات جن کا آغاز کیا گیا ہے انھیں منزل تک پہنچانے میں اہم کردار سرانجام دے گا۔

میں نے آپ کا کافی وقت لیا ہے۔ میں ایک دفعہ پھر آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ آپ حضرات کے مشوروں اور رہنمائی سے ریڈیو پاکستان انشاء اللہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرے گا اور جو کچھ وہ کر چکا ہے اس پر قناعت

نہیں کریگا۔ بلکہ ترقی کے نئے نئے میدان تلاش کرے گا اس لیے کہ ہم اس معاملہ میں قناعت پسند نہیں۔ اگرچہ ہم نے بہت کچھ کیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہم اپنی کارکردگی پر مطمئن نہیں ہیں۔ ہمارا مسلک تو خوب سے خوب تر کی جستجو ہی رہا ہے اور ہم اس چیز کے قائل ہیں کہ

؎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اور اسی دعا پر میں اپنی اس گفتگو کا اختتام کرتا ہوں کہ اللہ کرے ریڈیو پاکستان کے کارکنوں اور فن کاروں کا مرحلۂ شوق طے نہ ہو۔

بجٹ پر تقریر

"بجٹ تقریروں میں Cut Motion ایک خاص اصطلاح ہے جس وزارت کو ہدفِ تنقید بنانا ہو اس کے اخراجات میں سے ایک آدھ روپے کی علامتی کٹوتی کا نوٹس دے کر ممبر کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جی بھر کر اس وزارت کی کارکردگی کو زیرِ بحث لائے۔

۱۹۷۳ء میں وزارتِ اطلاعات سے اپوزیشن کو جو شکایات لاحق تھیں، ان کا بیان تحصیلِ حاصل ہے۔ اس وجہ سے قدرتاً سب سے زیادہ گرما گرم تقریریں بھی اسی وزارت کے متعلق متوقع تھیں۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

جس دن وزارت اطلاعات کے متعلق Cut Motion پیش ہوئے گیلریاں حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔

ع تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے

مگر جب ان تقریروں کے جواب میں توفیق ایزدی سے میں لب کشا ہوا تو سب حاضرین حسرت سے یہی کہتے سنے گئے کہ

ع دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا"

○

جناب والا! کئی دن سے بجٹ پر عام بحث کے دوران میرے اپوزیشن کے دوست بجٹ پر برائے نام گفتگو کر رہے ہیں اور بجٹ کے پردے میں دل جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں مصروف ہیں۔ میں نے بہت غور سے اپنے دوستوں کی فاضلانہ تقریریں سنی ہیں۔ مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس میں دنیا جہان کی ساری باتیں ہیں، ہر قصہ ہے، ہر لطیفہ ہے بلکہ بعض علماء صاحبان نے بڑے اسلامی لطیفے بھی سنائے ہیں اور کہانیاں بھی بیان کی ہیں لیکن اگر بجٹ کی تقریروں میں کسی مظلوم چیز کا ذکر نہیں ہے تو وہ صرف بجٹ ہے اگر کوئی بات بجٹ پر کی بھی گئی ہے تو وہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ بجٹ دنیا جہان کی خرابیوں کا مجموعہ ہے۔ بجٹ ساری برائیوں کی پوٹ ہے۔ اس بجٹ کے اندر کوئی اُمید کا پہلو نہیں ہے اور اپوزیشن کو اس بجٹ میں سوائے تباہی کے، سوائے بربادی کے، سوائے تاریکی کے، سوائے یاس کے اور کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس بے دردانہ تجزیہ میں بلکہ جھٹکے میں میرے دوست ان حالات کو بھی نظر انداز کر گئے ہیں جو حالات اس حکومت کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اس ملک میں، اس مظلوم ملک میں کارفرما تھے۔

جنابِ والا! میں ان حالات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ فاضل وزیرِ خزانہ نے اپنی بجٹ سپیچ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ جوابی تقریر کریں گے تو ان حالات پر بحث کریں گے لیکن میں صرف اتنا اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حضرات اس بات کو بھی نظر انداز کر گئے کہ جب کبھی دو ملکوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو اس جنگ کے نتیجہ میں Price structure کا متاثر ہونا ایک قدرتی اور لازمی امر ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں دوسری جنگِ عظیم میں وہ ملک بھی جنھوں نے فتح حاصل کی۔ جنھوں نے شکست نہیں کھائی تھی اور جو ہمارے ملک کی طرح ٹوٹے نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے عزم اور ارادے کے اعتبار سے شکست نہیں کھائی۔ لیکن جنابِ والا یہ ایک امرِ واقعہ ہے جس سے اغماض اور اعراض نہیں کیا جا سکتا۔ اصلاحِ احوال کے لیے اعترافِ حقیقت کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ انھوں نے شکست ہماری طرح نہیں کھائی تھی تو وہ ملک بھی جن میں جرمنی بھی شامل ہے اور انگلستان بھی، یعنی ان ملکوں میں بھی جو فاتح تھے ان ملکوں کی طرح جو شکست خوردہ تھے۔ افراطِ زر کی وبا پھیلی اور اشیائے صرف کی قیمتیں آسمان تک پہنچ گئیں اور لوگ کئی سال تک بُنیادی ضروریاتِ زندگی کے حصول میں مشکلات محسوس کرتے رہے۔ اس لیے اگر ایک جنگ کے نتیجے میں جو ہم پر تھوپی گئی۔ پاکستان میں ہمارا Price structure متاثر ہُوا۔ ہمارا معاشی نظام متزلزل ہُوا۔ ہمارے ہاں گرانی بڑھی۔ قیمتیں بڑھیں۔ لوگوں کو تکلیف پیش آئی تو یہ ایک ایسی ناگزیر بات تھی جس کا مقابلہ کرنا ظاہر ہے کسی کے بس میں نہ تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ گرانی نہیں ہے اور نہ میرے دوست یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم لوگ عوام میں سے ہیں ہمیں عوام کی تکالیف کا احساس ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ گرانی بڑھی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ لوگوں کو تکلیفیں ہیں لیکن میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ تکلیفیں قدرتی تھیں۔ یہ گرانی پیدا ہونی تھی اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے ہمارا فرض یہ تھا کہ ہم حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کے امتیاز سے بالاتر ہو کر اس قومی بحران کا مقابلہ کرتے۔ ہم مل جُل کر ایسی تجاویز سوچتے جنھیں رُو بہ عمل لا کر ہم عوام کو ان مشکلات سے نکالتے اور ہم آپس میں تعاون کر کے ملک

کو مضبوط اور مستحکم معیشت دینے کی کوشش کرتے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اپوزیشن کے دوستوں نے بجٹ پر تقریریں کرتے ہوئے اس سے محض سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اس Situation کو Exploit کیا ہے اپنے سیاسی مفادات کے لیے اپنی سیاسی اغراض کے لیے، سیاسی انتقام لینے کے لیے انھوں نے اپنی تقریروں میں ایک ٹھوس تجویز یا ایک ٹھوس حل جو نعرے بازی سے ماورا ہو، ہمارے سامنے لانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سلسلہ میں کوئی نسخہ ایسا سامنے نہیں آیا جس پر عمل کر کے یہ صورتِ حال تبدیل کرتے ٹھیک ہے بعض دوست نعرہ بازی کرتے ہیں مختلف Phrases استعمال کرتے ہیں لیکن ان Phrases کا پچیس سال میں آج تک ہمارے ہاتھوں جو حشر ہو تا رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ وہ نظام جو سرمایہ داری پر مبنی ہے سرمایہ داری کی بنیادوں پر قائم ہے اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے لوگ ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہے ہیں اور پس رہے ہیں۔ یہ میں کہہ رہا ہوں پس رہے ہیں اس معاشی نظام کے ہاتھوں جو غیر اخلاقی ہے غیر انسانی ہے۔ اس نظام کی چکی میں پس رہے ہیں جب ہم ان لوگوں کو ان عوام کو اس سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، مساواتِ محمدی کا نام لیتے ہیں۔ اسلامی سوشلزم کی بات کرتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ آئین میں کوئی ایسی شق آجائے جس کے بعد ہم سرمایہ دارانہ نظام کے پنجے توڑ سکیں تو انہی بینچوں کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے اور یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ مساواتِ محمدی کا لفظ آئین سے خارج کر دیں اور اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو ختم کر دیا جائے۔ جنابِ والا! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اس لفظ سے اتنے الرجک کیوں ہیں۔ یہ مساواتِ محمدی سے کیوں اتنے خائف ہیں۔ جناب والا! کل میں اس ایوان میں تھا، میں اوروں کی بات نہیں کرتا میں تو یہ کہتا ہوں کہ پاسباں مل گئے کعبہ سے صنم خانوں کو۔ کل ایک بزرگوار عالم نے تقریر کرتے ہوئے مساواتِ محمدی کا استفسار کیا اور مجھے تو خوشی ہے کہ انھوں نے وزیر خزانہ سے خطاب کرتے ہوئے جب کہ میں اُن کے پاس بیٹھا تھا یہ کہا کہ مساواتِ محمدی تیرے پہلو میں ہے۔ میرے لیے یہ سعادت ہے، میرے لیے یہ نجات کا باعث ہے۔ کاش میں اس کا

سزوار ہوتا۔ کاش کہ مَیں اس قابل ہوتا کہ مساواتِ محمدی کا مَیں Symbol بن سکتا۔ کاش میری زندگی اس جدوجہد میں بسر ہوتی اور مَیں اپنی حقیر توانائیاں سب کی سب اس میں نچوڑ سکتا۔ لیکن ان بزرگوار کا طرزِ تخاطب استخفاف و طرزِ استہزاء کے ان جذبات کا آئینہ دار تھا جو ان کے دل میں موجزن ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ مساواتِ محمدی کا Concept بھی قبول نہیں کرتے۔ آپ سرمایہ داری کا تحفظ چاہتے ہیں۔ آپ غیر محدود ملکیتوں کا وعظ بھی دیتے ہیں۔ آپ دجلہ سے لے کر فرات تک خرمن رکھنے کا فتویٰ بھی دیتے ہیں۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص یہاں بھوکا مرتا رہے مگر دوسری طرف آپ کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک شخص کی غیر محدود ملکیت کو کم کر کے اس میں سے فاضل حصہ لے کر اپنے لیے نانِ جویں حاصل کر سکے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ کون سا طریقہ ہے جس سے ہم اس معاشی Set up کو بدل سکیں جس سے ہم گرانی کو کم کر سکیں۔ جس سے ہم لوگوں کو ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی سبیل نکال سکیں۔ جنابِ والا! ایک ہی نسخہ ان لوگوں کے پاس ہے گرانی کے حل کا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کا۔ مشرقی پاکستان کو حاصل کرنے کے حل کا۔ پاکستان کے اندر آندھیوں، جھگڑوں پر قابو پانے کے حل کا۔ پاکستان میں بارشیں نہ ہونے کے حل کا گرمی زیادہ ہونے کے حل کا۔ صرف ایک ہی حل ان کے پاس ہے اور وہ یہ ہے کہ صدر بھٹو کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے۔ پیپلز پارٹی کو ان کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے۔ ان کی تمام تر تقریر کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے اور ان کے تمام جلسوں اور جلوسوں کی رُوداد یہ ہے۔ ان کا ملخّص یہ ہے، نچوڑ یہ ہے۔ جنابِ والا! ان سے پوچھیے کہ حل کیا ہے ان مشکلات اور مصائب کا جن میں آج قوم پھنسی ہوئی ہے تو یہ اور کچھ نہیں بتا سکتے کہ حل کیا ہے۔ کل آپ نے دیکھا کہ نعرہ بازی کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہا کہ صدر بھٹو کو حکومت چھوڑ دینی چاہیے۔ پھر ان کے نزدیک سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ مگر صدر بھٹو حکومت کو چھوڑیں کس کے اُوپر۔ جنابِ والا! سپرد کس کے کرنا چاہیے، وہ کون لیڈر ہے جو اس ملک میں آج صدر بھٹو کی جگہ لے سکتا ہے۔ کون شخص ہے جو آج بین الاقوامی شہرت میں ان کے پائے کا ہے۔ وہ کون انسان ہے جس کے

سیاسی تدبر کی وجہ سے ان کے ہاتھ عوام کی نبضوں پر ہیں اور جو دنیا کے عروج وزوال کی تاریخ کا ماہر ہے۔ یہ ٹھیک اور ممکن ہے کہ ان کی طرف سے کوئی آج یہ کہے کہ آپ لوگ صدر بھٹو کی اس لیے تعریف کر رہے ہیں کہ وہ صدر ہیں اور خوئے غلامی میں ہم رچ بس چکے ہیں۔ ہم اب تک غلامی کی عادتیں نہیں چھوڑ سکے ہیں ہم اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم انگریز کے دَور میں ہیں اور حکومتِ وقت کا مقابلہ کرنا مردانگی ہے اور یہ جہاد ہے۔ جنابِ والا! اس سلسلے میں ایک حدیث کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ بہترین جہاد سلطان جابر کے سامنے جیسے بہت سے میرے اپوزیشن کے دوست سلطان جابر پڑھتے ہیں۔ یا جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا بہترین جہاد ہے۔ لیکن جنابِ والا! ان لوگوں نے غور کیا اور حضرات علماء یہاں موجود ہیں جن کا میرے دل میں بہت احترام ہے کہ سلاطین جابر کا مفہوم کیا ہے۔ سلطان اتھارٹی کو کہتے ہیں۔ سلطان عربی زبان میں طاقت کو کہتے ہیں۔ جابر وہ ہے جو طاقت اور جَور سے بنا ہو، جو ظلم ڈھاتا ہو، جس کا شعار ستم ہو تو ایک ایسی طاقت جو جَور پر مبنی ہو جو ظلم پر مبنی ہو۔ لیکن وہ وقت گیا جب شاہ ظلم ڈھایا کرتے تھے۔ اب بادشاہی کا زمانہ نہیں ہے، شہنشاہی کا زمانہ نہیں ہے۔ اب زمانہ بتدریج جمہوریت کی طرف بڑھ رہا ہے اب ایسے بادشاہ صاحبان اور شہنشاہ صاحبان بھی جو موروثی ہیں ان کے ملکوں میں بھی ایسی اصلاحات نافذ کی جا رہی جن سے عوام کار وبارِ سلطنت میں شریک ہو سکیں اور اب تو طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔ لیکن ایک لیڈر کا' ایک سیاسی جماعت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے پیچھے نہ چلے' عوام کو اپنے پیچھے چلائے۔ عوام اگر صحیح ہیں تو ان کا ساتھ دے۔ لیکن عوام اگر غلط راستے پر جا رہے ہوں تو ان کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ میرا ایمان ہے کہ تمام عوام ایک وقت میں غلط راستے پر نہیں جاتے اور کبھی خلقِ خدا مل کر ایک غلط راستہ اختیار نہیں کرتی۔ اس لیے کہ خلقِ خدا کی آواز حقیقت میں خالق کی آواز ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی گروہ اور کوئی ایک فریق ہمارے ملک میں ایسا ہو جو غلط باتیں کر رہا ہو۔ غلط ذہن رکھتا ہو۔ غلط مزاج رکھتا ہو تو ایک لیڈر کا یہ بھی فرض ہے کہ ان کے سامنے بھی وہ کلمہ حق کہے۔ اس لیے

کہ طاقت ان کے پاس ہے۔ وہ ووٹر ہیں اور اگر وہ ووٹر غلط راستے پر ہیں اور وہ دھمکیاں دے رہے ہیں تو پھر وہ سلطانِ جائر نہیں۔ اس لیے صرف حکومت کے سامنے کلمۂ حق کہنا سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق نہیں۔ کبھی کبھی بپھرے ہوئے غلط کار گروہوں کے سامنے کلمۂ حق کہنا بھی اس حدیث کے منشا کے عین مطابق ہے۔ لیکن وہ حضرات جواب تک خوئے غلامی میں ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ اب عوام خود حکمران ہیں اور حکومت کے ارکان وہی لوگ ہیں جن کو عوام نے چُنا ہے عوام کی رائے سے ور آئے ہیں اس لیے ان کے ساتھ تعاون کرنا عوام کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ ان کے ساتھ تعاون کرنا خوشامد نہیں ہے اور اگر آج ہم صدر بھٹو کی تعریف کرتے ہیں تو ہم نے آج اس وقت سے ان کی تعریف کرنا شروع نہیں کی جب وہ صدر ہوئے۔ جنابِ والا! ہم اس وقت بھی ان کی تعریف کرتے تھے جب ان کی تعریف کرنا اس ملک میں پانچ سال قید بامشقت کی سزا کے مترادف تھا۔ اس وقت بھی ہم نے ان کا ساتھ دیا تھا جب یہ قبائیں اور عبائیں پہننے والے علماء ان پر کفر کا فتویٰ عائد کرتے تھے۔ ان کے ساتھیوں کا مقاطعہ جاری کیا تھا۔ ان کے نکاح پڑھانے کے لیے کوئی مولوی تیار نہیں ہوتا تھا اور جنابِ والا ان کے کارکنوں کا جنازہ رکھا ہی رہتا تھا لیکن بعض مولوی صاحبان ایسے سنگدل تھے کہ ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس لیے اگر آج ہم اپنے لیڈر کی توصیف کرتے ہیں تو ہمیں اس میں کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کل بھی ٹھیک کیا تھا اور آج بھی ہم ٹھیک کر رہے ہیں۔ مگر ان کے پاس حل کیا ہے۔ جنابِ والا! حل یہ ہے کہ صدر بھٹو حکومت چھوڑ دیں۔ کس کو سپرد کریں، اس کا کوئی جواب نہیں۔ جنابِ والا بچپن میں ہم نے ایک کہانی پڑھی تھی کہ ایک جانور تھا جس کے تین سر تھے۔ لیکن اب ہم نے وہ جانور بھی دیکھا جس کے آٹھ سر ہیں۔ جنابِ والا ایک محاذ بنا ہے جس میں آٹھ جماعتیں شریک ہیں۔ ایک وجود ہے مگر سر اس کے اوپر آٹھ ہیں۔ پہلے محاورہ تھا ایک جان دو قالب کا۔ مگر اب محاورہ میں ترمیم کرنا پڑے گی اور اب محاورہ ہوگا۔ یک جان ہشت قالب۔ یعنی یک جان

ہشت تالب نامی جانور جس کے آٹھ سر ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ صدر بھٹو حکومت چھوڑ دے اور اس جانور کے سپرد حکومت کر دے جس کے آٹھ سر ہیں۔ ہاں آپ حکومت شوق سے کریں اور اگر کل لوگ اتنے اندھے ہو جائیں کہ آپ کو چنیں تو کل حکومت آپ شوق سے کریں۔ مگر آپ پروگرام کیا رکھتے ہیں؟ صدر بھٹو کا ایک پروگرام ہے۔ آپ اسے پڑھ کر حوالہ دیتے ہیں ہمارے تضادات واضح کرنے کے لیے اور ہماری خامیوں کی نشان دہی کرنے کے لیے۔ ہم نے کب کہا ہے کہ ہم میں خامیاں نہیں ہیں۔ ہم نے کب کہا ہے کہ ہمیں منزل مل گئی ہے۔ ہم ان لوگوں کو صحیح نہیں سمجھتے البتہ آپ میں وہ لوگ ہیں جو جلسوں میں کہا کرتے ہیں کہ منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ حکومت مخالفین کو مل گئی تو کیا حکومت ہماری منزل نہیں ہے۔ کرسیاں کبھی منزل نہیں ہوتیں۔ ہم نے کبھی کرسیوں کو منزل نہیں سمجھا۔ ہم کبھی کرسیوں کو منزل نہیں سمجھیں گے۔ ہم انھیں ذریعہ منزل سمجھیں گے۔ ہم انھیں واسطہ سمجھیں گے۔ ہم انھیں ذریعہ اور وسیلہ سمجھیں گے اپنے مقصد تک پہنچنے کا۔ تمام اصلاحات' انتخابات' تمام تبدیلیاں' منشور کی تمام جزئیات ایک دن میں تو روبہ عمل نہیں لائے جا سکتے۔ سال ڈیڑھ سال ہوا۔ کچھ قدم آگے بڑھے ہیں' کچھ اور بڑھیں گے لیکن ہمارے پاس ایک پروگرام ہے جس کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ آپ کے پاس کیا پروگرام ہے۔ اگر آپ سے میں پوچھوں کہ بنگلہ دیش کے سلسلے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ آپ کا متحدہ محاذ سب یک آواز ہو کر بتا سکتے ہیں کہ اپوزیشن کیا ہے؟ بنگلہ دیش کے سلسلے میں ہمارے ولی خان تو اپنی تقریر سنا کر چلے گئے مگر ہماری باتیں سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ وہ تو کہیں گے کہ بنگلہ دیش کو فوراً قبول کر لیا جائے اور وہ ہم پر ناراض ہیں کہ کیوں اتنی دیر کرتے ہو۔ جہاں تک جماعت اسلامی کے مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کا تعلق ہے وہ تو یہ فرمائیں گے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا اسلام کے منافی ہے۔ جناب والا! اگر میں ان سے سوال کروں کہ آپ کا چار قومیتوں کے مسئلے پر کیا پروگرام ہے تو نیپ یہ کہے گی کہ اس ملک میں چار قومیتیں ہیں' لیکن شاہ احمد نورانی صاحب فرمائیں گے دو قوم کا نظریہ برحق ہے۔ نہیں یہاں تو ایک مسلمان قوم ہے۔ اور پچھلے دنوں میں انھوں نے خوش فہمی میں کہا تھا کہ

نیپ تائب ہو گئی ہے اور اس نے ایسا نہیں کہا ہم چار قومیتوں کی بات نہیں کرتے لیکن جس دن ان کا بیان شائع ہوا ابھی اس کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اگلے دن نیپ کے سیکرٹری اطلاعات محمد افضل خان کا بیان آگیا جس میں انھوں نے کہا۔ نہیں قوم کے متعلق ہمارا نظریہ اور ہے۔ ہم اس چار قومیتوں کے مسئلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ جناب والا! اگر میں بھارت کے ساتھ تعلقات کے متعلق سوال کروں تو ولی خان کہیں گے کہ جتنا آگے بڑھیں اتنا اچھا ہے۔ وہ تو اکھنڈ بھارت چاہتے ہیں۔ انھوں نے بہت خوب صورت الفاظ کے پردے میں قوم پرستی زندہ باد کے نعرے لگائے وہ تو اکھنڈ بھارت چاہتے ہیں ان سے زیادہ کسے خوشی ہوگی اور وہ تو چاہیں گے کہ ہندوستان سے تعلقات خوشگوار ہو جائیں یہ ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوگی۔ اس کے برعکس مسلم لیگیوں اور مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی سے پوچھیں تو وہ کہیں گے کہ جہاد لازم ہے۔ اگر اس ہشت سر" جانور سے یہ پوچھوں کہ آپ مجھے بتائیں کہ نظام کے مسئلہ پر کیا آپ کی یک جہتی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف سے آواز آئے گی اسلامی نظام، دوسری طرف سے مطر بزنجو کہیں گے سائنٹفک سوشلزم۔ اور اس کے بعد یہ لوگ ہیں جن کا نہ سسٹم میں اتحاد ہے، نہ ہندوستان کے متعلق پورا اتحاد ہے، نہ قومیتوں کے مسئلہ پر اتحاد ہے، نہ کشمیر کے مسئلہ پر اتحاد ہے، نہ بنگلہ دیش کے مسئلہ پر اتحاد ہے جن کے درمیان بعد المشرقین کی خلیجیں حائل ہیں، اور ان کا نعرہ ہے کہ "صدر بھٹو حکومت چھوڑ دے اور ہمارے حوالے کر دے" سبحان اللہ۔ وہ روزِ بد نہ آئے کیونکہ یہ آپس میں لڑیں گے، دنگل کریں گے اور اس ملک کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ ہم وہ وقت نہیں آنے دیں گے وہ وقت ہماری لاشوں پر سے گزر کر آئے گا۔ جب ان جیسے متضاد خیال لوگ برسر اقتدار آئیں گے۔ جناب والا ان کا حال یہ ہے کہ اتنے سارے پروگرام پر بھی کہتے ہیں کہ ہمارا متحدہ محاذ ہے۔ جناب والا۔ کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں ترمیم کرتے ہوئے کہوں کہ ان کو آئندہ متحدہ محاذ کہنے کی بجائے متفرقہ محاذ کہیں اور اس کے متعلق میرے معزز دوست میر علی احمد تالپور گواہی دیں گے کہ یہ نام زیادہ موزوں ہے۔ ان لوگوں نے خود آئین بنایا اور کہا کہ اس پارٹی کو پانچ سال کے لیے حکومت کرنے کا حق ہے۔ کیوں کہ

پاکستان کے اسّی فیصد عوام نے ہمیں ووٹ دے کر منتخب کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی امداد ہے اور یہ انشاء اللہ رہے گی۔ اس لیے ہر لحاظ سے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ جمہوری اصولوں کی رُو سے حکمرانی کرے اور وہ اپنے پروگراموں کو عملی جامہ پہنائے۔ لیکن یہ سب مل گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تحریک چلا کر آئینی حکومت کو ہٹائیں گے، ہم ان کو حکومت نہیں کرنے دیں گے اور صدر بھٹو کو حکومت چھوڑنے پر مجبور کریں گے اور انھوں نے یہ نعرہ لگایا ہے کہ "بھٹو حکومت چھوڑ دے"۔ اس کے بعد اکٹھے ہو کر نکلتے ہیں کہ جب وہ اسٹیشنوں پر سے گزریں تو ان کے راستے میں لوگ پھول برسائیں، آنکھیں بچھائیں، قالین بچھائیں تاکہ دروازہ کھلتے ہی وہ ان پر قدم رنجہ فرمائیں۔ جب اس ملک کے محبوب ترین لیڈر کو بزورِ بازو اور بزورِ قوت تحریک چلا کر یہ ہٹانے کی کوشش کریں گے تو پھر اس لیڈر کی پارٹی کے لوگ انہیں کس طرح برداشت کریں گے اور ان کے عزائم کو کیسے پورا ہونے دیں گے۔ پھر یہ اکٹھے ہو کر شکایت کرتے ہیں، پٹاخے چلتے ہیں تو ان کو بم قرار دیتے ہیں۔ اگر جناب والا یہ تحریک چلاتے ہیں کہ اس آئینی حکومت کو بزورِ قوت ہٹانے کی کوشش کرینگے تو عوام اس ملک میں قدم قدم پر ان کی مزاحمت کریں گے اور ان کا منہ پھیر دیا جائے گا اور ان کے عزائم خاک میں ملا دیئے جائیں گے۔ وہ وقت نہیں آئے گا کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔

جنابِ والا! یہ اپنے دلائل کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں اُترنے کی کوشش کریں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کوئی اعتراض نہیں ہے، ان کا اپنا پلیٹ فارم ہے، اس سے باتیں کریں لیکن جب سب اکٹھے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہم تحریک چلائیں گے اس آئینی حکومت کو ہٹائیں گے اور پھر یہ کہیں کہ مزاحمت نہ ہو اور ٹھنڈے پیٹے اسٹیشنوں سے گزر جائیں اور لوگ "ہٹو بچو" کہہ کر ان کا استقبال کریں تو پھر یہ احمقوں کی دنیا میں ہیں کہ ان حالات میں بھی ان کا استقبال ہو۔ اس ملک کے لاکھوں کروڑوں انسان ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔ جنابِ والا! اس کے بعد میں عرض کروں گا کہ یہ سوچیں کہ یہ جمہوریت کے علمبردار ہیں اور اس کے پرستار ہیں

اور پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم تحریک چلا کر اس آئینی حکومت کو ہٹا دیں گے۔ اول تو میں انھیں کہتا ہوں کہ ان کے عزائم کیا ہیں اور ان کی طاقت کیا ہے جس سے یہ حکومت کو ہٹا سکیں۔ "کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ"۔

فرض کیجیے دریاؤں میں پانی کی بجائے آگ کے فوارے اُبلنے لگیں۔ فرض کیجیے یہ کہتے ہیں کہ ہم تحریک چلا کر اس آئینی حکومت کو ہٹا دیں گے پھر کیا گارنٹی ہے کہ کل اس ہشت سر کے جانور کے اندر سے پھر کوئی تحریک چلائے گا' ان کو ہٹا دے گا اور پھر تحریک چلے گی جو اس بیٹھنے والے کو حکومت سے ہٹا دے گی اور پھر اس ملک میں ایسا ہی شیطانی چکر چلے گا۔ پھر کم سے کم ان لوگوں کے منہ سے جمہوریت کا نعرہ لوگوں کے کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہو گا۔ جنابِ والا اگر یہ جمہوریت چاہتے ہیں تو وہ ایک راستہ ہے۔ وہ انتخابات اور ووٹ کا راستہ ہے۔ انھیں انتخابات تک انتظار کرنا ہو گا۔ اگر انھیں متحدہ محاذ بنانا ہو تو جب اسمبلی کی مدت ختم ہو گی اس سے چھ مہینے پہلے اگر متحدہ محاذ بنا لیں اگست میں الیکشن ہونے والے ہوتے تو یہ جنوری ہی میں بنا لیتے اور جنوری سے لے کر جولائی تک محاذ بنا کر انتخابات کی کوئی بات کرتے تو پھر بھی سمجھ آتا تھا لیکن پانچ سال پہلے یہ متحدہ محاذ بنا کر میدان میں نکلیں اور اس نعرے کے ساتھ نکلیں کہ یہ اس حکومت کو ہٹا دیں گے اور پھر ہم سے یہ رواداری کی بھی توقع رکھیں اور پھر یہ بھی ہمیں درس دیں کہ عالی ظرفی اختیار کرو۔ پھر یہ بھی کہیں کہ تم اظہارِ خیال کے سلسلے میں اس نظریے کو سامنے رکھو جو یوٹوپیا ہو سکتا ہے اور عملی زندگی نہیں ہو سکتی تو یہ بھی اَن مل بے جوڑ ہے اور منطق کی کسی دلیل کے لحاظ سے پوری نہیں ہوتی اس کے بعد جنابِ والا۔ خان ولی خان فرماتے ہیں کہ آزادیٔ اظہار ہونی چاہیے ہم اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک شستہ مقرر ہیں لیکن عام طلوت باتیں کرتے ہیں۔ جب وہ باتیں کہہ رہے تھے تو ہم نے ان مضمرات پر غور نہیں کیا اور غور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی انھوں نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ غور کریں لیکن انھوں نے ایسے انداز سے پارلیمنٹ میں تقریر کی ہے جیسے یہ پاکستانی پارلیمنٹ نہیں ہے ایرانی پارلیمنٹ ہے' یا ایسی پارلیمنٹ ہے جہاں باہر سے

پاکستان کے معاملات پر تبصرے ہو رہے ہیں۔ پچیس سال میں آج تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ ہمارے ہاں کسی دوست ملک پر اتنی جارحیت کے ساتھ اور اس قدر برہنہ انداز میں ان پچھلے چند ماہ میں ہمارے ایک دوست شہنشاہ ایران پر۔ ایران جو ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ جس نے ہمیشہ ہماری امداد کی ہے۔ جس کے ساتھ ہمارا کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ جس نے ہمیشہ ایک سچے دوست کی حیثیت سے اپنے آپ کو اقوام دنیا کے اندر پاکستان کے دوست کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ خان عبدالولی خان صاحب نے یہ اصول تسلیم کیا ہے کہ کسی بھی ملک کو خواہ وہ کتنا ہی پڑوسی ملک کیوں نہ ہو خواہ اس سے کتنا ہی نسلی رشتہ نام نہاد قومیتوں کا کیوں نہ ہو۔ اس کو یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ وہ یہاں کے معاملات میں دخل دے۔ میں ان کے ان خیالات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور میں خوش آمدید کہتا ہوں کہ انھوں نے اس نظریے کو تسلیم کیا لیکن کاش اس نظریے کا استعمال اس وقت بھی کرتے جب ایک پڑوسی ملک نے یہ اعلان کیا تھا اور ریڈیو سے تقریر نشر کی تھی کہ نیپ اور J.U.I. کی حکومتیں ہٹنے کے بعد ایسا نہیں کہ ہم خاموش بیٹھے رہیں گے۔ کاش اس وقت خان ولی خان صاحب بیان دیتے اور کہتے کہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے کہ تم داخلی معاملات میں دخل دو۔ ہم آپس میں لڑیں گے لیکن بیرونی طاقتوں کو اور پڑوسی ملکوں کو ہم یہ اختیار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہاں کے معاملات پر اس طرح کا تبصرہ کریں اور ایک گروہ کو اپنی مدد کی یقین دہانی کرائیں اور دوسرے گروہ کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے کا اعلان کریں اس وقت وہ بھول گئے تھے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ اگر آج بھی انھوں نے اس نظریے کو تسلیم کیا ہے لہٰذا مجھے یقین ہے کہ کل کسی طرف سے جب کوئی آواز اُٹھے گی تو وہ ہمارے ساتھ اُٹھ کر جواب دیں گے۔ جناب والا انھوں نے کہا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ان کے دل میں تڑپ ہے میرا حسنِ ظن ہے کہ ان کے دل میں تڑپ ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ شہنشاہ ایران کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پاکستان کے ٹوٹنے کی بات کرتے۔ انھوں نے کیوں کہا کہ پاکستان اگر ٹوٹے گا، وہ ہو گا یہ ہو گا۔ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن کاش ولی خان صاحب اپنے اپوزیشن

کے دوستوں کی تقریروں کا وہ ریکارڈ ملاحظہ کر لیتے جو کہیں اور نہیں اسی قومی اسمبلی میں ہوئی ہیں۔ اس معزز ایوان میں ہوئی ہیں اور وہ ان تقریروں کی صدائے بازگشت سن لیتے جن کی لہریں آج بھی فضا میں ارتعاش کر رہی ہیں جن میں بارہا کہا گیا کہ اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو پاکستان ٹوٹ جائیگا اگر N.W.F.P کی حکومت کو بحال نہ کیا گیا تو پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ اگر صدر بھٹو نے حکومت نہ چھوڑی تو پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ آخر یہ پاکستان ٹوٹنے کی بات کس نے کی۔ یہ کس نے اتنا شہرۂ عام کیا کہ ہر چہار دانگ عالم میں یہ بات پھیل گئی ہے۔ جناب والا وہ کون دوست ہیں نادان کہ دانا۔ جنھوں نے پاکستان کے ساتھ یہ ظلم یا کرم روا رکھا ہے اور پاکستان ٹوٹنے کے تذکرے باہر کی دنیا میں بھی ہو رہے ہیں۔ کاش کہ وہ غور کرتے تو انھیں نظر آتا کہ اس میں ان کے دوست بھی شریک ہیں جب یہ تقریریں باہر کی دنیا میں جائیں گی اور چھپیں گی اور دوستوں کو تشویش ہو گی۔ اگر انھوں نے اس طرح کی کوئی بات کی جس کی وضاحت ایرانی پریس نے بھی کر دی ہے اور حکومت پاکستان نے بھی کر دی ہے تو پھر بار بار شہنشاہ ایران پر تنقید اور بار بار حکومت ایران پر تنقید۔ پاکستان کے عوام کو کوئی اچھا تاثر نہیں دے سکتی۔ ایسی صورت میں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ان کا ذاتی نظریہ ہے، یہ پاکستان کے عوام کا نظریہ ہرگز نہیں ہے۔ جناب والا میں نے کہا تھا کہ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں گرانی کے مسئلے پر عرض کر رہا تھا جتنی بھی تقریریں یہاں بعض حضرات نے کی ہیں ان میں ان کے پاس کوئی ٹھوس تجویز نہیں ہے سوائے اس کے کہ صدر بھٹو چلا جائے اور سوائے اس کے کہ پیپلز پارٹی ختم ہو جائے اور اس مخلوق کے حوالے یہ ملک کر دیا جائے جس کا ایک وجود ہے اور آٹھ سر ہیں لیکن انھوں نے کوئی ٹھوس تجویز پیش نہیں کی بجز۔ اس کے کہ بزرگ علماء کرام بھی اٹھے تو انھوں نے ایک ہی آواز میں ارشاد فرمایا کہ اس بجٹ میں سودی نظام شامل ہے، سودی نظام کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس کو ختم نہیں کیا گیا اور چونکہ اس کو ختم نہیں کیا گیا اس لیے یہ بجٹ غیر اسلامی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ سودی نظام کے خاتمے کے سلسلے میں ہم اور آپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ ہمارے پروگرام

میں شامل ہے۔ یہ ہمارے نصب العین میں شامل ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سودی نظام کیسے ختم ہو۔ وہ نظام جس کی جڑیں سالہا سال سے اس معاشرے میں پیوست ہیں اس کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت ہے۔ بڑی محنت کی ضرورت ہے اور بڑے تدبر کی ضرورت ہے۔ محض نعرہ بازی کے ذریعے سے اس سُودی نظام کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ آیئے اس بنیاد کو ختم کریں جس پر سودی نظام استوار ہوتا ہے۔ قرآن کریم سُود کی حُرمت کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "لَا يَظْلِمُونَ وَلَا يُظْلَمُونَ" نہ ظلم کرو تم اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ معلوم ہُوا کہ سُود کی بنیاد اور اساس پر جو نظام بھی قائم ہے وہ ظلم پر مبنی اور ظلم پر قائم ہے اور ہر وہ نظام جو ظلم پر قائم ہے وہ سودی نظام کی طرح حرام ہے۔ سُودی نظام کے ساتھ اس کا ماں جائی بہن کی طرح رشتہ ہے۔ اب یہ حضرات سودی نظام کے خلاف ہیں مگر سرمایہ دارانہ نظام کے محافظ ہیں۔ اس نظام کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب کچھ تبدیلی آئی ہے۔ میں بڑی خوشگوار حیرت محسوس کر رہا ہوں جب میں نے بعض علماء کرام کی زبان سے سرمایہ داری کے خلاف باتیں سُنیں۔ جب میں نے حضرت شاہ احمد نُورانی صدیقی کو یہ کہتے ہُوئے سُنا کہ سرمایہ دارانہ نظام ختم ہونا چاہیے۔ آپ نے کہا تھا کہ ہم قومی ملکیتوں میں ان چیزوں کو لیں گے لیکن آپ نے بینکوں کو قومی ملکیت میں نہیں لیا۔ "یتری آواز مکے اور مدینے" میں تو خوش ہُوا کہ مولانا صاحب بھی ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ یہ کس کا فیض ہے؟ کس کی محنت کا ثمر ہے؟ کس کی محنت کا نتیجہ ہے؟ وہ نعرے جنہیں کل کفر کہا جاتا تھا آج وہ آپ کی زبانوں پر بھی گونج رہے ہیں۔ کون ہیں وہ۔ کون سی پارٹی ہے جس نے ان نعروں کو عام کیا ہے۔ جس نے یہ شعور دیا ہے۔ مجھے شعر پورا یاد نہیں ہے لیکن وہ ایسا تھا۔

ہم نے جو طرزِ سخن کی تھی قفس میں ایجاد
آج گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

بہت اچھا ہے جو چیز کل ہمیں کہتے ہُوئے کافر قرار دیا جاتا تھا آج وہی بڑے بڑے عُلماؑ کی زبان سے سُنی جا رہی ہے۔ ہمارا آدھا کام بھی ہو گیا ہے جناب والا کیونکہ کل جب ہم

اور آگے بڑھیں گے تو اگلے بجٹ میں غیر محدودی ملکیت کے تفاوت پر کلہاڑا چلائیں گے اور پاکستان کے عوام کو حقیقی زندگی دلانے کے لیے غیر محدود ملکیتوں پر حد لگا کر اس ظالمانہ معاشی نظام کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ تو پھر یہ سرمایہ دارانہ نظام متزلزل ہو گا اور یہ سُودی نظام بھی ختم ہو گا تب مجھے امید ہے کہ اس وقت ہمارے علماء کرام ہم پر کفر کا فتویٰ نہیں لگائیں گے۔

آخر میں جناب والا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ وزیر خزانہ کسی خوش فہمی میں ہیں اور نہ ہی انھیں اس خوش فہمی میں مُبتلا ہونا چاہیے کہ یہ ایک مثالی بجٹ ہے۔ یہ عبوری دور کا بجٹ ہے اس میں کچھ نہ کچھ باتیں اچھی آئی ہیں۔ حالات بہت سنگین تھے اور ان میں اتنی ہی گنجائش تھی۔ جوں جوں حالات بدلیں گے تو انشاءاللہ یہ فضا بدلے گی اور لوگوں کے مطالبات پورے ہوں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ وقت دیکھنے کے لیے ہمارے اس طرف کے رہنما اللہ تعالیٰ انھیں لمبی عمر عطا فرمائے ہمارے ساتھ ہوں گے اور ان اچھے ثمرات کو دیکھیں گے اور اس وقت ملک کے وزیر خزانہ کو مثالی بجٹ پیش کرنے پر مُبارک باد دیں گے۔ شکریہ۔

کچھ ذرائع ابلاغ کے بارے میں

"مرکزی وزیرِ خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن نے ۷۳-۱۹۷۲ء کا بجٹ اسمبلی میں پیش کیا تو اس پر حسبِ توقع حزبِ اختلاف کی طرف سے خوب لے دے ہوئی۔ مخالفانہ تقریروں میں بجٹ کا تذکرہ کم تھا۔ دوسری سیاسی بحثیں زیادہ تھیں۔ عام طور پر ہر ملک میں اپوزیشن بجٹ سیشن کو سیاسی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے استعمال کیا کرتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ میرا ارادہ بجٹ سیشن میں بولنے کا نہ تھا مگر جب اپوزیشن کے لیڈر خان عبدالولی خان نے تقریر کی تو وزیرِ خزانہ کی خواہش پر میں نے اس کا جواب دیا۔"

○

جنابِ والا۔ اس ایوان میں میرے دوستوں نے مسلسل جو تقریریں کی ہیں ان کے اندازِ فکر سے مجھے اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ وزارتِ اطلاعات اپنے مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب رہی ہے۔

میرے اس یقین کا سبب اپوزیشن بنچوں کی طرف سے ہونے والی وہ شکایتیں اور تکلیفیں ہیں جن کا اظہار ان کے ایک ایک لفظ سے ہو رہا ہے۔ عربی زبان کے مشہور شاعر متنبیؔ کا ایک شعر ہے :۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص

فھی الشھادۃ لی بانی کامل

یعنی جب تمھیں کسی مردِ فضول کی طرف سے میری مذمت سُننے کا اتفاق ہو تو سمجھ لو کہ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ میں کامل (اور اس مذمت سے پاک) ہوں۔

اس معیار کو سامنے رکھتا ہوں تو اپوزیشن کی طرف سے ہونے والی مذمت مجھے وزارتِ

اطلاعات کے لیے باعثِ افتخار نظر آتی ہے مجھے افسوس تب ہوتا ہے جب اپوزیشن میری وزارت کی تعریف کرتی ہے۔

جنابِ والا! مجھ سے پہلے جو تقاریر ہوئی ہیں ان میں ہمارے ان دوستوں نے بیک وقت بہت سے موضوعات چھیڑ دیے ہیں۔ ان میں ریڈیو بھی ہے ٹیلی ویژن بھی، پریس بھی ہے اور رج بھی اور میری مشکل یہ ہے کہ وقت میرے پاس کچھ زیادہ نہیں پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ ہر موضوع پر اُٹھائے جانے والے تمام اعتراضات کا مدلل جواب دوں

جنابِ والا! ریڈیو کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ گزشتہ جنگ کے موقع پر اس کی ساکھ معرضِ خطر میں پڑی۔ اس وقت لوگوں کو گمراہ کیا گیا اور اس نے صحیح خبریں نشر نہیں کیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ غلط پالیسی کا بدل پبلسٹی کیسے بن سکتی ہے۔ اگر حکومت آمرانہ ہو تو ذرائع ابلاغ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں یہی ریڈیو تھا جس نے وہ کارنامہ سر انجام دیا تھا جس کا اعتراف آج بھی کیا جاتا ہے لیکن اس جنگ کے موقع پر ہماری سابقہ گورنمنٹ کی پالیسی غلط تھی اس کے بعد بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ریڈیو کے ذریعے اپوزیشن کو اظہار رائے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ ان کو موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنا نقطہ نظر پیش کر سکیں۔ میں جمہوریت کے ان چیمپئنز سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ کسی ملک کا حوالہ دے سکتے ہیں جہاں حزبِ اختلاف کو پراپیگنڈہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ کسی مسلمان ملک کا حوالہ دے سکتے ہیں جہاں ریڈیو پر سے اپوزیشن کو تقریروں کا موقع دیا جاتا ہو، پراپیگنڈہ کا موقع دیا جاتا ہو۔ کیا وہ افریقہ کے ممالک میں سے کسی ملک کا حوالہ دے سکتے ہیں جہاں ایک برسرِ اقتدار پارٹی جو ۸۰ فیصد عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئی ہو۔ وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی بجائے اپوزیشن کی ان پارٹیوں کو موقع دے جن کی سیٹیں وہاں تین تین چار چار ہوں۔ کیا وہ ترقی یافتہ ممالک میں سے جاپان کو سامنے رکھیں گے جس نے پہلی مرتبہ گزشتہ سال اپوزیشن کے اُمیدواروں کو ریڈیو سے اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی اجازت دی بلکہ اس کے برعکس اب اس نے اپوزیشن کے لیڈروں

کو اپنے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ جنابِ والا کیا وہ روس کا حوالہ دیں گے۔ وہ ایسٹ یورپ کے سوشلسٹ بلاک کا حوالہ دیں گے کیا وہ اسپین کا حوالہ دیں گے۔

جنابِ والا۔ میاں محمود علی قصوری صاحب پارلیمینٹرین ہیں۔ ان کی تقاریر ہم بڑے ادب سے سنتے رہے ہیں۔ اب وہ ازراہِ کرم اپنے بھاری بھرکم وجود کو اٹھانے کی بجائے بیٹھے بیٹھے گفتگو کرنے کا انداز چھوڑ دیں اور اس کے بعد پھر موقع آرہا ہے۔ ہم ان کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم موجود ہیں۔ ہم ان کو جواب دیں گے۔

جنابِ والا! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کیا اس کیلئے وہ فرانس کا حوالہ دیتے ہیں جو عظیم جمہوری ملک ہے۔ کیا انھیں معلوم ہے کہ فرانس میں چند ماہ پیشتر ٹی وی اور ریڈیو کے بعض اعلیٰ حکام کو اس سلسلے میں برطرف کیا گیا کہ انھوں نے اپوزیشن کے نقطہ نظر کو پروجیکٹ کیا تھا۔ حکومت کو اس سے شکایت پیدا ہوئی۔ انھوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے اعلیٰ حکام کو برطرف کردیا۔ جنابِ والا۔ لے دے کے اگر ان کو کوئی یاد ستا سکتی ہے تو وہ بھارت کی ہے۔ لیکن کیا وہ جانتے ہیں کہ بھارت میں کانگرس کے خلاف اپوزیشن کو مسلسل یہ شکایت چلی آئی ہے کہ ریڈیو سے اپوزیشن کے لیڈروں کو اپنے نقطہ نظر کے اظہار کا موقع نہیں دیا جاتا بلکہ حد یہ ہے کہ جب پاکستان میں ریڈیو کارپوریشن قائم کی گئی تو اس وقت جن سنگھ نے مظاہرہ کیا اور مطالبہ کیا کہ جس طرح پاکستان میں ریڈیو کارپوریشن قائم کی گئی ہے اسی طرح بھارت میں محکمہ ریڈیو کو کارپوریشن میں تبدیل کیا جائے اور بھارتی ریڈیو کے ملازمین اس مظاہرے میں اور اس مطالبے میں شریک ہوئے اور بھارت نے آج تک ریڈیو پر اپوزیشن کے لیڈروں کو وقت نہیں دیا جو ریڈیو پاکستان نے دیا ہے اور جس کے متعلق میں تفصیلاً ابھی عرض کروں گا اور اس کے بعد لے دے کر ایک ہی نام ہے جو میرے دوستوں کو یاد ہے اس لیے کہ وہ ملک ہم پر حکومت کرتا رہا۔ وہ بی بی سی کو تجویز کریں گے بی بی سی وقت دیتا ہے اور آپ وقت نہیں دیتے یعنی ریڈیو پاکستان وقت نہیں دیتا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ان حضرات کی لاعلمی کی دلیل ہے۔ یہ صرف نعرہ بازی پر

یقین رکھتے ہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کا تقابل نہیں کرتے کہ سوشلسٹ ملکوں میں ریڈیو اپوزیشن والوں سے کیسے ڈیل کرتا ہے اور ہمارے ملک میں ریڈیو کس طرح ڈیل Deal کرتا ہے۔ جہاں تک بی بی سی کا تعلق ہے اس میں پولیٹیکل پروگرام کی خبروں کے لیے یہ فارمولا مقرر کیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ میں جو تناسب مخالف پارٹیوں کو حاصل ہے۔ اس تعداد کے لحاظ سے پولیٹیکل پروگرام کی خبروں کی تقسیم کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے وہاں سے صرف جماعتوں کو وقت دیا جاتا ہے۔ ایک لیبر، ایک کنزرویٹو اور لبرل اور پارلیمنٹ میں ان کی جتنی تعداد ہے ان میں اس حساب سے وقت تقسیم کیا جاتا ہے۔ جناب والا۔ اگر اس فارمولے کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ میں جس قدر تعداد میں پیپلز پارٹی کے نمائندے ہیں اور جس تعداد میں اپوزیشن کی مخالف جماعتوں کی نمائندگی ہے اس تناسب سے اگر وقت تقسیم کیا جائے تو ریڈیو پاکستان اپنی خبروں میں اور مختلف نشریات میں جس تناسب سے وقت دے رہا ہے وہ بی بی سی کے وقت سے کسی طرح کم نہیں ہے اور یہ ہمیں فخر ہے کہ پاکستان کا ریڈیو اپوزیشن سے وقت دینے کے سلسلے میں جو برتاؤ کرتا ہے وہ کسی آزاد ملک سے کم نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے۔ میں آپ کی معلومات کے لیے عرض کروں گا کہ جناب والا جہاں تک پاکستان کے ریڈیو کا تعلق ہے اس سے پچھلے دنوں میں اپوزیشن کو جس طرح اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع دیا گیا ہے اس کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ ریڈیو پاکستان نے مسلسل نو گھنٹے اپنے نیشنل ہک اپ کے پروگرام میں اپوزیشن کو موقع دیا کہ وہ آئین کے معاملے پر اظہار خیال کر سکیں۔ اس کے برعکس پاکستان پیپلز پارٹی کو جو وقت دیا گیا وہ اس سے کم تھا۔ اس کے بعد میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان حضرات کو یہ کیوں تکلیف ہوئی ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ریڈیو پاکستان ان کے پاس رکھ دیں اور یہ اپنا نقطہ نظر پیش کریں اور جس پارٹی کو عوام نے بھاری اکثریت سے منتخب کیا ہے وہ اپنے پروگرام اور اپنے منشور کو اور اپنے خیالات کو پیش نہ کرے بلکہ ان پارٹیوں کو موقع دیا جائے جن پارٹیوں کی پارلیمنٹ میں کوئی حیثیت نہیں ہے اور جن پارٹیوں کو عوام کی تائید بھی حاصل نہیں۔

اس کے بعد جناب والا۔ میرے دوست جناب عبدالحمید جتوئی صاحب نے ریڈیو پاکستان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ سندھی ملازمین کی تعداد ریڈیو پاکستان کے اندر بہت کم ہے۔ اور کوٹہ کے مطابق نہیں ہے۔ میں ان کی اطلاع کے لیے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ کُل جو منظور شدہ تعداد ہمارے ریڈیو پاکستان کی ہے وہ ۲۸۲۰ ہے اور اس میں سندھی ملازمین کی تعداد ۶۷۳ ہے یہ کسی طرح بھی بجٹ کے تناسب کے لحاظ سے صوبے کے لحاظ سے جو ان کا حق ہے اس سے کم نہیں ہے بلکہ یہ کچھ ہونے کے باوجود بھی ان کو یہ شکایت ہوئی کہ سندھی ملازمین کی تعداد بہت کم ہے یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ریڈیو پاکستان میں علاقائی زبانوں کو موقع نہیں دیا جاتا یہ بھی سُنی سنائی چیز ہے بلکہ اس دور میں جیسی ریڈیو پاکستان نے علاقائی زبانوں کو اہمیت دی ہے۔ اسے وہ بالکل بھول گئے ہیں وہ یہ بھی بھول گئے ہیں کہ کس طرح ایک علاقائی زبان کو صوبائی زبان بنانے پر اپوزیشن کے حضرات نے شور مچایا تھا کس طرح لسانی فسادات اس ملک میں برپا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس پر تو وہ چین بجیں نہیں ہوئے تھے۔ لیکن حکومت نے لسانی اور علاقائی زبانوں کو موقع دیا کہ وہ زبانیں ترقی کریں اور قومی زبان کے ساتھ پھلیں پھولیں۔ اس لیے کہ ان میں اور قومی زبان میں آپس میں لڑائی نہیں ہے۔ یہ ساری ہماری زبانیں ہیں اور ساری زبانوں اور صوبوں کی ثقافت ہماری ثقافت ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ اس حکومت نے سندھی زبان کو پہلی مرتبہ ریڈیو پاکستان کراچی چینل نمبر ا سے روزانہ خبروں کے علاوہ آدھ گھنٹے کا وقت دیا ہے جبکہ دوسرے چینل پر بہت زیادہ وقت سندھی زبان کو دیا جاتا ہے۔ حیدرآباد ریڈیو سے تقریباً ۲۵ فیصد ٹائم سندھی پروگراموں کے لیے ہے۔ اسی طرح پشتو زبان میں خبروں کی نشریات ٹیلی ویژن سے شروع کی گئی ہیں اور ریڈیو سے بھی شروع کی گئی ہیں۔ علاقائی زبانوں کو پوری نمائندگی دی گئی ہے اس لیے ریڈیو پاکستان کے بارے میں یہ نظریہ رکھنا میرے نزدیک محض سنی سُنائی باتوں پر مبنی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد جناب والا

میرے بعض دوستوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ریڈیو پاکستان پر طاؤس و رباب کی بات ہوتی ہے۔ اس کے اوپر تو گانا بجانا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ فتویٰ کیوں نہیں دیتے کہ گانا بجانا سرے سے ناجائز ہے اور ریڈیو پر کوئی گانا بجانا نہیں ہونا چاہیے فتویٰ دے دیں۔ ان کے ہاں تو یہ حالت ہے کہ قوالی بھی ناجائز سمجھیں گے۔ معلوم نہیں یہ کس معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان پروگراموں کو بند کر دیا جائے۔ گویا معاشرے کے اندر انھوں نے اپنے فرائض منصبی چھوڑ دیے ہیں پھر لوگ کیوں نہ دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے زائد فائدہ حاصل کریں جبکہ ریڈیو پاکستان ان کی جائز ضروریات کو بھی پورا نہ کرے لیکن اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ سارے پروگرام بالکل بند کر دیے جائیں تو یہ انتہا پسندی ہے جسے عوام کی تائید حاصل نہیں ہوگی۔ جس کی تائید ولی خان جیسے لوگ بھی نہیں کریں گے اور پاکستان کے دوسرے لوگ بھی اس کی تائید نہیں کریں گے۔ لیکن میں ان کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ ہمارے پروگراموں کی ترتیب یہ ہے۔ تلاوت کلام پاک اور اس کا ترجمہ۔ اس کے بعد درس قرآن۔ خبریں۔ اس کے بعد اخباروں کی شہ سرخیوں پر مبنی پروگرام۔ اس کے بعد نعتیں اور اس کے بعد گانوں کا پروگرام ہوتا ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ صبح کی مجلس میں لوگوں کے لیے تفریح کا تھوڑا سا بھی سامان نہ ہو۔ اگر وہ اعتراض کریں کہ کوئی گندا گانا الاپا جا رہا ہے تو ہم یقیناً اس پر کارروائی کریں گے اور ہم کئی گانے پہلے بھی ریڈیو سے سنانے بند کر چکے ہیں۔ آج تک اپوزیشن کے کسی ایک ممبر نے یہ نہیں کیا کہ کسی ایسے گانے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہو اور ہم نے اس پر کارروائی نہ کی ہو یا اپنے فرضِ منصبی سے غفلت برتی ہو۔ کوئی ایک مثال بتا دیں۔ یہ تو محض اعتراض کرنا جانتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ گانے نہیں سنتے تو ان کو یہ ساری تفصیلات کہاں سے ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چوری چھپے گانے سنتے ہیں اگر ایسا ہے تو انسانی فطرت کے خلاف کیوں لڑائی کرتے ہیں یہ جائز ضرورت ہے اور اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد میں عرض کروں گا کہ میرے دوست راؤ خورشید علی نے یہ کہا ہے کہ ریڈیو پاکستان نے دو قومی نظریے کو کیوں فروغ نہیں دیا۔ اس نے اس نظریہ کو ذہنوں میں راسخ کیوں نہیں کیا۔ اس نے دو قومی نظریہ کی بنیاد کو واضح کیوں نہیں کیا۔ وہ ہم پر یوں ناراض ہیں کہ ہم نے دو قومی نظریہ کی تشہیر کیوں نہیں کی۔ اور فاروقی صاحب کو یہ شکایت ہے کہ ہم نے ان لوگوں کے خلاف بات کی ہے جو چار قومیتوں کے پروگرام کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ اگر ہم چار قومیتوں کے حامیوں کو بے نقاب کریں گے تو ظاہر ہے کہ اس میں کچھ جماعتوں اور اداروں کے نام بھی آئیں گے جب اس نظریہ کی بات ہو گی اور جب ہم بتائیں گے کہ جو سیاسی طاقتیں دو قومی نظریہ کے خلاف ہیں اور پاکستان کی قومیت کے خلاف ہیں اور جو چار قومیتوں کو چاہتی ہیں وہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کچھ شخصیتوں اور اداروں کے نام بھی آئیں گے جب ایسا ہو گا تو پھر اپوزیشن کا طبقہ برہم ہو گا۔

داور حشر! مرا نامہ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

اب مجھے راؤ صاحب ہی بتائیں کہ ریڈیو پاکستان اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں کس قدر کامیاب رہا ہے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کی بقا اور نظریہ پاکستان کے فروغ کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد جناب والا۔ بہت سے دوستوں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر تنقید کی ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ وہ اپنے دوست کے ہاں بیٹھے تھے اس نے اچانک ٹی وی چلا دیا تو میں نے دیکھ لیا۔ جیسے ٹی وی دیکھنا کوئی جرم ہے۔ آپ نے ایک دفعہ پروگرام دیکھ کر رائے قائم کر لی اور پورے پروگراموں کو نہیں دیکھا اور سنی سنائی باتیں آ کر بتا دیں۔ لیکن جو لوگ ناظرین ہیں ان کی رائے کی بھی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔ فاروقی صاحب نے پانچ گھنٹے کے پروگراموں میں سے صرف پانچ منٹ پروگرام دیکھا اور ایک رائے قائم کر لی یا کسی نے ان کے کان میں کچھ

پھونک دیا اور انھوں نے رائے بنالی۔ کہتے ہیں کہ ٹی وی پر فحاشی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نے اگر سنسر کے قواعد سخت کر دیے ہیں اور جب بھی کوئی بات ہمارے نوٹس میں آتی ہے ہم اس پر سخت کارروائی کرتے ہیں لیکن فحاشی کا جزو زیر نظر ہے وہ الگ الگ ہے۔ ٹیلی ویژن پر جو فلمیں پیش کی جاتی ہیں زیادہ سے زیادہ ان پر ہی اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ٹیلی ویژن کی فلموں کی چار قسمیں ہیں کچھ تو وہ ہیں جو Scientific Fiction کی فلمیں ہیں جن کے اندر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے اندر ٹیکنالوجی کس مقام پر پہنچ چکی ہے اور چاند پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں آج جبکہ ایٹمی طاقت بڑھ رہی ہے یہ چیز ہماری نئی نسل اور پاکستان کے عوام کی معلومات کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد دوسری قسم وہ ہے جو عوام اور مقامات کے بارے میں ہوتی ہیں۔ یعنی مقامات اور شہریوں کے بارے میں فلمیں ہوتی ہیں۔ اب شہریوں کے بارے میں کسی فلم میں کسی ایسے معاشرے کی جھلک نظر آتی ہے کہ گلیوں اور بازاروں میں خواتین گھومتی پھرتی ہیں تو میں ان کو وہاں برقع پوش خواتین کہاں سے دکھاؤں وہ تو دوسرا معاشرہ ہے اور وہ فلم اس معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ دوسرے شہریوں کے بارے میں ٹی وی غلط معلومات نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد جناب والا تیسری قسم وہ ہے جو عام طور پر بچوں کے دیکھنے کی فلمیں ہوتی ہیں ان میں لوسی اور فلپیپر وغیرہ شامل ہیں۔ ان فلموں میں دیانت، وفاداری، شائستگی اور اخلاق جیسی قدروں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اب اگر ایسی فلموں میں ان کو ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو ان کے نقطہ نظر سے غلط ہیں تو کیا جب یہ بازار میں جاتے ہیں اور کہیں پنساری کی دکان پر اپنی مرضی کے خلاف ایسے کلنڈر نہیں دیکھتے جس پر عورت کی تصویر بنی ہو۔ اس وقت بازار میں بھی ان کے نزدیک بے پردہ عورتیں گھوم رہی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم کوشش کرتے ہیں کہ جو چیزیں ہماری اقدار کے خلاف ہیں ٹی وی پر نہ دکھائی جائیں۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ دنیا کس حد تک ترقی کر چکی ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی ماحول کے اندر بند پڑے رہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے یہ بات نہ جانے کس شان قلندری میں کہہ

دی ہے کہ ٹیلی ویژن سے مفید کام لیا جانا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کو یہ احساس تو ہُوا کہ ٹی وی بھی مُفید کام کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کی توثیق اُن نشستوں پر بیٹھے ہوئے درویش منش، مجاہد صفت حضرت مولانا نعمت اللہ کر دیں کہ ٹیلی ویژن سے جائز کام لیا جا سکتا ہے تو وہ سب کچھ جو اپوزیشن نے ٹیلی ویژن کے خلاف کہا میں وہ سب کچھ بسروچشم ماننے کے لیے تیار ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ مولانا اپنی صحیح تعلیمات کے پیش نظر اس پر فیصلہ دیں گے جنھوں نے یہ نعرہ مستانہ بھی بلند کیا تھا کہ لونڈیاں بھی ملنی چاہئیں۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ کیا ٹی وی پر تصویر کا آنا ناجائز ہے۔

جناب والا! جو مفتی صاحب کی تصویر ہے جو انٹرویو کی صورت میں آتی ہے، بتا دیں مولانا نعمت اللہ صاحب۔

اس کے بعد جناب والا میں عرض کروں گا کہ یہ بات ٹیلی ویژن کے بارے میں کہی گئی ہے کہ اس پر اپوزیشن کو وقت نہیں دیا جاتا اور اس پر ایک ہی نقطہ نظر پاکستان پیپلز پارٹی کا پیش کیا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی چیلنج کرتا ہوں۔ یہ محض نعرہ بازی ہے۔ یہ محض سنی سنائی بات ہے۔ ان ملکوں میں جہاں جمہوری روایات مستحکم ہوں ٹیلی ویژن اپوزیشن کو اس طرح ٹریٹ نہیں کرتی جس طرح پاکستان میں ٹیلی ویژن اپوزیشن کے ساتھ فراخدلی کا ثبوت دیتا رہا ہے اور دے رہا ہے۔ جہاں تک مفتی صاحب کا تعلق ہے وہ شہادت دیں گے کہ جب نیپ اور جوئی کی حکومتیں تھیں اور اللہ کرے کہ یہ جلد قائم ہوں کیونکہ مفتی صاحب کی حالت دیکھ کر بڑا ترس آتا ہے وہ بیٹھے بیٹھے سوتے رہتے ہیں ان کے چہرے کی رونق ختم ہو گئی ہے اللہ کرے کہ وہ دن جلد آئے تا کہ مولانا صاحب کے چہرے کی رونق واپس آئے۔

جناب والا تو میں عرض کر رہا تھا کہ جب نیپ اور جوئی کی صوبائی حکومتیں قائم تھیں تو کیم

مئی ۱۹۷۲ء سے ۸ فروری ۱۹۷۳ء تک جتنی خبریں صوبائی حکومتوں کے گورنر صاحبان - وُزراء صاحبان، حضرت مفتی صاحب کو۔ ارباب صاحب کو اور دوسرے وزیروں کو دی گئی ہیں اس کی کل مُدت ۳ گھنٹے ۲ منٹ بنتی ہے یہ خبریں تینوں اسٹیشنوں پر دی گئی ہیں۔ ایک منٹ کی خبروں پر جو خرچ ہوتا ہے وہ ٹیلی ویژن کے کمرشل ریٹ کے مطابق ایک اسٹیشن کے پانچ سو روپے ہیں اور اگر اسے تینوں اسٹیشنوں پر دیا جائے تو بارہ سو روپے بنتے ہیں۔ ان حضرات کی جو ٹی۔ وی فلمیں لی گئی ہیں وہ دور دراز مقامات پر ہم نے کیمرہ مینوں کی خصوصی ٹیمیں بھیج کر لی ہیں اور اس پر حکومت کا کافی خرچ آیا ہے اس کے باوجود ان کے بارے میں خبریں دی گئیں اور اس طرح ہر ماہ ان کے لیے ۲۰ منٹ وقف کیے گئے ہیں۔ کمرشل ریٹ کے اعتبار سے نیپ اور جو ئی کے لیڈروں کے بارے میں خبریں نشر کرنے پر چوبیس ہزار روپے مہینہ خرچ ہُوا۔ اس کے بعد بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے ان حضرات کو وقت نہیں دیا۔ جہاں تک انفارمیشن منسٹر کا تعلق ہے جنابِ والا۔ ٹیلی ویژن کے حکام جانتے ہیں کہ ان کو یہ ہدایت ہے کہ انفارمیشن منسٹر کی کم سے کم تقریبات دیں۔ مہینے میں کبھی ایک مرتبہ یا دو مرتبہ ایسا موقع آتا ہے کہ اس کی ایک آدھ منٹ کی کوئی تقریب آ جائے ورنہ جتنے جلسوں کو وہ خطاب کرتا ہے اگر سب کی سب تقریبات فلمائی جائیں تو انفارمیشن منسٹر کے سوا ٹیلی ویژن پر کوئی دوسرا آ ہی نہ سکے۔

تو جنابِ والا۔ اس کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ جنوری ۱۹۷۳ء سے اب تک اپوزیشن پارٹیوں کے ممبروں اور لیڈروں کو ۹ گھنٹے ۱۳ منٹ کا ٹائم ٹیلی ویژن سے دیا جا چکا ہے اور اس طرح روزانہ ۲ منٹ اپوزیشن کے حصے میں آتے رہے ہیں۔ آئین وغیرہ کی بحثوں میں بھی اپوزیشن لیڈروں کو زیادہ وقت دیا گیا ہے۔

تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ۱۹ تاریخ کو بجٹ پر بحث کرتے ہوئے خان عبدالولی خان نے جو

تقریر کی پاکستان ٹیلی ویژن جس طرح اس سے عہدہ برآ ہوا ہے۔ جنابِ والا۔ میں وہ ہاؤس کی اطلاع کے لیے اس کی تفصیل اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو خان عبدالولی خان کی تقریر کی ٹیلی ویژن نے جس طرح رپورٹ کی ہے وہ میں آپ کو سُناتا ہوں۔ اس کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ یہ لوگ پاکستان ٹیلی ویژن والوں پر پھر بھی یہ تہمت لگاتے ہیں کہ وقت نہیں دیتے اور ان کے نظریہ کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں ہونے دیتے اور یہ بھی دیکھیے کہ جہاں سے بلیٹن شروع ہُوا ہے اس کے اندر انفارمیشن منسٹر بھی بولے ہیں۔ ڈپٹی لیڈر اور سردار شوکت حیات خان بھی بولے ہیں لیکن ٹیلی ویژن نے بلیٹن کا آغاز خان عبدالولی خان کی تقریر سے کیا ہے اور تقریر کے وہ الفاظ جو ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کیے گئے ہیں یہ ہیں :

"نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ، جناب عبدالولی خان نے یہ الزام لگایا کہ حکومت یہ تاثر پیدا کر رہی ہے کہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے اور بعض سیاسی جماعتیں اور عناصر علیحدگی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں ایسی کوئی تحریک نہیں۔ جناب عبدالولی خان نے سول انتظامیہ کی مدد کے لیے بلوچستان میں فوج بھیجنے کی مخالفت کی۔ انھوں نے الزام لگایا کہ حکومت عام جمہوری عمل کو نشوونما پانے کی اجازت نہیں دے رہی اور مختلف صوبوں کے لیے معیار کے مختلف پیمانے استعمال کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام کے ارکان کو اکثریت حاصل ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ نے سنٹو میں پاکستان کی مسلسل دلچسپی پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ اس سے بڑی طاقتوں کی ریاست پاکستان تک پہنچ جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ شہنشاہِ ایران پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں اور ایران کو پاکستان میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں شک ہے کہ ایران پاکستان کا دوست اور برادر ملک ہے۔ جناب عبدالولی خان نے کہا کہ

پاکستان کی یکجہتی کے متعلق شہنشاہِ ایران کی تشویش کے بارے میں جو وضاحت
کی گئی تھی وہ اطمینان بخش نہیں کیونکہ بقول ان کے اس سے دوسرے پڑوسی
ملکوں کو بھی پاکستان کے معاملوں میں مداخلت کرنے کا موقع ملے گا۔ انھوں نے
کہا کہ انتظامیہ پر بہت زیادہ اخراجات کیے جا رہے ہیں اور یہ اخراجات ملک کے
عام اقتصادی حالات کے مطابق نہیں۔

جناب والا۔ مجھے بتائیں کہ ٹیلی ویژن کی خبروں میں پہلی خبر کے طور پر اپوزیشن پارٹی کے لیڈر کے متعلق اس قدر خبریں دینا اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ پاکستان ٹیلی ویژن غیر جانبدار ہے اور وہ اس فراخدلی سے اپوزیشن کے بارے میں خبریں دے رہا ہے جو کسی جمہوری ملک کی روایات کے عین مطابق ہو سکے۔ اس کے بعد کیا یہ چاہتے ہیں کہ جس پارٹی کو جس لیڈر کو عوام نے اتنے ووٹ دیے ہیں اور کثرت رائے سے منتخب کیا ہے ان کو بالکل ٹائم نہ دیا جائے۔ ان کے نقطہ نظر کی پروجیکشن نہ کی جائے اور ٹیلی ویژن ہر وقت انہی کی تصویریں دیتا رہے اور ان کی تقریریں ٹیلی کاسٹ کرتا رہے۔ اس سے زیادہ ٹیلی ویژن کے پاس طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی اپوزیشن پارٹی کے بارے میں خبریں دے سکے۔ اس کے بعد جناب والا میں یہ عرض کروں گا کہ میرے بہت سے دوستوں نے یہ کہا ہے کہ ہم اخبارات کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔ وہ سلوک کر رہے ہیں۔ مار رہے ہیں باندھ رہے ہیں گرفتار کر رہے ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سابق وزیر قانون یہ نہیں جانتے تو اور کس سے شکوہ ہو کہ محکمہ اطلاعات اور وزارتِ اطلاعات کے پاس ایسی طاقت نہیں کہ وہ کسی کو گرفتار کرے۔ وزارتِ اطلاعات نے کبھی کسی اخبار نویس کو گرفتار نہیں کیا کبھی کسی اخبار کے خلاف اس نے بند کرنے کی کارروائی نہیں کی۔ صوبائی حکومتوں نے کارروائیاں کی ہیں۔ وزارتِ داخلہ نے کارروائیاں کی ہیں اور اس وزارتِ قانون نے کارروائیاں کی ہیں جو میاں محمود علی قصوری کی قیادت میں کام کر رہی تھی۔ جناب والا اور میاں محمود علی قصوری کے زمانے میں "پنجاب پنچ" اور "زندگی" پر بندش کے احکام جاری ہوئے اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے

تمام قانونی مشورے اس سے حاصل کیے جاتے تھے۔ اگر وہ اتنے ہی دلیر تھے اور اتنے آزادئ صحافت کے علمبردار تھے تو اس وقت انھیں کہنا چاہیے تھا اس وقت انھیں شور کرنا چاہیے تھا اس وقت انھیں ایوان میں بولنا چاہیے تھا یہ کیا کہ آج وزارت میں نہیں ہیں تو کہتے ہیں کہ اخبارات سے اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا۔ میں کہتا ہوں کہ اخبارات کو جس قدر آزادی۔ گالی گلوچ تک کی آزادی اس ملک میں ہے جناب والا اپوزیشن کے بہت سے اخبارات کو وہ کسی ملک میں حاصل نہیں۔ ہمارے وہ اقتباسات پڑھیں جو ان اخبارات نے ہمارے لیڈروں کے بارے میں ہمارے صدرِ مملکت کے بارے میں لکھے ہیں آپ یقیناً یہ کہیں گے کہ یہ کسی آزاد ملک کی صحافت کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور کسی صحافت کے لیے باعثِ فخر نہیں ہو سکتا کہ وہ اس طرح کے غیر مہذبانہ انداز میں لوگوں کی پگڑیاں اچھالے۔ اس کے باوجود وہ اخبارات روزمرّہ اسی قسم کے کالموں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد جنابِ والا یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے نیوز پرنٹ ختم کر دیا ہے اور ہم کاغذ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں مجھے افسوس ہے کہ کبھی دوستوں نے زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ وہ معلوم کر لیتے۔ سیکرٹری اطلاعات سے معلوم کر لیتے سیکرٹری اطلاعات سے مل لیتے۔ متعلقہ افسر سے مل کر حقیقتِ حالات معلوم کر لیتے تو اس طرح اس کاغذی گولہ باری کی جو کی جا رہی ہے انھیں ضرورت نہ پڑتی۔ صورتِ حالات نیوز پرنٹ کے بارے میں کیا ہے جنابِ والا۔ ایک دفعہ ذرا کانوں سے رُوئی نکال کر میرے دوست اچھی طرح نوٹ کر لیں تاکہ بار بار شکایت کرنے کی ضرورت نہ پڑے صورت یہ ہے کہ کھلنا نیوز پرنٹ مل کی سپلائی اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ختم ہو گئی اور شارٹیج Shortage سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کئی اخبارات بند ہو جائیں گے اس وقت کی حکومت نے اپریل کی ۱۱ تاریخ کو نیوز پرنٹ آرڈی ننس جاری کیا یہ ہم نے جاری نہیں کیا۔ آپ نے اس وقت اس حکومت کے خلاف کوئی آواز بھی نہیں اٹھائی۔ آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لیے کہ صدر بھٹو کی حکومت نہ تھی۔ اس نے آرڈی ننس نہیں جاری کیا تھا اور اس آرڈی ننس کی رُو سے یہ خیال

رکھا گیا تھا کہ نیوز پرنٹ اتنا محدود مقدار میں ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اخبارات وریادلی سے اس طرح نیوز پرنٹ کو خرچ کریں جیسا کہ وہ ایڈیشن نکالنے میں کرتے ہیں۔ اور ہم آگے چل کر اخبارات کو سپلائی نہ کر سکیں اور ایسا ایک وقت آئے کہ اخبارات بند ہو جائیں۔ چنانچہ اس پر ہم نے یہ کوشش کی کہ کینیڈا سے بارٹر اگریمنٹ کریں۔ سویڈن سے اگریمنٹ کریں۔ ان سے کاغذ حاصل کریں چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور میں ایوان کی اطلاع کے لیے خود کہہ رہا ہوں کہ فارن ایکسچینج خرچ کیے بغیر اس حکومت نے کاغذ کے حصول کے لیے ضرورت کے مطابق کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد اب حالت یہ ہے کہ اخبارات کی اشاعت چیک کی جاتی ہے جس اخبار کی جتنی اشاعت ہوتی ہے اس کی جانچ پڑتال الگ ادارہ کرتا ہے جسے اے بی سی کہتے ہیں۔ اے بی سی کا قانون ہم نے نافذ نہیں کیا۔ یہ قانون بھی سالہا سال سے چلا آرہا ہے۔ آڈٹ کے مطابق سرکولیشن کی جتنی تعداد جس اخبار کی ہوتی ہے اس کے مطابق اس اخبار کو کاغذ دیا جاتا ہے اور میں چیلنج کرتا ہوں اس طرف بیٹھے ہوئے ممبران صاحبان کو وہ بتلائیں کہ کیا نوائے وقت کو اس کی تعداد کے مطابق کاغذ نہیں دیا جا رہا ہے۔ کیا جسارت کو اے بی سی کے مطابق کاغذ نہیں دیا جا رہا ہے اور کیا جو اپوزیشن کے اخبارات ہیں ان کو کاغذ نہیں دیا جا رہا ہے؟

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جس اخبار کی اے بی سی کے مطابق جتنی سرکولیشن ہوتی ہے اسے اس کے مطابق کاغذ دیا جاتا ہے اب یہ کیا چاہتے ہیں؟ جتنا کاغذ یہ مانگیں اس کی اشاعت کا خیال کیے بغیر ہم ان کو کاغذ دے دیں؟ تاکہ وہ مارکیٹ میں بکے تاکہ وہ بلیک ہو؟ جس اخبار کا جتنا کاغذ خرچ ہو اس کی ضرورت کے مطابق کاغذ دیا جائے گا لیکن اس کی سرکولیشن چیک کر کے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہو جس میں ناانصافی کا شبہ ہو تو یہاں وزیر اطلاعات ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن جناب والا ان کے پاس اس اپوزیشن کے پاس سوائے نعرے بازی کے، سوائے الزام تراشی کے سوائے اخباروں میں واہ واہ حاصل کرنے کے کوئی میٹریل نہیں ہے۔ کوئی ڈیفینٹ Definite کیس ان کے پاس نہیں ہے سوائے ایک کیس

کے کہ انھوں نے ایک بات سُن رکھی ہے کہ نیوز پرنٹ بند کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم نیوز پرنٹ کو اے بی سی کی بنیاد پر مستر د کریں تو جب ہمارے پاس کاغذ کی ملیں نہیں ہیں تو کب تک کاغذ دیا جا سکتا ہے۔ اب جنابِ والا میں اس طرف آؤں گا جو میرے بعض دوستوں نے حج کے متعلق فرمایا ہے۔ مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جن سے کچھ توقع تھی کہ داد دیں گے، جن سے کچھ توقع تھی کہ خوش ہوں گے۔ ایک دینی فریضے کی ادائیگی کے سلسلے میں کہ ایک دریا دلی کا اقدام کیا ہے جن کے بارے میں ایک حسن ظن تھا کہ کہیں گے کہ حکومت نے یہ بڑا نیک کام کیا ہے۔ اور اب ایسا کام ہونا چاہیے، انھوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ حج کے مقدس فریضے پر پچیس سال میں پچھلی حکومتیں دو کروڑ، تین کروڑ روپیہ زر مبادلہ خرچ کرتی تھیں۔ جبکہ اس حکومت نے جنابِ والا پہلی مرتبہ بائیس کروڑ روپے کا زر مبادلہ حج کے فریضہ پر خرچ کیا اور جنابِ والا۔ پچیس سال میں حج پر پابندیاں تھیں۔ لوگ قرعوں میں جا سوتے تھے لیکن قرعے میں ان کا نام نہیں نکلتا تھا۔ لوگ سمگل ہو کر جاتے تھے اور دبئی میں جا کر ان کی لانچیں اُلٹ جاتی تھیں چھپ چھپا کر جاتے تھے۔ لیکن یہ پہلی حکومت ہے جس نے قرعہ اندازی کے سسٹم کو ختم کیا، جس نے عام اجازت حج کی دی اور اس طرح اس نے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ نہ صرف پاکستان کی پچیس سالہ ہسٹری میں بلکہ پوری دُنیائے اسلام میں ریکارڈ قائم کیا۔ اس سال نہیں، پچھلے تمام سالوں کا ریکارڈ بھی اس نے توڑ دیا اور اس سال پاکستان سے چھیانوے ہزار حاجیوں نے فریضہ حج ادا کیا، اس چیز کی بجائے اس کے کہ مولانا صاحب توثیق کرتے، تسلیم کرتے، اعتراف کرتے، تحسین کرتے۔ افسوس کہ اپوزیشن کی عینک "ڈارک عینک" لگانے کے بعد مولانا عبدالمصطفےٰ الازہری نے جو طریقہ اختیار کیا کہ جو جائز بات تھی اس کی بھی تعریف نہیں کی ہم کم از کم علمائے اس اپوزیشن کے متوقع نہیں تھے۔ اچھی پالیسی پر چلنا اچھی بات کا اعتراف کرنے کی تلقین کرنا یہ علماء کا منصب تھا —— افسوس کہ یہ منصب ان اصحاب نے فراموش کر دیا۔

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی۔ افسوس کہ سیاست کے کوچے میں انھوں نے وہ طور طریقے بھی چھوڑ دیے جو ہمارے علمائے کے پہلے سے چلے آرہے تھے۔ اور اس حمام میں جناب والا میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی حالت کیا ہے۔ اس کے بعد جناب والا میں عرض کرتا ہوں کہ حج کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ بزرگ خود منہ سے تو کچھ نہیں کہتے' ان کی نیت ہے کہ وہ میرے معاملے میں بہت محتاط ہیں' بہت کرم کرتے ہیں"۔ میں ان کا ممنون ہوں' مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ بعض بینچوں پر جا کر دوسروں کو انگیخت ضرور کرتے رہتے ہیں کہ تم بولو۔ لیکن ہم تو خود ان کی ترنم بھری آواز سننا چاہتے ہیں۔ تو بہر حال انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

خود بات کیجیے۔ دوسروں کو کیوں اُکساتے ہیں اور کہا یہ گیا ہے کہ حج کے سلسلے میں انتظامات ناقص تھے۔ سو گذارش یہ ہے کہ چھیانوے ہزار حاجیوں میں سے اگر ایک ہزار حاجی بھی یہ خط لکھ کر بھیج دیں کہ ہمیں یہ تکلیف ہوئی ہے تو ہم اس کا مداوا ضرور کریں گے۔ جناب والا آپ غور فرمائیں کہ اتنی عدیم النظیر تعداد کے انتظامات کے ضمن میں جس میں اس حکومت کا ہی صرف تعلق نہیں ہے بلکہ اس سے بیرونی حکومتیں بھی متعلق ہیں۔ کچھ مشکلات کا پیش آنا بھی قدرتی امر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسی مشکلات پیش آئی ہیں لیکن یہ علمائے کرام سہولت اور تن آسانی کے عادی ہیں۔ جو حاجی دیارِ حبیب میں گئے ہیں میرے خیال میں تو ان کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ان کو وہاں کا ہر کانٹا پھول لگا ہوگا' لیکن ان علمائے کرام کو یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کو حج کے سلسلے میں وہاں تکلیف ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ مزے سے زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ ذرا گرمی ہوئی اور لُو لگی تو کہہ دیا کہ ایرکنڈیشنگ کا انتظام کیوں نہیں۔ لیکن بہر حال عام حاجی، جنھیں پندرہ پندرہ سال سے حج کرنے کا موقع نہیں ملا تھا' ان لوگوں نے اس سال حج کا فریضہ ادا کیا ہے اور انھوں نے بہت دعائیں دی ہیں کہ انھیں اس حکومت کے عہد میں یہ سعادت نصیب ہوئی

ہے اور اگر کچھ چھوٹی موٹی تکلیف ہو تو وہ ان کو درجات کی بلندی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جناب والا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ان حضرات کو وزارتِ اطلاعات، اس کا عملہ اور اس کے کارکنوں کا ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے یہ کام سرانجام دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پاس کوئی الگ حج ڈویژن نہیں تھا۔ ان حاجیوں کے لیے الگ عملہ نہیں تھا۔ اس واسطے اس وزارت اور وزیر کو اکیلے ہی کام کرنا پڑا۔ میں نے حاجیوں کے لیے ان ساری مصروفیات کے ساتھ ساتھ جو کام کیا ہے۔ اس کی جزا نہیں لوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ رب جس کے دین اور جس کی راہ میں میں نے یہ کام کیا ہے، مجھے وہ جزا دے گا لیکن میرے ساتھیوں اور کارکنوں نے رات دن ایک کر کے حاجیوں کا کام کیا اور ان کے لیے انتظامات کیے اور اس کام کے لیے ان کو کوئی اوور ٹائم نہیں ملا۔ جناب والا۔ انھوں نے کس طرح رات کے ایک ایک دو دو بجے تک کام کیا اور دفتر کھلے رہے لوگ وہاں جا کر اپنے کام اور اپنی مشکلات حل کراتے تھے۔

لیکن اب انشاء اللہ علیحدہ حج ڈویژن قائم ہو جانے کے بعد ان تمام مشکلات پر قابو پا لیا جائے گا جو ہمارے ملک میں اس سلسلے میں موجود ہیں۔ لیکن اگر کوئی چھوٹی موٹی مشکل ہو تو اس سلسلے میں حکومت کو موردِ الزام ٹھہرانا کوئی صحیح بات نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ ٹرانسپورٹروں نے راستے میں نماز کے وقت گاڑی کھڑی نہیں کی۔ یہ تکلیف دی اور بدزبانی کی۔ جناب والا مجھے یہ بتایا جائے کہ اب میں کہاں سے ایسے ٹرانسپورٹر لاؤں جو صالح اور نیک ہوں اور اخلاق عالیہ سے متصف ہوں۔ اس معاشرے میں جس میں بزرگانِ دین کے متعلق اقبال نے فرمایا ہے: "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" انھوں نے منبر کو چھوڑا اور دنیا سے دل لگا لیا ہے۔ اگر وہ اصلاحِ احوال نہیں کریں گے، معاشرے کی اصلاح نہیں کریں گے اور لوگوں میں جو تصوف اور محبت کی راہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پیدا نہیں کریں گے تو پھر میں ٹرانسپورٹرز کو کہاں سے ایسے سانچے میں فٹ کر کے لاؤں کہ وہ اصلاح یافتہ ہوں۔ جناب والا! ہم

ان کو ہدایت کرتے ہیں، ان کو صورتِ حال سے باخبر کرتے ہیں ہم ان پر پابندیاں لگاتے ہیں اگر وہ راستے میں گاڑی کھڑی نہیں کرتے تو حکومت کا کیسا قصور ہے اور پھر یہ کتنا غلط ہے کہ ان کو حکومتِ پاکستان پر اعتماد نہیں۔

• جنابِ والا! اس کے باوجود میں بتاتا ہوں کہ جن ٹرانسپورٹروں کے خلاف وزارتِ اطلاعات کو شکایات موصول ہوئی ہیں کہ انھوں نے غلط طرزِ عمل اختیار کیا ہے یا کسی قسم کی تکلیف دی ہے یا انھوں نے مزید چارجز وصول کیے ہیں۔ ان میں کئی ٹرانسپورٹروں کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔ اور انھیں اس سال حج کا کارواں لے جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور کئی ٹرانسپورٹروں سے حاجیوں کے واجبات واپس دلائے گئے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں اس ایوان میں گوشوارہ پیش کروں گا۔ نام بھی بتاؤں گا کہ کن ٹرانسپورٹروں کو بلیک لسٹ کیا گیا ہے اور تفصیل بھی بتاؤں گا کہ کن حاجیوں کے واجبات واپس کرائے گئے ہیں۔ اب جنابِ والا! حکومت اس کے علاوہ کیا کر سکتی ہے؟ جنابِ والا اس کے بعد میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ بار بار کہتے ہیں کہ حاجی کیمپ میں ہزاروں آدمی آ گئے۔ اور وہاں بدانتظامی تھی سوال یہ ہے کہ جس قوم اور جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں ان کی اگر اس وقت تنظیم نہیں ہوگی اور یہ خود بھی محض نعرے لگائیں گے۔ اور لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کریں گے تو کیا کیا جائے۔ جنابِ والا! تین ہزار آدمیوں کو ہم بلاتے ہیں کہ آپ آئیں اور ٹکٹ لے لیں اور تین ہزار کی بجائے آٹھ ہزار آدمی حاجی کیمپ میں آ جاتے ہیں تو ان کی رہائش اور کھانے کا انتظام کرنا ہوتا ہے یہ ہمارے بے طلب مہمان بن کر چلے آئے۔ تب وہاں ہجوم ہو جاتا ہے تو کیا قصوروار حکومت ہے؟ اور پھر جن کے جہاز تاخیر سے آئے ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا کہ ان کو فری کھانا دیا جائے۔ تاکہ ان پر بوجھ نہ پڑے کیا یہ بدانتظامی ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ کہاں تھی یہ دینی جماعت؟ کہاں تھی یہ جمعیت العلمائے پاکستان اور دوسری جماعتیں کہاں تھیں؟ میرے دوست فاروقی صاحب، جو کراچی کے بڑے لیڈر ہیں کیا انھوں نے ہم سے جھوٹے منہ بھی یہ کہا کہ حاجی

کیمپ کے لیے رضاکار ہم سے لے لو یا ہم کام کریں گے یا تعاون کریں گے۔ لیکن یہ کام تو ان کا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ کام تو خدا کے فضل و کرم سے ہم نے ہی کرنا تھا۔ ان کا کام جیسا کہ اقبال نے کہا "فی سبیل اللہ فساد"۔ اب بعد میں کیڑے نکال رہے ہیں، تنقید کر رہے ہیں اور اس وقت کیا یہ تماشا دیکھ رہے تھے جب اتنا بڑا ہجوم تھا اور میں نے فاروقی صاحب کو حج کمیٹی میں رکھا تھا۔ اس لیے کہ وہ آئیں گے، تشریف لائیں گے، انتظامات سنبھالیں گے۔ لیکن وہ کبھی تشریف نہ لائے۔

حج کمیٹی کی افتتاحی تقریب ہوئی اس میں غالباً یہ تشریف لائے لیکن میں جہاز کے لیٹ ہونے کی وجہ سے دیر سے پہنچا اور یہ وہاں سے تشریف لے گئے۔

جناب والا! انھوں نے کچھ کام نہیں کیا۔ اگر یہ اپنے طلبا کا لشکر بھیج دیتے تو ہم ان سے کچھ کام لیتے۔ لیکن انھیں تو انھوں نے کسی اور کام پر لگایا ہوا ہے۔ اب اس کے بعد مختلف رفاہی اور سماجی تنظیمیں تھیں جنھوں نے کچھ تھوڑے بہت رضاکار بھیج دیے اور ہماری پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے مل کر اس حاجی کیمپ میں انتظام کیا۔ اب جہاں تین ہزار آدمیوں کی بجائے آٹھ ہزار آدمی تھے وہاں صفائی کے انتظام کی ضرورت ہو گی، وہاں بھیڑ لگے گی، وہاں ہر چیز تاخیر سے ہو گی۔ جناب والا یہ ایک سیلاب تھا جو پچیس سال سے بند تھا اور لوگوں کی آرزوئیں گھٹ رہی تھیں۔ لیکن اب انشاء اللہ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ اتنی بڑی تعداد میں حاجی نہیں جائیں گے۔ کیونکہ انھیں پتہ ہے کہ جب بھی ان کا حج کرنے کا ارادہ ہو گا وہ چلے جائیں گے اور اب انشاء اللہ انتظامات بہتر ہوں گے اور ہم نے چھ ماہ پہلے ہی سے انتظامات شروع کر دیے ہیں۔

جناب والا! میرے خیال میں حج کا موضوع ختم ہو جائے تو بھی مجھے وقت ضرور ملے گا کیونکہ مجھے ڈیڑھ گھنٹہ ابھی اور بولنا ہے۔ تو جناب والا میں عرض کر رہا تھا کہ میرے ہمدرد اور فاضل دوست

میاں محمود علی قصوری نے فرمایا ہے کہ زرمبادلہ کم تھا' یہ صحیح ہے جناب والا کہ زرمبادلہ کم تھا ہم بھی مانتے ہیں کہ واقعی کم تھا۔ لیکن کاش مجھے ان کا تعاون حاصل ہوتا۔ جب وہ کابینہ میں تھے وہ اپنے تمام تر اثرات کا استعمال کرتے ہوئے کابینہ کے ایک ممبر کے محکمے کے مسائل حل کرنے میں مدد بہم پہنچاتے اور اپنے اثرات استعمال کر کے زرمبادلہ زیادہ منظور کرا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ مگر انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کیا۔ شاید یہ سب اس لیے کہ جب وہ مستعفی ہوں تو تنقید کا حق محفوظ رکھ سکیں۔ لیکن میں پھر بھی خوش ہوں کہ انھوں نے کسی انداز سے ہم پر صحیح تنقید کی ہے۔ "تنقید ہی سے سہی وہ بے رُخی سے دیکھتے تو ہیں":

وہ بے رُخی سے دیکھتے ہیں' دیکھتے تو ہیں
میں مطمئن ہُوں' ہُوں تو کسی کی نگاہ میں

لیکن بہرحال اس وقت انھوں نے یہ کام نہیں کیا۔ اب وہ کہتے ہیں کہ زرمبادلہ میں کمی محسوس ہُوئی ہے۔ اس سال سے حاجیوں کا زرمبادلہ بڑھایا جا رہا ہے۔ انشاءاللہ اس سلسلے میں لوگوں کو جو تکالیف پچھلے تجربے میں پیش آئی ہیں وہ آئندہ نہیں آئیں گی۔ لیکن یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ لوگوں نے بھیک مانگی' ان کو اپنے کھانے کے لیے گداگری کرنی پڑی۔ یہ نہایت مبالغہ آمیزی ہے انھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ پاکستان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مستقلاً دوسرے علاقوں سے غلط راستوں سے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالحکیم صاحب ہی بتا دیں گے اگر یہ اپوزیشن بنچ پر بیٹھ کر بالکل ہی ظالم نہیں ہو گئے ہم نے صرف انہی کو حج نہیں کرایا بلکہ اس متبرک ہستی کو جو آسمان افتا کی آفتاب و مہتاب ہے۔ اس کو بھی حج کرایا ہے۔ اگر یہ کوئی جرم ہے تو اس میں بہت سے لوگوں کے نام آئیں گے۔ میں جناب والا اس پر بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مفتی صاحب بیٹھے ہیں اور بہت سے علمائے بیٹھے ہیں ایک دفعہ فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ بار بار نعرے بازی ہوتی ہے کہ حج پر سرکاری وفد چلا گیا' سرکاری خرچ پر حج نہیں ہوتا یہ تو ایسی بات ہے جیسے کسی فرض کی ادائیگی کے لیے اگر حکومت کسی کی پے منٹ کرے نیکی کے فریضے کے لیے تو کہا جائے کہ یہ فریضہ اس

وقت تک ادا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر فوج جہاد کرتی ہے اور فوج کو حکومت خزانے سے پیسے دیتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ فوج پیسے لیتی ہے اس کا جہاد نہیں ہوتا۔ یہ دنیا کے ساتھ کیا مذاق ہے؟ میں ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مفتی صاحب سے فتویٰ لے لیں اور مولانا حکیم صاحب سے بھی فتویٰ لے لیں۔ یہ بالکل غلط بات ہے یہ کہنا کہ انھوں نے حج غلط کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ انھیں حج کا فریضہ ادا کرنے کی توفیق ملی اور اس کے ساتھ اپنے ملک کی ترجمانی کرنے کا موقع بھی ملا۔ اگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا تو انشاءاللہ آئندہ آپ کو شامل کر لیں گے۔ بہر حال یہ بات ایسی نہیں جس کو مذاق کا موضوع بنایا جائے۔ جناب والا یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ سعودی عرب میں منیٰ اور عرفات کے مقام پر تکلیف تھی۔ آپ جناب ذرا غور کریں کہ وہاں ہمارا سکہ تو نہیں چلتا نہ وہاں ہماری حکومت ہے جس نے حج کے انتظامات میں اپنی تمام تر توانائیاں نچوڑ رکھی ہیں مگر میں سعودی عرب کی حکومت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس حکومت نے ہمیشہ حج کے انتظامات بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ حاجیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور جگہیں محدود ہیں اور شہر چھوٹے ہیں اور یہاں سے لاکھوں انسان جائیں تو بہت سے مسائل کا پیدا ہونا ناگزیر عمل ہے۔ اب معلموں کے سلسلے میں دیکھیے کہ اس سلسلے میں جو تکلیف پیش آئی وہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ حکومت ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے ہم وفد وہاں بھیج رہے ہیں وہ سعودی عرب جائے گا۔ وہاں کے سفارت خانے کی مدد سے ان معلموں سے بات چیت کریگا جنہوں نے پاکستانی حاجیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے ان کی لسٹ تیار کریگا اور ان سے یہ معاہدہ کرے گا کہ پاکستانی حاجیوں کو یہ یہ مراعات دی جائیں گی اور یہ معاہدہ تحریری شکل میں بھی ہم کوشش کریں گے کہ ہو جائے اور پھر پاکستانی حاجیوں کو صرف انہی معلموں کے پاس بھیجیں گے۔ جنھوں نے بدسلوکی کی ہے انھیں بلیک لسٹ کر دیا جائے گا۔ اس طرح مجھے یقین ہے کہ معلموں کے سلسلے میں جو تکالیف پیش آئیں وہ آئندہ پیش نہیں آئیں گی۔ اس کے بعد جناب والا میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے

دوستوں نے کیا بات کہی ۔ میاں منظور حسین صاحب نے کرایوں کے بارے میں بات کی ہے میں ان کے جذبات کا احترام کرتا ہوں ۔

(اس موقع پر ایوان میں اپوزیشن نے اپنے استدلال کی دھجیاں اڑتی دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ ان کا ٹائم ختم ہو گیا ہے ۔ اس پر کہا گیا)

جناب والا ! میرا ٹائم دو گھنٹے ہے ۔ میرے تمام ساتھیوں نے حقِ تقریر سے دستبردار ہو کر تمام تر وقت مجھے دے دیا ہے ۔ اب آخر یہ لوگ اتنی تکلیف کیوں محسوس کر رہے ہیں ۔ میں ایسی کوئی بات تو نہیں کر رہا جس سے ان کو تکلیف ہو ۔

(اس پر سپیکر نے کہا کہ کم و بیش ان کے تمام اعتراضات کا جواب دیا جا چکا ہے اور رات بھی بہت گذر چکی ہے ۔ اس لیے مناسب ہو گا اگر تقریر ختم کر دی جائے)

نیشنل پریس ٹرسٹ

"۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی میں این۔پی۔ٹی کے چیئرمین کی تقرری کا بل پیش ہوا تو اپوزیشن نے نیشنل پریس ٹرسٹ پر اپنے معلوم و معروف نقطۂ نظر کے مطابق سخت تنقید کی۔ اس موقع پر خود اکثریتی پارٹی کے بعض ارکان بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ اس بل کو کامیاب طریقے سے متعارف کرانا بہت مشکل ہوگا۔ تقریر کے بعد ہاؤس نے پوری گرمجوشی سے بل کی منظوری دی۔ بہت سے دوستوں کا کہنا تھا کہ آزاد دنیا کے پریس ٹرسٹوں کے تقابل میں یہ تقریر ان کے لیے بہت سے نئے حقائق کے انکشاف کا باعث بنی ہے۔"

جناب والا! میں نے اس معزز ایوان میں، حزبِ اختلاف کی طرف سے ہونے والی تقریروں کو بہت غور اور دلچسپی سے سُننے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس سادہ سے بے ضرر بل پر میرے ان دوستوں کو کیا بنیادی اعتراضات ہیں۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند رائج الوقت نعروں کے سوا جن کی حقیقت کا خود ان کو بھی علم نہیں ہے ان کی تقریروں میں حقیقت کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کیا ہے اور جب ہم نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ دیا جائے تو اس وقت کیا صورتِ حال تھی اور آج ہمارا موقف کیا ہے۔ یہ ساری باتیں اس ایوان میں بار بار اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ ان سے بہت کچھ خلطِ مبحث ہونے کا امکان ہے اس لیے میں آپ کی اجازت سے اس ضمن میں ٹرسٹ کی کچھ مختصر سی تاریخ اور اس کا تعارف عرض کروں گا۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا جناب والا! کہ نیشنل پریس ٹرسٹ حرامی بچّہ ہے یا حلالی بچّہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حرامی حلالی کی بحث اس ضمن میں خاص طور پر حزبِ اختلاف کے دوستوں کو نہیں چھیڑنی

چاہیے انھیں کم ازکم اپنے ایک بزرگ ساتھی ہی کا خیال کرلینا چاہیے کہ جن کی کوششوں اور محنتوں سے اور ریاضتوں سے اس بچے کی تخلیق ہوئی۔ میرے دل میں ان کا بڑا احترام ہے اور تجربہ کی وجہ سے، عمر کی وجہ سے کہ اب وہ ایسی منزل میں ہیں کہ ان کے بال سفید ہوچکے ہیں، اور وہ اپنے حق میں بہرحال ایک اہم مقام کے مالک ہیں اور اب اگر ان کا تعلق حزب اختلاف سے ہے تو یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے کہ ان کی ریاضتوں، محنتوں، کوششوں کا حاصل یہ بچہ ہے تو اس کو حرامی بچہ کہا جائے۔ میرا اشارہ جناب غلام فاروق کی طرف ہے جن کی کوششوں سے یہ نیشنل پریس ٹرسٹ معرضِ وجود میں آیا تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ۶۴ء میں بزنس ہاؤسز نے تقریباً ۵۲ لاکھ روپیہ ٹرسٹ فنڈ کے طور پر ریزرو کیا اور جن لوگوں نے اس میں حصہ دیا انھیں سٹلرز کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بورڈ آف ٹرسٹیز مقرر کیا جو چیئرمین سمیت دس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ میں جناب غلام فاروق کو اس مقصد کے لیے تحسین پیش کروں گا کہ انھوں نے شروع میں بورڈ آف ٹرسٹیز میں سٹلرز کے صرف دو نمائندے رکھے تھے اور باقی لوگ مشرقی اور مغربی پاکستان میں مختلف حیثیتوں کے مالک تھے جن میں سرکاری نمائندے بھی تھے، جن میں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی تھے اور اس طرح سرمایہ داروں کا اثر و نفوذ اس بورڈ آف ٹرسٹیز میں اتنا زیادہ نہ تھا لیکن اس ٹرسٹ کو اس انداز میں پیش کرنا مقصود تھا کہ اس کے خفیہ مقاصد نگاہوں کے سامنے زیادہ نہ آسکیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ وہ مقاصد لوگوں کے سامنے عیاں ہوتے چلے گئے اور بورڈ آف ٹرسٹیز کی ہیئت ترکیبی میں آہستہ آہستہ ردّ و بدل ہوتا رہا۔ مارچ ۶۷ء میں ایک ترمیم کے ذریعے بورڈ آف ٹرسٹیز میں سٹلرز کے نمائندوں کی تعداد دو سے بڑھا کر چار کر دی گئی اور چیئرمین بھی چونکہ ان کا اپنا ہوتا تھا اس طرح پانچ آدمی بورڈ آف ٹرسٹیز میں ان سٹلرز کے تھے اُن بزنس مینوں کے تھے ان سرمایہ داروں کے تھے، ان صنعت کاروں کے تھے جنھوں نے نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس سال میں دو چار ماہ کے بعد فوراً ایک اور ترمیم پیش کی گئی اور اس تعداد کو چار سے بڑھا کر

پانچ کردیا گیا اور اس طرح بورڈ آف ٹرسٹیز میں چیئرمین سمیت ان سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور ملز کے نمائندوں کی تعداد چھ ہو گئی اور جب دیکھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر پھر کچھ گرفت اس ٹرسٹ پر سرمایہ داروں کی ڈھیلی پڑ جائے تو پھر ایک ترمیم مزید کی گئی اور اس میں یہ بات پیش کی گئی کہ باقی جو چار آدمی بچتے ہیں بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبروں کی صورت میں ان کا انتخاب بھی یہ چھ آدمی کریں گے جو ملز کے نمائندے ہیں اس طرح آہستہ آہستہ اس بورڈ آف ٹرسٹیز کو کاملاً سرمایہ داروں کے جنگل میں پھنسا دیا گیا اور وہ مقصد عیاں ہو کر سامنے آ گیا جس کے لیے یہ پریس ٹرسٹ معرض وجود میں لانے کی کوشش کی گئی۔ یہ صورت حال تھی جب الیکشن قریب تر آنے لگے اور فضائیں میر و سلطان سے بیزار ہے کے نعروں سے گونجنے لگی۔ سرمایہ داروں کی صفیں ڈانوا ڈول ہونے لگیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ مستانہ لگایا۔ عوام کے اندر وہ شعور پیدا ہوا جس کی وجہ سے اسلامی سوشلزم کا مسئلہ قریب تر ہونے لگا تو سرمایہ داروں کی صفوں میں کھلبلی مچی۔ ان لوگوں نے کوشش کی کہ اس نیشنل پریس ٹرسٹ کے ذریعے اس انقلاب کی لہر کو روکا جائے جو پاکستان کے اندر سرمایہ داری کے سفینہ کو بہا لے جانے کے لیے اُمڈ آئی تھی ان لوگوں نے اس مقصد کے لیے ایک اور ترمیم کی۔ یہ ترمیم بظاہر بڑی بے ضرر نظر آتی ہے لیکن جناب والا اس ترمیم کی تلوار ہاتھ میں لے کر ان سرمایہ داروں نے ترقی پسند صحافیوں یعنی عوام پسند صحافیوں کا قتل عام کیا۔ اس ترمیم کی تلوار ہاتھ میں لے کر انھوں نے لوگوں کی معاش کو ختم کیا اور ان کے بچوں کو فاقوں کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی جنھوں نے اسلامی سوشلزم کے نصب العین کی تائید کی تھی اور جو اس ملک کے اندر عوامی انقلاب کی منزل کو قریب تر لانے کی جد و جہد کر رہے تھے وہ ترمیم جناب والا یہ تھی کہ نیشنل پریس ٹرسٹ

For propagating the ideology of Islamic Republic of Pakistan

کے مقصد کے لیے کام کریگا۔ یہ بظاہر ایک بے ضرر سی ترمیم نظر آتی ہے کہ نظریہ پاکستان کی تبلیغ و ترویج اس پریس ٹرسٹ کا مقصد ہو گا۔ لیکن جناب والا یہ بھی ستم ہائے روزگار میں

سے ایک بات ہے۔ آخر یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ نظریہ پاکستان کے مبلغ اس ملک میں وہ بن گئے ہیں جنھوں نے قائدِ اعظم کی مخالفت کی تھی۔ وہ لوگ نظریہ پاکستان کے کسٹوڈین اور اجارہ دار بن گئے جنھوں نے پاکستان کو معرضِ وجود میں آنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ نظریہ پاکستان کے زعما۔ اور امین وہ لوگ بن گئے کہ جنھوں نے اس ملک کے اندر غریب عوام پر کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ اُن عوام پر کفر کا فتویٰ دیا تھا جن عوام کی کوششوں، محنتوں اور قربانیوں کے نتیجہ کے طور پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ اگر نظریہ پاکستان کا کوئی وجود تھا جیسا کہ یقیناً تھا تو اس کی تعریف کا حق ان عوام کو پہنچتا تھا ان مسلمانوں کو پہنچتا تھا ان لوگوں کو پہنچتا تھا جنھوں نے اس کے لیے قربانیاں دی تھیں اور وہ ساحل پر کھڑے ہوئے موجوں سے لڑنے والوں پر قہقہہ زنی کر رہے تھے اور وہ سنگ دلی سے ان کا تمسخر اڑا رہے تھے وہ اس وقت ان پر پتھر پھینک رہے تھے وہ اس وقت ان کی راہ کھوٹی کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ نظریہ پاکستان کے ترجمان کا روپ دھار کر اس ملک کے اندر عوام دوست صحافیوں کی گردن مارنے کی کوشش کریں لیکن یہ ہوا کہ اس ترمیم کے ذریعہ سے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کی ہے جو بظاہر بے ضرر تھی لیکن حقیقتاً اسں نظریہ پاکستان کی ترمیم اس لیے کی گئی تھی کہ الیکشن کا مرحلہ درپیش تھا اور سرمایہ دارانہ تفسیر نظریہ پاکستان کی یہ تھی کہ اسلامی سوشلزم کی ترکیب اور اصطلاح اور اس کا مفہوم اور اس کی رُوح اور اس کا مقصود یہ نظریہ پاکستان کے خلاف ہے اس لیے آگے قدرتاً اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ جو صحافی اس کے خلاف ہو اس کو کان سے پکڑ کر ان اداروں سے باہر نکال دیا جائے ان اخبارات کو اسلامی سوشلزم کے خلاف، اسلامی سوشلزم کے علمبردار کے خلاف، اسلامی سوشلزم کے علمبردار قائد کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا چنانچہ یہی ہوا اور ان اخبارات کو پوری دیدہ دلیری کے ساتھ استعمال کیا گیا صحافیوں کو ان اخباروں سے چُن چُن کر نکالا گیا جو ان لوگوں کے نزدیک نظریہ پاکستان کے خلاف تھے جو لوگ اسلامی مساوات چاہتے تھے جو لوگ اس ملک میں

معاشی انصاف کے علمبردار تھے ان لوگوں کو نکالا گیا اور سرمایہ داروں نے ان کاغذی سفینوں کے ذریعے سے کاغذی بند باندھ کر اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی جو اس ملک میں عوام کی تمناؤں کا رُوپ دھار کر رونما ہو رہا تھا۔

یہ نظریہ پاکستان تھا جس کی یہ ترمیم ان لوگوں نے پیش کی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو آئے دن تقریریں کرتے تھے اور لاکھوں کے مجمع میں تقریریں کرتے تھے۔ جب ان کی پارٹی کے لوگ یا کارکن لاکھوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے تھے تو ان اخبارات میں اتنی جگہ بھی نہیں ملتی تھی جتنی کہ بی۔ ڈی کے چیئرمینوں کے بیانات کو جگہ ملتی تھی۔ اس موقع پر ظاہر ہے کہ عوام دوست حلقوں کا اس صورتِ حال کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا ایک قدرتی امر تھا چنانچہ عوامی حلقوں اور تمام ترقی پسند حلقوں میں اور انصاف پسند افراد کی جانب سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ دیا جائے۔ سرمایہ داروں نے یہ ٹرسٹ کس طرح چلایا۔ یہ بھی ایک دلچسپ مگر دردناک داستان ہے۔ کاش ہمارے دوست جو چلتے نعروں پر اپنی تقریروں کی بنیاد رکھتے ہیں کبھی یہ زحمت گوارا فرماتے اور یہ بھی مطالبہ کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ جن ٹرسٹیوں کا آج رونا رو رہے ہیں اور جن کے غم میں وہ آج گھلے جا رہے ہیں اور جن کے فراق میں وہ آج سوگوار بنے ہوئے ہیں وہ ان کے کارناموں سے بھی اس ایوان کو مطلع کرتے کہ اس ٹرسٹ کو سرمایہ داروں نے کیونکر چلایا۔ یہ صنعت کار اور سرمایہ دار جو اپنی تجارت کے معاملہ میں اتنے فرزانہ اور ماہر تھے کہ انھوں نے ایک کارخانہ سے دس کارخانے اور بارہ کارخانے پیدا کیے۔ ۱۹۶۴ء میں جس کا ایک کارخانہ تھا اس نے ۱۹۷۲ء میں بارہ کارخانے پیدا کر لیے۔ لیکن انھوں نے اس ٹرسٹ کو جس طرح چلایا وہ عجیب و غریب داستان ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جس ٹرسٹ کو ۵۲ لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے چلایا۔ جب ہم نے زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لی اور عوامی حکومت نے چارج سنبھالا اور ہم نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے معاملات کی چھان بین کی تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہ دیکھا کہ ٹرسٹ سوا دو کروڑ روپے

کا مقروض ہے جس ٹرسٹ کو بلیک میلنگ کے ذریعہ بنایا گیا جس ٹرسٹ کو ان لوگوں نے اپنی بلیک میلنگ پاور بنایا جس کے ذریعے اپنی فیکٹریوں میں اضافہ کیا اس پریس ٹرسٹ کے پریس کی حالت یہ تھی کہ پنڈی سے جو پاکستان ٹائمز اخبار چھپتا ہے اس کے پریس میں جو مشینری لگی تھی وہ سات سال کی پرانی مشینری ہے اور کسی بھی وقت یہ امکان موجود ہے کہ وہ ختم ہو جائے وہ تباہ و برباد ہو جائے اس کے کل پرزے ناکارہ ہو جائیں اور وہ بند ہو جائے جس کے نتیجے میں اخباری کارکن اپنی روزی کے خطرہ میں محسوس کریں لیکن ان ظالم سرمایہ داروں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس ادارے کی حالت کو بہتر بنایا جائے جس سے کارخانہ داروں کے روزگار وابستہ ہیں جس سے ان کی فلاح و بہبود وابستہ ہے جس سے ان کا مستقبل وابستہ ہے۔ ان لوگوں نے ۵۲ لاکھ روپیہ سیاسی رشوت کے طور پر اس وقت کی سیاسی جماعتوں کو پیش کیا جس کے نتیجے میں ان لوگوں نے مالی مفادات حاصل کیے اور جو ان کی اپنی جائدادوں ان کے اپنے کارخانوں، ان کی اپنی ملوں اور فیکٹریوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ٹرسٹ کی صورتِ حال تھی۔ جب ہم نے اس کے معاملات کا جائزہ لیا۔ اب یہ صورت تھی کہ ہمیں اپنے وعدوں کا پورا پاس تھا اور جب ہمارے اس طرف کے بیٹھنے والے دوست یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ انصاف سے کام نہیں لیتے اس لیے کہ ہم نے نیشنل پریس ٹرسٹ توڑنے کا اسی دن اپنا وعدہ پورا کر دیا جب ہم نے اس پریس ٹرسٹ کو توڑ دیا جس کے اندر وہ سرمایہ دار شامل تھے جنھوں نے عامل صحافیوں کا خون کیا اور ہمارا یہ وعدہ اسی دن شرمندہ تعبیر ہو گیا اور اسی دن شرمندۂ تکمیل ہو گیا جو ہم نے عوام کے ساتھ کیا تھا جس دن ہم نے عامل صحافی اور ایک کارکن صحافی کو نیشنل پریس ٹرسٹ کا چیئرمین بنایا اور جیسا کہ ہمارے سیکرٹری جنرل نے کہا کہ ٹرسٹ کے توڑنے میں بے شمار قانونی امور درپیش تھے اس کا جائزہ لیا گیا لیکن ٹرسٹ کی ہیئت ترکیبی کے اندر اور دوسرے امور کے اندر ایسی ضابطے کی پیچیدگیاں اور قانونی پیچیدگیاں تھیں کہ اس ٹرسٹ کو توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اسے وہ لوگ بھی نہیں توڑ سکتے

جنھوں نے اسے بنایا ہے۔ ہم چونکہ قانون کی حکمرانی چاہتے ہیں اس لیے ہم نے ٹرسٹ تو نہیں توڑا لیکن اس جھگڑے کی ہڈی ختم کر دی جس کی وجہ سے وہ سارا تالاب گندہ ہُوا تھا اس مچھلی کو تالاب سے نکال دیا یعنی ان سرمایہ داروں کو ختم کر دیا اور جس بورڈ کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوئی تھیں اس کو ختم کر دیا۔ اب جسے اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا ہے وہ ایک کارکن صحافی ہے جیسا کہ میرے ایک فاضل ممبر نے کہا ہے کہ وہ کارکن صحافی ہے جس نے تحریکِ پاکستان میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ اور جس نے اس وقت کے ایک اخبار میں مرحوم حمید نظامی کے ساتھ پاکستان کے لیے خدمات انجام دی ہیں اس کو ٹرسٹ کا چیئرمین بنایا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اپنا وعدہ ہم نے پورا نہیں کیا اور ہم نے اپنے وعدہ کو فراموش کر دیا۔ جنابِ والا۔ میں آپ سے کہوں گا کہ وہ لوگ ہمارے ساتھ سیاسی اختلافات ہونے کی وجہ سے انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن جنابِ والا میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ جہاں تک ٹرسٹ کی تشکیل کا تعلق ہے ٹرسٹ فی نفسہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔

ٹرسٹ کی ہیئت ترکیبی سے بُرائی یا بھلائی پیدا ہوتی ہے جہاں تک ٹرسٹ بنانے کا تعلق ہے یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔ ہمارے اس طرف کے بہت سے دوست برطانوی نظامِ حکومت کی مثالیں دیتے ہیں۔ برطانوی نظام کی دفعات ان کو قرآنی آیات معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے علمائے کرام بھی اس نظام کی مدح کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ جو انگریز سے ورثہ میں ملا تھا اور قرآنی منفرد نظام وہ آج تک پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں اور اس پر انھوں نے پردے ڈال رکھے ہیں یہی وہ نظام ہے جو برطانیہ میں چل رہا ہے اور جس کو انگریز چلاتا ہے۔ اسی برطانیہ کے اندر میں عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ بہت سے اخبارات ایسے ہیں جنھیں پریس ٹرسٹ چلاتا ہے اور ان اخبارات میں بہت سے مشہور اخبار شامل ہیں۔ اس میں "گارجین" شامل ہے اس میں "آبزرور" شامل ہے۔ "ڈیلی ایکسپریس" شامل ہے اور ان کو باقاعدہ ٹرسٹ چلاتا ہے اگر آپ مجھ سے اس کی مثال لیں گے کہ کیا کوئی ایسا ٹرسٹ بھی ہے کہ جو اپنے اخبارات نکالتا ہے اور وہ اخبارات حکومت کی تائید کرتے ہیں اور حکومت کی پالیسیاں عوام تک پہنچاتے ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ اُسی برطانیہ کے

اندر" ٹائمز" ایسا اخبار ہے جس کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ برسرِ اقتدار حکومت کی پالیسیوں کی تائید کریگا خواہ وہ لیبر حکومت کی پالیسیاں ہوں خواہ وہ کنزرویٹو حکومت کی پالیسیاں ہوں امریکہ کے اندر جناب والا! میں یہ عرض کروں گا کہ آدھے روزنامے یعنی پورے امریکہ میں جتنے اخبارات نکلتے ہیں ان کی آدھی تعداد ایسی ہے جن کو اجتماعی ادارے نکالتے ہیں جن کو مختلف گروپ نکالتے ہیں جن کو ٹرسٹ نکالتا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کو لے لیجیے جس کے صدر مرحوم جمال عبدالناصر تھے جن پر لوگوں نے کفر کے فتوے لگائے۔ وہ بزرگ میرے سامنے موجود ہیں لیکن خدا کی قسم جہاں تک جمال عبدالناصر کا تعلق ہے میں فتویٰ لگانے والے تمام علماء کو اس شخص کی جرأت اور کلمۂ حق پر قربان کر سکتا ہوں جو انگریزوں کے مقابلے میں انگریز کے استبداد کے مقابلہ میں انگریزوں کی سامراجیت کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا رہا۔ جناب والا میں عرض کر رہا تھا کہ ۱۹۶۰ء میں پورے پریس کو متحدہ عرب جمہوریہ میں قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا گیا تھا اور آج تک مصر کا تمام پریس قومی ملکیت میں ہے اور مصر کے اخبارات آج بھی مشرقِ وسطیٰ میں مثالی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں اور اس قوم کو کبھی اس بات پر شرمندگی نہیں ہوئی ہے اور اس قوم کو کبھی اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پھر تمام سوشلسٹ ممالک اور ترقی پسند ممالک میں پریس قومی ملکیت میں ہے۔ کئی ایک سوشلسٹ ممالک میں پریس کو قومی ملکیت میں لیا گیا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ محض اس خیال سے ہم پر تنقید کی جائے کہ ٹرسٹ کیوں موجود ہے۔ تو صاحب ہم آپ سے عرض کرتے ہیں کہ ٹرسٹ موجود ہے لیکن ٹرسٹ جن ظالموں کے قبضہ میں تھا۔ ٹرسٹ پر جن سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کا قبضہ تھا ہم نے ان لوگوں کو ہٹا دیا ہے اور انھیں حرفِ آخر کی طرح مٹا دیا ہے۔ اب اگر آپ چاہیں بھی کہ ان کو دوبارہ لے آئیں تو آپ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم نے ان کو ختم کر دیا ہے اس طرح ہم نے عوام سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا ہے۔

میں آج اس معزز ایوان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ کیونکہ میں نسبتاً تفصیل کے ساتھ اس بل کے مختلف پہلوؤں پر اپنی گزارشات پیش کر چکا ہوں۔ میں نے نیشنل پریس ٹرسٹ کی تاریخ بھی بیان کی تھی اور بتایا تھا کہ کس طرح سرمایہ داروں نے اس پر اپنے چنگل کو مضبوط کیا اور میں نے بتایا تھا کہ کس طرح ہم نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اپنے اس وعدے کو پورا کیا جو اس ٹرسٹ کے بارے میں ہم نے کیا تھا۔ آج میں ان دو باتوں کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو اس بحث کے دوران جو کل سے اس ایوان میں ہو رہی ہے اٹھائی گئیں۔ ان میں سے ایک بات تو یہ تھی کہ کچھ دوستوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اس ٹرسٹ کو صحافیوں کے حوالے کر دیا جائے اور میرے ایک محترم دوست نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اس سلسلے میں اپنے بعض حقوق سے بھی دستبردار ہونے کا اعلان کیا اور اس طرح بظاہر خوش آئند بات انھوں نے ایوان کے سامنے کہی لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ جب آپ اس کی گہرائی میں اتر کر دیکھیں گے تو اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نظر نہیں آئے گا۔

جناب والا! یہ حقیقت ہے کہ اگر اس ٹرسٹ کو صحافیوں کے حوالے کر دیا جاتا تو اس کا انتظام ان کے بس سے باہر ہوتا جیسے کہ میں نے کل عرض کیا کہ ٹرسٹ سوا دو کروڑ روپے کا مقروض ہے اور اس طرح کے سفید ہاتھی کو اگر ان غریب صحافیوں کے ہاں باندھ دیا جاتا تو بجائے اس کے کہ ان کو فائدہ پہنچتا ان کے لیے بڑی دشواریاں پیدا ہو جاتیں ان کے ہاں طرح طرح کی تکالیف جنم لے لیتیں یوں بھی ہمارے ہاں ابھی کوآپریٹو سسٹم اتنا آگے نہیں بڑھا ہمارے ملک میں ایسے تجربات نہیں ہوئے ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم ایسا کام کریں اور ایک بڑا خطرہ مول لیں اور نتیجتاً ہزاروں صحافی بیروزگار ہو جائیں۔ جبکہ اس سے پہلے بھی دو تین بار صحافی ایسے نقصان دہ مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔ معزز ایوان کے ارکان اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ اس سے پہلے بھی صحافیوں نے باہم مل کر کئی اخبار چلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پورا سرمایہ نہ ہونے کے سبب انھیں بے شمار مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہے بالآخر ناکام ہو گئے۔ ان میں سے ایک اخبار "ترجمان" تھا۔ یہ اخبار صحافی کارکنوں نے باہمی اشتراک سے نکالا تھا مگر اسے سخت کسمپرسی اور بے چارگی سے دوچار ہونا پڑا اس اخبار نے کارکن صحافیوں کے لیے جو مسائل پیدا کیے حکومت اب تک ان کو سلجھانے میں لگی ہوئی ہے اس قسم کا حادثہ روزنامہ "آزاد" کے ساتھ پیش آیا۔ جس کو صحافی کارکنوں نے شروع کیا لیکن اسے چلا نہ سکے نتیجتاً بہت سے صحافیوں کو بے روزگار ہونا پڑا۔ اسی طرح کا نتیجہ اخبار "کوہستان" کے صحافی کارکنوں کو بھگتنا پڑا ہے یہ اخبار سرمایہ دار مالکوں نے کارکن صحافیوں کے حوالے کر دیا تھا لیکن چونکہ ان کے پاس ذرائع و وسائل نہیں تھے اس لیے وہ اس اخبار کو چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور سینکڑوں کارکن مفلسی کا شکار ہو گئے۔ ان تین اخباروں کے سارے کارکن احتجاجاً مدتوں پنجاب اسمبلی کے باہر خیمے لگا کر بیٹھے رہے ہیں۔ یہ صحافی کارکن مالکوں سے اپنے واجبات مانگتے رہے۔ بالآخر ہمیں مداخلت کرنا پڑی اور ان کے واجبات دلانے کے لیے ہم نے کوشش شروع کی۔ پھر کہیں جا کر یہ صورت حال بہتر ہوئی۔ اس لیے میرے نزدیک معزز ایوان میں جو

حضرات نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کو صحافیوں کے سپرد کر دینے کی تحریک پیش کر رہے ہیں وہ بظاہر تو خوش آئند معلوم ہوتی ہیں مگر بر باطن ان کے نتائج بہت بُرے ہوں گے کچھ دوستوں نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ ٹرسٹ کو سرے سے توڑ ہی دیا جائے۔ میں نے کل بتایا تھا کہ ہمارے سیکرٹری جنرل مسٹر جے۔ اے رحیم نے بعض قانونی پیچیدگیوں کا ذکر کیا ہے جو ٹرسٹ کے توڑنے کے ضمن میں پیش آسکتی ہیں۔ یہ قانونی دشواریاں تو ایسی ہیں کہ ان کی رُو سے ٹرسٹ بنانے والے بھی اسے توڑ نہیں سکتے۔ میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ میں کسی کی نیت پر شبہ نہیں کرتا یقیناً یہ مطالبہ کرنے میں بہت سے لوگ حق بجانب ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے سامنے کچھ ایسے مقاصد بھی ہوں جنھیں وہ صحیح سمجھتے ہوں لیکن بہت سے سرمایہ دار اور بہت سے Enterprisers جنھوں نے یہ ٹرسٹ قائم کیا تھا، جو اس کے Settlers تھے آجکل اس تاک میں ہیں کہ اس ٹرسٹ پر پھر ان کا قبضہ ہو جائے اسی لیے وہ شور مچا رہے ہیں کہ یہ ٹرسٹ توڑ دیا جائے اور سابق مالکوں کی تحویل میں یہ اخبار چلے جائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ملک کے اندر الیکشن سے پہلے انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کے مسئلے پر کتنی زبردست نظریاتی بحثیں چھڑ چکی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ذاتی ملکیتوں کے تحفظ کے لیے کیسے کیسے فتوے اس ملک میں جاری ہو چکے ہیں۔ بعض علما کرام نے تو منبروں اور محرابوں سے یہ آواز بلند کی تھی کہ انفرادی ملکیت نصِ قرآن ہے۔ ہم نے اس مرحلہ پر عوام کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ محراب و منبر سے بلند ہونے والی یہ آواز نہ قرآن کی آواز ہے اور نہ اسلام کی۔ نصِ قرآن قطعاً انفرادی ملکیت کو تحفظ نہیں دیتا۔ قرآن تو ایسی جماعتی زندگی کا داعی ہے جس میں پورا پورا معاشی عدل کارفرما ہو۔ اسلام تو قطعاً جماعتی استحصال اور غصب کی اجازت نہیں دیتا ہے اس میں تو صرف ایسی ذاتی ملکیتیں محفوظ ہیں جو عدل و انصاف پر مبنی ہوں۔ عدل و انصاف سے ہٹی ہوئی کسی بھی ذاتی ملکیت کو قرآن جائز نہیں سمجھتا۔

یہ لوگ پھر چاہتے ہیں کہ جس انفرادی ملکیت کو بورڈ آف ٹرسٹیز توڑ دینے کے بعد ہم نے

ختم کر دیا ہے اس کے چنگل میں اخباروں کو پھنسا دیا جائے پھر سرمایہ دار ان کے مالک بن جائیں اور قومی ملکیت کے تجربوں کی طرف جو قوم جا رہی ہے اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں۔

جناب والا! میں عرض کروں گا کہ یہ لوگ انفرادی ملکیت کے تقدس کے حامی ہیں اور ان کی بہت سی دلیلیں اسی طرح کی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عوام ان کی ساری بے وزن دلیلیں رد کر چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ دور انفرادی ملکیت کا دور نہیں ہے یہ اجتماعیت پسندی کا دور ہے۔ اس لیے جو لوگ کہتے ہیں کہ ٹرسٹ توڑ دیا جائے اور اس کے اخباروں کو پھر سے انفرادی ملکیت کی صورت میں مالکوں کے ہاں منتقل کر دیا جائے، وہ اس کے تقاضوں سے منحرف ہو رہے ہیں اور نئے دور کی اجتماعی قدروں سے برسرِ پیکار ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج اس معزز ایوان میں جو تقریریں حزبِ اختلاف کے فاضل اراکین نے کی ہیں ان کے اندر کل کی نسبت ایک اعتدال تھا، ایک توازن تھا اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے ضمن میں کل جس قسم کی جلی کٹی باتیں سنائی گئی تھیں آج ان سے احتراز کیا گیا ہے۔ میں شکر گزاری کے احساس کے ساتھ اپنے ان فاضل دوستوں کی خدمت میں ہدیۂ اعتراف پیش کروں گا جنھوں نے آج یہ تسلیم کیا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ ایک اہم قومی ادارہ ہے اور ان حضرات نے اس قومی ادارے کی انتظامیہ کے ڈائریکٹرز کی تقرری کے ضمن میں اپنی مجوزہ ترامیم پیش کر کے یہ حق تسلیم کر لیا ہے کہ اس ادارے کا وجود باقی رہنا چاہیے۔ یوں انھوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ جس صورت میں موجود ہے۔ سرمائے داروں کو نکالنے کے بعد عوامی حکومت نے عوام سے جو وعدے کیے تھے وہ وعدے اس نے پورے کر دکھائے اور اس سلسلے میں اپنے فاضل دوستوں کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔

پھر جناب والا! آخر میں آپ سے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں اور میں معزز ایوان کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ آج ہم یہ جو بل لا رہے ہیں اور آپ جسے ازراہِ کرم منظور کر رہے ہیں تو یہ بل پیش کرنے کے ضمن میں ہمیں مشکلات پیش نہیں آئیں یا ہم نے پروپیگنڈے کے بارنہیں سہے یا ہم پر الزام تراشی نہیں کی گئی۔ وہ سرمایہ دار یا وہ مالکان اور وہ Enterprisers یہ چاہتے

تھے کہ کسی نہ کسی طریقے سے ان کا چنگل اس پر پھر مضبوط ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کیں۔ مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں نام نہاد انتہا پسند دائیں بازو کے بعض لوگ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ انھوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ان کا بھی یہی مطالبہ تھا کہ یہ ٹرسٹ توڑ دیا جائے تاکہ انفرادی طور پر مالکان اس پر متصرف ہو جائیں۔ لیکن ان کی ساری مخالفتوں اور ان ساری مخاصمتوں کو عبور کرنے کے بعد ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ یہ بل آج ہم اس ایوان کے سامنے پیش کریں اور آپ ازراہِ کرم اس کی منظوری دے دیں۔

اور میں اپنے فاضل دوستوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم بورڈ آف ٹرسٹیز ضرور مقرر کریں گے مگر یہ بورڈ آف ٹرسٹیز سرمایہ داروں پر بالکل مشتمل نہیں ہوگا۔ یہ بورڈ آف ٹرسٹیز اس ملک کے چند گنے چنے خاندانوں کے افراد پر مشتمل نہیں ہوگا بلکہ اس بورڈ آف ٹرسٹیز میں عوام کے منتخب کیے ہوئے نمائندے شامل ہوں گے۔ اس کے اندر صحافی کارکن بھی ہوں گے اور ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سفارش کریں گے کہ اس کے اندر حزبِ اختلاف کے ارکان کو بھی نمائندگی دی جائے۔ کیونکہ جنابِ والا! میں آزاد صحافت کا علمبردار ہوں اور میں یہ کسی قیمت پر نہیں چاہتا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو ہم اس طرح کی انتظامیہ کے سپرد کر دیں جو آزادیٔ اظہار رائے کا گلا دبا دے۔

میں اپنے دوستوں کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بورڈ آف ٹرسٹیز بنایا جائے گا اس کے اندر تمام لوگوں کو نمائندگی دی جائے گی اور یہ حقیقتاً ایک عوامی بورڈ آف ٹرسٹیز ہوگا اور جب یہ بورڈ آف ٹرسٹیز بنے گا تو معزز ایوان کے ہر رکن کو حق ہوگا کہ اس سے متعلق اپنی تجاویز پیش کر سکے اور میں یہ یقین دلاتا ہوں کہ ان تجاویز پر ہم پورا غور کریں گے۔ میں مولانا ظفر احمد کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے جو ترمیم پیش کی تھی اسے یہ کہہ کر واپس لے لیا ہے کہ انھیں یہ علم نہ تھا کہ بورڈ آف ٹرسٹیز توڑا جا چکا ہے۔

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی پاک یوتھ ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار کے افتتاح کے موقع پر تقریر کر رہے ہیں

لاهور کے نزدیک ایک گاؤں میں دیہاتیوں سے خطاب ـــــ (۸، فروری ۱۹۷۳ء)

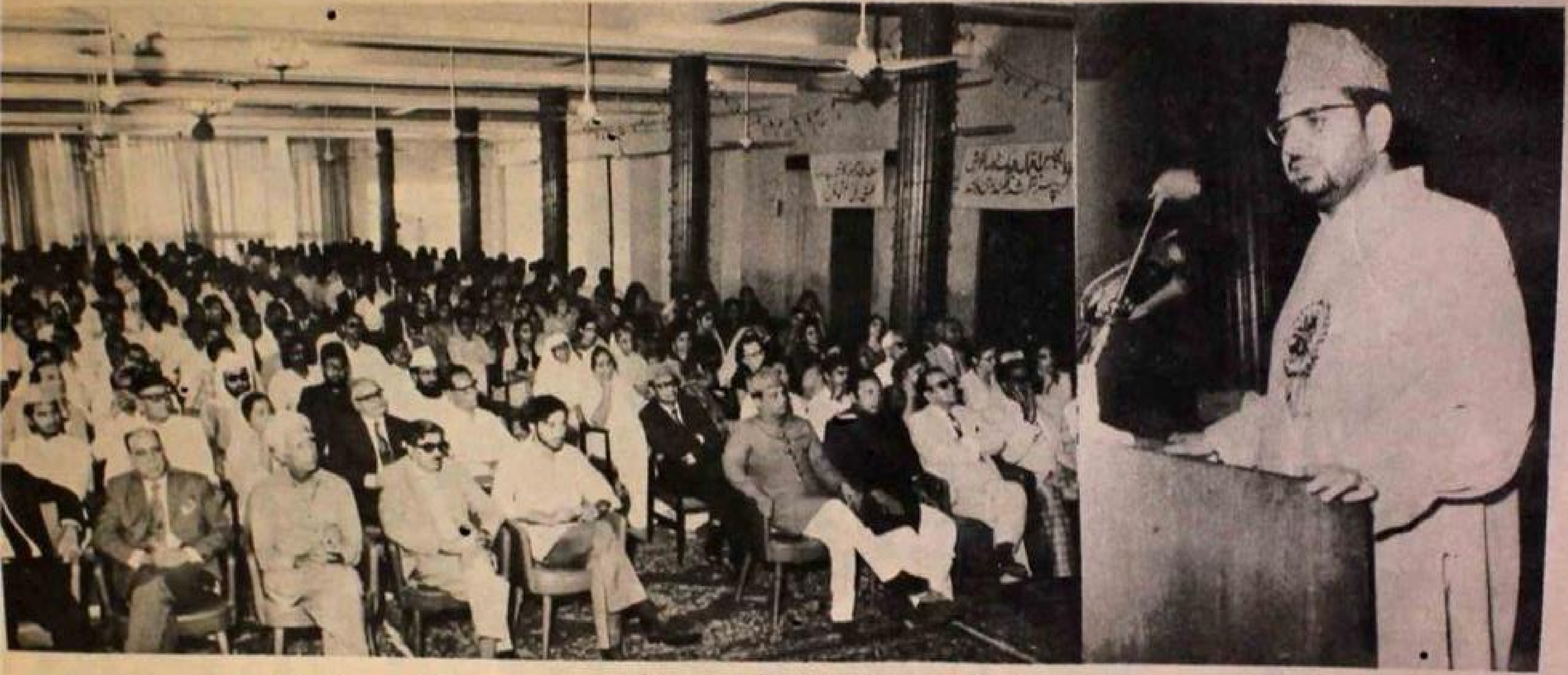

کراچی میں اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام اقبال ڈے کے موقع پر حاضرین سے خطاب (۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء)

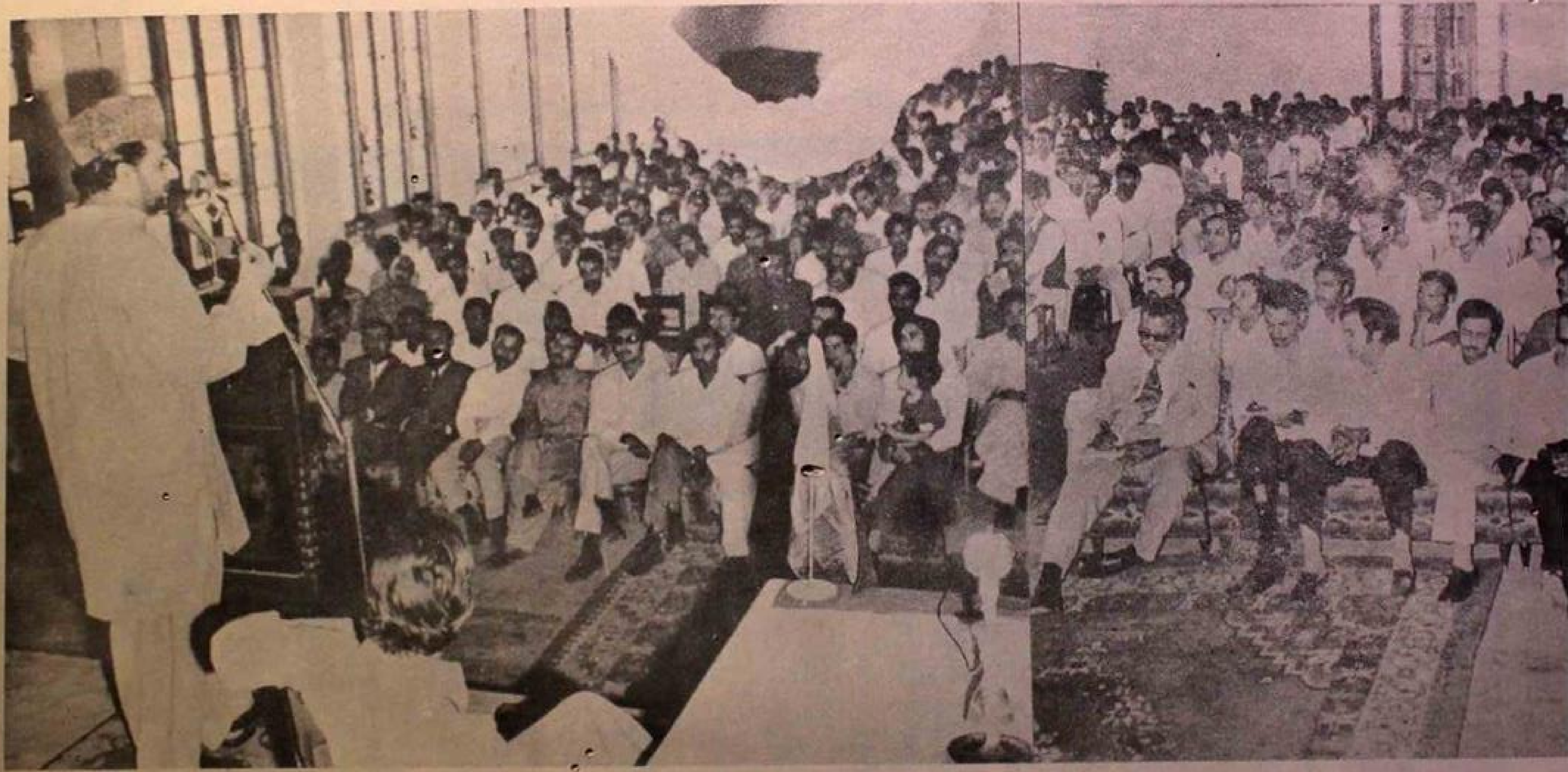

گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے ایک جلسہ کا منظر

گورنمنٹ کالج کہوٹہ کے طلبار سے خطاب

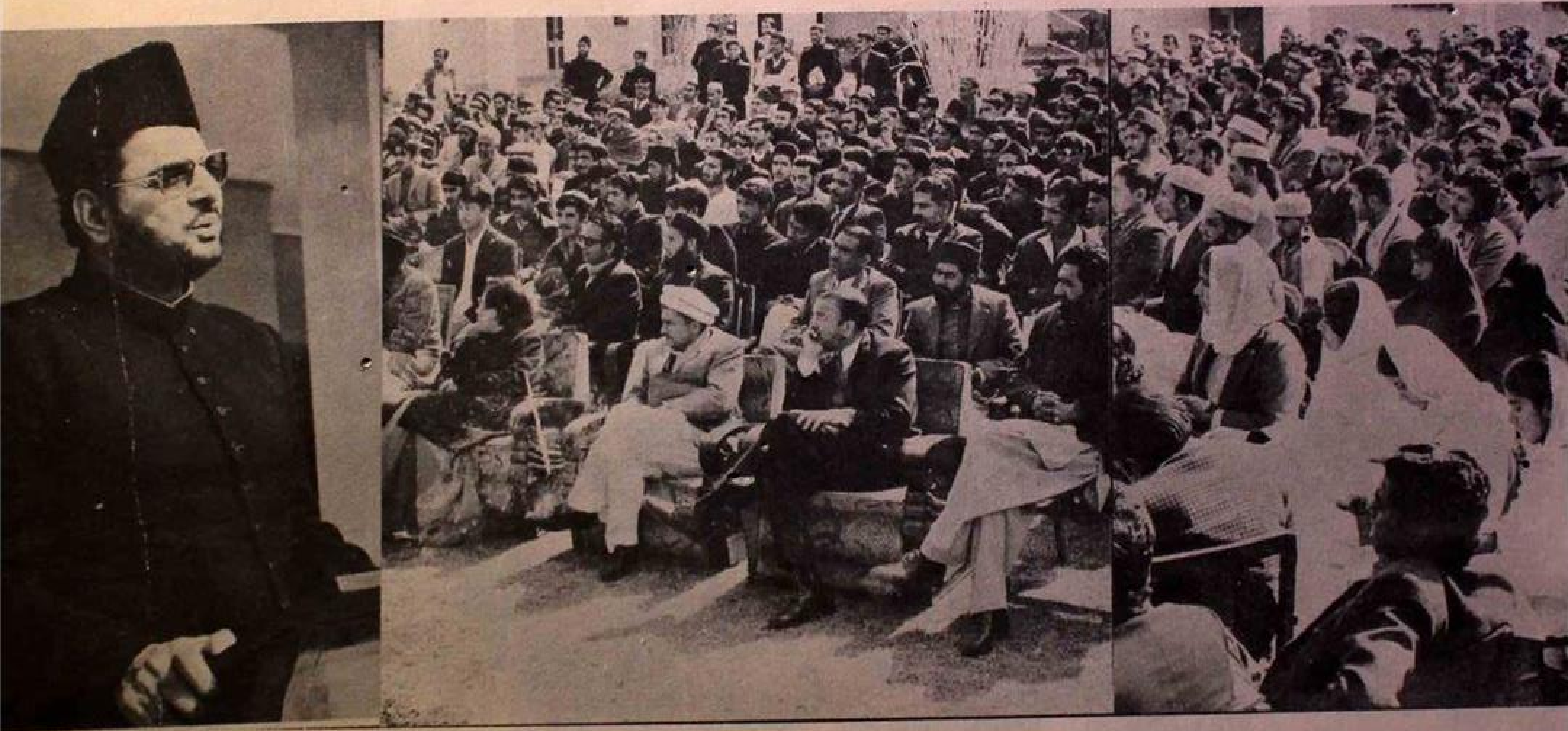

پشاور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات سے خطاب (۱۱ فروری ۱۹۷۴ء)

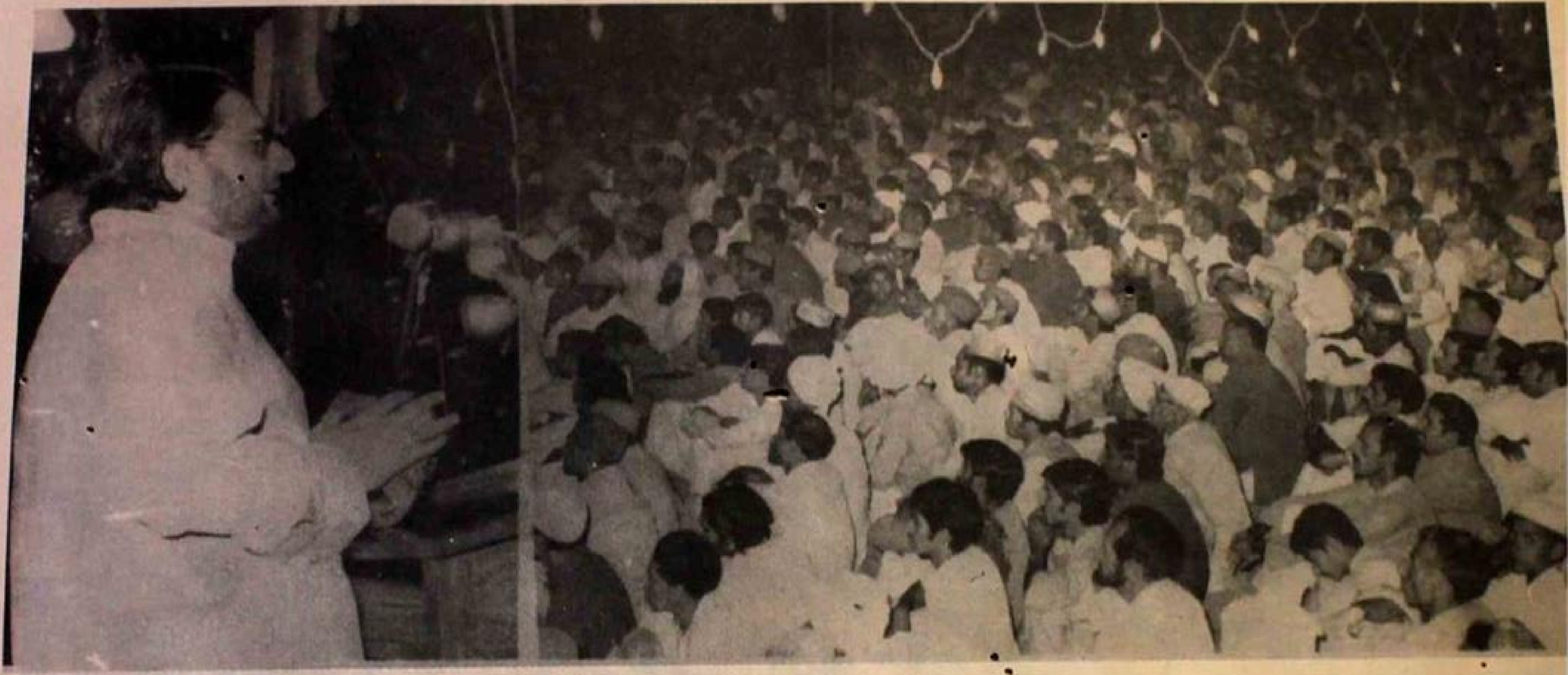

لاڑکانہ میں ایک عوامی جلسہ سے خطاب ـــــــ (۱۱۔ اپریل ۱۹۷۵ء)

آج شام حج کے سلسلے میں Cut Motion پر جو Debate ہوئی ہے میں اپنے بعض دوستوں کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس کے دوران نہایت مفید تجاویز ہمارے غور کے لیے پیش کی ہیں اور بعض نے فراخ دلی سے اس حقیر خدمت کا بھی امتحان کیا ہے جو عوامی حکومت فریضہ حج کی ادائیگی کے سلسلے میں سرانجام دے رہی ہے لیکن حسبِ معمول اور حسبِ توقع جو تعاریر بعض عُلما صاحبان نے کی ہیں وہ دو وجوہ پر مبنی ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس ایوان میں حقائق کی بات کی جاتی ہے اور اس کے باوجود انھوں نے بعض خلافِ حقائق باتیں کہیں اگر ایسا ہے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ ایک فاضل انسان ایسی بات کہے جس کا اس کو علم نہ ہو جس کی اسے تحقیق نہ ہو اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں یہ صحیح نہیں ہے اور اس کے باوجود کہے اگرچہ میں اس کی توقع نہیں رکھتا لیکن ایسا ہو تو یہ صورت حال پہلی صورت سے بدتر ہے۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض دوستوں نے جس انداز سے فریضۂ حج کے سلسلہ میں حکومت کی مساعی پر تنقید کی ہے وہ تنقید سے زیادہ

تنقیص کا رنگ لیے ہوئے تھی اور اگر اس میں ہمدردی کا پہلو ہوتا اصلاحِ احوال کا ہوتا تو اس کا قالب ولہجہ ہی مختلف ہوتا۔ اس کے لیے اندازِ گفتگو ہی مختلف ہوتا۔ لیکن آپ نے دیکھا یہ صورت ایسی نہیں۔ بعض دوست جو خود نہیں بول سکتے انھوں نے پس پردہ رہ کر کچھ اور لوگوں کو بریف Brief کیا تاہم کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اللہ عالم الغیوب ہے جو دلوں کے راز جانتا ہے اور وہ سب کی مساعی کا وزن کر رہا ہے۔ یہ حج اور دینی خدمات کوئی سیاسی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کے سلسلے میں سیاسی پارٹیوں اور ان کی رقابتوں کو درمیان میں لایا جائے اگر کچھ لوگ سیاسی اور ذاتی رقابتوں کو اس میدان میں بھی در آنے کی اجازت دینا چاہتے ہیں تو یہ ان کا اپنا مقدر ہے ان کا اپنا نقطہ نظر ہے۔ میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جنابِ والا۔ سب سے پہلے میں آپ سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اس حکومت کے اقتدار میں آنے سے پہلے وزارتِ حج یا محکمہ حج نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کبھی یہ کام وزارتِ مواصلات میں ہوتا تھا، کبھی منسٹری آف ڈیفنس کے ذریعے حج کے انتظامات ہوتے تھے اور جو اعداد و شمار ہمارے پاس موجود ہیں ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک ان کے پڑھنے سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ پاکستان سے حاجیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو کسی سال بھیجی جا سکی ہے وہ ساڑھے سترہ ہزار سے آگے نہیں بڑھی۔ یہ گزشتہ سالوں کا موازنہ ہے لیکن اس حکومت کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت دی کہ ہر چند کہ تکالیف بھی ہوئیں۔ ہر چند کہ مشکلات نے بھی دامن پکڑا مگر اس نے ۹۰ ہزار۔ ۶۰ ہزار اور ایسی تعداد میں حاجیوں کو بھیجا کہ جنہوں نے تعداد کے اعتبار سے عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے اور میں نہیں کہتا مفتی صاحب! —— ہر سال حج کے موقع پر سعودی عرب کے جو اعداد و شمار چھپتے ہیں اور وہ خود آپ نے ملاحظہ فرمائے ہیں، ان کے اندر یہ لکھا ہے کہ پاکستان ان دونوں سالوں میں تعدادِ حجاج کے لحاظ سے سرِفہرست تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے وہ جس کو مقدر کر دے۔ یہ اس حکومت کے لیے اعزاز تھا کہ اسے یہ

سعادت نصیب ہوئی اور اس سے پہلے جناب والا۔ کوئی ایسا سسٹم نہیں تھا کہ جس سے حاجی صاحبان کی رقوم کی واپسی کا مسئلہ آسان ہوتا۔ مشکلات کی جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان کے حوالے سے میں پوچھتا ہوں کہ یہ چار ماہ کی مدت ——— یہ رقوم کی واپسی کی مشکلات، یہ منیٰ اور عرفات میں حاجیوں کی تکالیف۔ یہ جہازوں کی تکالیف کیا یہ اس حکومت نے پیدا کیں؟ کیا چار ماہ کی جو مدت مقرر ہے وہ پہلے نہیں تھی اور اس حکومت نے اس میں اضافہ کر دیا ہے؟ کیا اس حکومت نے ایسا کیا تھا کہ منیٰ کے اندر لوگوں کے انتظامات خراب ہیں اور عرفات میں بھی خراب ہیں؟ کیا اس حکومت کے عہد میں ایسا ہوا؟ کیا منیٰ اور عرفات پر کنٹرول حکومتِ پاکستان کے پاس ہے؟ اگر یہ ساری باتیں ۲۵ سال سے چلی آ رہی ہیں اور ہم ان میں اصلاح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان ساری خرابیوں کو اس حکومت کے سر تھوپنے کی کوشش کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ آپ دیکھیں کہ اس حکومت نے ایک سنٹرل حج آرگنائزیشن قائم کی اور اس آرگنائزیشن کے تحت جیسا کہ مطالبہ کیا گیا ہے پہلی دفعہ اس حکومت کے عہد میں ایسا ہوا کہ اس نے میڈیکل مشن بھیجے اور اتنی رقم ان پر خرچ کی جتنی پہلے تمام سالوں میں کبھی خرچ نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے مستقل ڈسپنسریاں پاکستان کی طرف سے دو تھیں۔ ایک مکہ مکرمہ میں ایک مدینہ منورہ میں۔ مگر اس حکومت نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ ایک مستقل ڈسپنسری قائم کی۔ اور حج سیزن میں دو ڈسپنسریاں جدہ میں، دو مدینہ منورہ میں اور چار مکہ مکرمہ میں قائم کیں۔ اس کے علاوہ اس سے پہلے جو میڈیکل مشن بھیجے جاتے رہے۔ جناب والا۔ ان کا کل خرچ تین لاکھ روپیہ ہوتا تھا۔ صرف چار ڈاکٹر بھیجے جاتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں ہم نے آٹھ ڈاکٹر بھیجے اور بیس پیرا میڈیکل کے آدمی بھیجے اور پانچ لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ ۱۹۷۳ء میں ہم نے گیارہ ڈاکٹر بھیجے۔ کمپاؤنڈروں وغیرہ کا اسٹاف ۴۵ آدمیوں پر مشتمل تھا اور چھ لاکھ روپیہ ہم نے اس پر خرچ کیا اور جناب والا۔ آپ عجیب بات سنتے ہیں کہ ہمارے آدمی نے کہاں سے علاج کرایا کہاں سے نہیں کرایا۔ وہاں اللہ کی دین ہے، بے شمار مشن ہیں۔ حج مشن اور

ان کے شفا خانے ہیں اور راہ چلتے حاجی، پاکستانی حاجی کسی ہسپتال میں جا سکتا ہے۔ وہ بھی اس کا ہسپتال ہے لیکن پاکستانی شفا خانے سے جتنی تعداد میں غیر ملکی مسلمانوں نے علاج کرایا ہے اس کی تعداد پاکستانیوں کے مقابلے میں کم نہیں ہے اور جو اُن کے تحریری تاثرات ہمارے رجسٹرات پر درج ہیں جناب والا۔ اگر آپ ان کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے ہمارے پاکستانی ڈاکٹروں کی، ہمارے شفا خانوں کی، ہمارے علاج کی کتنی تعریف کی ہے اور کس قدر یہ ہمارا میڈیکل مشن موثر رہا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ اس حکومت نے کتنا اضافہ کیا۔ پچھلے سال کتنا کیا۔ اس سال کتنا کیا۔ بس ایک رٹی پٹی لائن۔ پُرانی باتیں۔ جو دماغ میں ہیں جو ہر دفعہ ہم سنتے ہیں وہی کہی جا رہی ہیں یہ حکومت میڈیکل مشن نہیں بھیجتی اس کو میڈیکل مشن بھیجنا چاہیے۔ اس کو یہ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد جناب والا۔ کیا آج تک سعودی عرب میں حج سروس ریڈیو سے شروع ہوئی؟ کیا آج تک پاکستان کے اخبارات سپلائی کرنے کے لیے لائبریریاں جدہ میں اور مکہ مکرمہ میں اور سعودی عرب میں قائم کی گئیں؟ کیا جناب والا! میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آج تک کوئی حج ویلفیئر فنڈ قائم کیا گیا؟ اس سال بجٹ میں یہ شامل ہے کہ حاجیوں کے ویلفیئر کے لیے رقم مخصوص کی گئی ہے تاکہ ان کو ایجوکیٹ کیا جائے، ان کو بریف کیا جائے، ان کو دینی لٹریچر دیا جائے۔ ان کے حالات بہتر بنانے کے لیے جو بعض اوقات ناگہانی مُصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کی مدد کرنے کے لیے اور اسی طرح سرائے وغیرہ کی تعمیر کرنے کے لیے۔ یہ اقدامات اس حکومت نے پہلی مرتبہ کیے اور اس کے بعد جناب والا۔ یہ بھی میرے دوست نے کہا ہے اور مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری کا میں ممنون ہوں کہ انھوں نے بڑی اچھی تجاویز دی ہیں۔ ان کو شاید علم نہیں ہے کہ پمفلٹ ہم چھاپتے ہیں ہر سال اور وہ مفت تقسیم ہوتا ہے ہر حاجی کو ہم دیتے ہیں۔ بہر حال میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ وزارتِ حج کی طرف سے کئی ایسے کتابچے شائع ہوتے ہیں۔ اگر کہیں ایسا ہُوا ہے کہ کسی کو نہیں مل سکا تو اس سال ہم اور زیادہ تعداد میں چھاپیں گے اور جیسا کہ ان کا کہنا ہے اور زبانوں میں بھی چھاپیں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ

لوگوں تک یہ دینی لٹریچر پہنچ سکے اور پھیل سکے اور میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ لٹریچر تقسیم ہوتا رہا۔ اس کے بعد جناب والا اس حکومت نے رقوم کی واپسی کا انتظام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ رقم لوگوں کو واپس نہیں ملتی۔ بہت سے ایسے کیس ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیس کب کے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ۲۵ سال پرانے یعنی ۱۹۴۸ء کے کیس آج تک موجود ہیں۔ بہت سے کیس کہ جن کو آج تک رقم نہیں مل سکی۔ ۱۹۴۹ء کے اور ۱۹۵۰ء کے سال کے کیس ہیں جن کو رقم نہیں مل سکی۔ کیا یہ چیز اس حکومت نے کی؟ ایسا سسٹم چلا آرہا تھا حج کی رقوم کے جمع کرنے کا جس کی وجہ سے یہ ساری تاخیر ہوئی۔ لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس سال جو حج ہوا۔ میں آپ کی معلومات کے لیے عرض کر رہا ہوں اس میں ایک بھی کیس ایسا نہیں ہے اس سال ایک بھی کیس ایسا نہیں کہ جس میں کسی نے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا ہو اور اس کو رقم نہ ملی ہو۔ ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں سال گزشتہ کی بات اور تھی۔ اس سال ہم نے جو بہتر انتظام کیا ہے اس میں ایک رقم کی ادائیگی کا مطالبہ بھی جناب والا ایسا نہیں ہے جو وہ کر سکیں۔ چند کیسز (Cases) ہیں جنھوں نے بنک ڈرافٹ بھیجے تھے اور اپنا نام انھوں نے نہیں لکھا تھا اس وجہ سے ان کی رقوم کی واپسی میں تاخیر ہوئی ہے ورنہ جتنے لوگوں کی رقوم واپس کرنے کا معاملہ تھا وہ سب کا سب طے ہو گیا ہے اور کوئی ایسی دقت پیدا نہیں ہوئی کہ جس کے لیے لوگوں کو تکلیف ہوئی ہو اور اب جیسا کہ مولانا الازہری نے کہا ہے یہ یقین دہانی میں کراتا ہوں اسمبلی کے فلور پر کہ اس سال سے خدا کے فضل و کرم سے ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ جو شخص حج پر نہیں جائے گا اور رقم واپس لینا چاہے گا تو ایک ہفتہ کے اندر اندر رقم اس کو واپس مل جائے گی۔ پچھلے سال بھی یہ انتظام کیا گیا تھا۔ اس سال بھی حکومت نے یہ انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ جو پچھلے سالوں کے معاملات تھے جو مشکلات تھیں ان کے لیے حکومت کو مورد الزام ٹھہرانا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد میرے بزرگ مولانا الازہری نے یہ فرمایا ہے کہ اسپیشل ٹرینیں چلائی جانی چاہئیں۔ سپیشل ٹرینیں ضرور

چلائی جانی چاہئیں اور میں اس کے حق میں بھی ہوں اور ہم نے واپسی پر سپیشل ٹرینیں چلائیں بھی۔ جاتے ہوئے اس لیے نہیں چلائی جا سکیں کہ سیلاب تھے اور اس میں سارے انتظامات درہم برہم ہو گئے تھے۔ لیکن اس سال سے پھر سپیشل ٹرینیں حاجیوں کی آمد و رفت کے لیے ضرور چلائی جائیں گی اور اس کا خیال خاص طور پر رکھا جائے گا۔ تو حکومت نے اس زمانے میں یہ کام کیا ہے۔ ایک ادارہ حج قائم کیا ہے اور انشاءاللہ سال بہ سال اس کے نظام میں توسیع اور ترقی ہو گی اور جو مشکلات درپیش ہیں ان کا ازالہ ہو گا اور اس دینی فریضہ کی ادائیگی میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں لوگوں کو حاصل ہوں گی۔ لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ عجیب جو تقریر کی گئی ہے ایسی تقریر جس میں حقائق سے اعراض کیا گیا ہے۔ بلکہ اگر میں کہوں کہ حقائق کا منہ چڑایا گیا ہے تو بجا ہو گا۔ میرے بزرگ میری بات پر خفا نہ ہوں۔ ایسی تقریر کرنے والے میرے دوست مفتی محمود صاحب ہیں۔ جناب والا میں پہلے تو باادب یہ گزارش کروں گا صرف فرق بیان کرنے کے لیے تاکہ ایوان پر یہ بات واضح ہو کہ میرے بزرگ دو دفعہ حج وفد کے ممبر کی حیثیت سے ہمارے ساتھ تشریف لے گئے اور ہر حج وفد کے ممبر کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے مشاہدات کی اور جو تکالیف اور جو معاملات اس نے دیکھے ہیں ان کے متعلق اور ان کے حل کے متعلق رپورٹ دے۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مفتی محمود صاحب نے کوئی رپورٹ اس سلسلے میں نہیں کی اور دو سال تک جب وہ حج وفد کے ممبر کی حیثیت سے تشریف لے جاتے رہے۔ اس ایوان میں بھی ان کی شعلہ نوائی نہیں سنی گئی اور اس سلسلے میں جتنے کیڑے آج انھوں نے نکالے ہیں پہلے کبھی نہیں نکالے۔ لیکن ٹھیک ہے اس سال یقیناً وہ ساری تکالیف وہ ساری مشکلات وہ سارے عیوب وہ سارے نقائص وہ ساری خطائیں ان کو نظر آ رہی ہیں جو نہ صرف اس سال کی ہیں بلکہ پچھلے سال کی بھی ہیں بلکہ اس سے پچھلے سال کی بھی ہیں اور مفتی صاحب کے بیانات ہیں جن کے اندر انھوں نے ہمارے انتظامات کو سراہا ہے۔ اگر جناب والا میں کل اس ایوان میں ان کا بیان اور ان کی تقریر پیش نہ کروں تو قومی اسمبلی کی رکنیت سے

مستعفی ہو جاؤں گا۔ اور اگر مفتی صاحب قومی اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی نہ ہوں تو یہ ان کی بات ہے۔ میں پیش کروں گا اُن اخبارات کے تراشے جن میں مفتی صاحب نے ہمارے انتظامات کو سراہا ہے۔ اگر آج یک لخت نظام بدل گیا ہے تو آج سارے کے سارے نقائص ہی نقائص ہیں، سارے عیوب ہیں۔ جہاز ایک طرف ہلتا ہے تو حکومت ذمہ دار، دوسری طرف ہلتا ہے تو حکومت ذمہ دار۔ اگر کسی کو پیشاب زیادہ آتا ہے تو حکومت ذمہ دار۔ کم آتا ہے تو حکومت ذمہ دار۔ تو جناب والا ٹھیک ہے یہ اپنا اپنا نقطہ نظر ہے کل جو چیزیں روا نہیں تھیں آج روا ہو گئی ہیں۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ لیکن اس کے بعد جو بات میں ذمہ داری سے کرتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ بات کر کے مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ اور میں کہتا ہوں اگر تحقیق کے بغیر کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے تو خدا کے لیے وہ اپنے علم کو، اپنے منصب کو دیکھے۔ کیا لوگ ان سے یہ توقع رکھتے ہیں اور کیا یہ ان کا مقام ہے اور کیا یہی ان کی عظمت ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ پچھلے سال چالیس پچاس ہزار حاجیوں کی درخواستیں مسترد ہوئیں اور اس ایوان میں بھی کہا گیا۔ مفتی صاحب اگر یہ کہا ہو تو آپ اس کی تردید کر دیں۔

(مفتی صاحب نے اس کی تصدیق کی)

جی جی کاروانوں کی چالیس پچاس ہزار کی درخواستیں جو ہیں وہ مسترد ہو گئیں۔ یہی فرمایا آپ نے؟

(مفتی صاحب دوبارہ یہی بات دہراتے ہیں)

یعنی آپ نے یہی کہا کہ چالیس پچاس ہزار حاجیوں کی درخواستیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ بعد میں یہ نہ کہا جائے کہ ہم نے یہ نہیں کہا تھا۔ جناب والا۔ چالیس پچاس ہزار کی تعداد تو بڑی ہے کاروانوں کے سلسلے میں چالیس سو حاجیوں کی درخواستیں بھی مسترد نہیں ہوئیں کُل درخواستیں جن میں بری کاروان۔ بحری اور ہوائی سب شامل ہیں جو پچھلے سال مسترد ہوئیں یعنی کُل لوگ جو نہیں جا سکے ان کی تعداد پندرہ ہزار تھی اور اس میں بری راستے سے جو لوگ جانا چاہتے تھے ان کی کل تعداد جن کی درخواستیں آئیں بارہ سو تھی۔ بارہ سو آدمیوں کو بیک جنبش

زبان چالیس پچاس ہزار میں تبدیل کر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں خدا کا خوف کیجیے۔ آپ کیا جواب دیں گے۔ میں کہتا ہوں کمیشن مقرر کیا جائے اس ہاؤس کا اور وہ دیکھے انکوائری کرے۔ اور مفتی صاحب اگر آپ نے غلط بیانی کی ہے تو آپ کو اپنی رکنیت سے مستعفی ہونا چاہیے نہیں تو میں مستعفی ہوں۔

جناب والا۔ خدا کے لیے جناب سپیکر ہمیشہ کے لیے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے آپ ضرور یہ کمیشن قائم کریں اور میں کہتا ہوں کہ اپوزیشن کے لوگ بھی اس کمیشن کے ممبر ہوں وہ سارا ریکارڈ دیکھیں۔ ہر چیز دیکھیں تاکہ انھیں معلوم ہو کہ حقیقت حال کیا ہے۔ آخر یہ کیا ظلم ہے کہ مخالف پارٹی پر بلا تحقیق ایک الزام لگا دیا جائے۔ کیا اس طرح فتوے لگائے جاتے ہیں؟ اس طرح لوگ آپ پر اعتماد کریں گے اور اعتبار کریں گے؟ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اس طرح وزارت حج کے اوپر الزامات لگائے جائیں کل تحقیق کی جائے کہاں بارہ سو اور کہاں چالیس ہزار۔ بارہ سو میں ایک صفر بڑھ جاتی تو میں کہتا کہ غلطی سے مولانا نے پڑھ لیا ۱۲۰۰۰۔ بارہ سو تھا بارہ ہزار پڑھ لیا۔ لیکن خدا کے لیے دیکھیے کہ بارہ سو کو چالیس پچاس ہزار بنا دیا گیا۔ اور اس کے بعد جناب والا میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ فرمایا گیا کہ بری قافلوں میں یہ ہوا۔ وہ تکلیف ہوئی اور سن سٹروک کا لطیفہ تو آپ سن چکے ہیں جب دسمبر میں برف باری ہو رہی تھی تو سن سٹروک ہو رہی تھی حاجیوں کو۔ خیر اس بحث میں نہیں جاتا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ٹرانسپورٹ کے ذریعے یعنی پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کے ذریعے حاجیوں کو بھیجنے کا تعلق ہے میں اعتراف کرتا ہوں کہ حکومت کا یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا۔ اور اس کے لیے میں اپنے دوست میاں محمود علی قصوری کی تجویز پر صاد کرتا ہوں اور میں نے انھیں خود یہ کہا ہے کہ بری رستہ ضرور ہونا چاہیے لیکن حجاج کو پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ اس کے لیے سرکاری بسوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ یہ انتظام کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ جب یہ انتظام ہو، وزارت خزانہ اس کے لیے رقم دے اور بیڑا تیار کرے

تو مجھ سے زیادہ کس کو خوشی ہوگی۔ میں یقیناً ان جذبات میں شریک ہوں۔ لیکن ایک اور دلچسپ بات اور مفتی صاحب سے معذرت کے ساتھ یہ ہے کہ بڑی قافلے میں تکلیفیں ہوئیں۔ لوگوں نے پیسے نہیں دیے۔ اب تک مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ ساری مشکلات بجا اور درست ہیں لیکن مفتی صاحب میں کیا کروں۔ میں اپنی وزارت سے کہتا تھا کہ ٹرانسپورٹروں کے انتخاب میں کڑے پن کا ثبوت دو اور معیار جو قائم کیا ہے اس سلسلے میں کوئی لچک پیدا نہ کرو۔ تو آپ تھے آپ جیسے اور بہت سے دوست تھے کہ جو آ کر ہماری گردن دباتے تھے اور کہتے تھے کہ نہیں ان لوگوں کو ضرور شامل کرنا چاہیے۔ آپ انصاف کریں کیا ڈیرہ اسمٰعیل خان کی الحمید ٹرانسپورٹ آپ نے سفارش کر کے منظور نہیں کرائی تھی۔ ویسے مفتی صاحب میں آپ کی معلومات کے لیے کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ جو ادائیگیاں ہیں وہ اس ٹرانسپورٹ کے ذمے ہیں جس کی سفارش آپ نے کی تھی۔

میں عرض کر رہا ہوں۔ ہم مواخذہ کر رہے ہیں ہم نے اس پر مقدمہ بنا رکھا ہے۔ لیکن خدا کے لیے آپ لوگوں نے جن ٹرانسپورٹروں کے متعلق کہا کہ ان کو بھیجا جائے حالانکہ ہم نہیں چاہتے تھے۔ آج وہ پیسے نہیں دے رہے اور اس کے لیے بھی وزارتِ حج ذمہ دار ہے۔ خواہ وہ الحمید ٹرانسپورٹ ہو جس کو آپ نے Recommend کیا اور ظلم یہ ہے کہ سارا الزام وزارتِ حج پر۔ اور اس کے بعد جناب میں کہتا ہوں یہ فرمایا گیا ہے کہ زرمبادلہ بڑھایا جائے۔ زرمبادلہ ضرور بڑھایا جائے میں اس کی تائید کر چکا ہوں اس فلور پر۔ میں کہتا ہوں کہ وزارتِ خزانہ نے جو رقم حاجیوں کے زرمبادلہ کے لیے منظور کی ہے وہ بڑھنی چاہیے میں یقیناً اس کے لیے کوشش کروں گا۔ میں کیبنٹ میں معاملہ Move کروں گا۔ میں پرائم منسٹر سے کہوں گا لیکن یہ بھی تو دیکھا جائے کہ اس حکومت سے پہلے زرمبادلہ کیا ملتا تھا اور اب کیا ملتا ہے۔ پہلے زرمبادلہ ملتا تھا ۱۵۰ ڈالر اور اب یہ حکومت دے رہی ہے تین سو ڈالر۔ اب زرمبادلہ دُگنا کر دیا گیا ہے لیکن جب ہم نے اسے دُگنا کیا تو ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میرے ایک اور سادہ دل بزرگ کہتے ہیں

حج کو مہنگا نہ کر دیں یہ کوئی درآمد کرنے کی یا برآمد کرنے کی چیز ہے۔ میں پوچھتا ہوں ان سے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ حج کے سلسلے میں اس وقت جو صورتِ حال ہے کرایوں کی صورت یہ ہے کہ روپے کی قیمت گر گئی۔

• ڈھائی گنا قیمت جو ہے وہ کم ہوئی ان کو علم ہے۔ کیا اس کا اثر نہیں پڑے گا حج پر؟ جب ہر چیز پر پڑے گا تو کیا اس پر نہیں پڑے گا۔ اس کے بعد زرمبادلہ جو ہم نے بڑھایا ڈیڑھ سو ڈالر، وہ بھی تو حج کوٹے میں آتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رقم زیادہ لی گئی ہے۔ لیکن ملتا ہے وہ حاجی کو۔ وہ زرمبادلہ بھی اس میں شامل ہے۔ پھر کرایہ جو ہے تیل کا۔ کیا تیل کی قیمت نہیں بڑھ گئی۔ قیمت تیل کی بڑھنے سے کیا باربرداری کا خرچ نہیں بڑھ گیا۔ کیا پہلے جہازوں میں باربرداری کا کرایہ جو ۲۶۰ ڈالر فی ٹن تھا اب ۹۶۰ روپے فی ٹن نہیں ہو گیا؟ یہ تین گنا خرچ بھی بڑھ گیا۔

زرمبادلہ بھی ہم نے زیادہ دیا۔ میں کہاں سے حج سستا کروں۔ حضرت مولانا، کوئی نسخہ کیمیا گری کا آپ کے پاس ہے تو مجھے دیجیے۔ مجھے اس سے زیادہ کوئی خوشی نہیں ہو گا کہ حج سستا ہو اور ہر شخص حج پر جا سکے۔ لیکن یہ کیا طریقہ ہے کہ حج سستا ہو، حج سستا ہو۔ کوئی تدبیر بھی دو، کوئی ٹھوس بات بھی کرو۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ محض ایسے ہی بات کہہ دی جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے، یہ بات قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں اور ساتھ یہ تقاضا ہے کہ زرمبادلہ بڑھاؤ۔ اور زرمبادلہ بڑھے گا تو پھر حاجی کو محسوس ہو گا کہ خرچ اور بڑھ گیا۔ جب آپ زرمبادلہ اور دیں گے، ساڑھے چار ہزار کا اگر خرچ ہے اور ڈیڑھ ہزار کا مزید زرمبادلہ دیں گے تو آپ حاجی سے چھ ہزار روپے مانگیں گے۔ پھر کہیں گے کہ حج مہنگا ہو گیا ہے۔ مگر یہ سارے مطالبے، تقاضے اور خواہشات آپس میں متضاد اور متصادم ہیں۔ ان کا کوئی علاج ممکن نہیں اور ایک بات میرے بزرگ مفتی صاحب نے اور کہی کہ ایران میں حج کا نظام بہترین ہے اور ایران کا سفارت خانہ ایسا انتظام کرتا ہے، ویسا انتظام کرتا ہے۔ یقیناً ایران کا انتظام بے حد اچھا ہے اور انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایران کے حاجیوں کے بہتر حالات کے بارے میں رپورٹ میں نے خود پرائم منسٹر کو دی تھی اور جب

اس دفعہ میں ایران کے سفر پہ گیا تو میرے ساتھ ایڈیشنل سیکرٹری وزارت حج تھے اور ہم نے ایران کے حج کے نظام کا مُطالعہ کیا۔ تاکہ ہم کچھ باتیں سیکھ سکیں اور انھیں اپنے ملک میں رائج کریں۔ لیکن ذرا سُنیے گا کہ حج کا نظام ایران میں بہتر کس طرح کیا گیا ہے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ ہم نے حج کو مہنگا کر دیا لیکن ایران میں کیا ہوتا ہے۔ حج کے بہتر نظام کی خواہشات بجا اور برحق، مگر ذرا ایران کے نظام کا تقابلی مقابلہ کرنے کے لیے یہ اعداد و شمار پیشِ نظر رکھے جائیں کہ ہر حاجی سے حج کا جو خرچ حکومتِ ایران وصول کرتی ہے وہ دو حِصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصّہ وہ ہے جس میں رہائش۔ کھانا۔ ٹرانسپورٹ شامل ہے یہ حکومت کے ذمّے ہے کوئی حاجی وہاں Bother نہیں کرتا اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ حکومت ذمّہ دار ہوتی ہے کہ ہر حاجی کے لیے رہائش فراہم کرے۔ کھانے بھی دے۔ ٹرانسپورٹ بھی فراہم کرے۔ مگر اس کے لیے وہ لیتی ہے صرف ۸۶۰۰ تومان اور ۸۶۰۰ تومان بنتے ہیں ساڑھے بارہ ہزار پاکستانی روپے کے برابر۔ حکومت ساڑھے بارہ ہزار تو یہ وصول کرتی ہے۔ اس کے بعد زرِ مبادلہ دیتی ہے۔ مزید لازماً ہر شخص کو ساڑھے پانچ ہزار کا اٹھارہ ہزار روپیہ ایک حاجی پہ حکومتِ ایران کا خرچ ہوتا ہے اور اٹھارہ ہزار روپے میں وہاں حج کا بہتر نظام قائم ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حج سستا بھی کرو۔ چار ہزار میں، تین ہزار میں، ڈھائی ہزار میں اور آپ سارے فوائد بھی وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو حکومتِ ایران سے وابستہ ہیں آخر دونوں کے اندر کیا تفاوت ہے اور دونوں کے اندر کیا موافقت ہے۔ آپ ہمیں اجازت دیجیے طے کر دیجیے پالیسی کہ حکومت یہ سارا نظام اپنے ہاتھ میں اس طرح لے اور حکومتِ ایران کی طرح سارا بند و بست کرے اور اس شرح پہ حاجیوں سے رقم لے۔ اگر ایسا انتظام نہ ہو تو پھر آپ کے سامنے ہم جواب دہ ہیں۔ ہمارا مواخذہ کریں۔ پاکستان کے پاس بھی اچھے کارکنوں کی کمی نہیں ہے وہ بھی بہتر انتظام کر سکتے ہیں لیکن ذرائع و وسائل ان کے پاس نہیں ہیں۔ دولت اور تموّل ان کے پاس نہیں ہے۔ خُلوص کی دولت ہے مگر خلوص کی دولت کے عوض سکّے تو نہیں ملتے آخرت میں اجر مل سکتا ہے۔ دُنیا میں کوئی اجر

نہیں تھا۔ جناب اس کے بعد میں ایک اور مسئلہ پر آتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ خدا کے لیے الزام لگانے سے پہلے تحقیق کر لیں۔ کیونکہ سیاسی مخالفت میں، ذاتی رنجش میں یا کسی ناپسندیدگی کی وجہ سے آپ ایسی بات کیوں کہتے ہیں جس کا کل مواخذہ ہو۔ کیوں آپ ایسی بات کہتے ہیں۔

آپ نے کہا کہ معلم حکومت کی مرضی سے مقرر ہوتے ہیں جناب والا۔ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے حکومت نے اس پر غور کیا کہ یہ بڑی تکلیف ہے ہمارے حاجیوں کو کہ معلم ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور معلموں کا انسٹی ٹیوشن حکومت پاکستان کے ماتحت نہیں ہے۔ یہ حکومت سعودی عرب کے ماتحت ہے۔ ہر حاجی کو معلم مقرر کرنا پڑتا ہے کوئی اگر اپنے معلم کے پاس رہے یا نہ رہے معلم کی فیس اس کو دینی پڑتی ہے اور معلموں کے نظام میں ہم کوئی دخل نہیں دے سکتے۔ البتہ کسی معلم کے خلاف شکایت ہو تو حکومت سعودی عرب کو ہم متوجہ کر سکتے ہیں اطلاع دے سکتے ہیں کہ فلاں معلم نے ہمارے حاجیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب پچھلے سے پچھلے سال یہ شکایات ہوئیں کہ بہت زیادہ حاجیوں کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی کی ہے معلمین نے اور اس سال مفتی صاحب حج پر نہیں تھے انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سال اللہ کے فضل سے ہمارے انتظامات خاصے بہتر تھے۔ کیونکہ ہم نے معلموں کو ڈرایا تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال جب انھوں نے انتظام اچھا نہیں کیا تو ہم نے یہ اعلان کیا کہ جن معلموں نے ہمارے حاجیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہم ان کو بلیک لسٹ کریں گے۔ چنانچہ ہم نے ان معلموں کو بلیک لسٹ کر دیا اور کہا اب ان کے پاس پاکستانی حاجی نہیں جائیں گے اور جس معلم کو پاکستان چاہے وہ اپنا معلم بنائے اس پہ کوئی قدغن نہ تھی اس پر کوئی پابندی نہیں تھی کسی کو نہیں کہا گیا کہ کون سا معلم کیا جائے کون سا معلم نہ کیا جائے۔ البتہ جن معلموں نے بدتمیزی کی تھی، جن کے انتظامات خراب تھے ان کے سلسلے میں حکومت نے بہت کچھ کرنے کا پروگرام بنایا اور وہ پورا کیا۔ اس لیے جو معلم تھے انھیں خوف پیدا ہوا اور اس سال جو ہمارے پاکستانی گئے تو اس کی وجہ سے وہ بڑے چوکنے تھے اور بڑے گھبرائے ہوئے تھے اس سال انھوں نے ان کی بہتر خدمت کرنے کی کوشش

کی لیکن سنی ہیں اگر حاجی کیمپ کہیں نہ تھے اور خیمے ٹھیک نہ لگے تھے یا عرفات میں اگر ٹھیک نہ لگے تھے اور پاکستانیوں کی حالت بدتر تھی تو کیا وہاں خیمے معلّم لگاتے ہیں یا پاکستانی حکومت لگاتی ہے اور اگر معلّم لگاتے ہیں تو پھر کیا طریقہ ہو جس سے معلّموں کی انسٹی ٹیوشن کی اصلاح ہو سکے میں تو یہ چاہتا تھا مگر میں نہیں کر سکا۔ میں جانتا ہوں اس ملک میں کوئی کام دیانت داری سے بھی کیا جائے تو بھی اس کے متعلق ہزار باتیں ہو سکتی ہیں۔ میں نے نہیں کیا۔ میری یہ خواہش تھی اور اب بھی ہے کہ کچھ بہتر لوگوں کا ایک وفد پاکستان سے جائے جو جا کر سفارت خانہ کی وساطت سے سعودی عرب میں معلّموں سے بات چیت کرے، بہتر معلّموں کا انتخاب کرے۔ ہر معلّم کو پہلے سے معلوم ہو کہ ہم اس کو بیس ہزار، دس ہزار یا پانچ ہزار حاجی دے رہے ہیں۔ ان سے شرائط طے ہوں کہ ہمارے حاجیوں کو کیا کیا رعائتیں دی جائیں گی جو معاہدہ ہو اس کی نقل سفارت خانے کے پاس بھی رہے اور حکومتِ سعودیہ کے پاس بھی رہے اور اس کے بعد پاکستانی حاجیوں کو اگر تکلیف ہو تو ہم اس معاہدہ کی رُو سے مُعلّموں کو پکڑ سکتے ہیں لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ ہم نے سوچا کہ اگر کریں گے تو اپوزیشن والے کہیں گے کہ پتہ نہیں معلّموں سے مل گئے ہیں کچھ معلّم کر لیے گئے اور ان سے پتہ نہیں کیا معاملے ہوئے، اس طرح کے شبہات پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کے اندر مفاسد ہیں اور اس کے اندر خرابی ہے تو پھر شبہات کی وجہ سے جناب والا یہ کام ہم نے ترک کیا۔ لیکن کسی معلّم کے ضمن میں یہ بات نہیں ہے کہ فلاں معلّم کو، صرف بلیک لسٹ کیے گئے چند معلّم ہیں اور ہم اس دفعہ خانہ بنا رہے ہیں آپ الزام بھی لگائیں گے تو میں یہ کام کروں گا۔ فارم میں ایک خانہ بنا رہے ہیں۔ ہر حاجی جب واپس ہونے لگے گا تو اس کے لیے ہم نے یہ خانہ بنایا ہے کہ معلّم جو ہے تمہارا اس نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا اور جس مُعلّم کی شکایات ہوں گی ہم اس کو بلیک لسٹ کریں گے اور اس کے پاس پاکستانی حاجی نہیں بھیجیں گے۔ آخر ہم پہ ذمہ داری ہے ہم سعودی عرب میں تو اثر انداز نہیں ہو سکتے لیکن پاکستان میں تو ہم اپنے حاجیوں کو بتائیں گے کہ کون لوگ جو ہیں وہاں معلّموں کے رُوپ میں قصاب ہیں اور وہ تمہیں تکلیف دے رہے ہیں۔ ان

کے پاس نہ جانا۔ بہ صورتِ حال جناب والا معترض کے سلسلے میں ہے اور اس کا کوئی تعلق جو ہے وہ حکومتِ پاکستان کے معاملات کے ساتھ نہیں ہے اور اس لیے میں بادب گزارش کروں گا کہ یہ بات جو کہی گئی ہے کہ مسلم حکومت نے منظور کیے تھے یہ درست نہیں ہے۔ بلیک لسٹ کیے گئے چند مسلم اور باقی کے لیے ہم نے اجازت دی کہ جس کی مرضی ہے وہ جو مسلم کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

جناب والا اس کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ ایک دوست نے آخر میں اگرچہ برسبیل تذکرہ ہی سہی قرآن حکیم کی طباعت کے سلسلے میں بات کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ضرور اس سلسلے میں ایوان کو احوال واقعی سے آگاہ کرنا چاہیے ——— میں اس پر کوئی تنقید نہیں کروں گا میں کوئی ان باتوں کی طرف نہیں آؤں گا۔ میں صرف آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ قرآن حکیم کی پرنٹنگ، قرآن حکیم کی غلطیوں سے پاک، طباعت میں نقائص تھے۔ چار ایڈیشن ایسے تھے جن میں غلطیاں پائی جاتی تھیں حکومت نے ضبط کر لیے ہیں۔ مزید برآں اب جتنے بھی قرآن حکیم چھپ رہے ہیں پاکستان میں، وہ سب کے سب وہ ہیں جن کے ساتھ کسی مستند عالم کا صداقت نامہ شامل ہو گا کہ اس نے پروف ریڈنگ کی ہے اور اس میں کوئی غلطی پائی نہیں گئی۔ یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا کرم ہے قرآن حکیم میں اصلاح کی بات نہیں ہے۔ قرآن حکیم جو لوگ چھاپتے ہیں اور غلطیاں کرتے ہیں یہ ان کی اصلاح کا کام ہے اور ہمارے باپ دادا کا کام نہیں ہے۔ اس حکومت کو اس سے کیا لینا ہے۔ یہ تو آخرت کی بات ہے اور آپ نے متفقہ طور پر اس کو منظور کیا تھا میں حیران ہوں کہ پھر یہ کس کی ذمہ داری ہے اور خدا تو ضرور محافظ ہے مگر خدا بندوں کے ذریعے محافظت کرتا ہے ایسا تو نہیں ہے کہ ہاتھ پاؤں بندے توڑ کر بیٹھ جائیں اور خدا خود محافظت کرتا ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور وہ انشاء اللہ اس کے تقاضے سے عہدہ برآ ہوتی ہے اور اخیر میں جناب میں اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ میں نے اگر کوئی سخت بات کہی ہے میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر میں نے اللہ کے فضل سے کسی کی شان میں کوئی غیر پارلیمانی لفظ استعمال نہیں کیا۔ مگر کمیشن ضرور قائم کریں گے۔ جناب اسپیکر وہ میں نہیں بھولوں گا وہ آپ کو کرنے پڑیں گے اور

ایک سیٹ نہیں ضرور خالی کرانی ہے یہ کام آپ کو ضرور کرنا ہوگا اور آپ سے میں استدعا کروں گا خدا کے لیے کہ پروفیسر غفور کو، مولانا نورانی کو، عبدالمصطفیٰ الازہری کو کسی کو آپ اس کا ممبر بنا دیں مجھے قبول ہے، لیکن ایک دفعہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہونا چاہیے تاکہ آئندہ اس کا سدباب ہو سکے اور دیکھیں جناب دیکھیے آپ یہ پیشاب ہوگا کہ پانی میں کیا کہوں۔ پیشاب ہوگا، کیونکہ جہاز چلتا تھا ادھر سے پھر اُدھر ہو جاتا تھا اُدھر سے چلتا تھا تو اِدھر ہو جاتا تھا تو اب میں کیا کہوں۔ میں کہتا ہوں مفتی صاحب کمیشن کا ریکارڈ دیکھنے آپ حج آفس میں بڑی خوشی سے آئیے خدا کے لیے سنی سنائی باتوں پر نہ جائیے اگر ریکارڈ دیکھیے۔ مجھے احساس ہے جناب سپیکر کہ آج میں کچھ زیادہ تلخ ہو گیا مگر ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

میں نے اس لیے یہ لہجہ اختیار کیا ورنہ مفتی صاحب میرے بڑے بزرگ ہیں اور میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ بعض علما صاحبان نے کٹ موشن پیش کیے آپ ذرا دیکھیں کہ گھٹا کر ساری رقم حج کی ایک روپیہ کر دی۔ ذرا آپ ملاحظہ کریں ان لوگوں کے جذبہ دینی کو تولیں، وزن کریں۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ ایک روپیہ کم کریں آپ۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ ایک روپیہ کم کریں اور بحث کریں۔ لیکن یہ نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ سارا کاٹ کر ایک روپیہ کر دیں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا انداز نظر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم پر سب کو چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

○

مولانا کوثر نیازی

کی

ایمان افروز کتابیں

اسلام ہمارا دین

دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور اخلاقی مسائل پر فکر انگیز مضامین کئی نئے اضافوں کے ساتھ۔ قیمت:-/۳۰ روپے

بصیرت

کلام اللہ کی اُن آیات کی تشریح جو ہماری روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں مختصر مگر جامع۔

قیمت:-/۲۰ روپے

بنیادی حقیقتیں

اسلام کے بنیادی حقائق مختصر الفاظ میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ قیمت:-/۱۲ روپے

آئینہ عیسائیت

مولانا نے اُن عیسائی مشنریوں کو آئینہ دکھایا ہے جو آدمیت کی نجات کے بہانے لوگوں کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیلتے ہیں۔ قیمت:-/۱۲ روپے

تخلیقِ آدم

ارتقاءِ انسانی کے بارے میں ڈارون کے نظریات کا ابطال قرآن وحدیث کی روشنی میں۔ قیمت:-/۱۲ روپے

اسلام ہمارا انتخاب

اسلام ہمارا دین، بصیرت اور بنیادی حقیقتیں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی، جو اسلامی تعلیمات پر بہترین مواد ... کرتی ہے۔ قیمت:-/۱۸ روپے

مطالعۂ تاریخ

تدوینِ تاریخ کے بارے میں مغربی مؤرخین کے نظریات کا ابطال قرآن کے تصورِ تاریخ اور مسلمان مؤرخین کی تحقیقات کی روشنی میں۔ قیمت:-/۹ روپے

زرِ گُل

مولانا کی نعتوں، نظموں اور غزلوں کا دلنواز مجموعہ۔ طباعت آفسٹ دو رنگا۔ متعدد اضافوں کے ساتھ۔ قیمت:-/۲۰ روپے

ذکرِ حسینؓ

شہادتِ حسینؓ پر تاریخ کے آئینہ میں ایک جامع اور مدلل کتاب۔

قیمت:-/۵۰ روپے

اندازِ بیاں

مولانا کوثر نیازی کے ادبی، سیاسی، پارلیمانی اور عوامی خطبات کا ایک ضخیم مجموعہ۔ تاریخی تصاویر سے مزین۔ قیمت:-/۶۰ روپے

داستانِ حج

ایک مکمل حج کا آئینہ جس میں علمی و دینی مسائل کے حل کے ساتھ جو آپ کو کسی اور کتاب میں نہیں ملیں گے۔

ایک ہفتہ چین میں

چین کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کے علاوہ مصنف کے دورۂ چین کے شگفتہ تاثرات ادبی زبان میں۔

میلاد النبی ﷺ اور اس کے تقاضے

میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت اور اس کے جذباتی، نفسیاتی اور دینی تقاضے۔

اسلام کے معاشی تصورات

ایک خطبہ جو اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ——— حیدرآباد ——— کراچی